مقالاتِ راشدی
سید حسام الدین راشدی
انسٹیٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز
جامعہ کراچی

مقالاتِ راشدی

سید حسام الدین راشدی

مرتب :

غلام محمد لاکھو

انسٹیٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز

جامعہ کراچی

سید حسام الدین راشدی مرحوم کے بیسویں یوم وفات،
یکم اپریل ۲۰۰۲ء کی مناسبت سے شائع کی گئی۔

مقالاتِ راشدی

مرتب : غلام محمد لاکھو

تعداد : ایک ہزار

قیمت : 400 روپے

سال : 2002ء

پبلشر : انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز جامعہ کراچی

پرنٹر : شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

ISBN-969-8120-06-8

فہرست

حرفِ اوّل

یہ کتاب مرحوم ڈاکٹر پیر سیّد حسام الدین راشدی کے اردو مقالات کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر غلام محمد لاکھو نے بڑی محنت اور محبت سے مرتب اور مدون کیا ہے۔ مرحوم راشدی صاحب (جنہیں احترام اور محبت کی بنا پر لوگ پیر صاحب کہا کرتے تھے اور اس مختصر تحریر میں بھی اسی لقب سے یاد کیا جائے گا)، پاکستان میں اپنے عہد کے عالی مرتبہ محقق اور فاضل شمار کیے جاتے تھے۔ وہ سندھی، اُردو، فارسی اور عربی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے۔ لیکن وہ صرف زبان دان نہ تھے، وہ کتبات شناسی کے ماہر تھے اور تاریخ اور آرکیالوجی پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ انگریزی، اسکول میں نہیں پڑھی لیکن اس زبان پر انہوں نے ایسا عبور حاصل کر لیا کہ تاریخ اور سیاسیات کے ادب پر اچھی نظر رکھتے تھے اور اس میدان میں نئے رجحانات سے باخبر اور نئی کتابوں کے متلاشی رہتے تھے۔

یہ تفصیلات اس لیے بیان کی گئیں کہ ان کی تحریر میں جو گہرائی اور تہہ داری ہے اُس کے سرچشمہ کا سراغ اِن ہی سے ملتا ہے۔ وہ محض ادیب نہ تھے، بلکہ صحیح معنی میں عالم، فاضل اور محقق تھے۔ قلم چاہے ادب کے موضوع پر اُٹھاتے، یا تہذیب و تمدن پر یا تاریخ پر یا کتاب پر، ان کی تحریر میں رچاؤ، ان کے گہرے اور وسیع علم کے سبب سے ہوتا تھا اور سونے پر سہاگا یہ کہ وہ نئی کتابوں سے باخبر رہتے تھے اور ان کا علم تازہ اور مستقبل رویہ تھا۔ اسی لیے ایک باذوق قاری کو اُن کی تحریر پڑھ کر سیر حاصل آسودگی ہوتی ہے۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ وہ اردو کے بلند پایہ ادیب تھے۔ کسی مسئلہ کے پرتوں کو ٹٹولنا ہو، کسی کی شخصیت کی تہہ داری کو الفاظ کے جال میں لانا ہو، کسی علمی مسئلہ کو بھرپور طریقہ سے پیش کرنا ہو، ان کا قلم بڑی روانی سے ایسے الفاظ اور فقرے اور جملے ڈھالتا چلا جاتا جو موضوعِ زیرِ بحث کے لیے انسب ہوتے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں عالمانہ مہارت اور ادیبانہ شان پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کتنے ہفت خوان طے کیے ہوں گے اور فطرت نے ان کو کیسی صلاحیتیں ودیعت کی ہوں گی جن کو بروئے کار لا کر وہ ایسا بے مثال ادب پیدا کرنے پر قادر ہوئے۔ اردو کے محاورہ اور روزمرہ پر انہیں ایسی دسترس حاصل تھی کہ اہل زبان کے لیے

باعث رشک تھی۔

اس مجموعے پر نظر ڈالیے تو ہر مقالہ جالب توجہ ہے اور کئی مقالے تو اتنے بلند پایہ ہیں، مثلاً مولانا محمد شفیع، اور پنبہ کجا کجا نہم، کہ وہ پچھلے پچاس سال کے اردو ادب میں کلاسیکی درجہ کے مستحق ہیں اور کئی مقالے آسیائی میانہ اور ایران سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، مثلاً میر ابوالقاسم نمکین، ابو علی ابن سینا کی تصانیف، میرزا غازی بیگ ترخان اور اصفہان کی ایک یادگار شام۔

غرض کسی پہلو سے بھی دیکھے جائیں، یہ مقالے غیر معمولی خوبیوں کے حامل ہیں۔ یہ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کے سالوں میں تحریر کیے گئے اور شائع ہوئے اور مختلف رسالوں اور کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ جواہر پارے ایسے نہ تھے کہ پرانے رسالوں کے فائل میں پڑے ہوئے گرد جمع کرتے رہیں۔ نوجوان اسکالر ڈاکٹر غلام محمد لاکھو نے انہیں کھوج لگا کر جمع کیا اور ہنر مندی سے ترتیب دے کر موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ لاکھو صاحب کو پیر صاحب کی تحریرات سے جو شغف ہے وہ ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے اُن کی کتابوں اور مضامین کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کیے ہیں۔ پیر صاحب مرحوم کی حیات میں بھی، ان کا شمار اُن کے پرستاروں اور پروانوں میں ہوتا تھا۔ پیر صاحب کی ان پر نظر التفات تھی اور انہیں اس نوجوان اسکالر سے بڑی توقعات تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ توقعات پے بہ پے پوری ہو رہی ہیں۔

ہمارے مشترک دوست ڈاکٹر نواز علی شوق نے اس کتاب کی طباعت میں جو دلچسپی لی اور تگ و دو کی اس کے لیے ادارہ ان کا ممنون ہے۔ کراچی یونیورسٹی نے اس ادارے کو تحقیق اور اشاعت کے کام میں جو آسانیاں مہیا کی ہیں، اس کے لیے ہم سب یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے احسان مند ہیں۔ آفاق فاؤنڈیشن کی جانب سے مالی عطیہ کے لیے فاؤنڈیشن کے اور خصوصاً محترم سید سعید جعفری صاحب کے شکر گزار ہیں۔

پیر صاحب انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے بانی تھے اور جیتے جی اس کے کرتادھرتا رہے۔ ادارہ کے ممبران کے لیے فخر اور مسرت کا موقعہ ہے کہ اسے پیر صاحب کی تحریرات کو شائع کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

ریاض الاسلام

سیکریٹری، انسٹی ٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز، کراچی

مقدمہ

سندھ کے نامور محقق، مؤرخ اور دانشور سید حسام الدین راشدی کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی علمی اور ادبی خدمات اتنی ہیں کہ ہماری تاریخ میں آپ کو قیامت تک یاد رکھا جائے گا۔ آپ نے سندھی، فارسی اور اردو میں چالیس سے بھی زیادہ کتابیں تحریر کیں، تالیف کیں اور ایڈٹ کیں۔ جب یہ کتابیں شایع ہو کر منظر عام پر آتیں، ہر طرف سے آپ کی کاوشوں کی داد دی جاتی۔ ان میں اکثر فارسی کی کتابیں ہیں جن کا تعلق سندھ کی تاریخ اور تذکروں سے ہے۔ زیادہ تر فارسی کی کتابیں آپ نے ایڈٹ کیں، ان پر مفصل مقدمے لکھے اور قیمتی حواشی سے آراستہ کر کے شایع کروائیں۔ علمی دنیا میں آپ کی مرتب کردہ یا ایڈٹ کردہ کتابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ چونکہ ہم یہاں ان کے اردو مضامین اور مقالات کو چھاپ رہے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم راشدی مرحوم کی اردو کے لیے خدمات کے حوالے سے ہی گفتگو کریں۔

اردو سے تعلق :

ویسے تو قیام پاکستان سے پہلے ہی، راشدی صاحب کا اردو کی دنیا سے ایک تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد جب سے نامور اردو شاعر، ادیب اور لکھنے والے یکے بعد دیگرے کراچی پہنچنے لگے، تب سے سید حسام الدین راشدی اور اردو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے چلے گئے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سے لے کر اردو کالج کے قیام تک، اردو کے نام پر ہر نئے بننے والے ادارے میں، کسی نہ کسی طرح راشدی صاحب کا نام دیکھنے میں آتا ہے۔ علمی کام ہو یا کسی جریدے کا اجراء، اردو کی ڈکشنری کا معاملہ ہو یا اردو کی ترقی کے لیے کوئی اور کام کرنا مقصود ہو، راشدی صاحب سے مشورہ ضرور کیا جاتا۔ اس طرح آپ بہت سے اداروں کے بانی رکن، متعدد جریدوں کے لیے ادارتی بورڈ کے رکن، کئی ایک اداروں کی مجلس عاملہ کے

رکن اور بیشتر ادبی کاموں میں معاون خصوصی رہے۔ غرض کہ اردو کے حوالے سے راشدی صاحب کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس کے جائزے کے لیے الگ سے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ البتہ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب نے ایک مناسب جائزہ لیا ہے جو پڑھنا چاہئے۔ قادری صاحب نے ان ہی خدمات کی بدولت آپ کو "اردو کا پیر" لقب دیا ہے (۱)۔

اردو تصنیف و تالیف :

جناب سید حسام الدین راشدی کے علمی اور ادبی کاموں سے متعلق، جو جائزے اب تک شایع ہوئے ہیں وہ نامکمل ہیں۔ آپ کی اردو تصنیف و تالیف کی ضمن میں بھی درست مطالعہ نہیں ہوا۔ ہم یہاں مختصر طور سے راشدی مرحوم کی اردو تصنیف و تالیف کا جائزہ پیش کر رہے ہیں، تاکہ آئندہ جو حضرات اس عنوان پر لکھیں ان معلومات سے استفادہ کر سکیں۔

(۱) سندھی ادب: اردو میں راشدی صاحب کی یہ پہلی کتاب ہے جو سندھی ادب کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے مختصر طور پر سندھی ادبی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب کراؤن سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور پاکستان پبلیکیشن کی جانب سے شایع ہوئی۔ کتاب پر اشاعت کا سنہ درج نہیں ہے۔ لیکن میری معلومات کے مطابق یہ ۱۹۵۲ء میں چھپ کر شایع ہوئی۔ آگے چل کر اس کتاب کا روسی زبان میں مس یگوروا رئیسہ (Miss Yegorova Raissa) نے ترجمہ کیا، جو U.S.S.R. Academy of Sciences: Institute of the Peoples of Asia کی طرف سے غالباً ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا۔ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر میں نے ۱۹۸۱ء میں اس کا سندھی ترجمہ شایع کیا۔ بعض اردو مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ کتاب سندھی میں لکھی گئی۔ یہ بات درست نہیں۔

(۲) ہفت مقالہ: انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے مشہور ادبی جریدے سہ ماہی "اردو" میں فارسی زبان اور ادب پر بہت سے مقالے اور مضامین اب تک شایع ہوئے ہیں۔ سید حسام الدین راشدی نے ایسے مواد سے ایک انتخاب کیا، اور اس منتخب کے لیے کل سات مضامین کو جمع کر کے ایک کتاب ترتیب دی۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۶۷ء میں شایع کی۔ سید حسام الدین راشدی صاحب نے ابتداء میں مختصر مگر دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔

(۳) دود چراغِ محفل : پیر صاحب نے یہ کتاب غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر تیار کی۔ غالبیات کے عنوان پر یہ ایک مفید اضافہ ہوا۔ اس میں ایسے پانچ فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، جن کا کسی نہ کسی طرح غالب سے تعلق رہا۔ اس کتاب کا پیش لفظ 'حقیقت حال' جو خود مصنف نے لکھا ہے، نہایت ہی پر لطف ہے۔ ادارۂ یادگار غالب کراچی نے ۱۹۶۹ء میں یہ کتاب شایع کی۔

(۴) میرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزم ادب : سندھ کے ایک حاکم میرزا غازی بیگ ترخان (وفات ۱۰۲۱ھ) سے متعلق یہ کتاب نہایت مفصل، محقق اور پراز معلومات ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں غازی بیگ کی سیاسی اور فوجی خدمات کی مفصل روداد دی گئی ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں ان کی بزم سے وابستہ ۳۵ شعراء کی سوانح کے ساتھ ان کا منتخب کلام بھی دیا گیا ہے۔ سندھ کی تاریخ کے مطالعے کے لیے اس کتاب کی بے حد اہمیت ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے ۱۹۷۰ء میں شایع کی۔

(۵) مقالاتِ راشدی : سید حسام الدین راشدی نے سندھی کے علاوہ اردو میں بھی مختلف موضوعات پر مختصر و مفصل مقالے اور مضامین لکھے ہیں۔ اس کتاب میں پہلی بار ایسے مواد کو جمع کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نیچے تفصیلی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

(۶) متفرقات : راشدی صاحب نے بعض کتابوں پر مفصل مقدمے لکھے ہیں۔ کچھ کتابوں پر مختصر لیکن بامقصد پیش لفظ تحریر کیے ہیں۔ ایسے متفرق مواد کو بھی ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا جاسکتا ہے۔

مقالاتِ راشدی :

آئندہ صفحات میں ہم راشدی مرحوم کے مضامین اور مقالات کو پیش کر رہے ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ ان کے بارے میں کچھ زیادہ گفتگو کی جائے۔ راشدی صاحب کی اس طرح کی تحریروں کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے شروع ہو کر سال ۱۹۸۰ء میں ختم ہوتا ہے۔

۱) فتاویٰ عالمگیری کے دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد۔

فتاویٰ عالمگیری، برصغیر کی ایک مشہور دینی تالیف ہے جو اورنگزیب کے دور میں تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں دیگر علماء کے علاوہ سندھ کے دو علماء نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ اعظم گڑھ

(ہندوستان) سے ماہوار "معارف" چھپتا ہے۔ اس کے دسمبر ۱۹۴۶ء اور جنوری ۱۹۴۷ء کے شماروں میں مولانا مجیب اللہ ندوی کا مقالہ "فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین" کے سلسلے میں شایع ہوا تھا۔ سید حسام الدین راشدی نے اسی حوالے سے سندھی بزرگوں کی خدمات پر قلم اٹھایا اور ایک مضمون تحریر کیا۔ یہ مضمون "معارف" شمارہ ۶، جلد ۵۹، سال ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا۔ راشدی صاحب کی یہ اوّلین اردو تحریر ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ حال میں مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور نے مولانا مجیب اللہ صاحب کا مذکورہ مقالہ کتابی صورت میں "فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین" نام سے شایع کیا ہے۔ اس میں اور مواد کے ساتھ راشدی صاحب کا مضمون بھی دیا گیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ یہ مضمون ابو ظفر ندوی کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں کچھ تحریف بھی کر دی گئی ہے۔ راشدی صاحب کے اس مضمون کا سندھی ترجمہ عبدالرسول قادری نے کیا اور رسالہ "مہران" (۲، ۱۹۹۰ء) میں شایع ہوا۔

۲) مولانا محبّ علی سندھی۔

مولانا محبّ علی سندھی مغل دور کے مشہور عالم اور صوفی تھے، جن کے ساتھ صاحب اقتدار لوگ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ راشدی صاحب نے اس مقالے میں مفصل طور پر مولانا کی سوانح ترتیب دی ہے اور ان کے فارسی اشعار بھی دیے ہیں۔ یہ مقالہ سہ ماہی "اردو" کے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شایع ہوا (۲)۔ ایک سال بعد "ملا محبّ علی سندھی" کے عنوان سے ایک اور مقالہ سہ ماہی "اردو" کے اکتوبر ۱۹۵۱ء کے پرچے میں چھپا۔ یہ مقالہ محمد مطیع اللہ راشد برہانپوری نے لکھا اور مولانا کی سوانح کے حوالے سے بعض دلچسپ اور مفید اضافے کیے۔ راشد برہانپوری مرحوم نے ایک خاندانی بیاض سے ثابت کیا کہ مولانا محبّ علی ۹۸۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۵۵ھ میں وفات کی۔ راشدی صاحب کا یہ مقالہ قاضی احمد میاں اختر کی "تقریب" سے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں ہی ایک کتابچے کی صورت میں بھی مشتہر ہوا (۳)۔ اس مقالے کا سندھی خلاصہ بھی شایع ہوا (مہران ۱، ۱۹۶۷ء)۔

مولانا محبّ علی کے حوالے سے ایک اور بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ راشدی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا کا تعلق "وبھر چغتا" قبیلے سے تھا۔ میرے فاضل دوست محمد

پنھل ڈھر نے مجھے آگاہ کیا کہ "کوبھر" ایک مقامی سندھی قبیلہ ہے۔ ان کے بہت سے گاؤں آج تک ضلع گھوٹکی سے لے کر رحیم یار خان (پنجاب) تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ماضی میں اس قبیلے میں متعدد نامور علماء اور صوفیہ ہو گزرے ہیں، جن کے مزارات اس وقت بھی مرجع خلائق ہیں۔ نیز اس قبیلے سے متعلق ایک مقامی رائے، معاصر ادیب جان محمد داؤد پوٹا نے بھی نقل کی ہے (۴)۔ اس مواد کی روشنی میں "کوبھر" سے متعلق مفصل مطالعے کی ضرورت ہے۔

۳) میر ابوالقاسم نمکین اور ان کا خاندان۔

میر ابوالقاسم کا تعلق ہرات کے ایک سادات خانوادے سے تھا اور وہ اکبر کے دور میں یہاں کی سیاسی اور فوجی افق پر نمودار ہوا۔ اکبر اور پھر جہانگیر کے زمانے میں ابوالقاسم سبی، بکھر اور سیوھن میں عملدار مقرر ہوا۔ ابوالقاسم نے سندھ کو اپنا اختیاری وطن بنالیا۔ جب فوت ہوا تب روہڑی میں دفن ہوا۔ اس کے خاندان نے تین صدیوں تک سندھ میں سیاسی، فوجی اور علمی خدمات سر انجام دیں۔ اس خاندان کے بعض لوگوں نے سیوھن میں رہائش اختیار کی اور کچھ افراد ٹھٹہ میں بس گئے۔ بعد میں ابوالقاسم کی اولاد سندھ میں "امیر خانی" کے نسبتی نام سے مشہور ہوئی۔ سید حسام الدین راشدی نے اس خانوادے پر مفصل تحقیق کی اور یہ مقالہ تیار کیا، جو انجمن کے جریدے "تاریخ و سیاسیات" میں دو قسطوں میں اپریل ۱۹۵۱ء اور اکتوبر ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا۔

اس مقالے کے چھپنے کے بعد بھی مصنف نے عنوان پر تحقیق جاری رکھی۔ اس طرح بعض دلچسپ حقائق سامنے آئے۔ میر نمکین کی کتاب "منشات نمکین" کا بعد میں پتا چلا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ایک اور بیٹا یوسف میرک کے نام سے تھا، جس نے سندھ پر ایک معرکتہ الآرا کتاب "تاریخ مظہر شاہ جہانی" کے نام سے سن ۱۰۴۴ھ / ۱۶۳۴ء میں تیار کی۔ خود اس کتاب کو تلاش کرنے کا کریڈٹ بھی راشدی صاحب کو جاتا ہے۔ سال ۱۹۶۲ء میں موصوف کی سعی سے یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ نے شایع کی۔ امیر خان عبدالکریم کے بیٹے سید اشرف کی تالیف "رقائم کرائم" کا بعد میں انکشاف ہوا۔ غرض کہ راشدی مرحوم نے مفصل تحقیق اور تلاش سے اس خانوادے کے بہت سے پوشیدہ گوشے ظاہر کیے اور ایک کتاب تیار کی۔ یہ کتاب سندھی زبان میں "تذکرہ امیر خانی" کے نام سے سندھی ادبی بورڈ نے سال ۱۹۶۱ء میں شایع کی۔ ابوالقاسم اور ان کے خاندان پر مزید مطالعے کے لیے یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہیے۔ ہم نے اس مقالے کے

آخر میں حواشی کی صورت میں کچھ اضافی معلومات درج کر دی ہیں۔

۴) اردو زبان کا اصل مولد سندھ۔

یہ مضمون فروری ۱۹۵۱ء میں سندھ کے شہر خیر پور میں منعقدہ اردو کانفرنس میں پڑھا گیا۔ اور پھر سہ ماہی "اردو" کے اپریل ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شایع ہوا۔

راشدی صاحب نے اس مضمون میں رائے دی کہ سندھ ہی اصل میں اردو زبان کو جنم دینے والا صوبہ ہے (۵)۔ لیکن خود راشدی صاحب نے تیس برس بعد لکھا کہ، سندھ میں اردو کے جنم کے حوالے سے میں نے جو رائے دی اس کی کوئی تاریخی وقعت نہیں ہے۔ لسانی طور پر بھی اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ ایک جذباتی قسم کی رائے تھی۔ اس طرح سندھ میں اردو کا جنم ثابت نہیں ہوتا اور اس عنوان پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے (۶)۔ اردو کے جنم کے حوالے سے راشدی صاحب کی اس رائے کو اب تک نظر انداز کیا گیا ہے اور آپ کا پرانا نظریہ متواتر گردش میں ہے۔

۵) سندھ کے اردو شعرا۔

یہ مقالہ سہ ماہی "اردو" کے اکتوبر ۱۹۵۱ء کے پرچے میں شایع ہوا (۷)۔ اردو کے حوالے سے مصنف کے یہ دو مضامین بعد میں ایک ساتھ اور الگ الگ بھی چھپتے رہے ہیں۔ ان مضامین کی بدولت ہی آگے چل کر سندھ میں، اردو کے ارتقا اور ترقی پر مفصل کام ہونے لگا۔ اس ضمن میں اب تک پانچ کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

سندھ کے جدید اردو شعراء، مشتاق علی جعفری، سال ۱۹۶۱ء۔ سندھ میں اردو شاعری، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سال ۱۹۶۷ء۔ صوفیائے سندھ اور اردو، محمد معین الدین دردائی، سال ۱۹۷۳ء۔ سندھ میں اردو، ڈاکٹر شاہدہ بیگم، سال ۱۹۸۰ء۔ اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ، ڈاکٹر وفا راشدی، سال ۱۹۹۴ء۔

۶) ابو علی ابن سینا کی تصانیف۔

مصنف نے یہ مختصر مضمون تھیوسوفیکل ہال کراچی کے ایک جلسے میں پڑھا اور اس کو ماہنامہ "فاران" کراچی کے ستمبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں شایع کر لیا۔ یہ مضمون ویسے تو مختصر ہے لیکن اس کی اہمیت پھر بھی برقرار ہے۔

۷)میرزاغازی بیگ ترخان۔

میرزاغازی بیگ سندھ میں ترخان خاندان (۹۶۲۔۱۰۲۱ھ) کا آخری حکمران تھا۔ ان کی وفات کے بعد (۱۰۲۱ھ) اس صوبے پر سیدھا مغل راج قائم ہو گیا، اور مرکز سے صوبیدار مقرر ہونے لگے۔ میرزاغازی کے متعلق راشدی صاحب نے مفصل مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ انجمن ترقی کے مجلہ "تاریخ وسیاسیات" میں مئی ۱۹۵۴ء اور اگست ۱۹۵۴ء کے دو شماروں میں شایع ہوا۔ بعد میں بھی مصنف نے اس عنوان پر کام جاری رکھا اور آگے چل کر بڑی تحقیق کے بعد ایک مفصل کتاب تیار کی۔ یہ کتاب بھی انجمن ترقی اردو پاکستان نے سال ۱۹۷۰ء میں شایع کی، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر کے آئے ہیں (۸)۔

۸)تاریخ سندھ کے ماخذ۔

تاریخ سندھ کے بنیادی ماخذوں پر یہ مقالہ جولائی ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ "ریاض" کراچی میں شایع ہوا۔ اس مضمون کا تعلق فارسی کتابوں سے ہے جو کہ سندھ کی تاریخ پر لکھے گئے۔ اس مقالے میں ۵۶ ماخذوں کا مطالعہ ہوا ہے۔ جب یہ مقالہ لکھا گیا اس وقت ہماری تاریخ کے بنیادی ماخذ کی تلاش اور ان پر تحقیقی کام کا ابھی آغاز ہوا تھا۔ سندھی ادبی بورڈ کا قیام عمل میں آچکا تھا اور اسی ادارے کی طرف سے تاریخ سندھ کے بنیادی ماخذ ترتیب اور تدوین کے بعد شایع کرنے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اگلے تیس برس میں بورڈ نے عملی طور پر بہت کام کیا اور اس مقالے میں ذکر کردہ پندرہ سے بھی زیادہ ماخذ شایع ہوئے۔ اس ضمن میں بیشتر کام پھر بھی راشدی صاحب نے کیا۔ بورڈ کے علاوہ کچھ اور اداروں نے بھی کام کیا اور بعض ماخذ شایع کیے۔ میں نے اس مضمون کے آخر میں حواشی کی صورت میں، اس حوالے سے ہونے والے کام کا جائزہ پیش کر دیا ہے۔ یہ مقالہ ایاز قادری مرحوم نے سندھی میں ترجمہ کیا اور سندھی جریدہ "مہران" میں شایع ہوا (۱۹۵۵ء)۔ اس میں مزید اٹھارہ کتب کا اضافہ ہوا۔

۹)غالب اور خادم۔

یہ مختصر تحریر نادرات سلسلے کے تحت، ترقی اردو بورڈ کراچی کے "اردونامہ" میں ستمبر ۱۹۶۳ء میں شایع ہوئی۔ اب یہ رسالہ بند ہو چکا ہے اور ادارے کا نام بھی تبدیل ہو کر اردو ڈکشنری بورڈ ہو گیا ہے۔

۱۰)ڈاکٹر عترت حسین زبیری۔

یہ مختصر تاثر نما تحریر "اردو نامہ" کے شمارے ۲۲، دسمبر ۱۹۶۵ء میں شایع ہوئی۔ اردو مشاہیر کے حوالے سے لکھنے کی، راشدی صاحب کی یہ ابتدائی کوشش تھی۔

۱۱)ایک عالی دماغ تھا نہ رہا۔

یہ مختصر تاثر اردو کے مشہور ادیب علامہ نیاز فتح پوری کی یاد میں لکھا گیا اور ماہنامہ "نگار" پاکستان کے جون ۱۹۶۶ء کے شمارے میں طبع ہوا۔

۱۲) کیفی دتاتریہ۔

کیفی دتاتریہ مولوی عبدالحق کے دیرینہ دوست اور اردو کے محقق اور ماہر لسانیات تھے۔ ان کی مشہور کتابیں "کیفیہ" اور "منشورات" ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی بنیاد پڑی، تب وہ مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ کراچی آئے، لیکن کچھ وقت کے بعد واپس ہندستان لوٹ گئے۔ راشدی صاحب نے اس مضمون میں کیفی سے متعلق خصوصاً کراچی میں گذرے دنوں کو یاد کیا ہے۔ اس مضمون میں بعض دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ یہ مضمون سہ ماہی "اردو" اکتوبر ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا۔

۱۳)سندھ اور ایران کے تعلقات۔

یہ مقالہ اصل میں فارسی میں لکھا گیا اور ستمبر ۱۹۶۶ء میں ایران شناسی کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس (تہران) میں پڑھا گیا۔ بعد میں مصنف نے اس کو اردو میں ترجمہ کر کے "نقوش" لاہور کے خاص نمبر ۱۰۶، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں شایع کرلیا۔ میں نے اس پیپر کا سندھی ترجمہ شایع کیا (مہران، ۴ / ۱۹۸۴ء)۔

۱۴) قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے۔

یہ معلوماتی مضمون سہ ماہی "الزبیر" "کتب خانہ نمبر (۱۱)، سال ۱۹۶۷ء، اردو اکیڈمی بہاولپور سے شایع ہوا۔ اس سے پہلے بھی کسی میگزین میں یہ مضمون چھپا تھا، لیکن سردست اس سے متعلق مجھے معلومات میسر نہ ہو سکیں۔ اس تحریر کا مختصر ترین خلاصہ ماہنامہ "ریاض" کراچی جولائی ۱۹۵۳ء میں بھی شایع ہوا۔ اس مضمون کا سندھی ترجمہ محمد صدیق منگیو نے کیا، جو سندھ الاجی کے جریدے "سندھی ادب" میں سال ۱۹۹۵ء میں شایع ہوا۔

۱۵)مولانا محمد شفیع۔

مولانا محمد شفیع پاکستان کے جانے پہچانے محقق اور عالم تھے۔ پیر صاحب نے ان کی شخصیت اور علمی کاموں کے حوالے سے، یہ نہایت ہی دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون سہ ماہی "اردو" جنوری ۱۹۶۸ء میں شایع ہوا۔ مقالات مولوی محمد شفیع، جلد اوّل کے شروع میں بھی یہ تحریر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ شایع ہوئی۔ مقالات کی یہ جلد احمد ربانی صاحب نے مرتب کی اور مجلس ترقی ادب لاہور نے مشتہر کی۔ اشاعت کا سال درج نہیں۔ اس دلچسپ مضمون کا سندھی ترجمہ سلمیٰ لوہر نے "مہران" میں طبع کرایا ہے (۲/ ۱۹۹۵ء)۔

۱۶)پنبہ کجا کجا نہم۔

شاہد احمد دہلوی اردو کے مشہور ادیب اور "ساقی" کے بانی و مدیر تھے۔ یہ رسالہ انہوں نے دہلی سے جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد شاہد احمد صاحب بھی کراچی پہنچے اور یہیں سے "ساقی" کو پھر سے جاری کیا۔ ان کی وفات کراچی میں ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کو ہوئی۔ راشدی صاحب نے ان کی یاد میں نہایت ہی دلچسپ مضمون لکھا۔ یہ مضمون ساقی کے "شاہد احمد دہلوی نمبر" میں سال ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا۔ یہ خاص شمارہ مشہور ادیب، محقق اور اسکالر ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے ایڈٹ کیا۔ اگر اردو کی بہترین نثری تحریروں کا کوئی انتخاب ہو تو اس میں راشدی صاحب کا یہ مضمون، یقیناً سر فہرست ہوگا۔

۱۷)ہمارا تعلیمی نظام اور ماحول۔

یہ مضمون گورنمنٹ اردو کالج کراچی کے مجلّہ "برگ گل" میں سال ۷۵۔۱۹۷۴ء میں، پروفیسر محمد ایوب قادری مرحوم کی زیرِ ادارت شایع ہوا۔ یہ مجلّے کا تعلیمی پالیسی نمبر، اشاعت خاص، بسلسلہ سلور جوبلی اردو کالج چھپا تھا۔

۱۸)سندھ کے تاریخی اور سیاسی مکتوبات۔

یہ مضمون سال ۱۹۷۳ء میں پہلی پاکستان ہسٹری اینڈ کلچر کانگریس منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا گیا۔ جس کو ڈاکٹر احمد حسن دانی صاحب نے کانگریس کی روداد جلد اوّل میں شامل کیا۔ روداد سال ۱۹۷۵ء میں اسلام آباد یونیورسٹی پریس (اب قائداعظم یونیورسٹی) سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اس مضمون میں کلھوڑا اور ٹالپر ادوار میں لکھے گئے تاریخی اور سیاسی مکتوبات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے (۹)۔ میں نے اس اہم پیپر کا سندھی ترجمہ کیا اور رسالہ "مہران" میں شایع

کیا(١/ ١٩٨٧ء)۔

١٩)اردو شعرا کے تذکرے کچھ گزارشات۔

سید معین الدین شاہ قادری صاحب کا ایک مضمون "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" اردو نامہ، شمارہ ٥١ میں شایع ہوا۔ راشدی صاحب نے اس مضمون کے حوالے سے بعض باتوں کی وضاحت لکھی۔ یہ وضاحت (مضمون نما خط) مذکورہ میگزین کے جون ١٩٧٦ء (نمبر ٥٣) کے پرچے میں چھپی۔

٢٠)اصفہان کی ایک یادگار شام۔

سید حسام الدین راشدی سال ١٩٧٤ء میں ایران گئے۔ اس وقت آپ نے اصفہان کے بعض تاریخی مقامات بڑے غور سے دیکھے۔ وطن واپسی کے بعد آپ نے قلم اُٹھایا اور اصفہان کے کچھ تاریخی اور ثقافتی پہلو اُجاگر کرنے کے لیے یہ مضمون لکھا۔ اسلام آباد میں قائم "مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان" نے سال ١٩٧٧ء میں ایک کتاب "پیوندھای فرھنگی ایران و پاکستان" شایع کی ہے۔ یہ کتاب جناب بشیر احمد ڈار نے مرتب کی۔ اس کتاب میں راشدی صاحب کا یہ مضمون شایع ہوا ہے۔ سندھی ترجمہ امام المتقین راشدی نے کیا جو کہ "مہران" میں شایع ہوا(١/ ١٩٩٧ء)۔

٢١)سلطان محمود بکھری کی زندگی کا ایک پہلو۔

یہ مقالہ اصل فارسی میں لکھا گیا اور سال ١٩٧٢ء میں ایران شناسی کی دوسری بین الاقوامی کانگریس منعقدہ تہران میں پڑھا گیا۔ اس میں شمالی سندھ کے ایک حاکم سلطان محمود کی زندگی کے ایک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس اہم مضمون کا اردو ترجمہ خود مصنف نے کیا، جس کو ملک کے نامور دانشور اور بزرگ ادیب جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی مرتب کی ہوئی کتاب "نذر حمید احمد خان" میں شامل کیا۔ یہ کتاب مجلس ترقی ادب لاہور نے ١٩٨٠ء میں شایع کی۔ فارسی مقالہ راشدی صاحب کی وفات کے بعد "دانش" اسلام آباد (نمبر ٩، بہار، ١٣٦٦ش ھ) میں بہ اہتمام سید عارف نوشاہی شایع ہوا(١٠)۔ میں نے اس مضمون کا سندھی ترجمہ "مہران" میں شایع کیا(١/ ١٩٨٨ء)۔

حرف آخر:

مقالات راشدی، کے حوالے سے میں نے مفصل روداد پیش کردی ہے، تاکہ اگر کسی

صاحب کو اس ضمن میں مزید تحقیق کرنی ہو، تو یہ معلومات ان کے لیے سود مند ثابت ہو سکیں۔ راشدی صاحب کا یہ منتشر ادبی سرمایہ مختلف رسائل و جرائد میں موجود تھا۔ اس مواد کے لکھنے اور چھپنے کی عمر تیس برس سے بھی زیادہ عرصے تک پھیلی ہوئی ہے۔ اب جب کہ یہ منتشر مواد کتابی شکل میں شایع ہو رہا ہے، تو اس کا اوّلین فائدہ تو یہ ہوگا کہ، یہ بہت قیمتی اور نادر علمی و ادبی سرمایہ ضایع ہونے سے بچ جائے گا۔ اس کتاب میں اکیس مقالات و مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو کے حوالے سے سید حسام الدین راشدی کے متعلق مطالعے میں بھی وسعت پیدا ہوگی اور یقین ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں بھی، آپ کو اپنا جائز مقام ملے گا جس کو آج تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

مواد کی رُو سے اس کے دو اہم حصے بنتے ہیں۔ ایک غالب حصہ مطالعۂ سندھ (Sindho-logical Studies) پر مبنی ہے۔ اس مواد کی روشنی میں سندھ کی تاریخ کے بعض اہم خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔ مستقبل میں سندھ پر جو بھی تحقیق اور اسٹڈی ہوگی، امید ہے اس میں یہ مواد بہت مددگار و معاون ثابت ہوگا۔ دوسرا حصہ اردو کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے مواد کی موجودگی میں اردو ادب کی تاریخ اور ان کے کچھ کرداروں کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس ضمن میں کچھ مضامین (کیفی دتاتریہ، مولانا محمد شفیع اور پنبہ کجا کجا نہم) تو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ راشدی صاحب نے ان مضامین میں اردو ادب سے متعلق بعض شخصیات کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا ہے، بلکہ پاکستانی معاشرے کے کچھ منفی پہلوؤں پر بھی خیال آرائی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ راشدی صاحب کے چند مضامین اردو نثر میں بہت بڑا مقام رکھتے ہیں اور آگے چل کر ان کو ایک کلاسکز (Classics) کا رتبہ حاصل ہوگا۔

اگرچہ اس کتاب میں شامل مواد مطالعۂ سندھ اور اردو سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اکثر مقالے و مضامین وسطی ایشیا کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسے مواد میں: ”سندھ اور ایران کے تعلقات“، ”اصفہان کی ایک یادگار شام“، ”سلطان محمود بکھری کی زندگی کا ایک پہلو“، ”میر ابوالقاسم نمکین“ اور ”میر زا غازی بیگ ترخان“ کا خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

سپاس گذاری:

جناب حسین شاہ راشدی نے ایک بار پھر مجھے اس قابل سمجھا کہ، میں سید حسام الدین

راشدی مرحوم کے چھوڑے ہوئے علمی کاموں کی تکمیل میں کچھ کردار ادا کرسکتا ہوں۔
جناب ڈاکٹر ریاض الاسلام صاحب نے مجھے یہ کام کرنے کا نہ صرف موقع فراہم کیا، بلکہ حد سے زیادہ شفقت کا اظہار بھی فرمایا اور اس طرح مجھے "مقالات راشدی" شایع کرنے کی ہمت بندھی۔ بزرگ ادیب و دانشور جناب احمد ندیم قاسمی اور نام ور محقق جناب ڈاکٹر جمیل جالبی نے، جب بھی میں نے اس حوالے سے ان کو زحمت دی، بڑی خندہ پیشانی سے میری مدد فرمائی۔ محترمہ مہتاب اکبر راشدی صاحبہ جب سندھ ہالاجی کی ڈائریکٹر تھیں، تب ان کی سعی سے ہی میں نے اس کام کا آغاز کر دیا تھا۔ سید عارف نوشاہی صاحب (اسلام آباد)، جناب ڈاکٹر نجم الاسلام (حیدر آباد)، ڈاکٹر محمد قاسم سومرو اور ڈاکٹر انور فگار ہکڑو نے بھی مجھے اس کتاب کی تیاری و اشاعت میں مسلسل مدد فراہم کی۔ رئیس غلام مصطفیٰ بھیو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ راشدی صاحب کی علمی کاوشوں اور تاریخی تحقیق کا اس جیسا عاشق صادق میں نے نہیں دیکھا۔ بعض نادر مقالات مجھے ان ہی سے ملے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ میں ان سب بزرگوں، ادیبوں اور دوستوں کا از حد ممنون ہوں، جن کے تعاون سے آج یہ کام پورا ہو رہا ہے۔ راشدی مرحوم کے منتشر اردو سرمائے کو میں نے بیس برس تلاش کیا ہے۔ امکان ہے کہ ابھی کچھ مواد کا مجھے پتا نہ ہو۔ پھر بھی زیادہ تر اردو مقالات اور مضامین پہلی بار اکٹھا ہو کر کتابی شکل میں چھپ رہے ہیں۔ اردو کی حد تک کتابی ترتیب اور پروف ریڈنگ کا میرا یہ پہلا تجربہ ہے۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ کوئی تشنگی رہ گئی ہو۔

۸/ اگست ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر غلام محمد لاکھو
شعبہ تاریخ عمومی
سندھ یونیورسٹی، جام شورو

حواشی :

۱۔ ماہنامہ "قومی زبان" کراچی، دسمبر ۱۹۸۲ء، مقالہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری۔

۲۔ سید سرفراز علی رضوی لکھتے ہیں کہ، یہ مقالہ سہ ماہی "اردو" کے اکتوبر ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شایع ہوا (اشاریہ اردو، ص ۴۲، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۶ء)۔ حقیقت میں راشدی صاحب کا یہ مقالہ اسی جریدے کے اکتوبر ۱۹۵۰ء کے پرچے میں چھپا۔

۳۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری اسی وجہ سے "مولانا محب علی سندھی" کو راشدی صاحب کی ایک مکمل اردو کتاب سمجھتے ہیں (قومی زبان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۲)۔

۴۔ تاریخ خاندان داؤد پوترہ، قلمی، ص ۱۶۷، ملکیت محمد پنھل ڈھر۔

۵۔ اس نظریے کو اولاً سید سلیمان ندوی نے پیش کیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر کہ : "سندھ، پنجاب اور دکن میں جو زبانیں تھیں وہ اردو نہیں بلکہ بالترتیب سندھی، پنجابی اور دکنی تھیں" رجوع کر لیا تھا (پروفیسر غفور شاد قاسم : "پاکستانی ادب"، ص ۱۲۲، بک ٹاک لاہور، ۱۹۹۵ء)۔

۶۔ میر محمد معصوم بکھری (سندھی)، ص ۴۹۔ ۵۰، حاشیہ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ جام شورو ۱۹۷۹ء۔

۷۔ اس ضمن میں البتہ سب سے اول افسر صدیقی امروہی نے قلم اٹھایا اور ان کا مضمون "سندھ کے اردو شعرا" سہ ماہی "اردو" جولائی ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا۔

۸۔ اسی زمانے میں ایک اور کتاب "میرزا غازی بیگ اور اس کا دربار علم و فن" شایع ہوئی۔ اس کے مؤلف سید اختر مسعود رضوی مرحوم، صدر شعبہ فارسی، پشاور یونیورسٹی ہیں۔ طباعت کا سال درج نہیں۔ یہ مختصر کتاب ہے جس میں میرزا سے وابستہ بارہ شعرا کا ذکر ہوا ہے۔ جب کہ راشدی صاحب کی کتاب مفصل ہے، جس میں تیس سے بھی زیادہ شعرا کا تذکرہ آیا ہے۔

۹۔ ایم سلیم اختر صاحب نے بعد میں اسی موضوع پر اپنی تحقیق شایع کی، جو مغل، کلہوڑا اور تالپر ادوار پر محیط ہے (پاکستان جرنل آف ہسٹری اینڈ کلچر، جنوری۔ جون ۱۹۸۶ء)۔

۱۰۔ فارسی میں یہ مضمون "روابط دربار سندھ با دربار ایران در قرن دہم" عنوان سے شایع ہوا۔

مقالاتِ راشدی

فتاویٰ عالمگیری کے دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد

دسمبر ۱۹۴۶ء اور جنوری ۱۹۴۷ء کے معارف میں "فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے، اس میں سندھ کے دو بزرگوں سید نظام الدین ٹھٹھوی اور قاضی ابوالخیر ٹھٹھوی کے نام بھی لیے گئے ہیں، جن کو فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں شمولیت کا شرف حاصل ہے۔

صاحب مضمون نے ان دونوں حضرات کے سلسلے میں تذکرہ علمائے ہند مصنفہ مولانا رحمان علی کو اپنا ماخذ بنایا جس میں دو سطروں سے زیادہ ان کے سوانح حیات موجود نہیں، ذیل میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق مزید معلومات پیش ہیں۔

ا۔ سید نظام الدین ٹھٹھوی

نسب: سید صاحب کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

سید نظام الدین بن سید نور محمد بن سید نظام الدین اوّل بن سید نور محمد بن سید شکر اللہ ثانی بن سید ظہیر الدین والاسلام عرف سید جادم اول بن قاضی سید شکر اللہ اول بن سید وجیہہ الدین بن سید نعمت اللہ بن سید عرب شاہ بن سید امیر نسیم الدین محمد المعروف بہ میرک شاہ بن امیر عطاء اللہ جمال الدین المحدث بن سید فضل اللہ بن سید میر عبدالرحمٰن بن سید عبداللطیف الحسینی الانکی الشیرازی۔

وطن: ان کے اجداد شیراز میں رہتے تھے۔ بعد میں ہرات میں رہنے لگے۔ جہاں سے قاضی سید شکراللہ اول بن سید وجیہہ الدین ۹۰۶ھ میں قندھار تشریف لائے۔

سندھ میں آمد: قاضی سید شکراللہ قندھار میں ۲۱ برس تک رہے، اس کے بعد مرزا شاہ بیگ ارغون کے ایما سے بسلسلۂ تجارت ۹۲۷ھ میں سندھ آئے اور ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کرلی، وہ صاحبِ علم و فضل ہونے کے علاوہ بڑے متقی اور دیندار تھے۔ مرزا شاہ بیگ کے بعد جب مرزا شاہ حسن ارغون سریر آرائے سلطنت ہوا، اس وقت قاضی صاحب کو ٹھٹھہ کی مسند قضا پر فائز کیا گیا۔

ایک دفعہ شاہ حسن نے چند تاجروں سے کچھ گھوڑے خرید کئے اور قیمت دینے میں جان بوجھ کر اتنا تساہل کیا کہ تاجر مایوس ہوکر قاضی سید شکراللہ کی عدالت میں دعویدار ہوئے۔ قاضی نے بادشاہ کو بحیثیت مدعا علیہ کے عدالت میں طلب کیا اور جب وہ آیا تو اس کو مدعیوں کے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا، دعوے کی مثل پیش ہوئی۔ بادشاہ نے دعوے کی صحت کا اقرار کیا اور مدعیوں کو رقم دے کر راضی کرلیا۔ اس کے بعد قاضی موصوف مسند سے اُٹھے اور آگے بڑھ کر آداب سلطنت بجا لائے اور بادشاہ کو اپنی مسند پر لاکر بٹھایا۔ مرزا شاہ حسن نے اپنے قبا میں چھپائی ہوئی ننگی تلوار نکال کر قاضی صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اگر آج آپ فیصلے سے پہلے آدابِ سلطنت کو بجالاتے اور میرے درجے کو ملحوظ رکھ کر مجھے مدعیوں کے ساتھ نہ بٹھاتے تو اس تلوار سے آپ کا سر قلم کردیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد سید صاحب نے استعفا دے دیا اور شاہ حسن نے محمد لوچی کو بلا کر ان کی جگہ مقرر کیا۔ جن کے متعلق صاحب تحفۃ الکرام لکھتا ہے کہ:

"قاضی شیخ محمد اچہ منسوب بآل جعفر از مشاہیر علمائے زمانہ است نخست از ہرات بہ اچہ رسیدہ بود، در عہد جام نظام الدین چوں سید میران محمد مہدی جونپوری وارد ٹھٹھہ گردیدہ و علماء زماں برلو نسبت تکفیر بستند، نام بردہ کہ بمعنی رہی داشت و مقامات اھلِ حال را مطلع بود حجت، اھل ظاہر را در تکفیر آں ولی اکمل بوجہ، ایلق رو نمود سید میران بحالش متوجہ گردیدہ دعائے ہالش بزرگی و دوام آثار سترگی باولادش کردہ، از انست کہ خاندان آں بزرگ بوجود حوادث شتی ھرگز انقلاب زدہ نمی شود، بالجملہ قاضی معزالیہ بعد ہجرت لوچہ و ملتان، بکھر

متوطن گردیده بنا بر کثرت شہرت منسوب باوچہ مانده وقتے کہ قاضی سید شکراللہ شیرازی استعفاء خدمت قضا ٹھٹھہ، چنانچہ سبق ذکر یافتہ، درخواست مرزا شاہ حسن حسب تجویز قاضی میر مذکور کہ در وطن قدیم ہرات بہم از اسلاف رابطہ خاص داشتہ و باحیائے آن رابطہ لنجا نیز قرب مقا برد پیوند صورت باب گردید ویرا طلبیده بآں منصب جلیل القدر مختص فرمود، بہ برکت قدیم نجابتش و دعائے میران سید مہدی جونپوری آں منصب بتوارث وقف اولادش است در ابتدائے حکومت میرزا عیسیٰ ترخان سجل حیاتش در نوردیده شد، دو پسر والا گہر از مخلف ماندند۔"

اس کے بعد آپ کی اولاد کا تذکرہ ہے [1]۔

اجداد : سید شکراللہ نے ٹھٹھہ کے ایک انصاری خاندان میں شادی کی جس سے سید ظہیرالدین پیدا ہوئے۔ سید ظہیرالدین کے متعلق صاحبِ تحفۃ الکرام رقمطراز ہے کہ :

"قائم مقام پدر بزرگوار گردیده، فضیلت وحکمت نیک اندوختہ و ظاہرش بہ تقوی و تشرع و تدریس و باطن بہ سلوک راہ فقر و سبیل سنت اجداد مصروف بود" [2]۔

تاریخ طاہری کا مصنف ان کو اس طرح یاد کرتا ہے :

"گوہر بحر عزت و سیادت در معدن بلاغت و فصاحت جامع العلوم موشگاف معانی میر ظہیرالدین" [3]۔

آپ کے دو فرزند ہوئے ایک سید شکراللہ ثانی، دوسرے سید عبدالرحمٰن۔ سید شکراللہ کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے :

"باوصف جدوپدر متصف بر آمده نامدار روزگار زیست۔"

انہوں نے ایک مسجد بھی بطور یادگار اپنے محلّہ میں بنوائی، ان کے چار بیٹے ہوئے، سید محمد حسن، سید نور محمد، میر سید ظہیرالدین جادم ثانی، سید لطف اللہ۔ سید نور محمد جن کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ :

"در وقت خود مظہر اتم علم و عرفان و مرجع اکمل دین و ایقان زیستہ۔"

ایک فرزند ہوا سید نظام الدین اول جو کہ بقول تحفۃ الکرام :

"در مناظم فضل و کمال لوفق اہل حال و قال گذشتہ۔"

ان کے چار بیٹے ہوئے سید نعمت اللہ، سید نور محمد ثانی، سید فضل اللہ اور سید محمد شفیع۔

سید نظام الدین ثانی : سید نور محمد ثانی کے دو فرزند ہوئے، سید ابوالقاسم اور سید نظام الدین ثانی۔ یہی سید نظام الدین ثانی فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں سے ہیں، میر علی شیر قانع، ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

"سید نظام الدین ثانی در فقہ لوفق انام در علوم اعلم کرام برآمدہ وجد بہ طبع گرائیدہ، سوئے جہان آباد شدہ، در فتاویٰ عالمگیری بسا مشکل حل سائر علماء کردہ از نظر بادشاہ بگذشت و استدعائے منصب کرد، بادشاہ مطابق ضابطہ کہ اہل فضل را باسم نوکری نخواندندی ازاں آبا فرمودہ تکلیف قبول معاش نمودہ سید رضاندادہ عن قریب آنجا سفر آخرت گزید۔"[۴]

آپ کی اولاد : ان کے دو فرزند ہوئے، ایک سید عرب شاہ، دوسرے سید احمد۔ سید عرب شاہ آخری زمانے میں مجذوب ہوگئے اور کوئی لولاد نہیں چھوڑی۔ سید احمد کا ایک بیٹا سید عطاء اللہ ہوا جس نے شادی کی اور صاحب لولاد بھی ہوا لیکن عین جوانی میں یہ بھی مجذوب ہوگئے۔

اجداد: ان کے اجداد میں میر نسیم الدین لور عطاء اللہ، جمال الدین نیز ان کے عم بزرگوار میر اصیل الدین کا تذکرہ قاضی نوراللہ شوستری نے حبیب السیر کے حوالہ سے مجالس المومنین میں کیا ہے۔ نیز روضۃ الصفا لور ہفت اقلیم وغیرہ میں بھی ان کا تذکرہ آیا ہے۔ صاحب تحفۃ الکرام نے دوسری جلد میں انہی حوالوں سے ان کے حالات بیان کیے ہیں۔

(۱) امیر جمال الدین عطاء اللہ بن فضل اللہ المحدث الاسکنی الشیرازی، سید نظام الدین ثانی کے بارھویں جد ہیں، ان کے متعلق تحفۃ الکرام میں مرقوم ہے کہ :

"عم گرامی صرف تتبع و حفظ اقوال و افعال ہدایت مال نمودہ، فنون عقلیہ را از علوم شرعیہ حلۂ ترتیب و تدوین پوشانیدہ، جواہر و لآلی حدیث مصطفویہ را

بانامل تقیظ در سلک انفحام واو لوصحاح و حسان سخنان عالمگیرش، تحفتہ الاحباء وریاض السیر و روضتہ الاحباب است۔ ۵ ۔

حبیب السیر کے حوالہ سے آگے چل کر لکھتا ہے کہ :

"آنحضرت مانند بزرگوار امیر اصیل الدین در علم حدیث بے نظیر افاق گشتہ، در سائر علوم دینیہ و یقینیہ از محدثان باستحقاق در گذشتہ، شاگرد عم خود است، چند سال در مدرسہ شریفیہ سلطانیہ در گنبدے کہ در دو مقبرہ حضرت خاقان منصور است اور در خانقاہے خلاصیہ بدرس و افادہ اشتغال داشتہ در ہفتہ یک نوبت در جامع ہرات بموعظہ پر داختے، سلاطین و حکام خدمتش واجب دانستندے۔ "۶ ۔

ہفت اقلیم میں امین رازی لکھتے ہیں کہ :

"برادرزادہ سید اصیل الدین عبداللہ است وے در عصر خود ملا از طوائف اکابر و اشراف انام بودہ، لوح ضمیر تنویرش مطرح اشعۂ انوار اسرار کتب الٰہی و صحیفہ مہر خاطر عالی، ماثرش سبط لوامع حقائق اخبار حضرت رسالت پناہے است۔

زبانش مظہر اسرار تحقیق
ضمیرش مظہر انوار توفیق
جمال دین مزین ز اہتمامش
علوم شرع واضح از کلامش

از مولفات فصاحت صفاتش روضتہ الاحباب در اقطار آفاق اشتہار دارد۔ "۷ ۔

۲۔ امیر نسیم الدین، امیر جمال الدین کے بیٹے اور سید نظام الدین کی گیارہویں پشت میں جد تھے ان کے لیے تحفتہ الکرام میں ہے کہ :

"در تکمیل علوم سیما حدیث یگانہ زمانہ بود، موجب تعین سلطان در مقبرہ مذکور قائم مقام پدر بزرگوار بود، خلف رشیدش سید عرب شاہ بجائے ابا نیک جاگرم کردہ، بعد از و پسرش سید نعمت اللہ باوصاف ابا متصف زیستہ از و سید وجیہ الدین یادگار و قائم مقام ماندہ، فرزند رشیدش قاضی سید شکراللہ کہ در مجلد

ثالث میان احوال ٹھٹھہ مذکور گردد۔"۸۔

یہی قاضی سید شکراللہ شیرازی تھے جو ۹۰۶ھ میں ہرات سے قندھار آئے، اور ۹۲۷ھ میں قندھار سے سندھ میں تشریف لائے۔

۳۔امیر جمال الدین عطاء اللہ کے عم بزرگوار السید الجلیل امیر اصیل الدین عبداللہ الحسینی الاسکنی الشیرازی کے سلسلہ میں تحفۃ الکرام کا مصنف لکھتا ہے:

"در علم تفسیر و حدیث و انشاو تالیف شبیہ و نظیر نداشت در زمان سلطان ابو سعید از شیراز بہ ہرات تشریف آوردہ ہر ہفتہ یک نوبت در مدرسہ مہد علیا گوہر شاد آغا بموعظۃ خلق می پرداخت درماہ ربیع الاول بربیان میلاد حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مواظبت نمودہ۔ از مولفاتش شرح درج الدر بر سیر سیہ خیر البشر و رسالہ مزارات ھرات مشہور ہفدہم ربیع لآخر سنہ ثلث و ثما نمایہ وفات کردہ، درگوہر نامدار ماند، صفی الدین محمد و برہان الدین محمد۔"۹۔

صاحب موصوف ہی کے متعلق صاحب ہفت اقلیم لکھتے ہیں کہ:

"بصفت اصالت و دفور جلالت موصوف و معروف بودہ، در علم حدیث و تفسیر شبیہ و نظیر نداشتہ، در زمان سلطان ابو سعید از شیراز بہ ہرات تشریف آوردہ و اقامت فرمودہ و باشارۂ آں بادشاہ ہفتہ یک نوبت زبان بموعظۃ و نصائح می کشود۔ از مولفاتش کتاب افادت اثر درج الدر کہ محتوی است بہ سیر سیئہ خیرالبشر در رسالہ مزارات ہرات بین الجمہور مشہور است۔"۱۰۔

اس خانوادے کے اور بھی چند حضرات کا تذکرہ ہفت اقلیم اور تحفۃ الکرام میں آیا ہے۔ میر اصیل الدین کے ابن عم سید الحکماء المدققین امیر صدرالدین محمد الشیرازی کے متعلق ہفت اقلیم میں آیا ہے کہ:

"بجودت طبع و دقت ذہن از جمیع علمائے تبحرین و فضلائے متاخرین ممتاز و مستثنیٰ بودہ چہ دراندک زمانے از شغل استفادہ فراغت حاصل کردہ آغاز درس و افادہ فرمود، بعدازاں ہمت بر تالیف و تصنیف گماشت۔ رسالہ تحقیق علم و اثبات واجب، حاشیہ شمسیہ و مطالع و حاشیہ تجریدرا در سلک تحریر کشید۔ وفاتش بعد ازفوت سلطان یعقوب در اندک زمانے اتفاق دلد۔"۱۱۔

تحفتہ الکرام بھی تقریباً انہی الفاظ میں رقمطراز ہے۔ ۱۲؎

امیر صدرالدین کے فرزند خاتم الحکماء غوث العلماء امیر غیاث الدین منصور شیرازی کے لیے ہفت اقلیم لکھتا ہے:

"پرتو آں قمر و ثمر آں شجر است۔ بعد از پدر بہ وفور علم و دانش بر وسادہ فضیلت تکیہ زدہ صیت مہارتش در علوم حکمی و ریاضی بمسامع علمائے نزدیک و دور رسید و صدائے دانشش بہ اطراف و اکناف آفاق افتادہ بین الجمود مشہور گردید۔

وصف خورشید ارنگوید ہوشمند
فیض نور او بود مدحش پسند

چوں فضلاء وے را استاد البشر و عقل حادی عشر خواندہ اند، ہر آئینہ تاریخ فوتش را مولانا علی حسن ضراس۔

عقل حادی عشر نماندہ بجا......یافتہ" ۱۳؎

تحفتہ الکرام میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

"ولادتش تسعمایہ درخدمت پدر بزرگوار میر صدرالدین محمد مذکور تحصیل علوم نمودہ درچہاردہ سالگی داعیہ مناظرہ علامہ دوانی درخود یافتہ رسائل جست در بیست سالگی ازضبط جمیع علوم فارغ گردیدہ مدتے بر منصب صدارت بادشاہی مغفور بوئے متعلق بود، در مرتبہ ثانی کہ مجتہد الزمانی شیخ علی بن عبدالعلی از عراق عرب متوجہ پایہ سریر خلافت شدہ بعضے مفسدان نقار بمیاں آوردند نامباحثہ علمی ممہد گردید و بخشونت انجامید بادشاہ حمایت مجتہدالزمانی کردہ و میر برنجیدند و بعد روزے چند از منصب صدارت استعفا نمودہ جانب شیراز شدند۔ درسنہ ثمان و اربعین و تسعمایہ فوت یافتہ ۱۴؎"

تحفتہ الکرام میں حبیب السیر کے حوالے سے ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست درج کی گئی ہے۔

"صاحب حبیب السیر گفتہ کہ از مصنفاتش انچہ بہ نظر رسید کتاب تجتہ الکلام ہست در آنجا متوجہ اقاویل حجتہ الاسلام غزالی شدہ، دیگر کتاب محکمات میاں تحریریں علین والد خود میر صدرالدین محمد و ملا جلال الدین محمد دوانی و حواشی

ایشاں بر شرح تجرید مطالع، دیگر محکمات میان ایشاں در حواشی لوائل شرح مختصر اصول عضدی دیگر شرح بر کتاب ہیاکل انوار دیگر شرح بر رسالہ اثبات واجب پدر خود، و کتاب تعدیل المیزان بر منطق کہ خلاصہ منطق شفا است باسوانح طبع نقاد ایشاں و کتاب معیار الافکار خلاصہ تعدیل المیزان و کتاب لوامع و معارج در علم ہیئت کہ در محاذات کتاب تحفہ شاہی است و آں را در ہفدہ سالگی تصنیف فرمودہ، دیگر کتاب تجرید بر حکمت کہ جمیع مسائل حکمت طبیعی والٰہی را بعبارت موجز و مجرد از دلائل ذکر فرمودہ دیگر رسالہ در معرفت قبلۂ دیگر کتاب معالم الشفا در طب، دیگر مختصر آں کہ مسمی بشافیہ است دیگر کتاب سفرویہ در ہیئت دیگر حاشیہ بر الہیات شفا، دیگر حاشیہ براشارات دیگر حاشیہ بر شرح حکمت العین، دیگر رسالہ در باب خلافت فرزند ارجمند میر صدرالدین محمد، دیگر رو بر حاشیہ شمسیہ علامہ دوانی، دیگر رو بر حاشیہ خلاصۃ التخلیص، دیگر رو بر حاشیہ تہذیب الامعز الیہ دیگر رو برانموذج مشار الیہ، دیگر رسالہ در تحقیق جہات، دیگر رو بر رسالہ زوار مشار الیہ، دیگر رسالہ مشارق در اثبات واجب، کتاب اخلاص مغفوری، دیگر حاشیہ بر لوائل کشاف تفسیر سورہ، دیگر کتاب مقامات العارفین در تصوف و اخلاق کہ باسم فرزند ارجمند میر شرف الدین علی نوشتہ، ورسالہ قانون السلطنت سوائے آں از تصانیفش انچہ در کتب ایشاں بتقریبے اسامی مذکورو بعضے علماء ازاں خیر دلوند، کتاب ریاض الرضواں و کتاب اساس در علم ھندسہ وغیر آں۔

صاحب السیر نوشتہ کہ غرض از تفصیل و تصانیف حضرت امیر و اظہار تشرف بمطالعہ اکثر آں رو کلام از افاضل عصر است۔ مثل ملا ابوالحسن کاشی و ملا میرزا جان شیرازی کہ مصنفات حضرت میرزا کہ اکثر بواسطہ، نفاست متدلول نشدہ بودند۔ بدست ہر کہ می افتاد۔ سخناں خوب را از آنجامی وز دیدند و می گفتند کہ از میر غیر نامے نیست، بعضے کتب کہ در مصنفات متدلولہ خود نام آں راندکور ساختہ اند۔ وجود خارجی نیافتہ اند۔ اگر احیاناً یکے ازاں کتاب بدست طالب علمے افتاد ویدزدی ایشاں مطلع شد، و عوامی توارد می کنند و از حضرت استاذ تحریر رحمہ

اللہ شنیدہ کہ می فرمودند ملا ابوالحسن ششں ولیل از جملہ اولہ کہ در رسالہ اثبات واجب ذکر کردہ، وآں را خواص فکر خود شمردی از شرح ھیاکل حضرت امیر انتحال نمودہ بود و در لیاے کہ بالتماس بعض اعزۂ دے رسالہ اوی نوشتم اظہار سرقہ و انتحال اونمودم، آں رسالہ متروک ساختہ، رسالۂ دیگر تالیف نمود، آں نیز خالی از سرقہ نیست از اثر مہارت میر در فنون اوعیہ و طلسمات قتل، ذو الفقار خاں حاکم بغداد است کہ با بادشاہ دیں پناہ بغی می درزید و تفصیلاں برالسنہ جمہور مذکور وجملے ازاں در رسالہ قانون السلطنت مسطور۔" ۱۵۔

ان کے دو فرزند ہوئے ایک سید شریف الدین، دوسرے میر صدرالدین۔ اس خانوادہ کے دو اور بزرگوں کا بھی تحفتہ الکرام میں ذکر آیا ہے۔ یعنی میر نظام الدین احمد و میر حبیب اللہ، یہ دونوں حضرات بھی علم و فضل کے لحاظ سے یگانہ روزگار تھے۔

سادات شکرالٰہی : قاضی سید شکراللہ کی نسبت سے میر نظام الدین کا خاندان ٹھٹھہ میں سادات شکر الاھی شیرازی کے نام سے موسوم ہوا، اسی خانوادہ کے تقریباً تمام افراد علم و فضل، نیز دینی مرتبے کی وجہ سے یگانہ روزگار ہوتے آئے ہیں۔ آج بھی ان کا خاندان اپنے قدیم محلہ میں آباد ہے۔

اس موقع پر میں خاندان کے چند بزرگوں کا بھی ذکر کردینا چاہتا ہوں، تاکہ اندازہ ہوجائے کہ اس خاندان کے مختلف افراد نے سندھ میں آنے کے بعد علم، ادب اور مذہب کی کیا کیا خدمتیں انجام دیں۔

سید شاہ ولی : بن سید ابوالقاسم بن سید علی اکبر بن سید عبدالواسع بن سید محمد حسین بن سید شکراللہ ثانی، علامہ مخدوم رحمہ اللہ جیسے یگانہ روزگار کے شاگرد تھے اور بقول صاحب تحفتہ الکرام :

"در املا و انشا و شعر طبیعت صافی و قریحت کافی داشتہ۔" ۱۶۔

صاحب تحفتہ الکرام میر علی شیر قانع، مقالات الشعراء میں آپ کا ذکر یوں فرماتے ہیں :

"بفنون کمالات علمی آراستہ و حلہ تورع و تقوی پیراستہ اوقات بابر کاتش صرف مطالعہ کتب و افادہ تلامذہ می بودہ، برجادہ اسلاف مستقیم و میان سادات بہ

بزرگی موصوف و بحسن و خلق و فرط متانت نزد اکابر و اصاغر معروف" ۱۷۔

صاحب موصوف نے تحفۃ المجالس کے نام سے ایک تصنیف بھی چھوڑی ہے۔ شوال المکرّم ۱۱۵۰ھ کی ۱۳ تاریخ کو رات کے وقت اپنی جاگیر جگت پور تعلقہ ٹکرالہ (سندھ) میں وفات پائی۔ نعش وہاں سے لاکر ۱۵ تاریخ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کی گئی۔ ان کے ایک شاگرد لطف اللہ نے "قدفات فی عشقہ" سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ مقالات الشعراء میں ان کے دو فارسی شعر بھی نمونہ کے طور پر دیئے گئے ہیں۔ تذکرہ علمائے ہند میں بھی صفحہ ۲۵۰ پر ان کا ذکر آیا ہے۔ ان کے دو فرزند ہوئے، ایک سید محمد ناصر، دوسرے سید محمد سراج الدین۔

میر سراج الدین: میر سراج الدین بھی بہت اچھے شاعر ہوئے ہیں، تاریخ گوئی میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی، تحفۃ الکرام میں درج ہے کہ:

"باوصاف اسلافش متصف جانشین و یادگار بزرگان است۔ بہ محامد اخلاق موصوف مشار الیہ سائر اولاد جدمی باشد، طبیعت شعر دارد و در استخراج تواریخ نیکو مہارت می نماید۔" ۱۸۔

سید غلام اولیاء: بن سید عنایت اللہ بن سید اسداللہ بن سید عنایت اللہ بن سید عبدالرحمٰن بن سید ظہیرالدین والاسلام عرف میر جادم بن سید شکراللہ اوّل بہت بڑے بزرگ اور اہلِ دل گزرے ہیں، ان کے متعلق تحفۃ الکرام کا مصنف لکھتا ہے کہ:

"در عین جوانی بہ تحصیل علوم ظاہر و باطن متوجہ شدہ بہ اتقاء و تورع درجہ علیا فرا اندوختہ۔۔۔ صاحب خوارق کلیہ برآمدہ مجرد در عین رشد جہان فانی راپدرود کردہ، جماعۃ مخصوصہ ارادتمند ماند، بیست و یکم ہر ماہ مطابق روز وفاتش مجمع ارادت مند بزیارتش و ختم و اطعام العجل آوردند و کشف مہمات می نمایند۔" ۱۹۔

سید محمد ناصر: بن سید عطاء اللہ بن سید نعمت اللہ، بن سید نظام الدین بن سید نور محمد بن سید شکراللہ ثانی بن سید ظہیر الدین بن سید قاضی شکراللہ اول زہد و تقویٰ میں "اعجوبۂ روزگار" تھے۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی عورت کا منہ نہیں دیکھا۔ اس حد تک معصوم تھے کہ جانوروں میں نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں وہ کامل تھے اور عقیدت مندوں کی بہت کثرت تھی، جن کی حاجت روائی فرماتے

رہتے تھے۔

ایک دفعہ ٹھٹھہ میں خشک سالی ہوئی، لوگ بہت پریشان ہوئے، مزارات اور مقابر پر جاکر دعائیں مانگنے لگے۔ کسی شخص کو خواب میں بشارت ہوئی کہ جس شخص نے کبھی عورت کا منہ نہ دیکھا ہو اسے نماز استسقاء پڑھانی چاہیے تاکہ باران رحمت کا نزول ہو۔ لوگ ان کے پاس آئے۔ والدۂ محترمہ کے ارشاد سے انہوں نے تین دن تک نماز پڑھائی اور دعائیں مانگیں تا آنکہ ابر رحمت جوش میں آیا اور گوہر مقصود حاصل ہوا۔

سید نظام الدین کے جد دوم یعنی سید نور محمد کے دوسرے بھائی سید ظہیرالدین جادم ثانی کی اولاد میں بھی بہت سے اہل کمال پیدا ہوئے۔

سید محمد کاظم : بن سید محمد مقیم بن سید ظہیرالدین ثانی کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ :

"عجائب احوالات داشتہ، احیاناً دو دو، سہ سہ، روز و شب در خواب کہ عین بیداری تواں انگاشت، بخلوت بودے، و ذکر قلبی، از مردم مسموع کردے آخر باخود بافاقہ رسیدے ہم چنیں کمالات دیگر داشت از احصاءِ افزوں باشد۔"۲۰۔

صاحب تحفۃ الکرام : میر سید علی شیر بن سید عزت اللہ بن سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیرالدین بھی اسی سلسلہ عالیہ کے ایک جوہر تابندہ اور گوہر درخشندہ تھے۔ تحفۃ الکرام، مقالات الشعراء اور کئی دیگر تصانیف انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں۔ اگر وہ تحفۃ الکرام اور مقالات الاشعراء نہ لکھتے، تو آج سندھ کی سیاسی اور ادبی تاریخ سے ہم قطعی نابلد رہتے۔

میر عظیم الدین : اس خانوادے کی ایک اور عظیم شخصیت میر عظیم الدین نام کی ہے، جس کا سلسلہ یوں ہے، سید عظیم الدین بن سید یار محمد بن سید عزت اللہ بن سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیرالدین ثانی۔ یہ بھی ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ ایک دیوان، ایک مثنوی ھیر رانجھا اور ایک منظوم تاریخ موسوم بہ فتح نامہ ان کی یادگار ہیں۔

غرض سید نظام الدین مولف فتاویٰ عالمگیری کا تمام خاندان شیراز، ھرات اور قندھار سے لے کر سندھ تک کئی صدی برابر علم و فضل کے دریا بہاتا اور دین کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا۔

۲۔ قاضی ابوالخیر ٹھٹھوی

سید نظام الدین کے بعد فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں قاضی ابوالخیر ٹھٹھوی کا نام آتا ہے۔ یہ بزرگ بھی سندھ کے مشہور مردم خیز اور تاریخی شہر ٹھٹھہ کے باشندے تھے۔

یہ ٹھٹھہ کے مشہور عالم اور بزرگ علامہ مخدوم فضل اللہ کے فرزند تھے، جن کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ :

"جامع فضائل قدسیہ حاوی معارف انسیہ، محل زیور ورع و تقویٰ بودہ ہموارہ بدرس علامہ اشتغال ورزیدی۔"۲۱؎

تاریخ معصومی ۲۲؎ اور مآثر رحیمی ۲۳؎ میں بھی تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اسی طرح ان کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ مرزا عیسیٰ اور میرزا باقی ترخان کے معاصر تھے، ان کے فرزند مخدوم ابوالخیر کے لیے تحفۃ الکرام کا مصنف بیان کرتا ہے کہ :

"در زمانہ خویش طالب علم کامل برآمدہ، در فتاویٰ عالمگیری شریک استنباط مسائل شد۔"۲۴؎

ان کا ایک فرزند ہوا ملا اسحٰق جو خود بھی بقول تحفۃ الکرام جامع کمالات تھا، ان کا ایک بیٹا کمال الدین ہوا جس کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حواشی :

۱؎ تحفۃ الکرام، قلمی، ص ۶۱۵
۲؎ تحفۃ الکرام، قلمی، ص ۵۴۳
۳؎ طاہری، قلمی، ص ۱۱
۴؎ تحفۃ الکرام، قلمی، ص ۵۴۳
۵؎ تحفۃ الکرام، جلد دوم، مطبع بمبئی، ص ۷۱
۶؎ تحفۃ الکرام، جلد دوم، ص ۷۱
۷؎ ہفت اقلیم، مطبوعہ بنگال، ص ۲۶۱
۸؎ تحفۃ الکرام، ، جلد دوم، مطبوعہ بمبئی، ص ۷۱

۹۔ تحفتہ الکرام، جلد دوم، مطبوعہ بمبئی، ص ۷۰
۱۰۔ ہفت اقلیم، مطبوعہ بنگال، ص ۲۶۱
۱۱۔ ہفت اقلیم، مطبوعہ بنگال، ص ۲۶۱
۱۲۔ تحفتہ الکرام، جلد دوم، ص ۷۱
۱۳۔ ہفت اقلیم، مطبوعہ بنگال، ص ۲۵۹۔ ۲۶۰
۱۴۔ تحفتہ الکرام، جلد دوم، ص ۷۲
۱۵۔ تحفتہ الکرام، جلد دوم، ص ۷۲۔ ۷۳
۱۶۔ تحفتہ الکرام، جلد ۳، ص ۱۹۵، مطبوعہ بمبئی
۱۷۔ مقالات الشعرا، قلمی، ص ۳۰۴
۱۸۔ تحفتہ الکرام، مطبوعہ بمبئی، جلد ۳، ص ۱۹۶
۱۹۔ تحفتہ الکرام، مطبوعہ بمبئی، جلد ۳، ص ۱۹۶
۲۰۔ تحفتہ الکرام، قلمی، ص ۵۵۶
۲۱۔ تحفتہ الکرام، قلمی، ص ۶۲۰
۲۲۔ تاریخ معصومی، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، ص ۲۱۷
۲۳۔ ماثر رحیمی، مطبوعہ بنگال، ص ۳۲۸
۲۴۔ تحفتہ الکرام، قلمی، ص ۶۲۰

مولانا محبّ علی سندھی

ہندوستان: کی اسلامی تاریخ میں سندھ کو اس بنا پر امتیازی درجہ حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی اور یہی خطہ ہے جسے عربوں نے فتح کیا، عربوں کی یہ شان برتری کسی شرح کی محتاج نہیں کہ اُن کے قدم جس خطے میں پہنچے، اسے الٰہی رنگ میں رنگ دیا، ومن احسن من الله صبغه۔ جس جگہ گئے اسلامی علوم و فنون کے انوار ساتھ لے گئے۔ سندھ ہی سے یہ انوار اس وسیع براعظم کے دوسرے گوشوں میں پھیلے، آج اسلامی حکومت کے اس اوّلین مستقر کے علمی و تہذیبی کمالات کی داستان پر فراموشی کے گرد و غبار کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، لیکن جن اصحاب علم و خبر کی نظریں تاریخی سفائن کے اوراق سے بہرہ مند ہیں، وہ جانتے ہیں کہ سندھ صدیوں تک، علوم دینی، فنون ادب اور فضائل سیر و سلوک میں اکابر کا سرچشمہ بنا رہا۔ اگر ان بزرگوں کے صرف ناموں کی فہرست مرتب کی جائے، تو ایک دفتر عظیم تیار ہو جائے، تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول، ادب، شعر، تاریخ، حکمت، یا تصوف میں سے کون سا شعبہ ہے جس میں سیکڑوں بلند پایہ اصحاب ہر دور اور ہر عہد میں موجود نہ رہے، اور اُنہوں نے اپنے کمالات کے گہرے نقوش یادگار نہ چھوڑے، لیکن کس قدر رنج و افسوس کی بات ہے کہ اکابر سندھ نے فضائل علم و عمل کے جو گراں بہا انبار لگائے، وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑے ہیں اور ہمارے عہد کے لوگوں کا تصور یہ ہے کہ گویا سندھ علوم و فضائل میں

قابل ذکر اور شایان توجہ ہی نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ سندھ اس برعظیم کے ایک گوشہ میں واقع تھا، اس لیے یہاں کے اصحاب فضل و کمال کو وہ شہرت و ناموری حاصل نہ ہو سکی، جو قلب ہند کے علما و صلحا کو مرکزیت کی وجہ سے حاصل ہوتی رہی۔ جب مغلوں کی حکومت میں ضعف و انحطاط کے آثار نمودار ہوئے سندھ اس برعظیم سے بالکل منقطع ہوگیا، اس وجہ سے دوسرے علاقوں کے لوگ سندھ کی علمی کارناموں سے اور بھی غافل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی موجب حیرت ہے کہ اگرچہ یہاں ہر فن کے ارباب کمال پیدا ہوتے رہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے یہاں کی علمی تاریخ فراہم کرنے پر توجہ مبذول نہ کی۔ سب سے آخری مصیبت یہ ہوئی کہ ۱۸۴۳ء میں سندھ کو خود مختاری سے محروم کیا اور صوبۂ بمبئی کا ضمیمہ بنا دیا گیا اور اس کی وہ حیثیت بھی زائل ہوگئی جو دوسرے صوبوں کو برطانوی حکومت کے زمانہ میں حاصل رہی، ان حالات کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ہماری ساری علمی میراث پر تاریکی چھا جائے، حالانکہ یہ بیش قیمت میراث نہ صرف اہلِ سندھ کے لیے بلکہ سارے ملک اور ساری قوم کے لیے سرمایہ فخر تھی اور اسے صحیح انداز میں دنیا کے سامنے پیش کر کے رغبت علم اور ذوق عمل پیدا کرنا ممکن تھا۔

مولانا محبّ علی: میں آج کی صحبت میں مولانا محبّ علی کے حالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو اکبر، جہانگیر، اور شاہ جہاں کے عہد میں سندھ کے ایک ممتاز بزرگ عالم اور شاعر تھے۔ آغاز جوانی ہی میں فضیلت کی شہرت سُن کر عبدالرحیم خانِ خاناں نے انہیں اپنی مجلس خاص کا رکن بنا لیا تھا،اور یہ حقیقت اہلِ علم پر آشکارا ہے کہ خانِ خاناں کی مجلس خاص میں، صرف ان ممتاز اصحاب کو بار ملتا تھا جنہیں مختلف علوم و فنون میں، درجۂ کمال حاصل ہوتا تھا۔ مولانا محب علی نہ صرف اس مجلس کے رکن بنے بلکہ تقریباً ۳۶ برس تک اس میں انتہائی اعزاز و اکرام کے حامل رہے اور ان کی بلند پائگی اور قدر و منزلت میں کبھی کمی نہیں آئی۔

مولانا محب علی کے حالات، متعدد کتابوں میں مرقوم ہیں۔ کسی تذکرہ نگار نے انہیں خدا پرست بزرگوں میں شامل کیا ہے تو کسی نے شعرا میں شمار کیا ہے، لیکن زیادہ تر ان کے حالات ملا عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہ نامہ" اور ملا محمد صالح کنبوہ کی "عمل

صالح" یا عبدالباقی نہاوندی کی "مآثر رحیمی" میں ملتے ہیں، جس میں خانِ خاناں کی مجلس علم و فضل کے تمام شرکا کے تذکرے تفصیل سے مرتب کیے گئے ہیں۔

خاندان: مولانا کے خاندانی حالات کے متعلق روایتوں میں بڑا اختلاف ہے، ملا عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ "سب سے پہلے مولانا کے جد بزرگوار علی بیگ، بابر بادشاہ کے ساتھ آئے اور افغانوں کی جنگ میں شہید ہوئے ا۔"

اگر یہ بیان درست ہے تو سمجھنا چاہیے کہ، علی بیگ نے سن ۱۵۲۴ء اور ۱۵۲۶ء کے درمیان پنجاب کی کسی جنگ، یا پانی پت کے میدان میں لڑتے ہوئے جان دی۔ لیکن مآثر رحیمی میں مولانا کے جد بزرگوار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مُلّا عبدالحمید، مولانا کے والد کا نام "صدرالدین محمد" بتاتا ہے لیکن عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی اور خوشگو کے سفینہ میں، مولانا کے والد کا نام "مولانا حیدر علی" مرقوم ہے۔ قرائن اس آخری بیان کے مؤید ہیں اس لیے کہ مولانا مصنف مآثر رحیمی کے دوست اور رفیق خاص تھے اس لیے ان کے والد کے نام سے متعلق یہی بیان زیادہ قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔

لاہوری نے بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ صدرالدین محمد:-

"بر سر آغاز جوانی، ہمراہ موکب معلائے حضرت جنّت آشیانی (ہمایوں) بہ تتہ رسید، بہ مقتضائی آبشخور، در آں جا اقامت گزید۔"۲۔

عمل صالح نے، مندرجہ بالا بیان پر، اتنا اضافہ کیا ہے کہ:-

"بنا بر صغر سن از متابعت خیل اقبال تخلف درزیدہ، در آں مقام (یعنی تتہ) توقف گزید، وبعد از اشراف بر سن تمیز تکلیف تاہل اختیار نمودہ۔" ۳۔

ہمایوں سن ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ پہنچا، یہ سن ۱۵۴۲ء کا واقعہ ہے، اسی سال عُمر کوٹ میں اکبر پیدا ہوا، پھر ہمایوں قندھار ہوتا ہوا ایران چلا گیا۔

ان حالات کی روشنی میں بادشاہ نامہ، اور عمل صالح کے بیانات پر غور کیا جائے تو خاصے مضطرب نظر آتے ہیں، اس لیے کہ اگر صدرالدین محمد کے والد نے سن ۱۵۲۴ء میں، میدان جنگ میں وفات پائی تو صدرالدین محمد اس سے پہلے پیدا ہو چکے تھے، پھر سن ۱۵۴۲ء میں ان کو صغیر السن سمجھنا غیر ممکن ہے اس لیے کہ وہ کم از کم سولہ برس

کے ہونے چاہئیں اور یہ عمر ایسی نہیں کہ وہ ہمایونی لشکر کے ساتھ جانے کے قابل نہ سمجھے جاتے۔

مُلا عبدالباقی نے ماثر میں لکھا ہے کہ مولانا محبّ علی کے والد حیدر علی :۔

"در لوائل عمر، از سمرقند بہ سیوستان، کہ از ولایت سندھ است، افتاد و در ملازمت سید ابوالمکارم سلطان سبزواری، کہ از جناب میرزا محمد باقی ترخانی، کہ والئی سندھ بود، می بودہ، واز پادشاہِ جنت مکان، شاہ طہماسپ حسینی الصفوی، پادشاہ ایران، بہ خطاب "سلطانی" سرافرازشدہ بود، وراہ مصاحبت و ملازمت یافتہ معزز و محترم بود۔"۴ ؎

مولانا کے والد اگر مرزا باقی کے عہد میں آئے تو یہ واقعہ سن ۹۷۵ھ/ ۶۸-۱۵۶۷ء کے بعد کا سمجھنا چاہیے۔ میرزا باقی نے سن ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں خودکشی کرلی۔ اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ لاہور کے فاضل نے مولانا کے والد کے وردد سندھ کی جو تاریخ بتائی ہے اس میں ماثر رحیمی کی بتائی ہوئی تاریخ میں کم و بیش ۲۶ سال کا فرق ہے۔ پادشاہ نامہ میں ہے کہ وہ "صغر سن" میں سندھ آئے، ماثر رحیمی کے نزدیک "سرِ آغاز جوانی" میں وارد ہوئے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے نزدیک ماثر رحیمی کا بیان بوجہ معلوم زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔

قبیلہ : اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ مولانا محبّ علی کس قبیلہ سے تھے، ماثر رحیمی اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔ پادشاہ نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"او خود را بہ گروہ "کوہ بر" کہ قبیلہ ایست از قبائل چغتا، منسوب می سازد۔" ۵ ؎

عمل صالح میں ہے کہ :۔

"از او یماق چغتا است، از نسل قوم مصروف "کوہ بر"۔ ۶ ؎

چوں کہ اور کوئی بیان اس کا ناقض نہیں، اس لیے ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ چغتائی ترکوں کے قبیلہ کوہ بر سے تھے، اور ان کے والد سمرقند سے سندھ کے شہر

سیوستان میں پہنچے۔
ولادت گاہ : مولانا کی جائے ولادت میں بھی اختلاف ہے، لاہوری کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کے والد نے ٹھٹہ میں توطن اختیار کیا، اور خود مولانا :-

"دراں سرزمین متولد گردید، وازیں رو بہ سندی اشتہار یافتہ، در صغر سن او والد اش ازیں جہاں رخت ہستی بربست، واو ہمت برکسب علوم گماشت۔"ے

عمل صالح کا بیان بھی یہی ہے۔۸ے جس سے متبادر ہوتا ہے کہ ملا محمد صالح نے پادشاہ نامہ کے بیان کو اپنے لفظوں میں لے لیا ہے۔

ان دونوں کے برعکس مآثر رحیمی میں واضح طور پر مرقوم ہے کہ مولانا محب علی سیوستان میں پیدا ہوئے۔

"وچوں بہ سن رشد و تمیز رسید، بدارالسلطنت تتہ کہ تخت سلاطین ترخانی بود، آمد، و در تتہ سندھ نشونما یافتہ، کسب کمال استعداد دراں بلدہ نمودہ، ازیں رہگذر بسندی اشتہار یافتہ۔"۹ے

مولانا ٹھٹہ میں پیدا ہوئے یا سیوستان میں، دونوں شہر، سندھ کے تھے، اس لیے ان کے سندھی ہونے میں کسی کے لیے کلام کی گنجایش نہیں۔

سن ولادت : مولانا کا سن ولادت کسی نے بھی نہیں لکھا، لیکن تخمینہ کے لیے بعض قرآئن موجود ہیں، جن کی کیفیت ذیل میں درج ہے :-

(۱) مولانا سن ۱۰۰۰ھ میں خان خاناں کی ملازمت میں داخل ہوئے، مآثر رحیمی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ "خورد و بمعنی بزرگ" تھے، اس سے ظاہر ہے کہ مولانا کی عمر اس وقت زیادہ نہ تھی، اگرچہ علوم و فنون میں درجۂ کمال حاصل کر چکے تھے۔ چوں کہ یہ واقعہ غیر معمولی تھا، اس لیے، صاحب مآثر نے اسے ابھار کر بیان کیا۔

(۲) "بہ سن خورد" سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ مولانا کی عمر اس وقت ۲۰ اور ۲۵ کے درمیان ہونی چاہیے۔

(۳) چوں کہ ان کے والد سن ۹۷۵ھ میں یا اس کے آس پاس بہ عہد میرزا باقی ترخانی سیوستان پہنچے اس لیے میرا خیال ہے کہ مولانا کی ولادت ۹۷۵ھ سے ایک آدھ

برس بعد ہوئی۔

(۴) یہ کسی نے نہیں بتایا کہ مولانا کے والد نے سندھ پہنچ کر شادی کی، یا وہ سمرقند سے اہلیہ سمیت آ گئے تھے، لیکن یہ تصریح موجود ہے کہ خود مولانا، سیوستان میں پیدا ہوئے، اس لیے، سن ولادت کے لیے جو اندازہ میں نے پیش کیا ہے وہ اصلیت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

ان کی تعلیم کے متعلق ضروری تفصیلات کسی کتاب میں مذکور نہیں ہیں، لیکن دو حقیقتیں بالکل واضح اور روشن ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ مولانا نے زیادہ تر تعلیم ٹھٹہ میں پائی، جو اس وقت دارالسلطنت ہونے کے باعث، علوم و فنون کا گہوارہ تھا، نہ فقط سندھ میں اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی بلکہ مختلف فنون میں اس کی شہرت کا آوازہ دُور دُور تک پہنچا ہوا تھا۔

اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے رسمی علوم کو بالاستیعاب حاصل کیا، پھر اپنے ذوق اور جودتِ طبع کے باعث، ابتدائے عمر ہی میں مرجع کمال بن گئے۔

لاہوری کے بیان کے مطابق ان کے والد صغر سن ہی میں فوت ہو چکے تھے، ماثر رحیمی نے اگرچہ اس باب میں تصریحاً کچھ نہیں سمجھا، لیکن سیوستان کو چھوڑ کر، مولانا کے ٹھٹہ جانے سے یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کے والد فوت ہو چکے تھے اور ساری تعلیم حالاتِ یتیمی میں پوری کی، اغلب ہے کہ انہیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی ہوں لیکن کوئی مشکل، کسب کمال میں دامن گیر نہ ہو سکی اور وہ خان خاناں کے ٹھٹہ پہنچنے کے وقت، بلند حیثیت حاصل کر چکے تھے، اگرچہ عمر زیادہ نہیں تھی۔

ملازمت: مرزا عبدالرحیم، خان خاناں، نہ محض اکبری دور کا یگانہ امیر ہے بلکہ علم و کمال کے مربیّ اور سرپرست کی حیثیت سے اسے تاریخ میں وہ بلند درجہ حاصل ہے جس پر بادشاہوں کے لیے بھی رشک زیبا ہے۔ اکبر نے سن ۱۵۹۱ء (۹۹۹ھ) میں اسے ملتان کا حاکم بنا کر حکم دیا تھا کہ ولایت سندھ کو جلد سے جلد مسخر کیا جائے، شیخ فیضی نے اس عزیمت کی تاریخ "قصد تتہ" (۹۹۹ھ) سے نکالی تھی۔

خان خاناں، منزل بہ منزل ٹھٹہ پہنچا، ۶ محرم سنہ ۱۰۰۰ھ (مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۵۹۱ء) کو جمعرات کے دن، شہر فتح ہوا، ترخانی حکومت کی بساط لپیٹی گئی، اور سندھ پھر

اپنی مستقل حیثیت کھو کر تخت گاہ دہلی سے وابستہ ہوا۔

خان خاناں، فتح کے بعد کچھ مدت تک ٹھٹھ میں ٹھہرا رہا۔ اس کے وابستگان دولت بھی ساتھ تھے، ان میں سے شکیبی اصفہانی نے جو خود باکمال شاعر تھا، قیام ٹھٹھ کے زمانہ میں مولانا محب علی کا سراغ لگایا اور ان کے فضل و کمال کا ذکر خان خاناں سے کیا۔ اس طرح سندھ کا یہ نادر گوہر علم و فضل، اس قدر شناس جوہری کے سامنے پہنچا۔ مآثر رحیمی کا بیان ہے کہ شکیبی :-

"ایشاں (یعنی مولانا محب علی) را دریافتہ و اطلاع بر فضل و کمال و سلامت نفس و فقر و مسکنت ایں، بہ سن خورد بہ معنی بزرگ پیدا کرد۔"۱۰؎

خانِ خاناں، ہر وقت اہلِ کمال کا جویا رہتا تھا، اور پاک نفس درویشوں سے، اسے بڑی محبت تھی، مولانا کا ذکر سُنتے ہی اُنہیں فوراً بلوا لیا۔ ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں، ان کی کوئی تفصیل موجود نہیں، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خان خاناں نے ان کو اپنے ساتھ رکھنے پر اصرار کیا، مولانا کو ملازمت پسند نہ تھی، لیکن خان خاناں کے حسنِ سلوک اور فضائل اخلاق سے اتنے متاثر ہوئے، کہ اپنی طبیعت کے خلاف وابستگی گوارا کرلی بلکہ بے ساختہ یہ شعر پڑھا ۱۱؎

بے غم عشق تو صد حیف زعمری کہ گزشت
پیش ازیں کاش گرفتار غمت می بودم

یہ محرم ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء کا واقعہ ہونا چاہیے، اس وقت سے لے کر خان خاناں کے ندیمان خاص میں شامل ہوئے اور جب تک اس کا سلسلہ امارت انقلابات کی گردش میں نہ آیا، اس وقت تک نہ خود الگ ہوئے اور نہ قدرشناس خاں نے ان کے اعزاز و اکرام میں کمی آنے دی، وہ خود فرماتے ہیں :-

مراچوں شد جوانی بر در تو
نخواہم شد بہ پیری از برِ تو

مآثر رحیمی میں ہے :-

"در متمادی عمر شریف کہ در خدمت ایشاں (خان خاناں) می

بود، ہموارۂ معزز و مکرم بودہ، وایں عالی شان بوجود فایض الجود او
دریں سلسلہ رفیعہ کہ ہمیشہ دانایان و دانشمنداں ہر صنف و ہر طبقہ
بودہ اند، مباہات می نمایند، وصحبت اورا غنیمت می شمارند، و بعلوفہ
لایقہ و انعامات و تکلیفات بے حد و نہایت سرافراز ساختہ اند ۱۲؎"

اس قدر شناسی پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں، اس لیے کہ خان خاناں کی شاہانہ سخاوت اور دریا نوالی سب پر آشکارا ہے، وہ اپنے تمام ندیموں پر داد و دہش کی بارش برساتا رہتا تھا، مولانا کے لیے اس کے دل میں خاص عزت و محبت تھی، لہذا، ان کے لیے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔

مولانا سے خان خاناں کے خاص حسنِ سلوک کی ایک شہادت یہ بھی ہے کہ جب سے ملازمت میں داخل ہوئے، کبھی علاحدگی اختیار کرنے کا خیال نہ آیا، حالاں کہ ملازمت کی پابندی، ان کی طبع نازک پر ابتدا میں بہت شاق تھی۔

سفر حج: مولانا کے زمانہ میں حجاز کا سفر اتنا سہل نہ تھا جتنا کہ ہمارے زمانہ میں ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہر سال ہزاروں مشتاقان زیارت، حرمین شریفین پہنچتے تھے، خود خان خاناں کے ندیماں خاص میں سے بھی ہر سال حج کے لیے جاتے تھے، اور خان عزت نشان ان کے تمام مصارفِ سفر احسن طریق پر پورے کرتا تھا، چناں چہ نظیری نیشاپوری اور شکیبی اصفہانی کے حج کے حالات ہمیں پہلے سے معلوم ہیں۔ سن ۱۰۱۴ھ /۱۶۰۵ء میں مولانا محبّ علی نے بھی شکیبی کے ساتھ حجاز کا قصد کیا، مآثر رحیمی میں ہے کہ شکیبی کو خان نے اسی ہزار روپے مدد خرچ اور ضروریاتِ سفر کے لیے عطا کئے، ان کے علاوہ بھی انعامات دیے جن کی تفصیل نہیں بتائی گئی ۱۳؎، مولانا کے لیے مرقوم ہے کہ جب یہ سفر حج کے لیے رخصت ہو رہے تھے تو:۔

"مایحتاج راہ و خرچ ضروری آں سفر را، چناں چہ باید و شاید بہ
جہت او مستعد و مہیا ساختند ۔" ۱۴؎

"باید و شاید۔" بہت مختصر جملہ ہے لیکن ان تین لفظوں میں وہ سب کچھ آجاتا ہے، جو انعام و اکرام کی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ بلند بنا سکتا ہے، یعنی اتنا خرچ دیا، جو ہر لحاظ

سے کافی اور مولانا کی رفعت اور منصب کے عین مطابق تھا، یقینی یہ رقم بھی شکیبی کی رقم سے کم نہ ہوگی۔

دورانِ حج کی کیفیت: مولانا کو، علم و فضل اور ادب و شعر میں جو رُتبہ حاصل ہے، اس سے کہیں بلند تر مرتبہ اُنہیں زہد و تقویٰ میں حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے معاصرین انہیں شاعر و ادیب و عالم کے بجائے زاہد و عارف اور صاحبِ مشیخت سمجھتے تھے، وہ محض ایک رسم ادا کرنے کے لیے حجاز نہیں گئے تھے بلکہ ان کا ساز وجود خدا پرستی کے ترانوں سے معمور تھا، مآثر رحیمی میں ہے کہ اس سفر میں ان پر ایک عجیب حالت طاری رہی، حرم پاک میں پہنچتے ہی لوگوں سے گریز و انقطاع کا ذوق اس قدر غالب آیا کہ گویا دنیا کی ہر شے سے رشتہ توڑ کر الگ ہوگئے، اکثر کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے، ذکر و فکر میں لگے رہتے، باہر نکلتے تو اکیلے نکلتے، شکیبی ان کا خواجہ تاش عزیز دوست اور خاص رفیقِ سفر تھا، لیکن عبدالباقی نہاوندی نے لکھا ہے کہ اسے بھی ملاقات کی ضرورت پڑتی تو انتہائی سعی و جستجو کے بعد سراغ لگا سکتا، ہر دس دن میں صرف ایک مرتبہ ملتے، لیکن کہاں؟ کسی ویرانے یا نا معلوم گوشے میں ۱۵؎

حج سے واپس آئے تو پھر خان خاناں کے پاس پہنچ گئے لیکن اب ان کے طریق زندگی میں اور بھی تغیر آچکا تھا، مآثر رحیمی کا بیان ہے کہ "دن کو برابر روزے رکھتے اور رات نماز و عبادت میں گزارتے۔" ۱۶؎

ایک حادثہ: حج سے مراجعت میں ایک سخت حادثہ پیش آیا، جس کی تفصیل نہاوندی نے شکیبی کے ذکر میں بتائی ہے، یعنی جس جہاز میں مولانا شکیبی اور مولانا محب علی سوار تھے، وہ راستہ میں تباہ ہوگیا، اور انہیں مجبور ہوکر کسی دوسرے جہاز کے انتظار میں عدن ٹھہرنا پڑا، وہاں کے حاکم بڑے ظالم اور حریص تھے، انہوں نے مصیبت زدہ مسافران حجاز کی امداد کے بجائے ان پر دست تعدی دراز کردیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کا پورا احترام کرتے، جو ایک اہم مذہبی فریضہ ادا کرنے کے بعد گھروں کو آرہے تھے، لیکن اُنہوں نے اُن کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا، ستم بالائے ستم یہ کہ تاجروں اور حاجیوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھی، سب پر یکساں ہاتھ صاف کیا، جن کم نصیبوں کے پاس سے کوئی

قیمتی چیز یا معقول رقم برآمد نہ ہوئی، ان کو سختیوں کا تختۂ مشق بنایا۔

معلوم نہیں ہمارے مولانا اور ان کے ساتھی اس مصیبت سے کیوں کر رہا ہوئے اور کس طرح دوسرے جہاز کا انتظام کیا، بہر حال وہ سورت پہنچ گئے جو اس زمانہ میں خان خاناں کی جاگیر میں شامل تھا، جو دوسخا کے اس بحر مواج کو قافلہ حجاج کی مصیبتوں کا علم ہوا، تو فوراً ایک لاکھ محمودی کی رقم ان کی امداد کے لیے بھیج دی، مولانا محب علی اور شکیبی، توخیر خان خاناں کے ندیمان خاص اور وابستگان دامن دولت تھے، ان پر جو نوازشیں ہوئی ہوں گی، وہ خاص تعلق کا نتیجہ سمجھی جاسکتی ہیں، لیکن خان نے اس قافلہ کے ہر فرد کے تاراج شدہ مال کے برابر مال دے کر، سب کے نقصانات کی تلافی کردی۔ ۱۷؎ کشادہ دل سخی ایسے کہاں مل سکتے ہیں۔ شکیبی نے ایک مدحیہ قصیدے میں خان خاناں کے لیے کیا خوب کہا ہے۔

شد است پیش تو پشتم دوتانہ از پیری

ازاں کہ ہست براد بار منتِ انعام

بیعت و خلافت: مولانا محب علی کو، مُلا عبدالحمید لاہوری، اور ملا محمد صالح کنبوہ نے، طبقہ فضلا میں نہیں بلکہ طبقہ مشائخ میں شمار کیا ہے۔ ۱۸؎ عمل صالح میں شاہ جہانی عہد کے سولہ مشائخ کا ذکر ہے، ان میں حضرت شیخ میاں میر، خواجہ خاوند محمود (معروف بہ حضرت ایشاں)، اور مُلا شاہ بدخشی، جیسے بزرگان کرام کے حالات بیان ہوئے ہیں، ان میں سے پانچویں نمبر پر مولانا کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ "مظہر تجلیات خفی و جلی مولانا محب علی۔"

پادشاہ نامہ کی فہرست صرف تیرہ مشائخ پر مشتمل ہے، اور ان میں بھی، مولانا محب علی شامل ہیں۔

نہاوندی نے مآثر رحیمی میں، مولانا کو اگرچہ شعرا میں شمار کیا ہے، لیکن وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ شاعر کی حیثیت میں ان کی تعریف کرنا ایسا ہی ہے، جیسے کہ سوت کی ایک اٹی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خرید کے لیے نکلیں، ساتھ ہی شعرا میں ان کا ذکر کرنے کے لیے یہ عذر پیش کیا ہے کہ۔ "میں نے ان لوگوں کی سوانح جمع کرنے کا التزام کیا ہے، جنھوں نے خان خاناں کی مدح میں شعر کہے، چوں کہ مولانا بھی

وقتاً فوقتاً قصیدہ یا مدحی قطعہ لکھتے رہتے تھے، لہذا انہیں شعرا میں محسوب کیا۔" ورنہ نہاوندی کے نزدیک بھی وہ "اصلاً صاحب ذوق و وجد تھے۔" اس کا بیان ہے کہ :-

"درویش نہاد و فانی مشرب واقع شدہ، در طرز تصوف و تذکیر و تحقیق جنید و بایزید وقت و زمانۂ خوداست۔۱۹

جس بزرگ کا درجہ خان خاناں کے ندیموں کے نزدیک جنید و بایزید وقت کا تھا، اس کی بزرگی کا اندازہ خوانندگان کرام خود کر سکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے ذکر و سلوک کا طریقہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟ ملا عبدالحمید نے لکھا ہے کہ زیارت حرمین کے قصد میں مولانا سورت پہنچے تو۔ "تاج مناہج شریعت کاشف اسرار حقیقت شیخ محمد فضل اللہ۔" کی "صحبت فیض منقبت" سے مشرف ہوئے، وہیں بیعت کی، انہیں سے خرقہ خلافت لیا، پھر حج کے لیے حجاز گئے۲۰۔ عمل صالح نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا بھی مفہوم یہی ہے۔۲۱

گوشہ نشینی: بادشاہ نامہ میں ہے کہ مولانا تیں برس کی عمر میں دنیا کے علائق سے بے زار ہوگئے تھے، اور برہان پور میں گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی، اس کے بعد حج کے لیے نکلے، واپس آکر پھر برہان پور میں جا بیٹھے، شاہ جہاں نے بادشاہ ہونے کے بعد جب دکھن پر پہلی مرتبہ یورش کی تو:

"بدرگاہ گیتی پناہ آمدہ، شرف ملازمت اندوخت، دمدتی ملتزم رکاب فیروزی نصاب بود، اکنوں از پیش گاہ حضور مرخص گشتہ در برہان پور بہ پرسش ایزدی و دعائے دوام دولت گردوں صولت کامیاب است۔"۲۲

ملا صالح نے بھی یہی لکھا ہے، صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ:

"حسب الامر عالی بالتزام رکاب نصرت نصاب ارتکاب نمودہ، ازاں وقت ہمہ جا بہ سعادت ملازمت فائز بودہ۔"۲۳

یعنی برہانپور میں سکونت کی شہادت دونوں دے رہے ہیں، بادشاہ نامہ کے مطابق شاہ جہاں برہان پور پہنچا تو مولانا بارگاہ میں حاضر ہوئے، اور ہم رکاب رہے، بعدازاں

رخصت لے کر برہان پور میں جا بیٹھے، عمل صالح کے مطابق، بادشاہ کے حکم سے۔ "موکب خسروی۔" میں شامل ہوئے، اور جہاں جہاں بادشاہ گیا، اس کے ساتھ رہے۔

اس سلسلہ میں چند امور کی تصریح ضروری معلوم ہوتی ہے، مثلاً :۔

(۱) مولانا ۱۰۰۰ھ/۹۲۔۱۵۹۳ء میں خان خاناں کے پاس ملازم ہوئے، نظر بظاہر اُس وقت اُن کی عمر ۲۵ سے زیادہ نہ ہوگی، اگر تیس برس کی عمر میں دنیاداری سے علاحدگی اختیار کی تو یہ واقعہ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء یا ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء کا سمجھنا چاہیے۔

(۲) ۱۰۱۴/۱۶۰۵ء میں حج کے لیے گئے۔

(۳) گوشہ نشینی کا یہ مطلب قطعاً نہیں سمجھا جاسکتا کہ خان خاناں کی ملازمت چھوڑی تھی، یا اس سے تعلق توڑ لیا تھا، نہاوندی نے اس انقطاع کا کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء تک ملازمت کا ذکر تصریحاً موجود ہے وہ لکھتا ہے۔

"از تاریخ سنہ نہ صد و نودونہ (۹۹۹ھ) تا امروز کہ سنہ خمس و عشرین والف (۱۰۲۵ھ) ہجری بودہ باشد دربندگی ایں خدیو ملک بے نیازی (خان خاناں) می باشد۔"۲۴۔

(۴) میرا خیال ہے کہ دنیا داری میں انہماک کی عام روش سے، مولانا کو سخت اجتناب تھا، ممکن ہے کہ ہر وقت دربار میں رہنے کے بجائے، وہ زیادہ وقت برہان پور میں گزارتے ہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، کہ وہاں کی آب و ہوا، اُنہیں زیادہ گوارا معلوم ہوتی ہو، اور یا ممکن ہے کہ ذکر و فکر کے لیے، اس شہر کی فضا میں جذب و گیرائی کے خاص عوامل محسوس ہوئے ہوں۔

خان خاناں، کا فرزند اکبر، میرزا ایرج مخاطب بہ شاہنواز خاں، بہادری و مردانگی اور سپہ کشی و سپہ آرائی میں شہرہ آفاق تھا، جس جنگ میں شریک ہوا، رستمانہ کارنامے انجام دیے، افسوس کہ عنفوان شباب ہی میں "عرق نوشی" کی لت پڑی اور بے اعتدالی سے صحت بگڑ گئی۔ ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں اس نے وفات پائی۔ ۲۵۔

۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں شاہنواز خاں کو دکھن بھیجا گیا، تو خان خاناں نے، مولانا محب علی کو بھی مصاحب بنا کر ساتھ کر دیا، تاکہ :۔

"آں خلف سخن شناس و سخن دان را، انیس بزم و رفیق و محرم

بودہ باشد، واز نسائم طبع و قادو خاطر نقاد ایشاں (مولانا) چمنِ طبیعت و گلزارِ فطرت ایں عالی نژاد (شاہ نواز خاں) سرسبز و شاداب گردد۔"۲۶۔

مولانا غالباً ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء تک شاہ نواز کے ساتھ رہے، پھر پہلے کی طرح برہان پور میں مقیم ہوگئے، کچھ مدت بعد نورجہاں بیگم کے توڑ جوڑ نے، شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) کو باپ کے خلاف کردیا تھا۔ پادشاہ اور ولی عہد کی اس کش مکش میں امرا کے لیے، بڑی آزمائش تھی، وہ پادشاہ کا ساتھ دیتے تو ولی عہد کے معتوب بنتے، ولی عہد کی معیت اختیار کرتے تو پادشاہ کی نظروں میں مجرم ٹھہرتے، اس دور اضطراب میں، خان خاناں اور اس کا خاندان بھی انقلاب کے چکر میں آگیا۔ ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں خان خاناں نے وفات پائی، اس وقت مولانا محب علی کا سلسلہ ملازمت منقطع ہوا اور وہ برہان پور میں بیٹھے رہے۔

حب وطن: مُلا عبدالنبی قزوینی، مے خانہ میں لکھتا ہے کہ خان خاناں کی ملازمت کے دوران میں ایک مرتبہ وطن کی محبت جوش زن ہوئی، تو مولانا رخصت لے کر ٹھٹہ روانہ ہوئے، تھوڑی دور گئے تو "حرص دینوی" نے غلبہ کیا، راستہ سے پلٹ کر پھر دربار میں پہنچے اور ایک قصیدہ پیش کیا جس میں کہا ۲۷۔

خواستم چوں صیت جودت سر نہم در عالمے
کوہ شوقت سدرہ شد چوں صدا باز آمدم

ممکن ہے وطن جانے اور پھر راستہ سے پلٹ آنے کا واقعہ درست ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رخصت لی، وطن پہنچے، تھوڑی دیر ٹھہر کر واپس آگئے اور محولہ بالا قصیدہ پیش کیا، لیکن "حرص دینوی" کا الزام یک سر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ نہ مولانا کی عام روش کو حرص سے کوئی مناسبت تھی نہ خان خاناں کے ساتھ، ان کے ربط و تعلق کی حیثیت ایسی تھی کہ وطن کے لیے رخصت لیتے وقت ملازمت ختم کردی گئی ہو، مآثر رحیمی میں صاف لکھا ہے کہ خان خاناں مولانا کی صحبت کو غنیمت سمجھتا تھا، مے خانہ سن ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں لکھا گیا، اس میں مرقوم ہے کہ:

"الحال در بندگیٔ آں خان عظیم الشان است۔"۲۸۔

شاہی دربار سے تعلق : مولانا کی زندگی کے سلسلہ میں اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ خان خاناں کی وفات کے بعد اُنہوں نے کس سرکار سے تعلق پیدا کیا، علی شیر قانع مولانا کا ہم وطن تھا اس لیے قیاس کہتا ہے کہ اس نے حالات کی تحقیق و جستجو میں خاص کاوش کی ہوگی لیکن وہ صرف اتنا لکھنے پر قانع ہوگیا کہ مولانا "جہاں گیر اور شاہ جہاں کے امرا میں سے تھے۔"۲۹

خان خاناں نے ۱۰۳۶ھ/۱۶۲۶ء میں وفات پائی، جہاں گیر ایک سال بعد فوت ہوا، میں نے جہاں تک غور کیا، یہ بات مولانا کی عام روش اور انداز طبیعت سے بعید نظر آئی کہ زندگی بھر کے دریادل مربی اور قدر شناس محسن کے مرتے ہی نئے دروازہ کی جستجو شروع کردی ہو، پھر وہ بڑی حد تک گوشہ نشینی اختیار کرچکے تھے، صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں بہ سلسلہ یورش دکھن برہان پور پہنچا تو دوسرے اکابر کی طرح مولانا نے بھی ملازمت کا شرف حاصل کیا، پھر عمل صالح کے بیان کے مطابق بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ہم رکاب ہوگئے۔

شاہ جہاں بھی انہیں خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوگا۔ اسی لیے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ ملا عبدالحمید ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء کے حالات میں لکھتا ہے کہ بارش نہیں ہوئی تھی،لوگ پریشان تھے شاہ جہاں نے "اصحاب طہارت و تقویٰ" سے کہا کہ میدان میں نکل کر نماز استسقا پڑھیں، اور عاجزی کے ساتھ، بارگاہ باری تعالیٰ میں بارش کے لیے دعا کریں، ان "اصحاب طہارت و تقویٰ" میں مولانا محب علی کا نام بھی صراحت سے درج کیا ہے۔ ۳۰ یہ واقعہ آگرہ کا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کبھی کبھی برہان پور سے آگرہ بھی پہنچ جاتے تھے۔

دربار شاہ جہانی میں مولانا کے رسوخ کی ایک اور شہادت تحفۃ الکرام سے ملتی ہے، یاد ہوگا کہ مولانا کے والد سیوستان پہنچے تھے تو سید ابوالمکارم ابن سید میر غیاث الدین سبزواری وہاں کے حاکم تھے اور انہیں ملازمت دی تھی، زمانہ گزر گیا، شاہ جہاں کے عہد میں شریف الملک گورنر ٹھٹہ معزول ہوا، تو سید ابوالمکارم کے بیٹے میر عبداللہ سلطان عریضی نے بھی اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور گوشہ نشینی اختیار کرلی، اب مولانا کو

قدیم احسان کا خیال آیا، جو سید عبداللہ کے والد نے مولانا کے والد پر کیا تھا، چناں چہ انہوں نے سفارش کر کے میر عریضی کے لیے پچاس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر شاہی دربار سے منظور کرالی۔ ۳۱ے

وفات: سن ولادت کی طرح مولانا کے سن وفات کے متعلق بھی قیاس سے کام لیے بغیر چارہ نہیں، عبدالحمید لاہوری نے ۱۰۴۳ھ تک کے واقعات لکھے ہیں، اس وقت تک مولانا برہان پور میں "بہ پرستش ایزدی" ۳۲ے مشغول تھے، ملاصالح کنبوہ نے، اپنی کتاب ۱۰۶۵ھ میں لکھی، اس میں مولانا کی وفات کا ذکر کیا ہے لیکن سن وفات نہیں لکھا اور کتاب کے مرتب مولانا غلام یزدانی نے سن کی جگہ استفہامی علامت لگا کر فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ :۔

> "محمد صالح سنین وفات آں بزرگانِ دین و اہل کمال کہ بعد از سپری شدن ایام حیات عبدالحمید مولف پادشاہ نامہ، جان بحق سپردند، بصحت رقم نہ کردہ، چناں چہ ایں نقص چند جا در تصنیفش یافتہ می شود۔" ۳۳ے

گویا صرف یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا نے ۱۰۴۷ھ اور ۱۰۶۵ھ کے درمیان کسی سال وفات پائی، اگر ملازمت کے وقت ان کی عمر ۲۵ برس کی فرض کی جائے تو ۱۰۴۷ھ میں وہ ۴۷ برس کے ہو چکے تھے، میرا خیال ہے کہ اس سے چند برس بعد وہ واصل بحق اور غالباً خاک برہان پور کی آغوش میں محو آرام ہوئے، جہاں کی آب و ہوا انہیں زندگی میں بھی بطورِ خاص مرغوب تھی۔

علم و فضل: ہم اب تک جو کچھ بیان کر چکے ہیں، اس میں مولانا کے فضائل کی متعدد شہادتیں پیش ہو چکی ہیں، یعنی وہ آغازِ جوانی ہی میں، اتنے باکمال ہو چکے تھے کہ خان خاناں نے اصرار کے ساتھ انہیں اپنے ندیمان خاص میں شامل کیا، جہاں بڑے باکمال آدمیوں کا مجمع تھا، ان میں فضلا بھی تھے، حکما بھی تھے، صلحا اور شعرا بھی۔ علاوہ بریں تمام سوانح نگاروں نے مولانا کے علم و فضل کا ذکر بڑے احترام اور عزت سے کیا ہے، عبدالباقی نہاوندی ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"در فن طالب علمی بے نظیر و بے مثال و فریدۂ عصر و یگانۂ دہر است۔"۳۴؎

اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ نہاوندی نے عدیم المثالی کی کوئی صفت بھی بے ذکر نہیں چھوڑی، گویا وہ مولانا کے فضل و کمال کے لیے جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کہہ کر محسوس کرتا ہے کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا، دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"الحق مثل مولانائے مذکور دریں جزو زمانہ نیست و نخواہد بود، واہل ہندرا اعتماد تمام بہ فضیلت و حالت او ہست، و می رسد، و می زیبد۔"۳۵؎

خان خاناں کے فرزند شاہ نواز خاں کے سوانح میں اس کے مصاحبوں کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:۔

"ازاں مولانا محبّ علی سندھی است کہ ازا فاضل داعیان روزگار ہست، وطبع نظم عالی دارد، انیس و جلیس ایشاں است۔۳۶؎

خان خاناں کے پاس جو علما و فضلا تھے، اُن کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

"مثل مولانا محب علی سندھی کہ امروز از مشاہیر روزگار است۔"۳۷؎

مذہبی اور روحانی درجہ: میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مولانا عالم و ادیب سے کہیں بڑھ کر صاحب ذوق ووجد تھے اور روحانیت میں ان کا درجہ نہایت بلند تھا، اس وجہ سے صاحب مآثر رحیمی، انہیں وقت کا بایزیدؒ اور جنیدؒ بتلاتا ہوا لکھتا ہے:۔

"بعد از معاودت از مکہ معظّمہ بہ ہندوستان، دائم الصوم و قائم اللیل بودن راشعار ودشار خود ساختہ و در زہد و ورع و تسبیح و تھلیل ہیچ گونہ فوت فروگذاشتے نمی نماید، وبراہ نمونئے قائد توفیق قدم در ایں وادی نہادہ موفق گردیدہ، دہادی و مقتدا ای وراہ نمائے ایں فرقہ گرامی می توانند شد، وزخارف دنیوی را معدوم انگاشتہ بہ مضمون ایں

رباعی مولف عمل می نمایند۔

در دہر کہ عیب و ہنرش می دانم
و ز ھرچہ در لوست کمترش می دانم
بارے نہ فشانم و صفیرے نہ کشم
برخود ز نفس تنگ ترش می دانم

وایں شیوہ از ایشاں بغایت پسندیدہ وینکومی نماید، چراکہ از سنائبہ ریاوکذب مبراست و تمام عمر بیک و تیرہ دروش کہ شیوہ اوست اوقات شریف سلوک می وارد کہ نہ ازنہایت و مرحمت جہانیاں خوش حال ونہ از کم لطفی دبے شفقتے زمانیاں آزردہ و صاحب ملال می گردد لطف مخلوق رامعدوم انگاشتہ بندگی خالق جزو کل و خدمت و صحبت فقرا ودرویشاں را برہمہ چیز ترجیح می نہد، دبودن اودریں سلسلہ و خدمتِ اہل زماں جائے تعجب است، وتعجب ہم ندارد، چہ ایں بزرگوارِ صورت و معنی اگرچہ ظاہراًدر لباس حکومت و سلطنت است، درباطن بہ پلاس فقر آراستہ و پیراستہ است، واگر ظاہر بیناں ازیں معنی غافل بودہ باشند، وایں عالی شان را ازاہل منصب و مہم دنیادانند، گوباش، علیم علامہ حال ہر کس رامی داند۔"

آخر میں لکھا ہے:۔

"الحق مثل مولانائے مذکور دریں جزو زماں نیست ونہ خواہد بود، واہل ہندرا اعتماد تمام، بہ فضیلت و حالت لوہست، ومی رسد ومی زیبد۔"۳۸؎

نہاوندی مولانا کی بزرگی لور تقویٰ سے اتنا متاثر ہے کہ ان کو شاعروں میں شمار کرنا اپنے لیے گستاخی قرار دیتا ہوالکھتا ہے:۔

"اگرچہ لورابہ شعرو شاعری ستودن و ستائش کردن یوسف بہ ریسمان خریداری نمودن است، چوں ایں خلاصہ مبنی بر ذکر احوال جمی است کہ مدح ایں ممدوح عالمیاں گفتہ اند نسبت شعرو شاعری

بہ ایشاں دادن، لازم آمد و الا مرتبہ وحالت ایشاں را در اقسام حیثیات و استعدادات بہ تخصیص فقر ومسکنت کہ انسان کامل عبارت از جمعی است کہ سر رشتہ بدست در آوردہ باشد، آنست راقم رازیں گستاخی بازمی داشت۔"۳۹-

بادشاہ نامہ نے بھی مولانا کی دین داری فقر و درویشی اور جذبۂ خدمت و اصلاح خلق کا ذکر بڑے اچھے لفظوں میں کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"از تکلفات رسمی و تصنعات عرفی بے گانہ، پیش تر اوقات بر انجاح حوائج مسلمانان و اسلام کفرہ و اصلاح فجرہ مصروف دارد، و تابہ ادراک سعادت حضور مستعد بود، بامر خاقان عدل پرور دادگستر، جمعی راکہ بہ جاذبہ توفیق از تنگنائے کفر بہ وسعت آباد ایمان، می گرائید، از نظر اکبر اثر گذرانیدہ در اسعاف مقاصد شان می کوشید۔۴۰-

غرض مولانا کے تمام سوانح نگار، ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ، بلندیٔ اخلاق، خدا پرستی، اور دوسری خصوصیات کے بے حد معترف ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے رنگ میں ان خصوصیات کا ذکر بڑے اچھے لفظوں میں کیا ہے۔

شعر و شاعری: مولانا دوسرے کمالات کے علاوہ شاعری میں بھی بلند پائے پر فائز تھے، مقالات شعرا میں انہیں "شاعر جید"۴۱- اور تحفۃ الکرام میں۔ "شاعر اشعر"۴۲- بتایا گیا ہے، عبدالباقی نہاوندی انہیں حکیم سنائی سے تشبیہ دیتا ہوا کہتا ہے:۔

"او در طرز منظومات بروشِ حکیم کامل سخن، و بالغ فطن حکیم سنائی، حرف می زند، و تتبع دے می نماید، وابیات و اشعار عالیہ او کہ دریں خلاصۂ ثبت می گردد، دلیل مبرہن و برہان قاطع است، بر صاحب فطنی و قادر سخنیٔ مومی الیہ۔۴۳-

عمل صالح میں ہے:۔

"وآں عارف کامل درعین غلبہ نشائی ذوق گاہے گاہے،

اشتعال نائرہ شوق رابہ رشحہ فشانئے لطف اشعار آب دار فرونشاندہ، انواع سخن از مثنوی و غزل و قصیدہ و رباعی کہ ازروے کمال مرتبہ وجدوحال ناشی شدہ، انشامی نمایند، واغلب اوقات شاہد معنی عاشقانہ و عارفانہ کہ از شمایم آں نسایم قدس ونفحات انس تمام بہ مشام ارباب عرفان ووجدان میرسد در لباس نظم جلوہ می دہند۔"۴۴؎

تذکرہ صبح گلشن میں ہے:

"بہ علم و فضل سر برافراختہ، زمستعدین فنون نظم بودہ، و خامہ اش طریق مثنوی رابکمال لطافت پیمودہ۔ محب کمال و ارباب کمال بود۔"۴۵؎

ان اقتباسات سے صاف آشکارا ہے کہ تمام سوانح نگار مولانا کی شاعری کے یکساں مداح ہیں، نیز مولانا نے تمام اصناف شعر میں طبع آزمائی کی یعنی قصائد، غزلیات، رباعیات اور مثنویات میں سے کسی صنف کو نہ چھوڑا، افسوس کہ آپ کے کلام کا کوئی مجموعہ مرتب نہ ہوسکا، عبدالنبی فخر الزمانی نے لکھا ہے کہ۔ "دیوان آں عزیز تالفایت جمع نہ شدہ، و بہ بیاض نہ رفتہ ۴۶؎ مآثر رحیمی میں ان کے جو اشعار نمونتاً درج ہوئے ہیں وہ بھی بہت کم ہیں اور یہ وہ اشعار ہیں جن کو کسی نہ کسی شکل میں خان خاناں کی مدح و ستائش سے تعلق تھا۔

خوش گو نے سفینہ میں بیان کیا ہے کہ مولانا نے ایک دیوان ایک مثنوی اور ایک ساقی نامہ یادگار چھوڑا ۴۷؎ لیکن ہمیں ساقی نامہ۔ چند قطعات، اور ایک مختصر سی مثنوی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

ساقی نامہ اور مے خانہ: صاحبِ مے خانہ نے، مولانا کے ساقی نامے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت چند باتیں عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے، مے خانہ میں ہے۔

"ساقی نامہ کہ در بحر مثنوی گفت، چنداں رنگ و بو نہ دارد۔"۴۸؎

پھر اس کے صرف تین شعر نقل کئے ہیں جو یقیناً ساقی نامہ کے بہترین شعر نہیں ہیں۔

معلوم نہیں۔ "رنگ و بو" سے صاحب مے خانہ کی مراد کیا ہے، لیکن جس ساقی نامہ کے سوا سو شعر مآثر رحیمی میں موجود ہیں، ان کو رنگ و بو سے بے بہرہ قرار دینا، یقیناً محل تعجب ہے۔ ہم نے یہ نادر نظم آیندہ صفحات میں نقل کر دی ہے یہاں اس پر مفصل نقد و بحث کا موقعہ نہیں ہے، اور نہ دوسرے ساقی ناموں سے اس کا مقابلہ منظور ہے، لیکن میں اہلِ ذوق کے سامنے اس میں سے مختلف اشعار پیش کرتا ہوں وہ خود اندازہ فرمالیں گے کہ صاحب مے خانہ نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کی وقعت کیا ہے، ساقی کو مخاطب کر کے مولانا فرماتے ہیں:

بہ دریوزہ گر در بدر گشتہ ام
ہم آخر بہ سوئے تو برگشتہ ام
بلندی و پستی ناساز تست
بم وزیر ہر نغمہ آواز تست

نباید چو بار آتش انگیختن
گرفتن نخست انگھی ریختن
بنہ آفتابے بہر سایۂ
جہان راز نو بخش پیرایۂ

پھر لکھتے ہیں:

بیا ساقیا کار از دست شد
دلے بود در قعرِ غم پست شد
فسونِ زتو باید انگیختن
براو خون ہر جادوئے ریختن
بیاتا بہ مستی نوائے زنیم
جہاں را بشادی صلائے زنیم

بہ شمعی زنو خانہ روشن کنیم
شب و روز را دود روزن کنیم
بہ من دہ کہ بس تیرہ دادم شبے
کشایم مگر دیدہ یا لبے
بیا ساقی آں طفل پوشید مشت
کہ دایہ چو برید نافش بکشت
بدہ تابہ خاکش سپارم زخوں
کہ دارم بہ دل نیز خاکی دروں

آخر میں خان خاناں کا ذکر آیا ہے:

بہ من دہ کز لو علم خود نوکنم
زمیں بوس درگاہِ خسرو کنم
برآور کہ بینم بروئے کسے
کز و تا خرد فرق نبود بسے
بیا ساقی آں چشمہ سلسبیل
بکن در رہ خان خاناں سبیل

بیا بر درِ میرزا خاں رویم
بہ دریوزۂ آبِ حیواں رویم
رخے راکہ آبش نماندہ زبیم
بمالیم درپائے عبدالرحیم

بہ شکرانہ صاحبِ روزگار
جہاں را بیارا چوروئے نگار

ساقی نامہ کی خصوصیات عام طور پر یہی سمجھی گئی ہیں کہ اشعار میں جوش ہو، کیف و مستی ہر شعر سے ٹپکے، بیان میں روانی ہو، الفاظ میں کیف و مستی کی مناسبت پیش نظر

رکھی جائے، معنی آفرینی بھی ہو، لیکن اس طرح نہیں کہ دماغ کو شعر کی تہہ تک پہنچنے میں کاوش اُٹھانی پڑے، یہ تمام خصوصیات مولانا کے ساقی نامہ میں نمایاں ہیں اور اس موضوع پر دوسرے شاعروں کے کلام سے وہ اگر بلند تر نہیں تو فروتر بھی نہیں ہے۔

خان خاناں کی مدح میں جو شعر کہے ہیں، وہ ویسے نہیں، جیسے درباری ملازم بہ سلسلۂ ملازمت اپنے آقا اور ولی نعمت کی مدح میں رسماً کہتے ہیں، مولانا کی مدح میں خان خاناں کے ساتھ دلی لگاؤ اور قلبی محبت موجزن نظر آتی ہے، اسے پڑھتے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ایک ملازم حق خدمت بجا لا رہا ہے بلکہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ آقا کے حسنِ سلوک اور قدر شناسی کے باعث دل میں محبت و عقیدت کی جو لہریں بے اختیار اُٹھ رہی تھیں، وہ خود بخود لفظوں کا جامہ پہن کر شعر کی صورت میں جلوہ گر ہوگئی ہیں۔

معاصرین: مولانا عمر بھر خانِ خاناں جیسے مربی علم و ادب کے دامن سے وابستہ رہے، پھر شاہ جہاں جیسے خوش ذوق شاہنشاہ کا دربار انہیں نصیب ہوا، یہ وہ زمانہ تھا، جس میں ہندوستان کا پایہ علم و ادب آسمان پر جا پہنچا تھا، اور ہر صنف علم کے بہترین باکمال یہاں موجود تھے، لہذا یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کہ مولانا کا ربط و ضبط کن لوگوں سے تھا، اور ان کی زندگی کیسے ماحول میں گزری، صرف بڑے شاعروں کو لے لیا جائے تو، نظیری نیشاپوری، شکیبی، اصفہانی، یولقلی بیگ انیسیؔ، فارسی کے ان بلند مرتبت شعرا میں سے ہیں، جن کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے، ان سب کو مولانا کے ساتھ دلی محبت و عقیدت تھی اور یقینی ہے کہ ان کی زندگی کے بیش تر لوقات انہیں کی مجلسوں اور صحبتوں میں بسر ہوتے ہوں گے۔

مولانا غوثی نے گلزار ابرار میں بہ ضمن حالات شکیبی لکھا ہے کہ:۔

> ”سن ۱۰۰۴ھ میں خانِ خاناں نے دکھن پر یورش کی تو نظیری نیشاپوری یولقلی بیگ انیسیؔ، مولانا محب علی سندھی، شریف کاشی، مُلا کامل سبزواری، مُلا بقائی اور دوسرے اہل سخن اکٹھے مانڈو سے گزرے، جو راقم کا غریب خانہ ہے، ان کے ساتھ غائبانہ شناسائی تو پہلے تھی، اب شناسائی نے ظاہر کا جامہ پہنا اور باہم محبت

و ربط بڑھا۔۴۹

اس بیان سے مولانا کے چند رفیقوں کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، جس بزرگ کے شب و روز ایسے ارباب علم و فضل کے ساتھ یک جا گزرتے ہوں، اس کے مقام و مرتبہ کے متعلق اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اشعار: جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مآثر رحیمی میں مولانا کے بہت کم اشعار نقل ہوئے ہیں، لیکن ان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ بڑے کہنہ مشق استاد تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے کتنی چیزیں صرف شعر میں یادگار چھوڑیں، لیکن ہمارے لیے، اس کے سوا چارہ نہیں کہ فی الحال مآثر رحیمی اور چند دوسری کتابوں میں نقل کردہ اشعار پر قناعت کریں۔

ساقی نامہ

دلا صبح شد آفتابے برآر
بہ نیلو فری جام آبے درآر

بہ چشم سبو تلخ کن خواب را
بہ بیداریٔ جام دہ آب را

بداں زخم تازہ رہ خوں مبند
کنوں پنبہ برداغ دارو گزند۔۵۰

بدست آر آں صبح روشن ضمیر
ازاں مرغ بے پر برآور صفیر

بدفعِ فراقش زبہتاں مگوئے
کہ خونِ کسے ریخت با آب روئے

بیار از لبِ شیشہ عیسیٰ دمے
گل از عطسۂ غنچہ کن مریمے

درگنج کن روزنِ شیشہ را
گہر ریز در دامن اندیشہ را

چہ شیشہ سپہرے سر افراختہ
سحا بے در و برق بہ گداختہ

بر آور چو مہ نقشِ مہر از جبیں
عقیقی ترا ز حلقہ بے نگین

زمے دہ بہ مستی سر انجام را
بگل بخش خمیازۂ جام را

بہ افسوں ببر خواب چشم پری
نگینِ دگر زن بہ انگشتری

تو ساقی آئینہ درپیش نہ
بیا دیدہ برجادۂ خویش نہ

صراحی دمِ عیسیٰ اندر دہن
بلبلی کشادہ زباں در سخن

منم با توں چوں نور با آفتاب　　ز تومی نیارم شدن درحجاب
بدر یوزہ گر در بدر گشتہ ام　　ہم آخر بسوئے تو برگشتہ ام
بلندی و پستی ما ساز تست　　بم و زیر ہر نغمہ آواز تست
تہہ جرعۂ ریختہ درسبو　　ازیں گل چو خورواستان رنگ و بو
نہ باید چو باد آتش انگیختن　　گرفتن نخست آنگہی ریختن
بنہ آفتابے بہر سایۂ　　جہاں را ز نوبخش پیرایۂ
بیک دام دہ رشتۂ مہر و ماہ　　بریز آب ایں چشمۂ ہفت چاہ
جہاں نقشِ آئینۂ بیش نیست　　نمودی گرش ہست از خویش نیست
توزیں نقش آئینہ فرزا نہ خوئے　　چو دیوانہ باخویش در گفتگوئے
غبارے کہ بینی دریں تیرہ دشت　　گریوست در رہ گہ باز گشت۵۱ ؎

یکے عکس خورشید درآب دید　　رواں برسرش دام ماہی کشید۵۲ ؎
چواز جنبشِ آب درہم شکست　　بغواصی آمد کش آرو بدست۵۳ ؎
فرو رفت ناگہ بکام نہنگ　　ترا زوئے مارا ہمین است سنگ۵۴ ؎
کجا گنج دیدم کہ مادم نہ خورد　　کجا دانہ چیدم کہ دامم نہ برد
گستہ عنانم دریں دشت دور　　چو بانگِ جرس کردہ ہر مو عبور
بہ منزل کجا زیں بیابان رسم　　کہ گیرم زسرچوں بہ پایاں رسم
جنوں را دگر کار بالا گرفت　　خرد را چو زنجیر دریا گرفت
صراحی گلوگیر زد خندۂ　　کجا نوحہ دارد سر افگندۂ
کجا اشک چشمے برانگخت گرد　　کہ مے در جگر کار الماس کرد
بہ جوش آمد ازہر سبوئے خسے　　نیامد زمے خانہ ماکسے۵۵ ؎
صراحی دمِ عیسیٰ اندد دھن　　چو طفلے کہ دارد زباں درسخن۵۶ ؎
نہ بینم کسے را دریں طرف جوئے　　کہ بگذشت ناریختہ آب جوئے
چنیں کا سیا نقش پائے خود است　　ہما نامیٔ کار رواں گم شداست
بیاتا برانیم کشتی بہ جہد　　کہ ترسم زگر داب ہیئیم مہد
بیا ساقیا کار از دست شد　　دلے بود درکار غم پست شد

فسوں نے زتو باید انگیختن   بر او خون ہر جادوئے ریختن
بیاتا بہ مستی نوائے زنیم   جہاں را بہ شادی صلائے زنیم
گہ از جادوئے شیشہ دل خوش کنیم   گہے جام رالعل آتش کنیم
گہ از خطِ ساغر بغوائے دل   نویسم برِ خون شیشہ سجل
بہ شمعے زنوخانہ روشن کنیم   شب و روز را دودِ روزن کنیم
بہ رنگین می و نغمۂ ہم چو آب   کشائیم خوں از رگِ آفتاب
مئے کش قلم برخطِ ساغراست   بہ مستی زآتش قوی دل تراست
چہ ساغر زعلم ابد دفترے   جہاں را ز پرکار او مسطرے
بیا سوئے مے خانہ ام رہنمائے   کزیں در بہ انجم فرو رفت پائے
دلم را بہ اندیشۂ غم مگیر   چہ دل گفتن از غم بود ناگزیر
بیا ساقی آں اصل ہستی بیار   گلِ عشرت و برگ مستی بیار
نہ ترسم زغم گرچہ غم آتش است   کہ دانم بلندی زپستی خوش است
غم آساں کند کار غم دیدہ را   چراغے نباید بشب دیدہ را
بیا ساقی آں ساغرِ پر زمئے   تہی کن دماغم زسودائے نے
کہ چوں نے جدا ازبُن و بارِ خویش   بنالم کہ دارم دل و سینہ ریش
بدہ ساقی آں مئے برآواز رود   کہ بر مستیٔ دوش خواہم فزود
مغنی بیا کشف ایں راز کن   برویم در معرفت بازکن
اگر شرط ایں پردہ خاموشی است   کزودہ کہ یادم فراموشی است
بیا ساقی آں جام چوں آفتاب   فروزندۂ صبح عہد شباب
بہ من دہ کہ بس تیرہ دارم شبے   کشائیم مگر دیدۂ یا لبے
بیا ساقی آں طفل پوشیدہ مشت   کہ دایہ جو برید نافش بجشت
بدہ تابخاکش سپارم زخون   کہ دارم بدل نیز خاکے دروں
بیا ساقی آں کبک آتش زباں   کہ منقار طوطیش رست ازدہاں
برآور کہ گر دو ہم آوازِ من   مرا باز دارد ز پروازِ من
بیا ساقی آں سلک نادر دہ تاب   کہ نورش تند پر دہ بر آفتاب

به من ده که تا برکشایم کمند   بگیرم بدو ایں حصارِ بلند
بیا ساقی آں گوہرِ پاک را   که از جرعه دریا کند خاک را
بر افشاں بخاکِ جگر تشنگاں   بر افروز شاں مغز در استخواں
بیاساقی آں لعبتِ سیم بر   که بر سیم پیرایه بسته ز زر
به من ده که گر چرخ بازی گراست   مراہم زتو بازئے در سراست
بریشم دوتا رشته را تاب ده   وزاں تابِ ابریشمیں آب ده
چناں نغمۂ زہره را ده تری   که رنگینی کند طیلساں مشتری
مغنی نوائے تو دل راشناست   که قانونِ تو نسخۂ ہر دو است
چه نسخه که نه نوشت حرفے درو   ہمه تار بینی چو مسطر براد
که انگشت بر حرفِ مردم خطاست   نه انگشت بر مسطر آخر رواست
بیاساقی آں مئے که جاں خاک اوست   جہاں جرعۂ جام نمناک اوست
به من ده کز او عمر خود نوکنم   زمیں بوس درگاه خسروکنم
بر آور که بینم بردے کسے   کزو تا خرد فرق نه بود بسے
بیا ساقی آں چشمۂ سلسبیل   بکن در رہِ خان خاناں سبیل
که چوں ہر کسی را سحابے رسد   منِ تشنه رانیز آبے رسد
مغنی نه مرغِ زباں بستۂ   نوائے بزن گرچه دل خستۂ
بیا بردرِ میرزا خاں ردیم   به دریوزۂ آب حیواں رویم
رخے راکه آبش نمانده زبیم   بمالیم در پائے عبدالرحیم
بیا سا قیا بربرِ کارِ خویش   که زیبد ہمه نخل را بار خویش
به شکرانه صاحبِ روزگار   جہاں را بیار را اچو روئے نگار
خدیوے که تا تیغ در دست اوست   سرِ آسماں چوں زمیں پست اوست
کجا اقدرش سایه بر آفتاب   گرفت از سیاہیٔ دیده حساب
کے اندیشه در بارگاہش شتافت   که در دل زوسعت دگر راه یافت
بہرگام در ره چو نقشِ قدم   که جز موکبش کاشت تخمِ کرم
نظر گرچه پرکارگر دنده است   زقدرش چو نقطه سر افگنده است

نگینش چو نقشِ بر انگیختہ | دو عالم زیک حلقہ آویختہ
بہ خطش چو آئینہ ہائے خیال | در آئینہ ہر شخص ماند مثال
گہ رزم تیرِ عدوش از سپر | شود رو چو ز آئینہ خطِ نظر ۵۷
اگر خصم راہست سنگین حصار | بود آہن تیغ تو آب دار ۵۸
بروں آردش ہم چو آتش ز سنگ | بیک قطرہ آبش کشد بے درنگ
زماں جنبشے از سمندش بود | فلک گنبدی از کمندش بود
برابر بدورش غنی بافقیر | چو اقطاع سطحِ خطِ مستدیر
زتیغش برو آب اگر زنگ را | کشد آتش خفتہ درسنگ را
ابا نیک عہدی کزانگشت خویش | دھی ماہ نورا درستی بہ پیش
اگر شش جہت پایۂ تخت تست | دگر نہ فلک سایۂ بخت تست
بریں پایہ چوں پا نہد ہر کسے | دراں سایہ چوں جاکند ہر خسے
جہاں را چو پرکار درگیر و دار | ہم اندر میانی و ہم برکنار
چو آہن ز تیغ تو افراخت سر | نہ زنجیر پاگشت نے قفل در
ز تیغ تو در بحر اشک سحاب | چو درکاں بود خندۂ آفتاب
کجا گرد برخاست از راہ تو | کہ نہ نشست بر راہِ بدخواہ تو
عدوگربود کوہ آہن چو میغ | بہ ریزد زہم چوں کشی برق تیغ
کہ جز تو سر خصم بشگافتہ | جہاں زیر پے کارِ خود یافتہ
زبس تیر تو خصم سو فارتن | ببر کردہ پیراہن پرشکن
کشادِ جہاں چشم بر چشم تست | نگاہِ عدو بند در خشم تست
برہ گرچہ اندیشہ آساں رود | پے عزمت افتان و خیزاں رود
برہ گر نظر سوئے پا افگنی | شود نقشِ پا دیدہ از روشنی
مکش درد سر زانچہ بے داغ تست | کہ ایں شش جہت نرگس باغِ تست
تہی باد ایں نرگسِ پر زخار | در و خصم را سر چو نرگس نگار
تو برپشت فیلاں بہ تختِ عاج | کہ خصم ترا پائے پیل است تاج
نگاہم کہ افتادہ بر پشتِ پا | شد از استواری عہدت عصا

مگر استواری عہد تو یافت که کلکم چنیں رشتہ از آب تافت
اگرچہ کشیدم دریں رشتہ دُر چناں کز دو دنم بروں گشت پُر
ولے نزد رائے تو بروم چناں کہ قطرہ بہ دریا و گوہر بکاں
فراخی نہ دیدم بہ سفتِ گہر کہ آں رشتہ را بود باریک سر
خرد پرورا در چنیں داوری مرا باد ز انصاف تو یاوری
جہاں نغز گو گرچہ دارد بسے نہ بیند زمن نغز گو تر کسے
نہ ہر جا سبوے شرابے وہادست نہ ہر رخنہ آفتابے در اوست
کند کلکِ من غیب را رہبری تواں دیدنش چوں نگارم پری ۵۹؎
بہ من تہمتِ نظم گوہر منہ بود گوہر از رشتۂ من گرہ ۶۰؎
برستہ درخت من از استخواں کہ دریائے او با وہ جوئے ہماں
نہ بر ہیچ کس منتے می نہم نہ بر خویشتن تہمتے می نہم
بود صیرفی نقد ہر کوئے را سخن گر شناسد سخن گوئے را ۶۱؎

عمل صالح میں مندرجہ ذیل دو شعر ساقی نامہ کے اشعار کے ساتھ درج ہیں، لیکن رحیمی اور مجموعہ دلکشا میں یہ دونوں شعر ساقی نامہ میں نہیں آئے، مقالات شعرا میں بھی یہ شعر درج ہیں۔

کلوخِ دو بالائے ہم چیدۂ
بروخانماں گفتہ پیچیدۂ

غمے چند برگر دنِ دل سوار
تو نامش کنی خانۂ روزگار ۶۲؎

قطعه

سرورا بندہ را بدل زاریست   کہ ہم ازدل بدل دروں آید
ہیچ گہ برزباں نمی آید   کہ نہ از دیدہ جوئے خوں آید
راز گفتن زدل سزد نہ زلب   کہ ازاں وحی وزیں فسوں آید
اے بر درگہ تو آید راست   ہر کرانجت رہ نموں آید
کرست عکس سایلے داند   ہر کجا سایۂ دروں آید
نہ یکے بودم آں زماں چیدم   دانہ ام کز زمیں بروں آید
عدوم چوں فرد ونیست عجب   قسمتم نیز اگر فزوں آید
تاہی ز آرزوئے تو برِتو   آرزو پیشہ را فسوں آید
آرزویت ہمہ بر آمدہ باد   پیش از آں کت بدل دروں آید ۶۳؎

قطعہ

اے بہ جہان بر سروخرو بردان در   سرز تو با افسر و خرد ز تو پرکار
گرد و جہاں ست از رہت چودو سنگ است   چیدہ بیک دست و برگرفتہ بیک بار
خاک ز تیغت چو باد ازہمہ سودر   باوز حفظت چو خاک تن ہمہ دیوار
دوریم از تست ہم دورے مرکز   از خط پرکار از وبزرگی برکار ۶۴؎

اے من تو من نہ من توگشتہ نہ تو من   اے من باتو بسان سلوئی با من
اے من بتو چوں منِ ترا زد ہمراہ   یک من چو کشی بخش بنا چار دو من

بادے نہ وز دبہ ہیچ سوئے   کز من نبرد دلے بہ بوئے
چوں آئینہ خلوتیست مارا   نابستہ درے بہ ہیچ روئے ۶۵؎

ما از ازل چو جام بقا نوش کردہ ایم | جامے فنائے خویش فراموش کردہ ایم
تا گشتہ ایم در رہِ الفقر مستقیم | تمت شدیم ویار در آغوش کردہ ایم٦٦؎

یہ شعر مقالات الشعراء میں درج ہے۔

چوں آئینہ ہست ہمہ چیز و لیکن | زاں ہر چہ بہ پرسی ہمہ راہیچ جوابست ٦٧؎

مثنوی

یہ مثنوی تصوف کے حقائق پر خان خاناں کو مخاطب کر کے لکھی ہے :۔

سرافرازا خدیوا شہہ نوازا | کریما کار سازا بے نیازا
فلک آبیست کز حکمت رواں است | جہاں باغیست کز بخت جواں است
بہ من کن گوش کزمہ تابہ ماہی | ہمہ رازِ جہاں گویم کماہی
در قبا پارہ کن از کہنہ تانو | ازیں پژ مردہ حرف تازہ بشنو
زہستی جنبشِ اول نمود است | کہ آں را نام دراستا و جود است
نمودِ ہستی ازمستیت تکرار | چو در آئینہ عکسِ روئے دلدار
بذاتِ بحت چوں گردو معبّر | زعکسش عقل آید در برابر
فروغ عقل نفس آمد دریں دور | ظہورِ نفس جسم آمد علی الفور
نظر تا بر فروغِ ذات بحت است | جہاں عاری زعار فوق و تحت است
مراتب چوں شود یک یک پدیدار | بسایط باشدت ازوے نمودار
چوں آں جملہ بہم درجلوہ آیند | مرکّب را درے بر رخ کشایند
از ایشاں ذاتِ انساں غایت آمد | کہ او از بہر فہم آیت آمد
کمالش در محمد گشت ظاہر | کز اول تا بہ آخر اوست حاشر
چو شرعِ او موافق شد بایجاد | شرایع شد ز شرعش جملہ برباد
چو از مہری شود ظاہر حقیقت | بر افتد پردہ برخیز و شریعت
قیامت گردد و آید نمودہ | کہ ہرکس راچہ استعداد بودہ

درین انموذج اسرار است پنہاں　　کہ کشفِ اونگر دو جز بقرآں
درین معنی سخن بسیار دارم　　اگر فرصت بود از روزگارم
بنامِ تو کنم دیباچۂ ساز　　نمایم دروے ازہر گوہرے راز
مراچوں شد جوانی بردر تو　　نخو اہم شد بہ پیری از برتو
مرا اکنوں ازیں دریا گریز است　　کہ پیری حلقہ در را نظیر است
چو خاکِ ایں درآید آبرویم　　عجب گر از درِ دیگر بجویم
الاہی تازمین و آسماں ست　　ترا بازو از زمیں برآسماں دست
ہمیشہ تا بہار است و خزاں است　　ہمیشہ تاگل است و گلستاں است
ہمیں تاہست از ہستی نشانہ　　جہاں بادا بکامت جاودانہ ٦٨—

قصیدہ

چو گل کشایم وچوں مل بہ بندم از ہر تنگ　　درامید بہ باد وور شکیب بہ سنگ
چناں کہ آب بجوئے درآید از جوئے　　کنم بسوئے غمے از غم وگر آہنگ
گہے بروں وہم از سینہ غم چو آتشِ دود　　گہے فرد برم اندہ بدل چو آہی زنگ
چو آب چاہم و بر سر نیا ہیم غوغا　　چو خاک راہم و بررخ نہ ہیلم آژنگ
ہے بکامم ہردم چو بادِ بردہ بوی　　ہے بریزم از ہم چو آب دیدہ رنگ
جز آبِ تیغ تو دبادِ تیر توکہ کند　　دل گو زناں خون و پر کلنگان رنگ
کہ دید آب کہ ماند ہے زشیر ونبات　　کہ دید بار کہ ماند ہے زباز چنگ
سخن پناہا بروے گندم منگر　　چو بر فراز برآید برہ رو است درنگ
زکار ماند بفکرِ دقیق خود طبعم　　زرہ فتاد بپائے زیاد خود خرچنگ
رہست پیشتراں راکہ پیش تر منزل　　غم است پیشتراں راکہ پیش تر فرہنگ
جہاں زجائے خودار برپروسزد کہ شد است　　زمیں چو پشت قدر وو ہوا چو پر کلنگ
سزد چو خشم فرد خوردہ باز پس گردد　　زمنع تو نفس شعلہ در گلوئے تفنگ ٦٩—
دراں زماں کہ زنعل ستور و تیغ شود　　زمین چو پیکر ماہی ہوا چو کام نہنگ
فلک زگرد چو چشمی شود پر از سرمہ　　ہوا ز تیر چو روئے شود پر از آژنگ
بر آفتابِ دگر تیغ بر نہد پرکار　　بر آسماں دگر گرد بر زندہ بیرنگ ٧٠—

قصیده

هم چو شاخِ گل از نسیم بہار — دست درکار دار و دل با یار
نیمۂ گردِ خویش گرد کہ ہست — نیمۂ دیگر از تو چوں پرکار
شو چو سایہ بہر دو سوئے رواں — کن چو دریا بہر دو روئے گذار
نہ کلہ وہ زدست نہ کلہ را — باش بر سر چو گل بپا چوں خار
کام بردار تانگردد شب — لیک آہستہ تانیفتد بار
گر جہاں سخت وست پیش آرد — ایں ہمہ سنگ گیرو آب انگار
آب را جوئے شو کزوت شود — راغ پر سبزہ باغ پر گلزار
سنگ دربار نہ کزدت رسد — دُر بہ مقدار خویش و زر بہ عیار
از غمِ دہر روئے دل برتاب — وزرہِ باد شمع خود بردار
بجہ از دام خود یکے چوں دور — پر از دست خود یکے چوشرار
آہن گرم وار و آتشِ نرم — تانہ از کار مانے دنہ زدار
خوف آں حاملہ مباش ز حرص — کشِ ہمہ باشکم بود سروکار
دل بصورت مدہ کہ کس نشود — غنی از نقشِ درہم و دینار
صورت و معنی اربہم بودی — گنج طاؤس را نشستی مار
دست خودرا بہ باد بند چو گل — پائے خود استوار دار چو خار
چہ نشینی چو روزن و سایہ — چشم بر راہ و پشت بر دیوار
رہ ز دیوار کن بہ ہمت سعی — نقب از گنبد رواں بردار
کہ زنقب و کمند بہ نبود — جادہ درہ شجاع را بحصار
چوں جرس لب بہ بندو ازدل پرس — خانۂ عشق و راہِ یار و دیار
عشق را خانۂ ایست برسردار — نہ درش بستہ نہ کسے رابار اے —
کس ازاں خانہ رہ نبردہ بدر — وز درش نیز کس نہ رفتہ بدار
چوں شبِ ہجر و خلوتِ شب دوصل — جادر و تنگ و رہ در و دشوار

همچوں کان اندروچہ سنگ وچہ لعل — ہمچو شاخ اندروچہ برگ وچہ بار
چشم چوں سایہ آتشِ خورشید — روکشادہ چو روزنش دیوار
خیرو شرز و چو پیش و پس در رہ — نیک و بد زوچہ زیر و بم در تار
ماندہ چوں آفتاب و چوں سایہ — شادی و غم درو بیک ہنجار
ساکا نش چو جاہ خانہ نشیں — ساکناںش چو ماہ خانہ گذار ۲۷ ـ
دشت پیما چو گریۂ ماتم — تنگ میداں چو خندۂ بیمار
ہنر آں جا چو باد بے قیمت — خرد آں جا چو خاک بے مقدار
بردمِ تیغ رہ روش را راہ — بہ لبِ خویش تشنہ اش راکار
سختیش سنگ را گستہ زمام — زمیش ابر را کشیدہ مہار
فکر ہا را دریدہ او دفتر — راز ہارا کشودہ او طومار
ہمہ چیزے ازو نمود چناں — کہ ز آب وز آئینہ رخ یار
ز آب شعرم چناں نماید نیز — چہرۂ مدحتِ سپہ سالار
خانِ خاناں کہ زابر احسانش — سایۂ بے دھن گل آرد بار
ساقی بزم او ز موجِ قدح — بردد دیدہ بہشت کردہ نگار
داعی رزم اوزہولِ غریو — از عظام رمیم بردہ قرار
خامہ اش را کہ مرغ بے بال است — دوہماں چوں دورلنہ درمنقار
خاتمِ او کہ چشمِ بے خواب است — بخت دولت ہمی کند بیدار
آسمانیست آفتاب . نشاں — آفتابیست آسماں کردار
کوہ را عزم او چو بردارد — جنبید بجاش تیرہ غبار
بادرا حلمش ار نگہ دارد — بازمانہ چو کردہ از رفتار
خلق راپادشاست در ہر حکم — شاہ را پیشوا ست در ہرکار
بس کہ بیند ہنر ازو ماند — روز پیکارش آسماں بے کار
اے بنامِ تو چرخ را منشور — وے زرائے تو عقل را معیار
عقل را بریمیں تست یمیں — خلق را بر یسار تست یسار

آسماں کام و نام تو جستہ — از ثوابت گرفتہ تاسیار
برعدو بندِ تست بستہ گراں — بہ گرانی رنج بر بیمار
بر فلک امرو نہی تست رواں — بہ روانیٔ آب در گلزار
اے بہ چشم تو بوستاں را چشم — اے بکارِ تو آسماں را کار
دستش از حل و عقد دہر ستود — خصمت از غل حقد تو بیمار
تاجہان ست و در جہاں شادیست — شاد باش و جہاں بعیش گذار
بہمہ عیش راندہ از دنیا — طپدت رنج دیدۂ بیمار

محمد صالح کنبوہ نے "نظم" کے عنوان سے (۳۶۹ / ۳) پانچ شعر نقل کیے ہیں، ان میں تین شعر مندرجۂ بالا قصیدہ میں آگئے ہیں، باقی دو شعر مآثر رحیمی میں نہیں ہیں، وہ شعر یہ ہیں :-

مست بنیاں جو گریۂ ماتم — تنگ میداں چو خندۂ بیمار
نہ دراں مے نہ جام مستانش — بے خبر گشتہ از سرو دستار

حواشی :

۱۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۲۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۳۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۷
۴۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۸۹۔
۵۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۵۔
۶۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۷۔
۷۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۸۔ عمل صالح جلد ۲، ص ۳۶۸۔
۹۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۸۹۔۴۹۰۔
۱۰۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۔
۱۱۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۱۔

۱۲۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۱۔
۱۳۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۶۹۔
۱۴۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۲۔
۱۵۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۲۔۴۹۳۔
۱۶۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۳۔
۱۷۔ مآثر رحیمی جلد ۳، ص ۶۹۔
۱۸۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۱۹۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۰۔
۲۰۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۲۱۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۸۔
۲۲۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۶۔
۲۳۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۸۔
۲۴۔ مآثر رحیمی،
۲۵۔ مآثرالامرا، جلد ۲۔
۲۶۔ مآثر رحیمی جلد ۳، ص ۴۹۲۔
۲۷۔ مے خانہ عبدالنبی لاہور، ص ۴۹۸۔
۲۸۔ مے خانہ عبدالنبی لاہور، ص ۴۹۸۔
۲۹۔ تحفۃ الکرام مطبوعہ ص ۲۴۲، جلد ۳
۳۰۔ بادشاہ نامہ، جلد ۲، ص ۲۷۸
۳۱۔ تحفۃ الکرام مطبوعہ جلد ۳، ص ۱۴۹
۳۲۔ بادشاہ نامہ جلد ۱، ص ۳۳۶
۳۳۔ عمل صالح جلد ۳، ص ۳۶۸
۳۴۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۰
۳۵۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۴
۳۶۔ ماثر رحیمی، جلد ۲، ص ۶۳۴
۳۷۔ ماثر رحیمی، جلد ۲، ص ۵۸۸
۳۸۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۳۔۴۹۴۔
۳۹۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۰۔
۴۰۔ بادشاہ نامہ، جلد ۱، ص ۳۳۵۔
۴۱۔ مقالات الشعرا مصنفہ میر علی شیر قانع ٹھٹوی قلمی، ص ۲۵۸۔
۴۲۔ تحفۃ الکرام، مصنفہ میر علی شیر قانع، مطبوعہ بمبئی، جلد ۳، ص ۲۴۲۔

۴۳۔ ماثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۰۔

۴۴۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۸۔

۴۵۔ صبح گلشن، ص ۳۰۷۔

۴۶۔ مے خانہ، ص ۴۹۸۔

۴۷۔ مے خانہ بحوالہ سفینہ، تعلیقات، ص ۸۵۔

۴۸۔ مے خانہ، ص ۴۹۸۔

۴۹۔ ترجمہ اردو گلزار ابرار مولانا غوثی، بنام اذکار ابرار، ص ۶۰۰، وخزانہ عامرہ مطبوعہ، ص ۲۶۷۔

۵۰۔ یہ شعر مجموعۂ دلکشا میں نہیں ہے۔

۵۱۔ یہ شعر عمل صالح ۳۔ ص ۳۶۹ پر ہے۔

۵۲۔ و ۵۳ یہ شعر مقالات الشعرا قلمی، ص ۲۵۹ میں اور مے خانہ، ص ۴۹۸ میں نقل ہیں۔

۵۴۔ یہ شعر بھی مقالات الشعرا قلمی، ص ۲۵۹ اور مے خانہ ۴۹۸ میں نقل ہے۔

۵۵۔ یہ شعر مجموعہ دلکشا میں نہیں ہے۔

۵۶۔ یہ شعر مجموعہ دلکشا میں نہیں ہے۔

۵۷۔ یہ شعر مجموعہ دلکشا میں نہیں ہیں۔

۵۸۔ یہ شعر مجموعۂ دلکشا میں نہیں ہے۔

۵۹ و ۶۰۔ مجموعہ دلکشا میں یہ شعر نہیں۔

۶۱۔ ساقی نامہ، مآثر رحیمی میں درج ہے، مجموعہ دلکشا (قلمی) میں بھی درج ہے، لیکن اس میں نشان زدہ اشعار نہیں ہیں، اس کے علاوہ ساقی نامے کے مختلف شعر مقالات الشعرا (قلمی) مے خانہ اور عمل صالح میں بھی ہیں ہیں، اُن پر ہم نے نشان اور حوالہ دے دیا ہے۔

۶۲۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۲۹، مقالات الشعرا، ص ۲۵۹۔

۶۳۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۵۰۱۔

۶۴۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۵۱۶۔

۶۵۔ عمل صالح، جلد ۳، ص ۳۶۸۔

۶۶۔ مقالات الشعرا، ص ۲۵۹۔

۶۷۔ مقالات الشعرا، ص ۲۵۹۔

۶۸۔ مآثر رحیمی، جلد ۳، ص ۵۱۴ تا ۵۱۶۔

۶۹۔ یہ شعر صبح گلشن، ص ـــــ اور مقالات الشعرا میں بھی درج ہے۔

۷۰۔ یہ قصیدہ ماثر رحیمی، جلد ۳، ص ۴۹۹۔ ۵۰۰ پر درج ہے۔

۷۱۔ یہ شعر عمل صالح نے بھی نقل کیے ہیں۔ جلد ۳، ص ۳۶۹۔

۷۲۔ یہ شعر عمل صالح نے بھی نقل کیے ہیں۔ جلد ۳، ص ۳۶۹۔

ماخذ

کتاب	مصنف	جلد	مقام
(۱) مآثر رحیمی	ملا عبدالباقی نہاوندی	جلد ۲-۳	کلکتہ ۱۹۳۱ء
(۲) بادشاہ نامہ	ملا عبدالحمید لاہوری	جلد ۱	کلکتہ ۱۹۳۱ء
(۳) عمل صالح	محمد صالح کنبوہ لاہوری	جلد ۳	کلکتہ ۱۹۳۹ء
(۴) مقالات الشعرا	میر علی شیر قانع ٹھٹوی		قلمی کتب خانہ حسام الدین
(۵) تحفۃ الکرام	"	جلد ۳	بمبئی
(۶) تحفۃ الکرام	"	"	قلمی کتب خانہ حسام الدین
(۷) صبح گلشن	نواب علی حسن		بھوپال
(۸) خزانہ عامرہ	میر غلام علی آزاد بلگرامی		دکھن
(۹) میخانہ	عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی		لاہور ۱۹۲۶ء
(۱۰) گلزار ابرار	غوثی		آگرہ
(۱۱) مجموعۂ دلکشا	میر کرم علی خاں تالپور		قلمی کتب خانہ حسام الدین
(۱۲) سفینہ	خوشگو		بحوالۂ مے خانہ
(۱۳) مخزن الغرائب	سندیلوی		"

میر ابوالقاسم نمکین

اور

اُس کا خاندان

سکھر سے جب ہم روہڑی کی طرف چلتے ہیں تو ریلوے پُل کو عبور کرنے کے بعد ہمیں اپنی داہنی جانب دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا ٹیلا دکھائی دیتا ہے، جس میں ایک عمارت بنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چھت پر ہمیں دُور سے کچھ چھوٹے چھوٹے مینارے اور چند سنگین قبریں نظر آتی ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچتے ہیں تو منظر بہت ہی بھلا اور فضا نہایت ہی دل خوش کن معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف لینس ڈون برج ہے اور دوسری طرف سکھر بیراج کا لمبا پُل، ٹیلہ کے دامن سے ٹکراتا ہوا دریائے سندھ بہہ رہا ہے۔ اس کے درمیان میں شاد بیلہ کا خُوش نما اور سرسبز جزیرہ دیکھنے میں آئے گا۔ دریا کے کنارے سکھر کے شہر کا منظر اور ریلوے پُل کے قریب، بکھر کے پُرانے قلعہ کے آثار بھی دکھائی دیں گے۔ دریا کے اس پار، یعنی جس طرف آپ کھڑے ہیں، روہڑی کے قدیم شہر کا نظارہ آپ کے سامنے ہوگا۔ الغرض اس جگہ پر قدیم اور جدید تمدن کا آپ عجیب سا امتزاج پائیں گے۔

اس عمارت کے سلسلے میں آپ جب دریافت کریں گے تو آپ سے کہا جائے گا کہ "یہ ستیوں کا تھان"، یعنی سات کنواری لڑکیوں کا آستانہ ہے۔ لیکن در حقیقت یہ دورِ مغلیہ کے ایک نام

در سپہ سالار اور مشہور امیر اور اُس کے خاندان کا قبرستان ہے۔اس امیر کا نام ابوالقاسم خان نمکین ہے اور اس قبرستان کا نام "صفۂ صفا" تحریر ہے۔

اکبر سے لے کر فرخ سیر تک یہ خاندان برسرِ اقتدار رہا،اس کے افراد میں سے کئی امیر اور گورنر ہوئے اور کئی بزرگ صاحبِ نسبت، شاعر اور ادیب گزرے ہیں،اس دودمان عالی کے پس ماندہ آج بھی ٹھٹھہ میں "امیر خانی" سادات کی نسبت سے موجود ہیں۔

صفحاتِ ذیل میں اس خانوادہ کے منتشر حالات کو تاریخی صفحات سے سمیٹ کر،ایک ترتیب کے ساتھ ، تاریخی ذوق رکھنے والے حضرات کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تاکہ صاحب "صفۂ صفا" کی عظمت اور اس کے خاندان کے علمی اور عملی کارنامے صدیوں کے گردو غبار سے چھٹ کر ایک دفعہ پھر اپنی اصلی صورت میں نظر افروز ہوں۔

خاندان اور وطن : میر ابوالقاسم نمکین کے والد کا نام ملّا میر سبزواری تھا، موضع بیجک کے رہنے والے تھے، تحفۃ الکرام میں ہے :۔

"ملّا میر متولی درگاہ امام موسیٰ رضا بودہ ودر فترت اوزبک،از موضع بیجک من اعمال ہرات نقل کردہ در حدود قندھار در گزشتہ"(۱)۔

ذخیرۃ الخوانین اور مآثرالامراء میں میر ابوالقاسم کا تذکرہ آتا ہے، لیکن ان کے والد یا ان کے وطن کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔مآثر الامراء میں ہے :۔

"از سادات حسینی ہروی ست"(۲)۔

اسی طرح صاحبِ ذخیرۃ الخوانین نے صرف ایک ہی جملہ لکھا ہے :

"ہروی ست"(۳)۔

بلاخمن مترجم آئینِ اکبری نے اپنے انگریزی ترجمہ میں، جہاں ابوالقاسم کی سوانح تحریر کی، وہاں بھی اسی طرح کا ایک جملہ لکھ دیا ہے :۔

"میر ابوالقاسم ہرات کا سیّد تھا"(۴)۔

بلاخمن کا ماخذ مآثرالامراء ہے۔اس لیے کچھ زیادہ نہ لکھ سکا۔ہمیں اس سلسلے میں تحفۃ الکرام سے ہی تھوڑی سی مدد مل رہی ہے جیسا کہ اس کی مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوا،اس کے والد کا نام ملّا میر تھا،وہ ہرات کے ایک گاؤں بیجک کے رہنے والے تھے،امام موسیٰ رضا کا روضہ

تحویل میں تھا، ازبکوں کے فتنہ کی وجہ سے وطن چھوڑا اور قندھار کے حدود میں آ کر سکونت اختیار کی، وہیں انتقال کیا، بقول ماآثر، وہ حسینی سید تھے۔

میر ابوالقاسم نمکین کی ابتدائی زندگی کے باب میں کچھ نہیں لکھا گیا، حدود قندھار میں آجانے کے بعد ہمیں ان کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ :۔

"ابتداء نوکر مرزا محمد حکیم بود" (۵)۔

اسی طرح ذخیرۃ الخوانین میں بھی یہی ایک فقرہ ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق موجود ہے۔

میرزا محمد حکیم (المتوفی سن ۹۹۳ھ) اکبر کے بھائی اور کابل کے والی تھے۔ غالباً میر نمکین نے قندھار میں بودوباش اختیار کرنے کے بعد مرزا کی ملازمت کرلی تھی۔ مرزا حکیم کی ملازمت چھوڑنے کے بعد میر نمکین، اکبر کے زمرۂ امرا میں منسلک ہوگیا، مآثرالامرا رقم طراز ہے کہ :۔

"بہ یاوری طالع در ملازماں عرش آشیانی انسلاک گرفت.... در بھیرہ و خوشاب جاگیر یافت" (۶)۔

نمکین کا لقب : آپ کی یہ جاگیر نمکسر پہاڑ کے قریب تھی، اس مناسبت کی وجہ سے آپ نے اکبر کے حضور میں :۔

"رکابی و پیالہ از نمک تیار کردہ پیش کش فرستاد بہ "نمکین" ملقب گردید" (۷)۔

میر نمکین نے نمکین پیالہ اور طشت (۸)، کو بادشاہ کے حضور میں پیش کر کے اپنی نمک حلالی کی تلمیح کی، اسی کے جواب میں ان کو "نمکین" کا خطاب دربار شاہی سے عطا ہوا، جو بعد میں ان کے نام کا جزو بن گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، میر نمکین، میرزا حکیم کی ملازمت سے نکل کر اکبری دربار میں پہنچ گئے اور جاتے ہی نمکسر کی جاگیر انعام میں پائی۔ دربار میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی، جیسا کہ صاحب مآثر نے لکھا ہے کہ "میر در پیش گاہ اکبری قرب و منزلت داشتے" (۹)۔

صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ میر کو دربارِ اکبری میں بہ مقام لاہور بازیابی حاصل ہوئی تھی :۔

"در لاہور ملازمت اکبر بادشاہ کردہ، چہار ہزار منصب یافت"(۱۰)۔

لیکن ابتدائی دور کے اس منصب کی اور کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی، معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی ملازمت میں میر نمکین سن ۹۸۰ھ سے پہلے داخل ہو گیا تھا، کیونکہ اکبر نامہ میں سب سے پہلے سن ۹۸۰ھ کے واقعات میں ان کا ذکر آیا ہے، صاحب اکبر نامہ لکھتا ہے کہ ۷ رجب سن ۹۸۰ھ، ۱۷ سال اکبری میں بادشاہ سلامت صوبہ احمد آباد میں رونق افروز ہوئے "وچوں موضع جوتانہ (چوریانہ) موردِ اعلام ظفر قرین شد، بہ تحقیق پیوست کہ مظفر گجراتی (کہ دست آویز تسلط گجراتیان بود) از شیر خان فولادی جُدا شدہ درین نواحے سراسیمہ می گردد۔"

یہ معلوم کر کے بادشاہ نے :-

"میر خان یساول و فرید قراول را فرستادند واز عقب آنہا ابوالقاسم نمکین و کرم علی را رخصت فرمودند کہ بہ تفحص نمودہ تن سر گردان بادیۂ حیرانی را بدرگاہ والا آورند، میر خان چون قدرے راہ آمد چتر و سائبان او بدست افتاد، میر ابوالقاسم و کرم علی کہ از عقب رسیدہ بودند گرفتہ پیشتر روان شدند..... آخر میر خاں او را کہ در غلہ زارے پنہاں شدہ بود بدست آوردہ بحضورِ اقدس آوردہ"(۱۱)۔

یہ پہلی اطلاع ہے جو اکبر نامہ کے ذریعہ میر نمکین اور اکبر کے سلسلے میں ہمیں ملتی ہے۔

داؤد خان کی مہم : سن ۹۸۲ھ مطابق سال ۱۹ جلوس اکبری میں پھر میر صاحب بنگالہ کے حاکم داؤد خان کے خلاف لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ داؤد کو شکست نصیب ہوئی اور وہ سات گام کی طرف بھاگا تو خان خاناں اور راجہ ٹوڈرمل انتظام بنگالہ کے سلسلے میں ٹانڈہ میں ٹھہر گئے اور :-

"چوں چارہ آسودگی عموم رعایائے آن دیار انتظام گرفت۔ اشتہار یافتہ کہ جنید کررانی (کہ از درگاہ والا فرار نمودہ بود) خاک ناکامی بر فرق روزگار خود ریختہ، مایوس از گجرات و دکھن بحدود جھارکنڈ آمدہ، در کمین فتنہ اندوزی و شرانگیزی ست۔"

یہ اطلاع پا کر :-

"راجہ ٹوڈرمل و ضیاء خان و نظر بہادر و ابوالقاسم نمکین و طائفہ از غازیان شہامت اندیشہ بہ دفع ایں شوریدہ بخت ہمت گماشتند۔"

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوالقاسم کی شخصیت فوجی نقطہ نگاہ سے اہم اور قابلِ ذکر ہو چکی تھی، ورنہ ابوالفضل جیسا آدمی دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ، ان کا نام نہ گنا تا بلکہ انہیں بھی "طائفہ از غازیان شہامت اندیشہ" کے زمرہ میں داخل کر دیتا، اس مہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ:

"بہ تائید آسمانی فرستادہا، مصدر خدمات شائستہ شدند و مخالفان دولت خایب و خاسر روے بدشت ادبار نہادند" (۱۲)۔

یعنی شکست کھا کر جنید کررانی پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ اس کے بعد دوبارہ:۔

"آگہی آمد کہ جنید از گوشۂ خمول بر آمدہ، شور افزاست، راجہ (ٹوڈر مل) بآئین کار دانان خدمت گزین روے ہمت بہ آں صوب آورد، و خود از جھاڑ کھنڈ پیش داؤد رفتہ بود کہ شاید باو نرد دغاباز دو دست آویز شورش بہم رساند، از خود سری و زیادہ طلبی صحبت او بر نیامدہ، را معاودت می سپرد، کہ آوازۂ لشکر منصور اورا در حیرت انداخت۔"

اس کے بعد واقعہ یوں ہوا:۔

"نظر بہادر خاں و ابوالقاسم نمکین و محمد خاں پسر سلطان آدم گکھر و امام قلی حولک و بھارامل کھتری و برخے از دلاوراں (کہ پیش پیش فوج نصرت اعتصام می رفتند) از معاملہ نافہمی دور تر شوند و لوازم ہوشمندی بہ تقدیم نہ رسید۔ جنید بر سر آنہا دتحت، مہر خاں و بھارامل چندے دیگر، مردانگی بجائے آوردہ جانفشانی نمودند..... چوں ایں خبر بہ راجہ ٹوڈر مل رسید بہ آئین ہوشمندی و طرز نبرد شناسانہ بہ تادیب آں مدبر رواں شد، جنید تاب مقاومت نیاوردہ بہ سرعت بجانب جھار کھنڈ گریخت و بہ عنایت روز افزوں ایزدی غبار فتنہ فرونشست" (۱۳)۔

خواجہ نظام الدین اس سلسلہ میں رقمطراز ہے:

"جاسوساں خبر آوردند کہ جنید ابن عم داؤد کہ میاں افغانان بہ شجاعت و مردانگی، علم روزگار بود، واز گجرات بہ بنگالہ آمدہ بود در حوالی رین کساری آمدہ میخواہد کہ بداؤد ملحق شود، راجہ ٹوڈر مل بہ صلاح واستصواب امرا، ابوالقاسم نمکین و نظر بہادر را بجنگ جنید فرستاد۔ ابوالقاسم و نظر بہادر مقابلہ اورا سہل پنداشتہ در جنگ احتیاط و حزم از دست دادند، واز پیش او گریختہ بے ناموسی بخود لاحق ساختند،...." (۱۴)۔

صاحب مآثر رحیمی بھی اس واقعہ کو لکھتا ہے :

"راجہ ٹوڈر مل بہ صلاح و استصواب امرا، امیر ابوالقاسم نمکین و نظر بہادر را بجنگ جنید فرستاد۔ ابوالقاسم نمکین و نظر بہادر مقابلہ او را سہل پنداشتہ در جنگ احتیاط و حزم از دست دادہ از پیش او گریختہ بے ناموسی بخود لاحق ساختند" (۱۵)۔

یہ دونوں مصنف بھی ابوالفضل کی طرح میر نمکین کا نام لے کر اس واقعہ کو لکھ رہے ہیں جس سے ان کی شخصیت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح ملّا عبدالقادر نے اس واقعہ کا ذکر میر صاحب کے نام کے ساتھ کیا ہے :

"دریں اثنا جنید..... در حوالی رین کساری آمدہ خواست کہ بداؤد ملحق شود۔ راجہ ٹوڈر مل میرزا ابوالقاسم کو حالا بہ کنیتے نمکین ملقب است، بہ اتفاق نظر بہادر بہ جنگ او فرستاد۔ ایشاں ہر دو در جنگ ہزیمت یافتہ و مہار گستہ نزد راجہ آمدہ....." (۱۶)۔

اسی سلسلے میں خان خانان کے ساتھ جو جرنیل تھے ان کی فہرست میں بھی مآثر رحیمی میں میر صاحب کا نام آیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں :۔

"قباخاں کنک، خان عالم، خواجہ عبداللہ، سیّد عبداللہ، مرزا علی اشرف خان میر منشی راجہ ٹوڈر مل، لشکر خاں، مظفر مغل، یار محمد ارغون، ابوالقاسم نمکین، شاہم خان جلایر، پاینده محمد خاں، قتلق قدم خاں، قمبر علی خاں توقبائی، سید شمس الدین بخاری" (۱۷)۔

جنید کے بعد پھر داؤد خاں : داؤد خاں بنگالی کا معاملہ ابھی درمیان میں تھا، وہ پہلی شکست کے بعد بھاگتا رہا اور شاہی لشکر اس کے پیچھے رہا۔ اسی درمیان میں اس کے عم زاد بھائی جنید سے جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر کار داؤد خاں نے ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کرنی چاہی۔ عظیم الشان لشکر جمع کیا بنگالہ اور اڑیسہ کے درمیان بہ مقام ہرپور ڈیرہ ڈال کر لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ شاہی لشکر بھی یلغار کرتا ہوا آپہنچا۔ طرفین میں ٹھن رہی (طبقات اکبری میں ٹانڈہ لکھا ہے۔ ج ۲، ص ۳۰۴) کے مقام پر خوں ریز جنگ ہوئی۔ ابوالفضل نے شاہی فوج کی تنظیم دکھاتے ہوئے ابوالقاسم نمکین کو "جرانغار" میں بر سرپیکار بتلایا ہے۔ لکھتا ہے کہ :۔

"و جرانغار بدیدہ وری و ثبات پائی اشرف خاں و راجہ ٹوڈر مل و مظفر مغل و یار محمد قرول و ابوالقاسم نمکین و چندے دیگر از مبارزان خدمت دوست منضبط شد" (۱۸)۔

صاحبِ طبقات اکبری ہمارے جرنیل کو "جرانغار" کی بجائے "برانغار" میں دکھاتا ہے۔ فہرست دیتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"برانغار۔ اشرف خاں میر منشی وراجہ ٹوڈرمل، لشکر خان، و مظفر خاں مغل ویار محمد ارغون و ابوالقاسم نمکین ودیگر مردان جنگی"(۱۹)۔

یہ جنگ نہایت ہولناک و قیامت خیز تھی۔ اس کی نسبت ملّا عبدالقادر نے لکھا :۔

"آن چناں جنگ عظیم افتاد کہ زبان قلم از کیفیت وکمیت آں قاصر باشد"(۲۰)۔

جنگ کا نتیجہ داؤد خاں کے مخالف نکلا، یعنی اسے شکست فاش نصیب ہوئی، شاہی لشکر کو یہ فتح جمعہ کے روز بتاریخ ۲۰ ذی القعدہ ۹۸۲ھ مطابق سال ۱۹ اکبری ہوئی(۲۱)۔

مرزا حکیم کی بغاوت : میر نمکین کے سلسلے میں ۹۸۲ھ سے لے کر سن ۹۸۹ھ تک صفحاتِ تاریخ خاموش نظر آتے ہیں۔ چھ سال کی طویل غیر حاضری کے بعد وہ پھر میرزا حکیم کی بغاوت کے سلسلے میں تاریخ کے صفحات پر سپاہیانہ انداز سے نمودار ہوتا ہے۔ میرزا حکیم ابھی تک کابل کا حاکم تھا۔ اکبر کے خلاف اس نے بغاوت شروع کی۔ بادشاہ نے اپنے شاہزادہ محمد مُراد کی سرکردگی میں اس کے خلاف ایک لشکر روانہ کیا اور حکم دیا :۔

"کہ ازاں آب عبور کردہ بہ آہستگی متوجہ ولایت پشاور گردد۔ اگر میرزا(حکیم) بیدار شدہ، راہ فرماں پذیری سُپرد، بگوناگوں نوازش امیدوار سازد، وگرنہ بہ کابلستان شتابد"(۲۲)۔

اس فوج کی ترتیب دکھاتے ہوئے ابوالفضل، ابوالقاسم کو "جرانغار" کے حصہ میں دکھاتا ہے، جرانغار کی فہرست یہ ہے :۔

"وسپہ آرائے جرانغار، بہ سیّد حامد بخاری و مخصوص خان وسیّد مہدی قاسم وابوالقاسم نمکین و عرب وسیّد حُسین و حسن قلی بیگ و عبداللہ بلوچ، و طائفہ زاد مردان نامور قراریافتہ"(۲۳)۔

طلائی زنجیر : داؤد خان بنگالی کی جنگ کے دوران میں میر ابوالقاسم کے گھر سے ایک طلائی زنجیر جو غالباً سرکاری ہاتھی کے سازوسامان کی تھی، نکلی، جس کی وجہ سے اس کے منصب اور مرتبہ میں کمی کردی گئی تھی۔ صاحب ماثر الامرا لکھتا ہے کہ :۔

"در جنگ داؤد خاں کررانی زنجیر طلائی فیل از خانہ اش برآمد، در رُتبہ انحطاطے واقع شد"(۲۴)۔

اسی طرح ذخیرۃ الخوانین میں آیا ہے :۔

"در جنگ داؤد افغان زنجیر فیل کہ از طلا بود از خانہ او برآمد در قرب تفاوت افتاد"(۲۵)۔

لیکن اکبر نامہ یا کسی اور تاریخ میں یہ واقعہ نظر نہیں آیا، ان دونوں شہادتوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کے منصب یا منزلت میں کسی قسم کا فرق پڑا، بہر حال جو کچھ ہو لوہ سن ۹۸۲ھ سے ۹۸۹ھ تک میر صاحب نے بھگت لیا ہو گا اور محمد حکیم کے خلاف جاتے ہوئے سرکاری فوج میں ہم انہیں پھر اسی کروفر کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

قتلو خان کا معاملہ : سن ۹۹۱ھ سال ۲۸ اکبر شاہی میں قتلو خاں کی بغاوت کے سلسلے میں ابوالفضل نے نمکین کا ذکر کیا ہے۔ قتلو خاں نے بغاوت کے دوران میں طرح طرح کی چالیں چلیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ :۔

"گزارش نمود کہ قرۃ العین خود را بہ درگاہ والا روانہ می سازم، صادق خاں جریدہ از اردو برآید و من نیز با چندے بیرون شوم تا بدیدن یک دگر دل بہ آرامش گراید، و خلاصہ زندگی را بدو سپارد۔"

یعنی اس نے یہ جال پھیلایا کہ صادق خاں اکیلا لشکر شاہی سے نکل کر اس کے پاس جائے اور وہ اپنا لڑکا لے کر اس کے پاس آئے اور سپرد کر دے تاکہ وہ بادشاہ کے حضور میں اس کو ضمانت کے طور پر لا کر پیش کرے، لیکن صادق خان دُور اندیش تھا، وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

"او (صادق خان) از دور بینی خویش تن را بہ کنارہ گرفت و شیخ فرید بخشی بدین خدمت قرار یافت"(۲۶)۔

بلوچوں کی سرکوبی : سن ۹۹۴ھ میں میر ابوالقاسم کو ہم بلوچوں کی سرکوبی کے لیے شاہی دربار سے رخصت ہوتے ہوئے پاتے ہیں۔ اکبر نامہ میں ہے :۔

"وہم درین سال (سن ۹۹۴ھ ۳۰ اکبر شاہی) اسمٰعیل قلی خان بہ بلوچستان رخصت شد، چوں آگہی آمد (کہ ایں گروہ راہ ناسپاسی می سپرند و پرستاری بجائے نمی آرند) آں

گزین خدمت را نامزد فرمودند راءِ رائے سنگ، ابوالقاسم نمکین و بسیارے مبارزان کار طلب راہمراہ کردند"(۲۷)۔

آصف خان : سن ۹۹۶ھ (۳۳ سال اکبری) میں ہم ابوالقاسم نمکین کو یوسف زیون کے ساتھ بر سر پیکار پاتے ہیں، اس وقت وہ آصف خان کے ساتھی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اکبر نامہ میں ہے کہ جب آصف خان نے دیکھا کہ علاقہ میں اب کوئی کام نہیں رہا تو وہ بادشاہ کے حضور میں جانے لگے، چنانچہ :۔

"جریدہ از مالکند (پشاور) رو بہ بارگاہ اقبال نہاد چندے نوکران او.... مے آمدند، ناگہاں کوس را بلند آوازہ گردانیدند، فرومایگاں (یعنی یوسف زئی) تبہ رائے را سراسیمگی فرو گرفت، و بے تابانہ راہے گریز سپردند، و بسیاری اسباب خود نیز انداختند۔ پس ابوالقاسم نمکین و شیر خان را بہ پاسبانی آنجا گزاشتند و شایستہ کار بجائی آوردند"(۲۸)۔

کالو خاں : اسی سال میر نے کالو خاں افغان کی سر زنش کی۔ کالو خاں، شاہی نوازشوں کے باوجود دربار سے بھاگ نکلا اور اپنے قبیلہ کے لوگوں کو لے کر کوہِ مہرہ کی طرف چلا گیا تھا ابوالفضل لکھتا ہے کہ :۔

"کوکلتاش (زین خان) ازیں آگہی شبگیر نمود، پیش دستاں ہراول نقارہ نواختند و غنودگان بے خبری، آگاہی یافتہ بہ پراگندگی تکاپو نمودند، اگرچہ آن نافرجام (کالو خان) بدر رفت، لیکن بیش از ہفتاد گزیدہ مرد را روزگار سپری شد، و ہم درین اثنا محمد بحری، و ملک اصغر بر سروی ترمحند۔ میر ابوالقاسم بکار زار در آمد و شیر خان کہ بسر غنچیں شدہ بود، بہنگام تاخت و فیروزی روئے داد نزدیک چہار صد افغانان بہ خاکدان نیستی غبار آلودہ گشتند و ہنگامہ فرومایگان لختے از ہم پاشید"(۲۹)۔

سال ۹۹۷ھ (۳۴ اکبری) میں اکبر کشمیر سے واپس آ رہا تھا، راستہ میں خواجہ صندل کے مزار پر قیام ہوا، اس وقت میر ابوالقاسم، کالو افغان کو لے کر حاضر ہوا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ :۔

"درین ولا میر ابوالقاسم نمکین از سواد (؟) آمدہ بہ سجدۂ نیایش روشن پیشانی گشتہ، کالو افغان را (کہ گریختہ شورش یوسف زئی را سرمایہ شدہ بود) ہمراہ آورد، چوں فیروزی سپاہ آن کوھسار را گرد گرفت، و کار بر سرکشان آن زمین تنگ شد و ہر گروہے پیکے از

امرا پناہ برد، این بد گوہر (کالو افغان) میرا دستاویز رستگاری گردانید، گیتی خدلوند آن نیستی سزلوار را بہ زنداں دبستان فرستاد (۳۰)۔

اس طرح کالو افغان کی میر صاحب کی وجہ سے جان بچ گئی۔

تیول داری : سن ۱۰۰۱ھ کے ۱۷ جمادی الآخر شب یک شنبہ کو ۳۷ سال اکبری شروع ہوتا ہے، اس حساب سے اکبر کا الٰہی ماہِ فروردین، جمادی الآخر کے ۱۷ سے شروع ہوا۔ اس ماہ فروردین کی ۸ تاریخ کو خان خانان فتح سندھ کے بعد مرزا جانی بیگ کو ساتھ لاکر دربار شاہی میں حاضر ہوا، فروردین کی ۱۰ تاریخ کے حالات میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ :۔

"درین روز ولایت ٹھٹھہ، در اقطعاع میرزا شاہ رُخ دادند، و میرزا جانی بیگ را منصب سہ ہزاری و صوبۂ ملتان عنایت شد، و ہر کدام از خدمت گزینان سندھ پاداش نکوکاری بگرفت" (۳۱)۔

اسی تاریخ میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ :۔

"شاہم خان جلائیر و قاسم خان نمکین از تیول آمدہ دولت باریافتند، و بہ خسروانی نوازش سر برافراختند" (۳۲)۔

ابوالقاسم کون سی جاگیر یا تیول داری سے دربار شاہی میں حاضر ہوا، ابوالفضل نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ بکھر جاگیر مراد ہو۔

سیوی اور بکھر : سن ۱۰۰۳ھ میں ابوالفضل، میر صاحب کو سیوی (بلوچستان) کی طرف افغانیوں کی سرکوبی کے لیے لے جاتا ہے۔ اس کا بیان ہے :۔

"سیوی، استوار قلعہ ایست نزد قندھار۔ در باستان زماں مرزباں بکھر داشت وازوے بعض افغانان پنسین بر لوچیرہ دست۔ سید بہاالدین بخاری، تیول دار اچھ، و بختیار بیگ اقطاع دار سیوستان، و میر ابوالقاسم نمکین جاگیردار بکھر، و میر معصوم و دیگر سپاہ صوبۂ ملتان را فرمان شد کہ بدان جا شدہ از گوی را دست مایہ کشایش بر سازند، و اگر نمی شنود بہ سزا برمالند" (۳۳)۔

عبارتِ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر نمکین سن ۱۰۰۳ھ میں بکھر کا جاگیر دار تھا۔ بکھر بطور جاگیر کے اسی سال ملا تھا یا اس سے پہلے، اس کی تصریح اکبر نامہ میں نہیں ہے۔ صاحب

ذخیرۃ الخوانین اس کو ۱۰۰۴ھ میں بکھر کی جاگیر کا ملنا بتاتا ہے :۔

"درسنہ اربع والف مرتبہ اوّل سرکار بکھر جاگیر یافت" (۳۴)۔

اس باب میں مزید اختلاف یہ ہے کہ صاحب مآثر الامرا لکھتا ہے کہ ان کو بکھر کی حکومت ۱۰۰۷ھ میں تفویض ہوئی اور دوسری مرتبہ ۱۰۱۵ھ میں بہ زمانۂ جہانگیر وہ بہ حیثیت حاکم بکھر میں آئے۔ ہمارے سندھی مؤرخ خان بہادر خداداد خان صاحب "لب تاریخ" لکھتے ہیں کہ پہلی بار ۱۰۰۴ھ میں اور دوسری دفعہ ۱۰۰۷ھ میں میر ابوالقاسم بکھر کے حاکم ہو کر آئے۔ طبقاتِ اکبری نے فقط زمرۂ امرا کے سلسلے میں یہ فقرہ لکھا ہے :

"(میر) در زمرۂ امرا است و حکومت بکھر دارد" (۳۵)۔

تحفۃ الکرام خاموش ہے۔ تاریخ معصومی کا مصنف تو میر ابوالقاسم کا اپنی پوری تاریخ میں نام تک نہیں لیتا۔ اِدھر سن ۱۰۰۷ھ (۴۳ اکبری) میں میر ابوالقاسم کا کشمیر کی طرف سے آنا اکبر نامہ میں مذکور ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ جب شہنشاہ، لاہور سے جنوب کی طرف چلا تو پہلی منزل پر "ابوالقاسم نمکین از کشمیر آمد و دولت باریافت" (۳۶)۔

کشمیر جانے کی وجہ معلوم نہیں۔ قیاساً معلوم ہوتا ہے کہ میر وہاں سے اکبر کی جلو میں آگرہ تک آیا۔ چنانچہ اسی سال ماہ دی کی ۹ تاریخ کو ابوالفضل اطلاع دیتا ہے کہ "ابوالقاسم نمکین را در بہار اقطاع دادند و بہ پاسبانی آنجا دستوری یافت" (۳۷)۔

اگر اس عبارت کے لفظ بہار کو کتابت کی غلطی سمجھ کر ہم بکھر سمجھیں تو اس صورت میں مآثر الامراء کا قول کہ "ایک ہزار سات ہجری میں میر بکھر میں بحیثیت جاگیر دار آیا۔" صحیح ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔

بکھر کی رعایا سے بد سلوکی : میر صاحب نے بکھر کے دورانِ قیام میں وہاں کی رعایا کے ساتھ سخت بد سلوکی کی جس کی وجہ سے صوبہ بھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ذخیرۃ الخوانین میں ہے کہ :۔

"با ارباباں و رعایا سلوک خوب نہ کردہ" (۳۸)۔

مآثر الامرا میں بھی اسی طرح ہے :۔

"با رعایا و سکنہ آنجا بد سلوکی و ناہنجاری پیش گرفت" (۳۹)۔

رعایا نے شاہی اردو کے قاضی مولانا عبدالحیٔ کے پاس استغاثہ کیا۔ قاضی نے میر صاحب کو عدالت میں بلولیا، لیکن میر نے اس عدالتی کارروائی کی کوئی پروانہ کی، یہاں تک کہ عدالت میں جانا بھی گوارا نہیں کیا۔ قاضی صاحب سخت ناراض ہوئے اور دربارِ شاہی میں شکایت لکھی کہ فلاں شخص "حکم بادشاہی اور عدالت خانہ الٰہی کی تعمیل نہیں کرتا" (۴۰)۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، صاحب ذخیرہ کی زبانی سنیئے :۔

"حکم شد کہ اورا بہ پائے فیل بستہ تمام شہر گردانندہ حق بہ حقدار رسانند دریں ضمن او خبر یافتہ، بہ استصواب پدر راقم ایں اوراق، شیخ معروف صدر، اربابان وغیرہ کلہم اجمعین مستغاثیان را زر دادہ راضی کردہ روانہ بکھر ساخت، فردائی آں بدربار حاضر شد وبعرض رسانید کہ قاضی خلاف واقعہ بعرض رسانند، کہ مردم بکھر فریادی آمدہ اند، وفلانے بعدالت خانہ حاضر نمی شود۔ چوں از قاضی استفسار فرمودند، قاضی دست وپا رابسیار زد، کسے از فریادیاں حاضر نہ گشت" (۴۱)۔

اسی طرح میر صاحب شاہی غضب سے محفوظ ہو سکے۔

ذخیرۃ الخوانین نے لکھاہے اور مآثر الامرا کا بھی قول ہے کہ اس کے بعد حکم صادر ہوا :۔

"ازاں روز قرار یافت کہ قاضی چہرۂ مستغیث نوشتہ بہ پیش گاہ بادشاہی فرستادہ نماید" (۴۲)۔

خطاب اور گجرات کی تیول داری : میر صاحب کو اس مصیبت سے نہ فقط نجات ملی بلکہ اضافہ منصب کے ساتھ ساتھ "خان" کا خطاب عنایت ہوا، نیز گُجرات (پنجاب) کی تیولداری بقول مآثر الامرا (۴۳)، ان کے سُپرد ہو گئی۔

۱۰۱۱ھ تک پتا چلتاہے کہ میر صاحب بکھر میں تھے یا بکھر ان کی تحویل میں اس وقت تک موجود تھا، کیونکہ اسی سال (۴۷ اکبری) اکبر نامہ لکھتاہے کہ :۔

"باابوالقاسم نمکین فرماں نافذ گشت، مرزا غازی را با خسرو خاں غلامے کہ معتمد اوست، روانہ درگاہ والا سازد" (۴۴)۔ قیاس ہے کہ مرزا غازی اور خسرو خاں اس وقت ٹھٹھہ میں تھے اور میر ابوالقاسم بکھر میں، اس وجہ سے ان کے نام حکم صادر ہوا کہ غازی کو خسرو کے ساتھ دربار میں روانہ کردے۔

۱۰۱۴ھ ماہ مہر کی تاریخ ۱۲ کو بادشاہ بیماریٔ مرگ میں مبتلا ہوا اس کے دو دن بعد یعنی ۱۴ تاریخ کو میر ابوالقاسم دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ اکبر نامہ میں ہے کہ۔

"چہار دہم مہر ماہ الٰہی، سعید خاں باپور خورد، ابوالقاسم خاں نمکین ملازمت نمود، و مرزا غازی پور مرزا جانی ترخان از ٹھٹھہ آمدہ جبین بہ سجود آستان اقبال نورانی ساخت، و گزیدہ پیشکش بہ نظر انور گزرانید" (۴۵)۔

بادشاہ نے شب چہار شنبہ (۴ آبان سال ۵۰ اکبری شاہی) ۱۰۱۴ھ کو انتقال فرمایا، ضرور ہے کہ میر نمکین اس وقت وہیں موجود ہو گا۔

الغرض ۹۸۰ھ سے لے کر ۱۰۱۴ھ تک پورے ۳۴ سال میر ابوالقاسم نہایت عزت، آبرو کے ساتھ اکبر کے درباری امیروں میں شامل رہا۔ اس طویل عرصہ میں دو ایک واقعات ایسے بھی ہوئے کہ عتاب شاہی کا مورد ہوا، لیکن پھر جلد ہی شہنشاہ کی نظروں میں اعتبار پایا اور ہمیشہ نوازش و عنایات شاہی سے سرفراز ہوتا رہا۔

جہانگیر کا عہد : جہانگیر کے عہد میں بھی میر صاحب حسبِ سابق اپنے منصب اور عہدوں پر قائم رہے۔ بادشاہ کی ان پر خاص عنایت تھی، جہاں گیر اپنے پہلے سال میں لکھتا ہے کہ :۔

"میں نے ابوالقاسم نمکین کے منصب میں ترقی دی اور ۱۵۰۰ سو کا اضافہ کیا وہ میرے باپ کا پرانا خادم ہے" (۴۶)۔

اس عبارت سے میر صاحب کے متعلق جہانگیر کے ذاتی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

۸ ذوالحج ۱۰۱۴ھ (سالِ اوّل جہانگیری) میں شہزادہ خسرو، آگرہ سے فرار ہوا، راستہ میں لوٹ مار کرتا، لاہور تک پہنچا۔ جہانگیر نے سیّد فرید بخاری اور دوسرے امرا کو کمک کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ کیا اور بعد میں خود بھی اس طرف روانہ ہو گیا۔

خسرو نے لاہور پہنچ کر شہر کی ناکہ بندی شروع کی، لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ شیخ فرید ۱۲ سو گھوڑے سواروں کے ساتھ سلطان پور پہنچ چکا ہے تو لاہور کا محاصرہ اُٹھا کر بھاگا، اس کے بعد کے واقعات مآثر کی زبانی سنیئے :۔

"بحال تباہ سرگرداں بادیہ حیرت و ہیمان شد کہ بکدام جانب رخت ادبار کشد جمعے از

افغانان (کہ رفیق طریق عصیاں شدہ بودند) گفتند کہ از ولایت میان دو آب تاخت و تاراج کنان سرے بہ دار الخلافہ باید، کشید، اگر کارے از پیش رفت بہتر والا بدیار مشرقیہ باید شتافت کہ ملکے وسیع است۔ حسن بیگ بخشی گفت کہ ایں کنگاش غلط است، شمارا بہ جانب کابل باید رفت، چوں خسرو عنان اختیار بدست لو دادہ بود، صوابدید اورا مرجح پنداشتہ یکران عزیمت بداں طرف راند۔"

بادشاہ نے تمام صوبوں میں فرمان جاری کر دیے تھے کہ جہاں خسرو پہنچے اس کو گرفتار کر لیا جائے، لہٰذا صوبہ دار اور رعایا اس کے در پے تھے چنانچہ :۔

"خسرو بہ احسن بیگ و چند کس دیگر خواست کہ از دریائے چناب بگزرد، بگزر سودھرہ رفتہ، وقت شب بہ تفحص کشتی می گشت، یک کشتی بے ملّاح بدست افتاد، ناگاہ کشتی دیگر پر ہیمہ و کاہ ہم رسید، حسن بیگ ملّاحان آن کشتی را خواست بزور کشیدہ بر کشتی خالی آورد، شور و غوغا برخاست، چودھری سودھرہ مطلع شد بکنار آب رفت و ملاحان را از گزرانیدن مانع آمد تا آنکہ سپیدۂ صبح دمید"(۴۷)۔

شہزادہ خسرو کی گرفتاری : چناں چہ صبح ہوتے ہی میر ابوالقاسم نمکین جو اس وقت گجرات میں بہ حیثیت تیولدار موجود تھا، وہاں پہنچا، اور :۔

"آخر غریق بے راہ روی را بہ قبضہ آوردہ نظر بند نمود"(۴۸)۔

خسرو کی گرفتاری کا واقعہ جہانگیر نے بھی وضاحت کے ساتھ توزک میں بیان کیا ہے، جو مآثر سے کسی قدر مختلف اور زیادہ مفصل ہے (ترجمہ) :۔

"اس موقع پر سودھرہ کے چودھری کمال کا داماد وہاں پہنچا اور اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کشتی پر دریا کو عبور کر رہا ہے، اس نے کشتی بان سے کہا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ کسی آدمی کو رات کے وقت دریا عبور کرنے نہ دیا جائے، اس جواب و سوال کے شور و غوغا سے دوسرے لوگ بھی کنارے پہنچ گئے۔ کمال کے داماد نے کشتی بان سے چپو چھین لی، جس کی وجہ سے کشتی چلنے کے قابل نہ رہی، کشتی بان کو پیسے کی لالچ دی گئی، لیکن وہ تیار نہیں ہوا، یہ خبر ابوالقاسم کو دی گئی جو اس وقت چناب کے نزدیک گجرات میں تھا، وہ فوراً اپنے لڑکوں اور کچھ سواروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، حالات

اس حد پر پہنچے کہ حسن نے اور کشتی بان نے تیر چلادیا اور جواب میں کمال کے داماد نے بھی کنارے سے تیر چلانے شروع کئے، چار کوس پر کشتی اپنے آپ ندی میں پھنس گئی، حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ ندی کے کنارے ابوالقاسم نے ہلال خان کی امداد سے پہرا بٹھا دیا اور دوسرے کنارے کو زمینداروں نے مضبوط کیا۔

اس معاملے سے پہلے میر نے ہلال خاں کو فوج کا سزاول کر کے سعید خاں کے تحت کشمیر بھیج دیا تھا، خوش قسمتی سے وہ عین وقت پر وہیں پہنچ گیا، اس نے ابوالقاسم نمکین اور خواجہ خضر خاں نے مل کر خسرو کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ ۲۴ تاریخ اتوار کی صبح کو آدمی کچھ تو کشتیوں پر سوار ہو کر اور کچھ ہاتھیوں پر چڑھ کر دریا میں خسرو کے پاس پہنچے اور اس کو گرفتار کر لیا" (۴۹)۔

منتخب اللباب میں بھی یہ واقعہ سال سن ۱۰۱۴ھ کے حالات میں لکھا گیا ہے، ابوالقاسم کے لیے فقط اتنا ہے کہ :۔

"چوں خبر میر ابوالقاسم نمکین وہلال خان، خواجہ سرا کہ در گجرات لاہور بودند، رسید، بلا توقف شتافتہ خسرو را با حسن بیگ و عبدالرحیم و دیگر ہمراہیان مقید ساختہ بحضور معروض داشتند" (۵۰)۔

اسی طرح اقبال نامۂ جہانگیری میں بھی ہے کہ :۔

"میر ابوالقاسم نمکین را کہ در پرگنۂ گجرات بود، آگاہ ساختند.... میر ابوالقاسم نمکین و ہلال خان خواجہ سرا و دیگر منصب داران کہ دراں حدود بودند فراہم آمدہ آخر غریق بحر ضلالت و ادبار را با حسن بیگ از کشتی بر آوردہ بہ پرگنۂ گجرات بردند و براق ازو گرفتہ نظر بند داشتند" (۵۱)۔

ذخیرۃ الخوانین میں مرتضٰی خان کے احوال میں خسرو کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی ہے لکھا ہے کہ :

"میر ابوالقاسم نمکین را کہ در پرگنۂ گجرات خورد بود، خبردار ساختند، او در خدمت سلطان رسیدہ بہ ہزار حیل و تزویر او را با حسن بیگ و عبدالرحیم با پنج و شش کس دیگر را بہ گجرات بردہ، لہٰذا علاج شدہ بہ قضا درداد ند" (۵۲)۔

بکھر کی بار دگر حکومت : مآثرالامرا کی روایت ہے کہ میر ابوالقاسم کو اس خدمت کے صلہ میں بکھر کی حکومت عنایت کی گئی :۔

"ایں حسن خدمت، در پیش گاہ خلافت باعث مجر اگشتہ از اصل واضافہ بہ منصب سہ ہزاری ترقی نمودہ" (۵۳)۔

اور اس کے ساتھ بکھر کی حکومت بھی ملی۔ یہ ۱۰۱۴ھ کا واقعہ ہے، جہاں گیر اس کے متعلق کچھ نہیں لکھتا، منصب کے اضافہ کا بھی صرف ایک مرتبہ ذکر کرتا ہے، جو ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔

جلال آباد کی حکومت : تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۵ھ یعنی سال دوم جہانگیری میں، میر ابوالقاسم جلال آباد کا جاگیر دار تھا۔ جہانگیر جب ۲۸ محرم ۱۰۱۵ھ کو کابُل جاتا ہے اور درۂ خیبر کے قریب علی مسجد کی منزل پر خیمہ زن ہوتا ہے، اس وقت ابوالقاسم جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے لیے خوبانیاں تحفے میں لایا۔ چنانچہ تزک میں لکھا ہے کہ :۔

"یہاں ابوالقاسم نمکین جلال آباد کا جاگیر دار میرے لیے خوبانیاں لایا جو کشمیری خوبانی سے خوبصورتی میں کم نہیں" (۵۴)۔

اس کے بعد پھر لکھتا ہے کہ :۔

"جلال آباد کی جاگیر ابوالقاسم نمکین سے لے کر عرب خاں کو دی گئی" (۵۵)۔

یہ واقعہ ۳ ماہ صفر ۱۰۱۵ھ کو (سال دوم جہانگیری میں) ہوا۔ ان روایات پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ ۱۰۱۴ھ کے بجائے ۱۰۱۵ھ میں جلال آباد سے تبدیل ہو کر بکھر آیا ہو اور مآثر سے ایک سال کی غلطی ہو گئی ہو۔ آئینِ اکبری کے ترجمہ میں بلاخمن نے بھی مآثرالامرا کے حوالہ سے بکھر کی گورنری کا ذکر ۱۰۱۴ھ میں کیا ہے۔ بلاخمن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے سوانح کے سلسلے میں مآثرالامرا کے سوا کوئی اور کتاب اپنے سامنے نہیں رکھی۔

بکھر کی سکونت : میر صاحب نے آخر میں اپنی سکونت کے لیے بکھر کو پسند کیا تھا، وہیں اپنا خوب صورت قبرستان اور اپنی یادگار مسجدیں بنوائیں۔ صاحب مآثر لکھتا ہے کہ بکھر اسے بہت پسند تھا، مستقل سکونت کے لیے اس کو منتخب کیا اور اس کے بعد خاندان کے تمام لوگ بھی یہیں بس گئے، جو "سادات قاسم خانی" موسوم ہیں۔

بکھر اور لوہری میں میر صاحب نے بہت سی عمارتیں بہ طور یادگار تعمیر کرائیں، ان میں سے اکثر زمانہ کی دست بُرد سے مِٹ گئیں، باقی ایک ان کا سنگین اور خوبصورت قبرستان رہ گیا ہے جو اپنے مدفون کی یاد اب تک تازہ کرا رہا ہے۔ اس قبرستان کے متعلق ہم تفصیل سے الگ عنوان کے تحت میں لکھ رہے ہیں، یہاں صرف ان عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو آج تاریخ کے صفحات پر قائم رہ گئی ہیں۔

انہوں نے سکھر میں جو عالی شان مسجد تعمیر کرائی تھی اس کے متعلق صاحب مآثر لکھتا ہے :۔

"مسجد عالی قصبہ سکھر، اساس گزاشتہ اوست" (۵۶)۔

بقول مآثر یہ مسجد انہوں نے پہلی مرتبہ بنوائی تھی، صاحبِ ذخیرۃ الخوانین، جن کے والد شیخ معروف صدر الصدور بکھر، میر صاحب کے دوست تھے مزید تفصیل بتاتے ہیں :۔

"مسجد عالی جامع در قصبۂ سکھر در عین رسیدہ، بازار بنا نمود، کہ اساس او در سالہائے دراز خواہد بود، و در قصبہ سکھر مسجد عیدگاہ ہم بنا کردہ است" (۵۷)۔

اس عبارت سے یہ عمارتیں ثابت ہوتی ہیں :

(۱) ایک جامع مسجد سکھر میں بنوائی، یہ وہی مسجد ہے جس کا ذکر مآثر میں آیا ہے۔

(۲) ایک عالی شان بازار بنوانا شروع کیا تھا، جو غالباً پورا نہ ہو سکا۔

(۳) ایک عیدگاہ سکھر میں بنوائی۔

(۴) اور ایک عیدگاہ روہڑی میں تعمیر کرائی۔

یہ سب یادگاریں آج ناپید ہیں۔

بسیار خوری : میر صاحب کے ذاتی اوصاف میں سب سے عجیب ان کی بسیار خوری ہے، جس کو تاریخ کی کتابوں نے رہتی دنیا تک شہرت دے دی ہے۔ لکھا ہے کہ وہ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ میوے وغیرہ کثرت سے اور کثیر تعداد میں کھاتے تھے، اس ذوق کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے روہڑی شہر کے قریب سندھ کے قدیم دار السلطنت الور کے حدود میں اپنے خاص باغ لگوائے تھے، ان کی بسیار خوری کا ذکر کرتے ہوئے صاحب مآثر لکھتا ہے :۔

"گویند اشتہا بسیار داشت، ہزار انبہ و ہزار سیب شکری و دو خربوزہ یک یک منے می خورد" (۵۸)۔

صاحب ذخیرہ بھی یہی تعداد بتاکر اس کی تائید کرتا ہے (۵۹)۔ میووں کے ساتھ ان کی یہی دل بستگی تھی جس کی بناپر وہ قندھار سے جہانگیر کے لیے خوبانیاں لے آئے، جس کی اس نے بھی تعریف کی ہے۔

کثرتِ اولاد : صاحبِ ذخیرۃ الخوانین نے میر صاحب کی پُر خوری کا ذکر کرنے کے ساتھ لکھاہے کہ وہ کثیر الاولاد بھی تھے۔

"و پسران نیز بسیار بہم رسانید" (۶۰)۔

تعداد اولاد کی وضاحت کرتے ہوئے صاحب مآثر رقم طراز ہے کہ :۔

"کثیر الاولاد بود، بیست ودو پسر داشت" (۶۱)۔

جہانگیر نے تزک میں بیٹوں کی تعداد ۳۰ لکھی ہے اور کہا ہے کہ "ایسے کثیر الاولاد آدمی بہت کم پائے جاتے ہیں، اگر ان کی لڑکیوں کی فہرست لکھی جائے تو وہ بھی اس سے نصف نکلیں گی۔" یعنی تیس بیٹے اور ۱۵ بیٹیاں (۶۲)۔

مؤرخوں نے ان کے چار بیٹوں کے نام لکھے ہیں (۶۳)۔

(۱) میر ابوالبقا امیر خان۔

(۲) میرزا کشمیری۔

(۳) میرزا حسام الدین۔

(۴) میرزا یداللہ۔

غالبًا یہی چار صاحبزادے ہیں جو کسی نہ کسی نسبت سے قابلِ ذکر قرار پائے ہیں۔

میر صاحب کے دوسرے لڑکے کی نسبت لکھا گیا ہے کہ دوران بغاوت میں یہ خسرو کے رفیق رہے اور اسی وجہ سے جہانگیر کے حکم سے ان کو خصی کر دیا گیا تھا، جیسا کہ مآثر میں لکھا ہے۔

"آلت رجولیت اورا حسب الحکم بریدند" (۶۴)۔

نمکین کے تیسرے بیٹے حسام الدین کے متعلق ذخیرہ میں ہے کہ عالمِ شباب میں رحلت پاگئے (۶۵)۔

مآثر نے بھی یہی لکھا ہے کہ "بہت ترقی کی اور جوانی میں انتقال کر گئے" (۶۶)۔

چوتھے بیٹے مرزا یداللہ کو سرکاری منصب نہیں ملا، خان جہان لودی کے ملازم تھے، ذخیرہ

میں لکھا ہے کہ بہت معزز آدمی تھے لیکن قابلیت میں صفر تھے۔

"بغایت معزز بود اما قابلیت نداشت" (۶۷)۔

میر صاحب کے ایک صاحبزادے کا، جو غالباً سب سے بڑے تھے یعنی میر ابوالبقا کا آگے تذکرہ آتا ہے۔ وہ باپ کی طرح اپنے دور میں بہت اہم شخصیت کے مالک تھے۔

ایک داماد : ذخیرۃ الخوانین میں ابوالقاسم خاں کے ایک داماد کا بھی ذکر آیا ہے۔ لکھا ہے کہ :۔

"جمیل بیگ ولد تاش بیگ کابلی' داماد میر ابوالقاسم نمکین بود' در جنگ راجہ باسو کانگڑہ شہید شد۔"

ان کی نسبت صاحبِ ذخیرہ نے ایک عجیب روایت نقل کی ہے، وہ یہ ہے :۔

"مردم معتبر حکایات از و دارند، کہ بعد از مردن بہ ہیئت اصلی بخانۂ خود بر آمد با منکوحہ خود چنانچہ در حین حیات خروج و خول بود سر کرد، درین باب مقبول دلہا بسیار اند، والعلم عنداللہ۔"

اُس کی وفات پر اُس کے باپ تاج خان نے کلاں نور میں اس کا مقبرہ بنوایا اور اس پر کتبہ اپنے ہاتھ سے لکھا اور آخر وہ بھی اسی گنبد میں مدفون ہوا جیسا کہ صاحبِ ذخیرہ کا بیان ہے :

"تاج خان (تاش بیگ) در فوت پسر بغایت اندوہ ناک گشت، در کلاں نور بیرون شہر مقبرہ پسر بنا نہاد، باغ بارونق کرد و مرثیہ کہ در گنبد پسر بخط کتبہ نوشتہ یاد از سوز و گداز می دھد، خود نیز در آن گنبد آسود" (۶۸)۔

نواسے پر نواسے : میر صاحب کے بعد بکھر میں ان کے عم زاد بھائی اور ان کے پوتے پروتے صاحب تحفۃ الکرام کے زمانہ میں موجود تھے۔ چنانچہ میر علی شیر قانع رقم طراز ہے کہ :

"بنی اعمام ایشاں (امیر خانیاں) الموسوم بہ قاسم خانیاں، خاندانی بو فور لیاقت گزشتہ، بیشتر بہ ذی منصب دراں زیستند" (۶۹)۔

ان میں سے چند کے نام حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) میر محمد رحیم نبیرہ قاسم خان، اس کے بیٹے میر کریم کی نسبت میر قانع نے لکھا ہے کہ وہ اپنے آباد اجداد کی نقشِ قدم پر چلتا تھا اور لاولد فوت ہوا۔

(۲) میر ابوالنصر نبیرہ میر قاسم خان نے بھی بزرگانہ وضع میں زندگی گزاری، مزار "صفہ صفا" میں ہے۔ مزار پر آیات قرانی کے ساتھ یہ کتبہ کندہ ہے :۔

وفات یافت چو مغفور........ میرزا

ابوالنصر بتاریخ...... شہر ذوالحجہ سنہ ۱۰۴۵ھ"

ان کا ایک بیٹا میر شیر افگن تھا، اس نے بھی بزرگی کے ساتھ زندگی بسر کی، اس کا بیٹا میر محمد عابد تھا، جس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

(۳) میر محمد اسلم نبیرۂ قاسم خان کی نسبت قانع کا بیان ہے کہ :۔

"بکمال انسانیت زیست کردہ۔"

ان کے بیٹے میر محمد قابل نے بھی نیکی کے ساتھ بسر کی۔ کوئی لولاد نہیں ہوئی۔

(۴) میر محمد نعیم نبیرۂ قاسم خاں، جو بقول قانع :۔

"در وقت خود بہ قدم اسلاف گزشتہ۔"

ان کا بیٹا میر محمد صالح عرف میر قلندر تھا، میر علی شیر قانع کے زمانے میں فقط یہی ایک تمام خاندان ان کی یادگار رہ گیا تھا (۷۰)۔

ہلال خان خواجہ سرا: اس خواجہ سرا کا ذکر اوپر خسرو کی گرفتاری کے سلسلے میں آچکا ہے۔ عہدِ اکبری کا امیر تھا۔ ابتدا حکومت میں "میر تزک" ہوا اور بعد میں آگرہ کے قریب اسے جاگیر بھی ملی، اپنی اس جاگیر کے ایک گاؤں رہتہ میں جو آگرہ سے ۶ کوس کے فاصلے پر تھا، ایک قلعہ اور ایک سرائے پختہ بنوائی۔ اس کا نام "ہلال آباد" رکھا۔

یہ ابتدا میں میر تمکین کا غلام تھا، جیسا کہ مآثر الامرا میں صراحت کی گئی ہے (۷۱)۔ ذخیرہ میں سعید خاں کے ذیل میں اس کا تذکرہ ہے (۷۲)۔ پھر علیحدہ بھی سوانح لکھے ہیں لور اس کی بہت تعریف کی ہے (۷۳)۔

ہلال خان بہت شاہ خرچ آدمی تھا، اکبر آباد میں اس کا ایک عالی شان محل تھا، جس میں ہمیشہ امرا کی دعوتیں کیا کرتا تھا، ایک دفعہ دعوت میں سعید خان چغتہ جو (سن ۱۰۱۱ھ میں) بکھر کے جاگیر دار تھے اور ٹھٹھہ کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ دعوت میں شریک ہوئے، مکان لور اس کے ساز و سامان کو سعید خان نے بہت پسند کیا اور تعریف کی۔ ہلال خاں نے اسی وقت وہ مکان معہ تمام آرائش کے ان کے حوالے کر دیا۔

مآثر میں یہ واقعہ اس طرح لکھا گیا ہے :۔

"اکثر امرائے عظام را بہ ضیافت بوریا کوبی برخواند، سعید خاں ہم حاضر شدہ مکان را پسندیدہ و تعریف بسیار کرد۔ خواجہ ہلال از روئے تواضع گفت پیش کش است۔ سعید خان برخواستہ تسلیم بجا آورد، مردم و اسباب خود را طلبید، ہلال (کہ بمصاحبت بادشاہی سر بفلک داشت) ایستادگی نمود، نوکران سعید خاں بہ جبر و قہر بہ آوردند، بادشاہ آں راشنیدہ بہ سعید خاں گفت، کہ ایں وضع زیبندہ و شایان عمدگی شمانیست، عرض کرد کہ حضرت سلامت مثال من آفسقال این سلطنت حضور جمعے از او بنیان بزرگ مرتبہ بیک غلام سہ تسلیم کند، و آنہا مفت و رائگاں بروند، بسر من وابستہ است، اگر حضرت حکم می فرمایند کشت می شوم، و آخر بدیں کافرماجرائی آں حویلی غصب کرد" (۷۴)۔

میر کی وفات: میر ابوالقاسم کے انتقال کی مفصل کیفیت کہیں نہیں ملی، تحفۃ الکرام نے فقط اتنا لکھا ہے کہ :۔

"آخرھا در جنگ قندھار مقتول شد، برکوہ لوہڑی مدفن یافت" (۷۵)۔ میر اپنے قبرستان "صفۂ صفا" میں دفن ہوئے، ان کے مزار پر مندرجہ ذیل کتبات کندہ ہیں۔

میر ابوالقاسم آں یگانۂ عصر
کہ بجز تخم دین و داد نہ کشت
ملک و اقبال در تصرف داشت
چوں اجل در رسید جملہ بہشت
دیدۂ دل کشا و برگیرید
عبرت اے عاقلان پاک سرشت!

باقی دو شعر اندر کے رخ کندہ ہیں :

گر بود بستر از حریر چہ سود
چوں نہد مرگ زیر بالش خشت
خلف خیر او ز "داغ ابی"
سن ۱۰۱۸ھ

چونکہ تارخ سال فوت نوشت
گفت ملہم مرا بگوش ضمیر
سال فوتش کہ "باد جاش بہشت"
سن ۱۰۱۸ھ

(۲) یہ کتبہ پائینتی کی طرف قبر پر کندہ ہے:
خاں زمانہ میر ابوالقاسم آن کہ او
لوح وجود از رقم غیر سادہ کرد
..... دودمان .... گلبن حیا
سال وفات لوطلب از "داغ دادہ" کرد
سن ۱۰۱۸ھ

ان کتبوں سے ان کا سال وفات ۱۰۱۸ھ ثابت ہوتا ہے لور دوسرے کتبوں میں بھی یہی سال کندہ ہے۔

میر ابوالبقا امیر خان

میر ابوالقاسم نمکین کے بڑے صاحبزادے تھے لور اپنے زمانہ کے بہت بلند پایہ امیر گزرے ہیں، ان کے متعلق مآثرالامرا لکھتا ہے:۔

"رشید ترین پسر از قاسم خان نمکین است، بہ کارشناسی و معاملہ دانی سر آمد برادران بود، وبہ ارجمندی و بختیاری ممتاز رضوان" (۷۶)۔

باپ کے زمانے میں پانصدی منصب پر پہنچے لور ان کی وفات کے بعد بتدریج ترقی کرتے ہوئے بقول مآثر بلند مراتب پر فائز ہوئے (۷۷)۔

جہانگیر کے زمانے میں پندرہ سو کا منصب لور پندرہ سو سواروں کی سرداری ان کو عطا ہوئی۔ جب ملتان کا صوبہ یمین الدولہ کو تفویض ہوا تو ان کی طرف سے میر ابوالبقا نے نیابت کے فرائض ادا کیے۔ بادشاہ نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کی نیابت پر وہ آخری دورِ جہانگیری میں مقرر ہوئے تھے۔ شاہ جہاں کی مسند نشینی کے بعد جن صوبہ داروں لور نیابت داروں کو معزول یا تبدیل نہیں کیا گیا، ان میں ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے (۷۸)۔

سال دوئم جلوس شاہ جہانی میں جب مرتضیٰ خان انجو صوبہ دار ٹھٹھہ نے وفات پائی، اس

وقت بقول مآثر الامرا، خاں مذکور صوبہ ملتان کے ناظم (گورنر) مقرر ہوئے۔

"خان مزبور بہ اضافہ پان صدی ذات پان صد سوار، بہ منصب سہ ہزاری دو ہزار سوار، سر برافراختہ، بہ نظم آں صوبہ مامور شد۔" (۷۹)

شاہ جہاں نامہ میں ہے کہ وہ شاہ جہاں کے پہلے سال یعنی یکم رجب سن ۱۰۳۷ھ کو دو ہزاری اور پانصدی منصب پر پہنچ گئے (۸۰)۔

صوبہ ٹھٹھہ کی نظامت کا واقعہ دوسرے سال شاہ جہانی کا ہے، جو یکم جمادی الثانی سن ۱۰۳۸ھ سے شروع ہوتا ہے، اس سال کے آخر کے واقعات لکھتے ہوئے صاحب شاہ جہاں نامہ، رقم طراز ہے:

"وچوں بہ عرض مقدس رسید کہ مرتضیٰ خان ولد میر جمال الدین حسین خان انجو، صوبہ دار ٹھٹھہ رخت ہستی ازین جہان بربست، امیر خان ولد قاسم خان نمکین را کہ بہ نیابت یمین الدولہ بہ حکومت ملتان می پرداخت، بنظم آں صوبہ و بہ اضافہ پان صدی ذات و پانصدی سوار، بہ منصب سہ ہزار، دو ہزار سوار سر فراز گردانیدہ" (۸۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کے آخری عہد سے لے کر جمادی الثانی سن ۱۰۳۸ھ تک ملتان میں قائم مقام گورنر کی حیثیت سے رہے اور اس کے بعد ٹھٹھہ کے مستقل گورنر مقرر ہو گئے۔

صاحب تحفۃ الکرام ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ شاہ جہاں نے ان کو اس ہدایات کے ساتھ ٹھٹھہ روانہ کیا کہ وہاں پہنچتے ہی جام ککرالہ کو سزا دے اور ان سب کو معزول اور مصعوب کرے، جنہوں نے شریف خان گورنر ٹھٹھہ کے ساتھ مل کر شاہ جہان کے ساتھ اس کے قیام ٹھٹھہ کے اثنا میں گستاخی کی تھی۔ چنانچہ میر ابوالبقا جب ٹھٹھہ پہنچے تو وہاں کے اکثر منصب داروں کو معزول اور گرفتار کیا، جام ککرالہ کو سزا دی، رانا دھاراجہ اور حمل جت اچھی طرح پیش آئے تھے۔ اس کے عوض اعزاز و احترام کے ساتھ شاہی دربار میں روانہ کیا اور انہوں نے وہاں حاضر ہو کر انعام اور اعزاز پایا (۸۲)۔

میر ابوالبقا کو نویں سال شاہ جہانی میں ہم دولت آباد (دکن) کے علاوہ بیر کا تیول دار پاتے ہیں۔ مآثر الامرا کا بیان ہے:-

ہنگام، معاودت شاہزادہ از دولت آباد بدار الخلافہ بہ تیول داری سرکار بیر مضاف

صوبہ دکھن تعین شدہ، چندے در کمکیان آن ولایت انتظام داشت"(۸۳)۔

چودھویں سال شاہ جہانی میں میر صاحب کو ہم سیوستان میں ناظم صوبہ کی حیثیت سے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں، ماآثرالامرا نے لکھا ہے کہ :۔

"از تغیر قزاق خان بہ ضبط الکائے سیوستان رخصت یافت"(۸۴)۔

بادشاہ نامہ میں یہ واقعہ ۴ ربیع الاوّل سال ۱۰۵۱ھ کے وقایع میں مذکور ہے جو شاہ جہان کے دور دویم کا چوتھا سال ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"امیر خان ولد قاسم خان نمکین، بہ خلعت و اسپ و خدمت ضبط سیوستان از تغیر قزاق خان سر برافراخت"(۸۵)۔

ایک سال کے بعد ۱۵ویں سال شاہ جہانی میں شاد خان کا تبادلہ ہوا تو دوبارہ ٹھٹھہ کے صوبہ دار بنائے گئے(۸۶)۔ صاحب شاہ جہاں نامہ اس تغیر کی تاریخ ۴ ربیع الاوّل سنہ ۱۰۵۲ھ بتاتا ہے، یہ سال پنجم دور دویم شاہ جہانی ہے، لکھا ہے کہ :

"چہارم ربیع الاوّل امیر خان ولد قاسم خان نمکین بہ مرحمت خلعت و صوبہ داری ٹھٹھہ از تغیر شاد خاں کہ نظمِ سیوستان بدو مفوض شد، نوازش یافت"(۸۷)۔

اور وہیں ٹھٹھہ میں بقول ماآثرالامرا ۳۰ جلوس شاہ جہانی (۱۰۵۷ھ) میں انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا(۸۸)۔ ان کی وفات کے بعد ان کے خانہ زاد مغل خاں کو ٹھٹھہ کی گورنری پر سرفراز کیا گیا۔ شاہ جہاں نامہ میں لکھا ہے :۔

"ہژدھم ربیع الاوّل (سال ۱۰۵۷ھ مطابق دہم دور دویم شاہ جہانی) چوں بعرض اقدس رسید کہ امیر خان صوبہ دار ٹھٹھہ رختِ ہستی ازیں جہان بربست مغل خاں پسر زین خان را کہ از خانہ زادان معتمد لایق تربیت است، و در دکھن بخدمت قلعہ داری او دگیری پرداخت، ناظم آن صوبہ گردانیدند و بہ اضافہ پانصدی ذات بمنصب سہ ہزاری ذات و دو ہزاری سوار برنواختند"(۸۹)۔

وفات اور قبر : یہی مصنف دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"امیر خاں سہ ہزاری، دو ہزار سوار، ماہ ربیع الاوّل سال دہم از دور دویم در ٹھٹہ بگزشت"(۹۰)۔

ماثرالامراء نے بیان کیا ہے کہ ان کا مزار "صفۂ صفا" واقع روہڑی میں ہے یعنی اپنے باپ کے قبرستان میں (۹۱)۔ صاحب تحفۃ الکرام (۹۲)، نے ان کا مزار مکلی کے پہاڑ پر بتایا ہے۔ (۹۳)۔ مسٹر کزنس (Cousens) بھی تحفۃ الکرام کے بیان کی تائید کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

نواب خلیل خاں کے مقبرے سے تھوڑی دور پر ایک شکستہ حال مقبرہ ہے جو امیر خاں ابوالبقا کا ہے۔ گنبد کی محراب کا نصف حصہ گر چکا ہے لیکن پھر بھی اس کی خوبصورت اینٹوں کے نقش و نگار اور آثار ابھی تک باقی ہیں۔ آپ کا سالِ وفات سن ۱۶۲۷ء ہے" (۹۴)۔

مسٹر کزنس اور تحفۃ الکرام نے غالباً "امیر خاں" کے خطاب سے سمجھ لیا ہے کہ یہ قبر ابوالبقا امیر خان کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ ایک دوسرے امیر خاں عبدالکریم نامی کی قبر ہے کیونکہ ایک قبر "امیر خان کی صفۂ صفا" کے اندر، میر ابوالقاسم کے پہلو میں موجود ہے اور اس کے قطعۂ تاریخ سے سالِ وفات سن ۱۰۵۷ھ نکلتا ہے، لہٰذا یہی ابوالبقا امیر خان کی قبر ہو سکتی ہے۔ اس کے کتبات یہ ہیں :۔

سرہانے کے پتھر پر اندر کے رُخ :

مصدر، خلق امیر خاں کہ بسے
خلق عالم، بہ خلق او آسود
تا دریں دھر بود صاحب جاہ
در رضائے خدائے خود می بود
کوس رحلت چو زد ز دار فنا
رخت آسودگی بہ خلد کشود
سال نقلش بگفت ہاتف غیب
"ہادی دیں امیر خان آسود"

سن ۱۰۵۷ھ

بقول مآثرالامرا ان کی وفات ۲۰ جلوس شاہ جہانی مطابق سن ۱۰۵۷ھ میں ہوئی اور اس قبر کے قطعہ سے بھی یہی سال بر آمد ہوتا ہے۔ مسٹر کزنس اور تحفۃ الکرام کو یقیناً امیر خاں کے

لفظ سے اشتباہ ہوا ہے۔

آپ کی عمر کے متعلق مآثرالامرا کا بیان ہے کہ :۔

"زیادہ بر صد سال عمر داشتہ" (۹۵)۔لور تمام عمر صحت مند رہے، حواس اور قویٰ میں آخر دم تک فتور نہیں پیدا ہوا، ذخیرۃالخوانین سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

لکھا ہے کہ :۔

"در قوت دست، رجولیت، وشنوائی وبینائی فتورے واقع نہ شد" (۹۶)۔

جہانگیر کے زمانے میں ان کو "میر خان" کا خطاب ملا، شاہ جہاں نے بھی بقول مآثرالامراء "اعلیٰ حضرت بہ افزایش الف، بخطابش یک لک روپیہ ازو پیشکش گرفتہ با امیر خان نامی فرمود" (۹۷)۔ یعنی ایک لاکھ روپے لے کر ایک الف کا اضافہ کر کے میر خاں سے "امیر خاں" بنادیا۔

اولاد : مآثرالامرا نے آپ کی اولاد کی فہرست دیتے ہوئے لکھا ہے، یہ اپنے باپ کی طرح کثیر الاولاد تھے۔

(۱) عبدالرزاق

شاہ جہاں کے زمانہ میں نو صدی منصب دار تھے۔ ۲۶ سال شاہ جہانی میں وفات پائی، صاحب مقالات الشعراء کا بیان ہے کہ "وہ جامع علوم عقلی و نقلی تھے" "زبان میں لکنت تھی، بعض حروف زبان پر انکتے تھے اور ٹھیک ادا نہ کر سکتے تھے لیکن ان کو زبان اور لغت پر اتنا عبور تھا کہ جب کوئی لفظ ان کی زبان پر آ کر اٹک جاتا تو فوراً اسی کے ہم معنی لور لفظ اس طرح بول جاتے کہ سننے والا محسوس نہ کرتا تھا، اس بنا پر صاحبِ مقالات کی یہ تعریف بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ "قوت درک وحافظۂ لغت وجامعیت علوم بریں قیاس تواں کرد" (۹۸)۔

کزنس صاحب (۹۹)، نے لکنت کا قصہ میر ابوالبقا کے نام سے منسوب کیا ہے، حالانکہ ان کا مآخذ تحفۃ الکرام ہے لور اس میں صفائی سے میر عبدالرزاق کے لیے لکھا گیا ہے۔

شاعری : میر عبدالرزاق شاعر بھی تھے، چنانچہ مقالات میں ان کے چند اشعار درج ہیں :

می فروزد جان ماچوں دست سوے مے برد

می فزاید حال ما چوں لب بسوئے نے برد

مخفیم در جوہر معنی چو معنی در سخن

دیدن من ھر کہ خواھد کو بمعنی نے برد

دردمندم قطرہ خوے خواہم از زلف بگت

خواہش مجروح باشد تا زافعی تے برد

اسی غزل پر ان کے بھائی میر ابوالمکارم شہود نے بھی غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے

مست نوش لعل او کے دست سوے مے برد

نغمہ ساز عشق او کے دست سوے نے برد

وفات: ان کا انتقال جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ۲۶ سال شاہ جہانی میں ہوا، سن ہجری کسی نے نہیں لکھا، ان کا مزار جو "صفۂ صفا" میں واقع ہے، اس پر سن ۱۰۶۲ھ لکھا ہوا ہے، جو شاہ جہانی جلوس ۲۶ کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ مزار نمکین اور میر ابوالبقا امیر خاں کے درمیان، یعنی اپنے دادا اور والد کے درمیان محوِ خواب ہیں۔ مزار پر یہ کتبہ کندہ ہے:

عبدالرزاق کہ روحش، قریں

باد ز ایزد بہ ہزار آفریں

سنی و شیعہ چو در افتاد دید

تیغ شجاعت زمیاں بر کشید

ہمت عالیش عنان گرم تاخت

جام شہادت زقضا نوش یافت

ترک ازیں عالم فانی گرفت

"ملک بقا آل حسینی گرفت"

۱۰۶۲ھ

ان کا باپ امیر خان ۲۰ جلوس شاہ جہانی سن ۱۰۵۷ھ میں فوت ہوا اور انہوں نے ان کے ۵ سال کے بعد ۱۰۶۲ھ میں انتقال کیا۔ کتبہ سے ایک اور اہم واقعہ پر بھی روشنی پڑتی ہے، جس کے متعلق تاریخ خاموش ہے، یعنی انہوں نے کسی سنی شیعہ فساد میں لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

(۲)ضیاء الدین یوسف

یہ شاہ جہاں کے آخری دور میں ایک ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور چھ سو اسپ سوار عطا ہوئے۔ نیز "خان" کا لقب بھی ان کو دیا گیا، صاحبِ تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ وہ سیوستان کے فوجدار تھے(۱۰۰)۔

ضیاء الدین خان کی اولاد کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاں ایک لڑکی ہوئی، جس کا نام تحریر نہیں البتہ نواسے میر ابو الوفا کا کسی قدر مفصل حال ملتا ہے، بقول مآثر الامرا وہ اورنگ زیب کے آخری عہد میں داروغہ جانماز تھے اور ــــــــ "ضمیمہ خدمات دیگر داشت و بہ حدت فہم و درستی استعداد روشناس بادشاہ قدر شناس بود"(۱۰۱)۔

اس سلسلے میں ان کی فہم و فراست کی تعریف کرتے ہوئے مآثر میں ایک واقعہ یوں لکھا ہے:

> "چنانچہ روزے عرض داشت بادشاہ زادہ، بہادر شاہ بخط رمز از نظر گزشت، چوں رمز معلوم نمی شد، بادشاہ بیاض خاص بہ میر مذکور حوالہ نمود کہ مادر سہ رمز واضح نوشتہ گزاشتہ ایم، آں را بہ ایں سنجیدہ استنباط مطلب نماید، مشار الیہ بیاوری وقت نظر و سرعت فکر رموز مستورہ، مسطورہ باستخراج آوردہ، مضمون عرضداشت را نوشتہ گزرانیدہ و درجہ استحسان یافت"(۱۰۲)۔

(۳)امیر خان عبد الکریم

ان کے حالات جُدا عنوان کے تحت لکھے جائیں گے۔

(۴)ایک لڑکی

میر ابو البقا کی ایک لڑکی کا عقد شہزادہ مُراد بخش سے سن ۱۰۶۶ھ میں ہوا، ابو البقا کے وفات پاجانے کے کافی عرصہ بعد یہ نسبت ہوئی تھی۔

شاہزادہ مراد بخش کی پہلی شادی شاہنواز خان(۱۰۳)، صفوی کی لڑکی سے ہوئی لیکن اس سے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے بقول مآثر الامرا:

> "اعلیٰ حضرت در سال سیم سنہ ۱۰۶۶ھ آں عفیفہ را کہ شائستگی از دواج شاہزادہ

واشت، یک لک روپیہ از جواہر و دیگر اشیا بطریقہ جہاز عنایت فرمودہ بہ احمد آباد فرستاد کہ در عقد نکاح شاہزادہ کہ در ان وقت صاحب صوبہ آں ولایت بود در آرند"(۱۰۴)۔

(۵) شمس الدین خان

کا نام بھی آیا ہے۔

(۶) میر ابوالمکارم شہود

بھی ان کا بیٹا تھا، جس کا ذکر علیحدہ عنوان سے کیا جائے گا۔

میر ابوالبقا کی فراست : میر ابوالبقا کی فہم و فراست کی صاحبِ مقالات الشعراء نے بڑی تعریف کی ہے اور اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ میر صاحب آئینہ دیکھ رہے تھے اور اس میں اپنے عکس کو سلام کر رہے تھے، اس واقعہ کو خبر رسانوں نے بادشاہ کے حضور میں پہنچایا، اور یہ حاشیہ آرائی کی، اب میر صاحب کی عقل میں فتور واقع ہوا ہے اس لیے مناسب ہے کہ ان کو اپنے عہدے سے ہٹایا جائے، میر صاحب کو جب معلوم ہوا تو حضور میں عرض کی کہ "اپنے عکس کو سلام نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے چہرے پر سفید بال دیکھ کر ان کو سلام کر رہا تھا کیونکہ :۔

"غلام در ظل سلطنت وسیاہ تربیت حضرت جہاں پندہ پیر شدہ"(۱۰۵)۔

اور اس طرح اپنی فراست اور عقل سے کام لے کر بادشاہ کو مطمئن کر دیا۔

میر ابوالبقا شاعر بھی تھے، صاحبِ مقالات الشعراء نے ان کا کلام لکھا ہے مگر مقالات کے قلمی نسخہ میں صرف ایک مصرعہ لکھ کر دہ ورق سادہ چھوڑا گیا ہے۔ غالباً اس سادہ ورق پر مصنف کو میر صاحب کے دوسرے اشعار بھی نقل کرنے تھے، جو افسوس ہے کہ بعد میں کسی وجہ سے نقل کرنے سے رہ گئے۔

میر صاحب کی عمارتیں اور شہر : میر صاحب نے اپنے اقتدار کے زمانے میں ٹھٹھہ میں، بقول تحفۃ الکرام، ایک مسجد بنائی اور ایک نئی بستی بسائی۔ مسجد محلہ بھائی خان میں مابین

چوک عبدالغنی اور چوک ملک امان تھی لیکن اس مسجد کو صاحب تحفتہ الکرام نے اپنی دوسری تصنیف، مقالات الشعراء میں میر سیّد عبدالکریم ملتفت خاں کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"از آثار و اہتمام اوست مسجدے در تھتہ بہ محلہ بھائی خان متصل قانون گو کہ دراصل معبود ہنود بودہ۔"

مسجد کے اختتام کی تاریخ لفظ "ختم" سے نکالی ہے، جو دروازہ پر کندہ ہے (۱۰۶)۔

۱۰۴۰ھ

اور ایک گاؤں امیر آباد کے نام سے آباد کرایا، جس کی تفصیل صاحب تحفتہ الکرام نے اس طرح لکھی ہے:

"وجہ آنکہ سابق بر آں کہ ہنوز بہ امارت نرسیدہ بود، روزے از آن گو شوارہ گزشتہ، میان صحرا جماعت شبان خدمت موفورہ کردہ بودند، راضی شدہ استفسار حال ایشاں نمود، معلوم شد کہ آں زمین خارج جمع و ویران است، و آں مردہ آنجا مویشی رامی چرانند، و اوقات بہ عسرت می گزرانند، مکافاتِ احسان را درین وقت کہ ناظم ٹھٹہ شدہ و ضابطہ آن زمین گردید، زمین مذکور بنام آن مردم مقرر کردہ، گفت تا آباد کردند و دہ بستند، حالا جاے۔ عامل نشین پر گنات بتورہ و بہرام پور و درک و پلیجا است" (۱۰۷)۔

ٹھٹھہ کی مشہور تاریخی جامع مسجد کے متعلق، جس کی ابتدا شاہ جہاں کے زمانے میں ہوئی اور کچھ جہانگیر کے ابتدائی زمانے میں تیار ہوئی، صاحب لب تاریخ سندھ (۱۰۸)، لکھتا ہے کہ امیر خاں نے اس کی ابتدا کی، ہمیں اب تک اس کی تصدیق اور کسی کتاب میں نہیں ملی۔

امیر خانی: میر ابوالبقا کے بعد ان کی اولاد "امیر خانی سادات" کے لقب سے سندھ میں مشہور ہوئے۔ (۱۰۹)

میر عبدالکریم امیر خان سندھی

میر ابوالبقا کے غالباً منجھلے بیٹے تھے، صاحب مآثرالامرا لکھتا ہے کہ ان کے جد ابوالقاسم نے جب اپنی رہائش اختیار کی اور اپنی آخری آرام گاہ بھی وہیں پسند کی اور ان کے بعد میر ابوالبقا نے

بھی اپنے لیے ٹھٹھہ کو منتخب کیا اور وہیں وفات کے بعد دفن بھی ہوئے تو ان کے بعد ان کا خاندان ان تمام تعلقات کی بنا پر ہمیشہ کے لیے وہیں مقیم ہو گیا اور "سندھی" کے لقب سے شہرت پائی۔ مآثرالامرا نے میر عبدالکریم کے ترجمہ کو عنوان میں "سندھی" لقب دیا ہے(۱۱۰)۔

عالم گیر کی ملازمت: میر عبدالکریم کے سلسلے میں مآثرالامرار قمطراز(۱۱۱) ہے کہ :۔
"چوں عروج دولت و صعود ثروت در طالع او مودع دست تقدیر بود" لہٰذا پچیسویں سالِ عالم گیری میں، جس وقت بادشاہ سلامت اورنگ آباد میں مقیم تھے۔"مومی الیہ منظور نظر تربیت خسروانی گشت" اور ان کو "داروغہ جانماز" کے عہدے پر مامور کیا گیا اور ساتھ ہی خدمت امانت ہفت چوکی عنایت ہوئی۔ اس کے بعد بقول مآثر "چوں پیش آمد و ترقی او مذکور خاطر بادشاہی بود۔" "داروغہ نقاش خانہ" کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی۔

اٹھائیسویں جلوس عالمگیری میں میر صاحب سے کوئی غلطی سرزد ہوئی، جس کی پاداش میں جانماز کی داروغگی واپس لی گئی، قصور معمولی تھا اس لیے معمولی سرزنش ہوئی اور جلد ہی پھر عنایات خسروانی کے مستحق قرار پائے۔

انیسویں سال عالمگیری میں شاہزادہ شاہ عالم بہادر، خان جہاں کی معیت میں ابوالحسن شاہ والی تلنگانہ کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا اور معمولی کشمکش کے بعد حیدر آباد پر قبضہ کیا۔ بادشاہ عالمگیر نے فتح کی خبر سُن کر میر عبدالکریم سندھی کو منتخب فرمایا کہ وہ شاہی خلعت وانعام وغیرہ، فاتح شاہزادہ اور دوسرے سرداروں کے لیے لے جائیں۔ چنانچہ میر صاحب شاہی تحفے تلنگانہ لے چلے۔ جب حیدر آباد سے چار کوس کے فاصلہ پر یہ قافلہ پہنچا، اس وقت شیخ نظام حیدر آبادی لشکر لے کر اس قافلہ پر ٹوٹ پڑا۔ زروجواہر اور شاہی ساز و سامان لُوٹا گیا، چند آدمی مارے گئے، چند زخمی ہوئے۔

میر عبدالکریم کو زخمی حالت میں میدان سے اُٹھا کر ابوالحسن کے پاس پہنچایا گیا، جس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے ان کو رات کے وقت شاہی لشکر میں پھنکوادیا، محمد مُراد خاں حاجب کو جب معلوم ہوا، تو وہ میر صاحب کو اُٹھا کر اپنی قیام گاہ پر لے گیا اور وہاں ٹھہرا کر میر صاحب کا علاج کرایا اور ان کی خاطر تواضع کی، جب ٹھیک ہو گئے اس وقت شہزادہ کے حضور میں پیش کیا۔

سامان تو تمام لٹ گیا تھا، باقی شاہی پیام عرض کیا، خان جہاں واپسی کے لیے تیار تھے، میر صاحب بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔

عہدہ کروری : محاصرۂ گولکنڈہ کے دوران میں جب شریف خان دکھنی صوبوں کے جزیہ وصول کرنے پر مامور ہوا، تو اس کی جگہ شاہی لشکر کی کروری گری میر صاحب کے سپرد ہوئی اور اس دوران میں جرمانہ وصول کرنے کی داروغگی بھی آپ کے حوالے ہوئی۔

میر صاحب نے کروری گری کے سلسلے میں اپنی حُسنِ خدمت کے خوب جوہر دکھائے۔ "شاہ دیں پناہ" بہت راضی ہوئے اور میر صاحب کو "ملتفت خان" کے لقب سے سرفراز فرمایا اور خواجہ حیات کے انتقال کی وجہ سے "آبدار خانہ" کی خدمت بھی ان کے سپرد کی۔

چھتیسویں سال عالمگیری میں مآثر لکھتا ہے کہ :۔

"بخدمت قرب رتبت داروغگی خواصاں از انتقال انور خان پسر وزیر خان شاہ جہانی، واز اصل و اضافہ منصب ہزاری برافراختہ در تقرب و مزاج دانی محسود اماثل شد" (۱۱۲)۔

یعنی انور خان کے وفات پا جانے کے بعد منصب بھی بڑھا اور "داروغہ خواصان" کا عہدہ پھر آپ کے سپرد کیا گیا۔

خطابات میں اضافہ : بادشاہ کی عنایات کی وجہ سے امیر عبدالکریم کے اعزاز اور مناصب میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ "ملتفت خاں" کا لقب ملا تھا، اس کے بعد پینتالیسویں سال میں۔۔۔۔ "خانہ زاد" کے خطاب سے سرفراز ہوئے :

"از کمال عنایات بہ افزائش لفظ۔ میر۔ بر خانہ زاد خانی چہرۂ عزت افروخت"

اڑتالیسویں سال عالمگیری میں جب تورنا کا قلعہ فتح ہوا تو آپ کو اپنا موروثی خطاب "امیر خان" بھی عنایت ہوا۔ اس سلسلے میں شہنشاہ نے ایک دن ازراہِ تلطف فرمایا، کہ "جب تمہارے والد کو یہی خطاب ملا تھا تو انہوں نے ۱۰۰۰ھ سال کی مناسبت سے ایک لاکھ روپے بادشاہ کے حضور میں نذر گزرانہ تھا اور اب اس خطاب کے ملنے پر تم کیا نذر کرتے ہو؟" میر صاحب نے عرض کی :۔

"ہزار ہزار جان فدائے ذات مقدس باد، جان و مال ہمہ تصدق حضرت است" (۱۱۳)۔

دوسرے دن میر صاحب نے یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کلام مجید بادشاہ کے رُوبرو ہدیہ کیا۔ شہنشاہ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ "تم نے ایک ایسی چیز پیش کر دی جس کی قیمت ساری دنیا اور آخرت بھی نہیں ہو سکتی" (۱۱۴)۔

واکنگیرہ کی فتح کے بعد :۔

"بہ افزونی پانصدی از اصل و اضافہ بمنصب سہ ہزاری کامیاب دولت گردید" (۱۱۵)۔ یعنی پانصدی کے اضافہ سے سہ ہزاری منصب پر فائز کئے گئے۔

مقرب خاص : آخر عہدِ عالمگیری میں میر صاحب، شہنشاہ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئے، دن رات تقرب رہنے لگا اور بادشاہ کو ان سے نہایت اُنس ہو گیا، مآثر کا بیان ہے :۔

در مصاحبت و محرمیت فوق نداشت، چہ شب و روز بہ باریابی حضور تفوق می اندوخت" (۱۱۶)۔

مآثر عالمگیری کے حوالے سے، مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ واکنگیرہ سے تین کوس کے فاصلے پر "دیوار پور" کے مقام پر بادشاہ کے مزاج میں خلل پڑا۔ طبیعت ناساز ہو گئی۔ مرض نے اس حد تک شدّت اختیار کی کہ ضعف اور کمزوری کی وجہ سے بیہوشی کے دورے پڑنے لگے اور :۔

"ازانجا (کہ سن بہ نود رسیدہ) یاسی تمام، بہ مردم رو آورد، نزدیک بود کہ از ہول آں حادثہ ملک بہم بر آید" (۱۱۷)۔

اسی دوران میں، امیر خان نقل کرتا ہے کہ ایک روز انتہائی ضعف کے عالم میں بادشاہ سلامت ذیل کے اشعار گنگنانے لگے :۔

بہشتاد و نود چوں در رسیدی
بسا سختی کہ از دوراں کشیدی
وزانجا چوں بہ صد منزل رسانی
بود مرگے بصورت زندگانی

میں نے جب یہ اشعار سنے تو عرض کی کہ حضور، شیخ گنجوی علیہ الرحمتہ نے انہیں اشعار کے تمہید میں ایک شعر لکھا ہے، فرماتے ہیں :۔

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری
دراں شادی خدا را یاد داری

شہنشاہ نے فرمایا کہ پھر پڑھو، میں نے چند مرتبہ شعر کو دُہرلیا، پھر فرمایا کہ اس کو لکھ کر پیش کرو، چناں چہ میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ بار بار اس کو پڑھتے رہے اور "خدائے توانائی بخش" نے آپ کو قوت اور صحت عطا کی۔"

دوسرے دن صبح کو بادشاہ "دیوانِ مظالم" میں تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ "تمہارے بتائے ہوئے شعر نے مجھے صحتِ کامل بخش دی اور غیر معمولی قوت میرے جسم میں پیدا ہو گئی" (۱۱۸)۔

صاحب مآثر الامرا آخر میں میر صاحب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :۔

"خان مذکور بہ جودت فہم و حدت ادراک و شگوفی، حیثیت و بلندی استعداد (کہ ازاں بہ قابلیت تعبیر رود) ممتاز بود" (۱۱۹)۔

اشعار کا ذکر آ گیا ہے، تو اس مناسبت سے ضرور ہوا کہ میر صاحب کی ادبی مہارت کا بھی تھوڑا سا ذکر کر دیا جائے۔

تاریخ گوئی : آپ کے علمی اور ادبی ذوق کے متعلق بہت ہی کم لکھا گیا ہے، تاریخ سے ہمیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شعر و شاعری سے شغف تھا اور شعر کے ذریعے استخراج تاریخ میں کافی مہارت تھی، اس سلسلے میں ہمیں چند مثالیں ملی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں :۔

ایک دفعہ بیجاپور کے محاصرے کے دوران میں بادشاہ سلامت، خندق اور بند کے دمدمہ کو ملاحظہ فرمانے کے لیے تختِ رواں پر تشریف لائے، دمدمہ قلعہ کے کنگرہ کے سامنے تھا، جب بادشاہ کی سواری پہنچی تو قلعہ سے "چرخ آشوب" توپ چلی اور گولے ان کے تخت کے اوپر سے گزرتے ہوئے جا کر گرتے تھے، میر صاحب داروغۂ جانماز کی حیثیت سے اس وقت جلو میں تھے، فوراً آپ نے مصرعہ تاریخ کہا :

"فتح بیجاپور روزے می شد"

۱۰۹۹ھ

ایک پرزہ کاغذ پر لکھ کر حضور میں پیش کیا، بادشاہ نے اس کو فال نیک سمجھ کر فرمایا کہ۔۔۔

"خدا کند چنین باشد۔"

اس ہفتہ قلعہ سورت کی فتح نصیب ہوئی، حصار گولکنڈہ کی جب تسخیر ہوئی تو میر صاحب نے کہا:۔

۱۰۹۹ھ

"فتح قلعہ گول کنڈہ مبارک بادا۔"

اس پر بادشاہ کی طرف سے بہت تحسین کی گئی۔

شاعری: ان کی تاریخ گوئی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں شاعری سے لگاؤ تھا، چنانچہ میر علی شیر نے ان کا تذکرہ مقالات الشعراء میں "ملتفت" کے تخلص سے کیا ہے، اور دو شعر بھی نمونۃً دیے ہیں:۔

جاں کردہ ام ضیافت تیر تو راست گو
مفلس ازیں زیادہ بہ مہماں چہ می کند
ہمدرد ما کسی است کہ داغ است بر دلش
باما دریں دیار ہمیں لالہ آشنا است

آخری شعر کی نسبت لکھا ہے کہ یہ مرزا جانی کی طرف بھی "بیاض" میں منسوب ہے۔ واللہ اعلم (۱۲۰)۔

عزت اور وقار کا منظر: جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، بادشاہ کے خاص تقرب اور عنایت کی وجہ سے میر صاحب تمام امرا میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے، عوام تو خیر لیکن امرا اور شاہزادے بھی شاہی لطف و عنایت کی وجہ سے آپ کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ صاحب مآثر الامرا لکھتا ہے کہ:۔

"چوں مواد پندار و خود آرائی آمادہ داشت، کہ گوشۂ نخوت بر سر بے نیازی کج می گزاشت، و باکم منصبی از جمیع نوئیان بلند مقدار یکسر و گردن بر خود می مالید، امیر

زادہائے خاندان در جلواو راہ می رفتند، نگاہ دُرست بجانب کسی نمی کرد، نقش اعتبارش دربارگاہ سلطنت آن چناں بر کرسی نشست کہ عمدھا کسی (کہ پالکی بہ لو از سرکار پادشاہی عنایت شدہ) دیگرے از بادشاہ زادہ، وامرا پالکی سوار "در گلال باڑی" نیامد از چندے جملہ الملک اسد خان وروح اللہ خاں مجاز گشتند، ازیں جا رتبۂ او تواں شناخت کہ قدر در دل بادشاہ جا کردہ، در دیانت ہم قدم می گزاشت......

اہلِ روزگار بہ فرمایش او جنس ہر دیار بہ قیمت نصف و ثلث ارسال می کردند۔ دیدہ و دانستہ نگاہ می داشت و در پردہ قدغن استیعاب حصص از وی می نمود" (۱۲۱)۔

عالمگیر کے بعد : بادشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد میر عبدالکریم، شہزادہ محمد اعظم کے ساتھ رہے، وہ جب گوالیار میں تھے، تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ جب بہادر شاہ تخت حکومت پر جلوس افروز ہوا تو میر صاحب بھی اس کے امرا میں شامل ہوگئے اور بقول مآثرالامرا،

"امرائے عہدِ سلف از مخلص و مخالف بافزونی مناصب کام دل افروختند۔"

تو یہ بھی :۔

"از اصل و اضافہ بمنصب سہ ہزاری پانصد سوار مورد مرحمت شد" (۱۲۲)۔

لیکن! "آن قرب و مصاحبت کو؟ و آں ناز و تبختر باکہ؟"

اس لیے ناچار میر صاحب نے قلعہ داری پر اکتفا کی اور گوشہ گیر رہنے لگے۔ منعم خاں، خان خاناں نے از راہِ مروّت اور گزشتہ تعلقات کی بنا پر قلعہ داری کے ساتھ ساتھ آگرہ کی صوبہ داری بھی ان کے سپرد کی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس سے معزول کیے گئے اور فقط قلعہ داری ان کے پاس رہی۔

فرخ سیر کا زمانہ : محمد فرخ سیر کے وسطی دَور میں جب سادات بارھہ کا زور ہوا، تو بادشاہ نے امرائے عالمگیری کو از سر نو نوازنا شروع کیا، چناں چہ عنایت اللہ خاں، حمید اللہ خان بہادر، اور محمد نیاز خاں پر دوبارہ نوازشیں شروع ہوئیں اور ساتھ ہی :۔

"خان مذکور را نیز از آگرہ طلب حضور نمودہ بداروغگی خواصان ممتاز گردانیدند" (۱۲۳)۔

سادات بارھہ کا زمانہ : فرخ سیر کے معزول و مقتول ہونے کے بعد، جب سادات بارھہ

تمام سلطنت پر چھاگئے تو انہوں نے میر صاحب کے ساتھ اور زیادہ سلوک کرنا شروع کیا، افضل خان صدر الصدور کو عہدہ سے الگ کیا گیا تو وہ جگہ میر صاحب کو دی گئی، سادات بارھہ اور میر صاحب کے تعلقات کاذکر کرتے ہوئے مآثر الامر الکھتا ہے کہ :۔

"قطب الملک بمراعات پیشیں رتبہ تعظیم و توقیر او از دست نمی داد و بر گوشہ مسند خود می نشاند" (۱۲۴)۔

وفات :وفات کی تاریخ ہمیں نہیں ملی، مآثر الامرا سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں میر صاحب کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر مکلی کے قبرستان میں ہے، جسے صاحب تحفۃ الکرام اور کزنس نے غلطی سے (جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا) میر ابوالبقا کی قبر بتایا ہے۔ ان کی اولاد کی تفصیل بھی نہیں ملی۔ مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعدد لڑکے تھے لیکن ان میں کوئی لائق نہ تھا :۔

"ہیچ کدام رشدے نکردہ بہ اندوختہ پدر بسند نمودند" (۱۲۵)۔

ابوالخیر خان :ان کے ایک لڑکے ابوالخیر خاں کے متعلق صاحب مآثر لکھتا ہے کہ :۔

"بنائے قرابت باخان دوران خواجہ عاصم در عہد بادشاہ (؟) مرحوم خطاب خانی یافتہ، جمعیت ودستگاہ داشت وہمراہ خاں مزبور بسر می برد" (۱۲۶)۔

صاحب مآثر نے امیر خاں میر عبدالکریم کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

ایک واقعہ : "گویند، روزی بادشاہ پیغامی با امیر خاں سندھی ہتہ فرمود کہ بہ کامگار خاں برساند، او مصحوب معتمدی ازیں ماجر خان مزکور را مطلع ساختہ، استدعائے آمدنش بہ خانۂ خود کرد، خان مذکور بدر تجاہل زدہ پرسید کہ کدام امیر خاں خود بینے عم ما بود؟ واسطہ گفت کہ امیر خاں عبدالکریم ہتہ، گفت یعنی عبدالکریم فراش؟ بگوئید ما بخانہ، فراشان نمی آئیم، و بہ این حرف تلمیح بداں کرد کہ میر عبدالکریم مدتے داروغگی جانماز خانہ بادشاہی داشت۔

چوں امیر خاں ایں نقل پیش بادشاہ کرد فرمود کہ آخر پسر جعفر خان است، در خانہ نبایستے طلبداشت" (۱۲۷)۔

کامگار خاں، جعفر خان کا دوسرا لڑکا تھا اور بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا، نعمت خاں عالی نے اسی کے لیے ایک ہجویہ قطعہ لکھا تھا، جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

کتخدا شد بار دیگر خان عالی منزلت
باکمال و عز و تمکین و وقار و زیب و زین

میر ابوالمکارم شہود

میر ابوالبقا امیر خاں کے صاحبزادے (یعنی میر عبدالکریم کے بھائی) تھے، تحفۃ الکرام نے ان کو "ولی کامل" لکھا ہے اور آپ کی سادہ اور صاف زندگی کی بہت تعریف کی ہے، باوجود ان کے کہ باپ نے کافی سرمایہ چھوڑا تھا، پھر بھی وہ نہایت ہی فقیرانہ طور پر بسر کرتے تھے (۱۲۸)۔

میر علی شیر قانع، اپنی دوسری تصنیف مقالات الشعرا میں ذرا تفصیل سے کام لیتے ہوئے، میر صاحب کے متعلق لکھتا ہے:

"صاحب کشف و کرامات، واقف عالی مقامات، سراسر شہود، پیوستہ با معبود می بود، ...... در عین دولت والد خود را بحدے شناختہ کہ بائے حوائج ضروری خود، بہ بازار می شتافت، و کارہائی خود بدست خود می کرد" (۱۲۹)۔

والد ایک مرتبہ ان کی اس کسر نفسی پر ناراض بھی ہوئے لیکن انہوں نے عرض کی کہ :۔

"چرا از دست نموئی کسے عار دارد" (۱۳۰)۔

علوم ظاہری میں کافی دستگاہ رکھتے تھے اور ہر شعبۂ علم میں آپ کو استادی کی حد تک قدرت حاصل تھی، "مقالات" میں ہے :۔

"در ہر چہاردہ علم یگانہ می زیست" (۱۳۱)۔

یہی مصنف تحفۃ الکرام میں رقمطراز ہے کہ :۔

"در علوم ظاہری ہم جامع بودہ" (۱۳۲)۔

یہی مصنف مقالات الشعرا میں یہ واقعہ نقل کرتا ہے :۔

"کہ ایک مرتبہ امیر الملک خان ابراہیم تتوی نے آپ کی دعوت کی، شام ہوتے ہی قاضی صاحب نے ملازموں سے قندیلیں روشن کرنے کو کہا، قندیل کے قاف کو قاضی ابراہیم نے فتح کے ساتھ کہا، میر صاحب نے ٹوکا کہ قندیل کا قاف کسرہ کے ساتھ ہے، قاضی صاحب چونکے، بحث کی اور آخر لغت کی طرف رجوع کیا، لغت

ب نے میر صاحب کی تائید کی۔"

آپ فرماتے تھے کہ مختلف علوم پر پانچ سو جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے سب کی سب مجھے ازبر ہیں۔

تصانیف اور شاعری: آپ نے ایک مثنوی میں "سلیمان اور بلقیس" کا قصہ لکھا اور نام "پری خانۂ سلیمان" رکھا (۱۴۳)۔ ایک دیوان فارسی میں مرتب فرمایا اور ایک مثنوی قصہ "بدیع الجمال وسیف الملوک" لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی (۱۴۴)۔

شعر میں شہود تخلص کرتے تھے، صاحبِ مقالات نے آپ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔

در تعریف انبہ

ز وصف انبہ چوں گویم کہ چون است — کہ از رشک شرابش شہد خون است
ز نام او چو گیرم لذت قند — زبان با کام و لب بالب شود بند
بسختی ہمچو لعل اما شکر بار — بنرمی چوں طلاے دست افشار
بطفلی چوں دل معشوق سنگ است — بپیری چوں رخِ من زرد رنگ است
ز شیریں کاریش چوں نخل عسل شد — زمرد باز در یاقوت حل شد
شرابش بہتر از شیر و شکر ہست — گہے ہمرنگ سیم و گاہ زر ہست
بصورت مردم و باشجار — کلیم آرزو را شعلہء نار

(از مثنوی "پری خانۂ سلیمان")

رباعیات

ما آئینہ جہاں نمائے یاریم — رخت دگریم و زیب ابن بازاریم
چوں سنگ ترازو وئیم در پلۂ خویش — بیکار نشستہ ایم و ہم در کاریم

ہر چند غبار را عروج سطع است — آخر چو نگہ کزتہ پا نطع است
جمعیت دنیا ست پریشانی را — چوں دو ختن جامہ کہ بہر قطع است

ابناے زمانہ یکسر از بندۂ و حر — باشند زماں یکدگر مایدہ خور
چوں شیشہء ساختند در دست فلک — تا ایں نشود تہی نگردد آں پر

بیت

در حیرتم کہ گوشہ نشینان زیر خاک   دور از رخ تو چوں مژہ نہادہ اند

☆

میر صاحب نے ایک رباعی مولانا لطف اللہ نیشاپوری کے رنگ میں لکھی ہے جس کا ہر مصرعہ پانچ چیزوں پر مشتمل ہے یعنی گل، زمانہ، اسلحہ، جواہر اور عنصر میں سے ہر قبیل کے نام اس میں آئے ہیں، مولانا لطف اللہ نے لکھا تھا:

گل واد پری درع فیروزہ بباد   دے جوشن لعل لالہ برخاک فتاد
داو آب سمن خنجر مینا امروز   یاقوت سناں آتش نیلوفر واد

میر صاحب نے اسی رنگ میں کہا:

گل واد پری قبائے یاقوت بنار   دی، بادہ بدرع لالہ شد لعل نگار
امروز درآب کلہ، زد نسریں   فردا سازد سمن ز خاک فیروزہ ازار

میر علی شیر قانع صاحب مقالات الشعرا کا بیان ہے کہ اس نے "لطائف الطوائف" میں دیکھا ہے کہ جب مولانا لطف اللہ نے یہ رباعی کہی تو اس عہد کے شعرا نے ان کو بہت داد دی اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے نہ اس قبیل کی رباعی کسی شاعر نے کہی ہے نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکے گا۔ چنانچہ اس زمانے کے ایک شاعر اسمی نے جو "سر آمد شعرائے نیشاپور اور فاضل استاد وقت تھا" پورے ایک سال تک زور لگایا لیکن آخر عاجز آ گیا اور کچھ نہ کہہ سکا" (۱۳۵)۔

میر صاحب کا ایک اور شعر بھی مقالات میں درج ہوا ہے جو آپ نے اپنے بھائی عبدالرزاق کی غزل پر ایک غزل میں کہا ہے۔

مست نوش لعل او کے دست سوے مے برد   نغمہ ساز عشق او کے دست سوے نے برد

مندرجہ ذیل اشعار ایک قلمی بیاض سے لیے گئے ہیں جس کا نام "بیاض ثناء اللہ خان" ہے اور میرے کتب خانہ کی زینت ہے۔

تبسم در لبش چوں خندۂ گل | فسوں در نرگش چوں نشہ در مل
چساں پنہاں کنم راز خرابات | اشارت می کند مینا کہ قل قل
حجاب روے اوہم روے اوشد | نقاب غنچہ عین چہرۂ گل
ز کفر اسلام را گرم است بازار | کی زینت نیست اورا غیر کاکل
شہود از بسکہ در بستاں غزل خواند | بہ بستاں نام او خوانند نہ بلبل

انسی ایک شاعر تھا۔ ۱۰۵۲ھ میں اس کا انتقال ہوا، میر شہود نے تاریخ وفات لکھی۔

قدح بشکست مستان سخن را | نفس بگداخت مرغان چمن را
ازیں پس ہر نوا کز بلبل آید | بگوش گل ہمہ شیون نماید
شہود از حق بہ "انسی" مغفرت خواہ | کہ وقت است ایں اجابت کرد اللہ
الٰہی از بحار جود یک نم | کہ پیش تشنہ لب بیش است از یم
ز ابر لطف خود برما بباراں | کزاں باراں شود گلخن بہاراں
لب انسی کہ شد لب تشنہ در خواب | بکن زاں نم بہ گلشن گور سیراب
پے تاریخ نقل آں سخن سنج | گرفتم گوہر چند از گراں گنج
قلم در خون سال غم سرشتم | "بہشتش داد جائے ایزد" نوشتم

۱۰۵۲ھ

وفات: آپ نے بقول مقالات سنہ ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی، اور حضرت لعل شہباز رحمتہ اللہ علیہ کے جوار میں دفن ہوئے، ان کی سکونت زندگی میں وہاں تھی، اور وفات پا جانے کے بعد وہیں پیوند خاک ہوئے، مرنے سے تھوڑی دیر پہلے، اپنی تاریخ وفات کہی تھی، جو بعد میں آپ کے لوح مزار پر کندہ کی گئی۔

کسے گر بپرسد ز تاریخ ما
ہمیں گو "بہ جنت خدا داد جا" (۱۳۶)۔

۱۰۷۳ھ

اولاد: تحفتہ الکرام میں آپ کے تین صاحبزادوں کے نام آتے ہیں:
(۱)۔ میر امین الدین حسین خان۔ (۲) میر رضی الدین محمد فدائی۔ (۳) میر حافظ الدین خان۔

اسی مصنف نے "مقالات الشعرا" میں ایک اور صاحب زادے کا نام بھی لکھا ہے۔
(۴) معین الدین حسن خان

ا۔ میر امین الدین حسین خان

تحفۃ الکرام نے لکھا ہے کہ ایک مدّت تک وہ ٹھٹھہ کے حاکم تھے:

"بہ ایالت تتہ زمانے قدر اعزاز برافراختہ مقیم جاوید شد" (۱۳۷)۔

پھر ٹھٹھہ کے نوابوں کی جو فہرست صاحب تحفۃ الکرام نے دی ہے، اس میں سعید خان المشہر بہ "خانہ زاد خاں" اور نواب یوسف خان کے مابین اُن کو ٹھٹھہ کا نواب سن ۱۱۱۴ھ میں قرار دیا ہے، جو بقول مصنف چھیالیسواں سن جلوس ہوتا ہے۔

اس سے آپ کا ٹھٹھہ کے ایالت پر آنا تو ثابت ہوتا ہے، لیکن سال ورود کے متعلق ہمیں شبہ ہے کیونکہ مصنف نے نوابان ٹھٹھہ کی جو فہرست مرتب کی ہے، وہ اکثر حالتوں میں تاریخی نقطۂ نگاہ سے دُرست نہیں ہے اور نہ اس کے سنین برابر ہیں۔ علاوہ ازیں فوجدار، ایالت دار اور صوبہ دار میں بھی کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ بعد کے جن مصنفین نے گورنروں کی فہرست دی ہے، انہوں نے بھی فقط تحفۃ الکرام کو آنکھیں بند کر کے اپنا ماخذ قرار دیا ہے، اپنی طرف سے کوئی تحقیقات نہیں کی۔ یہی مصنف اُن کے متعلق لکھتا ہے کہ:۔

"امیرے والا مقدار بود۔ اغلب لوقات بہ مطالع کتب و صحبت باعلما پر داختہ" (۱۳۸)۔

تصانیف

میر امین الدین خاں نے چند کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں سے دو کتابوں کے نام تحفۃ الکرام کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں۔

(۱) رشحات الفنون: اس کتاب میں "چہاردہ علوم" سے مختلف پیرایوں سے بحث کی گئی ہے، کتاب کا ایک قلمی نسخہ، پٹنہ کے کتاب خانہ خدا بخش میں موجود ہے۔ کتاب میں ۱۵۲ ورق ہیں، ہر ورق ۱۹ سطروں کا ہے۔ خط تعلیق ہے۔ سن ۱۲۷۳ھ میں اس کی کتابت ہوئی ہے، کاتب

کا نام سیّد احمد ابن سید حبیب اللہ ہے۔ مصنف کا نام فہرست میں اس طرح لکھا گیا ہے۔ "امین الدین بن سیّد ابوالمکارم بن سیّد امیر خان حسینی الہروی" (۱۳۹)۔

(۲) معلومات الآفاق: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ کتاب فلکیات پر لکھی گئی تھی، لیکن اس میں عجیب و غریب قصے بھی پائے جاتے ہیں، چنانچہ ایک قصہ اس کتاب کے حوالے سے تحفۃ الکرام میں یہ درج کیا گیا ہے :۔

"عالمگیر کے آخری دور میں سندھ کے ساواتی پرگنہ کے ایک قصبہ میں جو "برسر کولاب نیلوفری" تھا اور اس میں کسی زمانے میں زیادہ تر برہمن اور قبیلہ چاچک کے لوگ رہا کرتے تھے، ایک چاچک عورت کے ہاں چھ ماہ کا بچّہ پیدا ہوا۔ قبل از وقت پیدا ہونے کی وجہ سے فقط گوشت کا ایک لوتھڑا تھا، انسانی صورت ابھی اس نے اختیار نہیں کی تھی، نہ اس میں رُوح کی رمق پیدا ہوئی تھی، ایسی حالت میں والدین نے بجائے دفن کرنے کے اس کو کسی گرم جگہ میں محفوظ کر دیا، رفتہ رفتہ اس نے صورت اختیار کرنی شروع کی اور آہستہ آہستہ اس کے کان، ناک اور ہاتھ پیر نکلنے لگے۔ دس ماہ کے بعد اس نے پورے بچّہ کی شکل و صورت اختیار کر لی اور ماں کا دودھ بھی پینا شروع کیا۔ والدین نے بعد میں عمر کوٹ لے جا کر اس کی پرورش کی، وہ بچّہ ۱۰ برس تک زندہ رہا، اس کے بعد مر گیا" (۱۴۰)۔

امین الدین خان کے استاد ٹھٹھہ کے مشہور فاضل شیخ عبدالواسع تھے، جو اپنے زمانے کے یگانۂ عصر صوفی اور عالم متبحر تھے، بہت سی تصانیف بھی آپ نے چھوڑیں اور صاحب مقالات الشعراء کے قول کے مطابق مخزن الاسرار کی شرح قاضی ابراہیم ٹھٹوی سے بھی بہتر لکھی تھی (۱۴۱)۔

وفات: خان بہادر خداداد مرحوم نے "لب تاریخ سندھ" میں نوابان ٹھٹھہ کی وہی فہرست دی ہے جو تحفۃ الکرام میں درج ہے، انہوں نے بھی ایالت ٹھٹھہ کی تاریخ سن ۱۱۱۴ھ بتائی ہے، البتہ ایک قیمتی اضافہ کیا اور لکھا ہے کہ میر صاحب کوہِ مکلی میں دفن ہوئے، ان کے مقبرہ پر چند آیات و احادیث اور ابیات کے بعد، لوحِ مزار کا قطعہ ذیل میں لکھا ہوا ہے جس سے سن وفات نکلتا ہے :۔

خانِ با تمکین امین الدین خان
عالی از حسن عمل درجات او
چوں سفر کرد از جہان بے ثبات
سال فوتش "داخل الجنات" او (۱۴۲)۔

داخل الجنات سے وفات کا سن ۱۱۲۷ھ نکلتا ہے، جس کا عیسوی سال سن ۱۷۱۵ء ہوتا ہے۔

اولاد : تحفۃ الکرام نے آپ کے تین صاحبزادوں کا ذکر کیا ہے،

متین الدین خان اسمٰعیل : بقول میر علی شیر قانع۔

"در حیات پدر بخدمت عمدہ نام و روزگار و داخل اجلہ اعیان زیستہ، در مکنت و قدرت میرزائی مثل است" (۱۴۳)۔

ان کے دو صاحبزادے ہوئے ا۔ میر محمد غوث، جو نواب نور محمد خاں عباسی، والی سندھ کے زمانہ میں منصب داروں کی بخشی گری پر مامور تھے اور بزرگی میں اپنے زمانے کے مستثنیٰ لوگوں میں سے تھے (۱۴۴)۔

محمد غوث کا ایک لڑکا بھی اس دربار میں باپ کی جگہ پر مقرر ہوا، ان کا نام صاحب تحفۃ الکرام نے میر کریم الدین لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ان کے بڑے لڑکے ہیں اور اب تک اپنے باپ کے عہدہ پر مامور ہیں۔ متین الدین خان کے دوسرے صاحبزادے کا نام تحفۃ الکرام میں میر ابوالفاخر لکھا ہے۔ ان کے متعلق اور کچھ نہیں بتایا۔

میر محمد گدا : میر امین الدین کے دوسرے صاحبزادے کا نام میر کلب علی خاں تھا اور میر محمد گدا کے نام سے مشہور تھے، ان کے لیے میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں لکھا ہے :۔

"بہ بزرگی مفرد، عن قریب گزشتہ"

مقالات الشعرا میں ذرا تفصیل سے کام لیا ہے، کلب علی خاں کے حال میں لکھا ہے کہ :۔

"شیوۂ بزرگان بہمہ باب در ذات سعادت مآب او مضمر، بحسن اخلاق و کمال بلاغت معروف و موصوف۔"

چند اشعار بھی نقل کیے ہیں :

چوں آئینہ بیتاب نگہ بود دل ما
ہر چند ترا دید نیاسود دل ما

سگ صحاب کہف یافت نجات
چوں نیابد نجات کلب علی

بے یاد روے یار چہ در دل کند کسے
جائیکہ نیست یار چہ محفل کند کسے
ہمچوں حباب برسر بحریم بے قرار
ہر روی سطح آب چہ منزل کند کسے

کلب علی خاں کا ایک لڑکا ہوا، مگر اس کا نام نہیں دیا۔

میر محمد عطا : میر امین الدین خان کے یہ تیسرے صاحبزادے ہیں، تحفۃ الکرام میں ہے کہ :-

"بر قدم آبا مزید عزت وافتخار چہار سال پیش از تحریر ایں اوراق در گذشتہ۔"

دو لڑکے ان کے ہوئے لیکن ان کا نام مذکور نہیں۔ مقالات الشعراء میں میر علی شیر، محمد عطا کی نسبت مزید تفصیل سے کام لیتے ہیں اور ان کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "بھمہ وجوہ شائستہ، و بر آثار بزرگان سلوک، بسیار خوش اختلاط و خلیق و متواضع است، صحبت ہائے امرا دیدہ، و فیض آداب از خدمت والد ماجد فرا اندوختہ، در سادات امیر خانی ممتاز و مشار الیہ می باشد۔"

عطا شاعری بھی کرتے تھے، تصوف کی طرف طبیعت مائل تھی، مقالات میں آپ کے چند شعر ہیں :

محو گشتم در خیال یار خویش
خود شدم آخر عطا غمخوار خویش

اے عطا ایں عطا بما حق کرد
پرد ہائے حجاب را شق کرد

چارۂ کار ما چو او نہ کند
کارہا ہیچ بگفتگو نہ کند
من سپردم بہ دوست مطلب خویش
داغ اورا کہ جز نکو نہ کند

میر محمد جعفر کے نام سے ان کے خانوادہ کا ایک سیّد وفات پا گیا، اس کی تاریخ نکالی :۔

"آبِ کوثر بہ کام جعفر" ۱۱۴۵ھ۔

حیات نامی ایک عورت سے دلی لگاؤ تھا اور بقول صاحبِ مقالات اس کو اپنی رُوح جانتے تھے، وہ وفات پا گئی تو کہا :۔

"ہائے حیاتم رفت" (۱۱۴۵)۱۱۵۵ھ۔

۲۔ میر رضی الدین محمد فدائی

میر ابوالمکارم شہود کے دوسرے صاحبزادے تھے، صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں :۔

"بہ محاسن والا موصوف، در شعر کامل گزشتہ، فدائی تخلص می فرمود، صاحب دیوان است از اشعارش کمالات ظاہری وباطنی پر مسامع روزگار می رسد۔"

صاحبِ دیوان تھے، مرصع قصیدے لکھتے تھے، ایک قصیدہ کا ایک شعر جو چار صنعتوں میں ہے، صاحبِ مقالات نے نموتناً دیا ہے :

عدوی خاندان او بہ شمع کشتہ (و گشتہ؟)
سپر خاک و بہ پابند و برو، اشک و بہ دل اخگر

ایک اور غزل کا شعر انتخاب کیا ہے :

غیر خاموشی کسے از درد ما آگاہ نیست
آہ را بہر عیادت بر سر ما راہ نیست

ان کی وفات سن ۱۱۲۰ھ میں ہوئی۔ صاحبِ مقالات الشعرا نے تاریخ وفات اس شعر سے نکالی ہے:

بسکہ یہ فوتش ہمہ گفتند ہے
ہے رضی الدین بود سال وے

۱۱۲۰ھ

میر حیدر الدین کامل: ان ہی میر رضی الدین کے صاحبزادے اپنے دور کے بلند پایہ ادیب اور نامی شاعر مانے جاتے ہیں۔ نام میر حیدر الدین۔ ابو تراب غالباً کنیت تھی، اور کامل تخلص کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل اور بزرگی کے متعلق صاحب تحفتہ الکرام و مقالات الشعرا رطب اللسان نظر آتا ہے۔ تحفتہ الکرام میں لکھا ہے کہ :۔

"استاذ محقق مجرد زیستہ، در کمالات آنجناب کتابہا باید، بسا اہل دل صحبتش سرمایہ فیوضات ظاہری و باطنی می دانستند، اغلب بزرگان بہ قدم ارادت بہ وے سلوک داشتند ہرگز رجوع بہ دنیا نہ فرمودہ، و بہ عمل منطوقہ 'کن فی الدنیا کانک غریب او عابری السبیل' زیستہ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ازدواجی زندگی کی قید کبھی گوارا نہیں فرمائی۔ میر علی شیر مقالات الشعرا میں زیادہ وضاحت سے کام لیتا ہے، جس سے ان کے حُسنِ اخلاق اور حُسنِ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے :۔

"جناب کامل، آں میر بے نظیر، سراپا کمال و مرجع ارباب کمال بودہ، فقر اختیاری برگزیدہ، حصور و مجردی زیستند۔ باوجود آنکہ معیشت آں بہ عسرت کلی بود، و اکثر ارباب دول، مثل نواب مہابت خاں کاظم وغیرہ حکام بہ سماجتہا وظیفہ و نیاز عرض می کردند، از ہیچ کدام قبول نہ فرمودہ، ہمہ راہ عزلت گزین و گوشہ گیر از ابنای دنیا پیمودند و ہر کہ از اہل دول وغیرہ بہ خدمت شان فائز می شد، بے بہرہ نمی ماند۔ صحبتش غیہ قال حال و قال اللہ و قال الرسول نہ بود، او قات بابرکات در تحزان دائمی و استغراق بسر می رفت۔ خوارق بسیار از ایشان سر زدہ است" (۱۴۶)۔

کامل کی شاعری: جناب کامل کو شاعری میں بھی کمال حاصل تھا، مختلف زبانوں میں شعر

کہتے تھے، سندھی، ہندی اور خاص طور پر فارسی میں۔ صاحب مقالات لکھتا ہے کہ :۔

"در ایہام ہندی بے مثل و دوہرہ و کبک و نکات غریب و صفات عجیب، وسائر اقسام از ایشان بسیار بر زبانہا است۔ زبان سندھی نہ دانستند و دران شعر می فرمودند، شعر فارسی ہم بر عنوان ایہام سر زد طبیعت گرامی می شد" (۱۴۷)۔

ان کی تصانیف کے متعلق صاحب مقالات لکھتا ہے کہ :

"دہ کتاب بزرگ در مسودات شعر فارسی، حین اختصار بہ میاں محمد پناہ رجا کہ شاگرد و خادم حضرتش بود، برائے تدوین سپردہ کہ ہنوز سواد بیاض نہ رسیدند۔"

پھر معلوم نہیں کہ ان مسودات کا کیا حشر ہوا۔ یہ بھی علم نہیں کہ ان کا کوئی اب دیوان موجود ہے کہ نہیں۔ سندھی شعر کسی کتاب میں درج نہیں۔ البتہ فارسی اور ہندی یعنی اردو کلام مقالات میں منقول ہے، جو آگے آتا ہے۔

کامل کے تلامذہ : آپ کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سے چند کے نام ہمیں ملے ہیں۔

(۱) ایک تو خود مصنف مقالات الشعراء میر علی شیر قانع ٹھٹوی، آپ کے شاگرد رشید ہیں، مقالات میں مختلف جگہوں پر اعتراف کرتے ہیں کہ "فقیر چندے فیض صحبتش دریافتہ۔"

"فقیر نیز در حضور آں استاد کامل گاہے فکر ہندی می کرد۔"

"قریب دو سال دیگر زبان بہ سخن آشنا نبودہ تا بہ تجدید بفیض خدمت استاد کامل میر حیدر الدین ابوتراب کامل مستفید شدہ، چند غزل گزراند۔"

(۲) سندھ کا مشہور شاعر میاں محمد پناہ رجا بھی آپ کا فیض یافتہ اور بقول مقالات حضرت کا "شاگرد اور خادم" تھا (۱۴۸)۔ انہیں کو آپ نے اس قابل سمجھا تھا کہ آپ کا دیوان ترتیب دے۔ رجا، ٹھٹھہ کا باشندہ اور اپنے دور کا مشہور اور مقبول شاعر تھا۔ اس نے فارسی میں شعر کہا ہے اور کثرت سے کہا ہے۔ مقالات میں میر علی شیر نے ۴۔۵ صفحے اس کے اشعار کے لیے وقف کیے ہیں۔ اس کا دیوان بھی مرتب ہوا تھا۔

(۳) آپ کے تیسرے شاگرد ٹھٹھہ کے سبزواری عریضی خانوادہ کے درخشندہ ستارے میر ابوالبقا بہرور علی تھے۔ آپ صاحب تصنیف تھے، شعر میں بھی آپ کا

مرتبہ اپنے ہم عصروں میں بلند تھا۔

ایک قصّہ : صاحبِ تحفۃ الکرام ایک دلچسپ قصّہ نقل کرتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہے :

"حبیب شاہ نامی، ڈاھری قوم کے ایک شخص تھے، نوجوانی میں والدین نے ان کی شادی کی، بیوی کے ساتھ پہلی رات گزاری اور صبح ہوتے ہی شہر سے غائب ہو گئے۔ بارہ سال کے بعد شہر میں نمودار ہوئے، سر پیر سے ننگے، حال مجنونانہ، نہ کسی سے بات، نہ کسی سے تعلق، منبہ پیر کے مزار پر رہنے لگے۔ لوگوں کو ان سے عقیدت ہو گئی۔ وہ بغیر کچھ کہے لوگوں کو ان کے دلوں کا حال بتادیا کرتے تھے۔

ایک دن میر حیدرالدین کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، مچھلی کا سالن تھا، انہوں نے فقط شوربہ کھانا شروع کیا، خود بھی مچھلی کے ٹکڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اور سیّد صاحب کو بھی کھانے نہیں دیتے تھے، جب انہوں نے دوسری طرف منہ پھیرا تو سیّد صاحب نے ٹکڑا اُٹھایا اور چاہا کہ منہ میں ڈال لیں لیکن مجذوب نے ہاتھ پکڑ لیا، چنانچہ وہ ٹکڑا بھی پھینک دیا اور پوری طشتری باہر پھینک دی۔ زمین پر پڑے ہوئے مچھلی کے ٹکڑے جب ایک بلّی نے کھائے تو وہ فوراً تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ سیّد حیدرالدین حیران رہ گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ایک مرتبہ مجذوب، میر محمد عطا (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے بالاخانہ پر بغیر اطلاع کیے ہوئے چلے گئے اور چادر تان کر سو گئے، اسی حالت میں تین راتیں اور تین دن گزر گئے۔ سندھ کے مشہور قومی شاعر اور ولی سیّد عبداللطیف بھٹائی رحمتہ اللہ علیہ بھی اس بالاخانہ پر فروکش تھے، جب ان کو اطلاع ہوئی تو وہ ان کے سرہانے تشریف لائے اور فرمایا کہ :

"اے مجذوب! آپ نے ایسی نیند کہاں سے سیکھی، آپ تو خواب میں بھی ایسی حالت میں ہوتے ہیں جو ہمیں بیداری میں بھی نصیب نہیں۔"

جب نادر شاہ کی ہنگامہ آرائی ہوئی اور فوجیں شہر میں داخل ہوئیں، اس وقت یہ مجذوب غائب ہو گئے، اس کے بعد پھر کبھی دکھائی نہیں دیے۔

نمونہ کلام : حیدرالدین کامل کے مندرجہ ذیل اشعار مقالات کے مصنف نے نقل کیے ہیں۔

سجود اہل دیں را نقش بر خاک دگر باشد
زمین پاک نبود در طہارت خانہ دنیا

نگاہش ساغر مل می تواں گفت
صراحی گفت قلقل می تواں گفت
شہادت جنّت از دوزخ بر آرد
چراغ کشتہ را گل می تواں گفت

فانوس حجاب است چراغ سحری را
دامن بکمر برزده بایدی سفری را

پیر گشتیم و ھماں داغ تو گرم است بہ دل
ایں نہ شمع است کہ از صبح شدن تار شود

بہ ہندوستان زلف یار منصب دار شد کامل
ہزاراں دام در جاگیر دلخواہست تنخواہش

قانع بخانہ دست بہر خواں مکش مکش
یک نان بس است منّت دو نان مکش مکش
ایما شناس نرگس بیمار یار باش
با درد ساز منّت درماں مکش مکش

خاطر جمع است حفظ آبرو ہا مرد را
راہ رفتن نیست آبے را کہ گوہر می شود

ظالم خوں ریز را در خانہ نانے کد نہ دید
چوں کماں در قبضہ اش جز استخوانے کس نہ دید

نقش آں خال سیاہ از دید پیروں کے رود
آخر اے حرف آشنایاں نقطہ ازنوں کے رود
راستی ہرجا کہ باشد ریشہ محکم می زند
از خیالم جلوہ آں سرو موزوں کے رود
جبہ سائی کرد روشن در جہاں نام نگیں
روسیاہی جز سجود از بخت واژوں کے رود

از کاروان عشق تو کامل چو نقش پا
ہر چند ماندہ بود براہ اوفتادہ بود

دریں دار یک آید و یک رود
خدا بالیقیں آید ارشک رود
خطش سرزد و پربر آوردہ شوق
چو شاہیں کہ دنیا سبزک رود

تا کے بہ آب تیغ قناعت کند کسے
لشکر جو شد گرسنہ خورد از عدو شکست

اردو اشعار: کامل سندھ کے پہلے شاعر معلوم ہوتے ہیں، جنھوں نے شاعری کے لیے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو بھی منتخب کیا۔ اس خانوادہ کو اردو کے ساتھ خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ ایک اور شاعر بھی اسی دودمان سے اُٹھے ہیں، جنھوں نے زبان اردو کو اپنایا ہے، ان کا ذکر آئندہ صفحات پر آرہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کامل نے اردو زبان میں بکثرت اشعار کہے ہیں اور ان کا اردو کلام اس دور

میں قبولِ عام کا شرف حاصل کر چکا تھا، جیسا کہ صاحبِ مقالات کے اس اشارہ سے معلوم ہوتا ہے :-

"ہر چند اشعار ہندی ایشاں عالمگیر است، اما فقیر انچہ یاد دارد نویسد۔"

لبوں دلبر کے میرے قتل پر بیڑا اوٹھایا ہے
خدایا خون سوں میرے تو اس کوں سرخ رو کرنا

چاک ناموس کا ہے سینہ میں
نام کا زخم ہے نگینہ میں

خال رخسار پر، اچنبا ہے
گال کے کھیت موں اگا ہے تِل

سویا پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا
خوں جوش دے ٹپکتا جامن اسے اُٹھا دیکھ

عشق اب ڈول ہے زلیخا کا
اس سوں آگنے ہے چاہ میں یوسف

کل کل پگل پگل کے محبت کی راہ میں
پانی ہوئی زلیخا یوسف کی چاہ میں

دوست بخشیگا دوست سب کے سب
گرچہ عاصی ہوں اس کا آسی ہوں

کہ دیا جس کے داغ چھاتی ہے

اس کے مرہم کی بات باتی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں سیّد صاحب کی دیکھا دیکھی کچھ اور شاعر بھی سندھ میں اردو سے دلچسپی لینے لگے تھے لور ایک عام فضا اس زبان کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

میر علی شیر قانع، صاحبِ مقالات الشعرا نے بھی اردو میں دلچسپی لی ہے اور کچھ اشعار اس میں کہے ہیں، چنانچہ لکھتا ہے کہ :۔

"فقیر نیز در حضور آں استاد کامل گاہے فکر ہندی می کرد"۔ اور نمونے کے طور پر اپنا یہ ایک شعر نقل کیا :۔

مجھ شہادت کی جگت میں تھی پیاس

کیوں نہ لیاوے نیلے انکھیاں کربلا

میر حیدرالدین ابو تراب کامل کی وفات سن ۱۱۶۴ھ میں ہوئی، میر علی شیر نے آپ کی تاریخ نکالی :

"انّ للمتقین جنّت۔"

۱۱۶۴ھ

۳۔ میر حافظ الدین خان

میر ابوالمکارم شہود کے تیسرے صاحب زادے تھے، یہ بھی اپنے بزرگوں اور بھائیوں کی طرح صاحب علم و فضل تھے، آپ کے سوانح میں تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے، مگر آپ کے ایک صاحب زادے کی بہت تعریف کی ہے، ان کا نام میر حفیظ الدین علی تھا، صاحب تحفتہ الکرام لکھتا ہے کہ :۔

"دریں وقت صاحبِ کمال گزیدہ ارباب حال و قال، کمالاتش چہ در نثر و چہ در نظم، بھمگی ایہام در و سہ معنی وافزوں بر آں۔"

بصارت لور سامعہ میں فتور تھا، زندگی تجرد میں بسر کی، شعر اور انشا میں، تحفتہ الکرام لکھتا ہے کہ میر کامل بے نظیر تھے۔ مقالات میں مزید تفصیل لکھتے ہوئے رقم طراز ہے کہ : "وہ اپنے چچا کامل کے تمام کمالات کے حامل تھے، طبع عالی پائی تھی، ہندی زبان کی شاعری میں خسرو ثانی تھے، وہ جن خیالات اور معنی کو اپنے دوہروں، گیتوں اور ابیات میں بند کرتے ہیں، وہ فقط انہیں کا

حصہ ہے، فارسی کے مقابلے میں ان کا کلام ہندی میں زیادہ ہے اور :۔

"ایہام کہ از دو سہ و چہار و پنج معنی ہم گاہ گاہے تجاوز دارد۔"

کلام کا نمونہ یہ ہے :

"آچار ہوا کھٹا پاپر لینی ہے مچھی
سر کا بنا تو آکے سوی سلونی اچھی

فارسی کا فقط ایک بیت دیا ہے۔

پے شکار من آں ترکتاز می آید
ز بہر صید دلم یار باز می آید

عبارت کے انداز سے ظاہر ہے کہ مقالات اور تحفۃ الکرام لکھتے وقت سیّد صاحب بقید حیات تھے۔

۴۔ میر معین الدین حسن خان

میر ابوالمکارم شہود کے چوتھے صاحبزادے تھے، ان کا ذکر فقط مقالات الشعراء میں آیا ہے۔ یہ صاحبِ حال و قال تھے، شعر بھی کہتے تھے، ایک دفعہ اپنا گھر بنوا رہے تھے، لوہے کی کیلوں کی جگہ رسّی سے کام لے رہے تھے، لوگوں نے کہا: جب آپ صاحبِ حیثیت بھی ہیں تو پھر کیوں نہیں آپ اس کو مضبوط اور پائدار بنواتے۔ آپ نے فرمایا کہ :۔

خانۂ بے بقا و فانی را
بہ ازیں دیگرے چہ آراید
فکر بیت دگر چرا نہ کنی
کہ ترا جاوداں بکار آید

آپ کے اشعار کا رنگ یہ ہے :

مرغان غریبیم اسیر قفس ہجر
ما را ز قفس باز بہ بستاں کہ رساند

سیّد صاحب نے سن ۱۱۳۳ھ میں وفات پائی، میر شیر علی قانع نے آپ کی تاریخ اس آیتِ کریمہ سے نکالی :

"ان اکرمکم عند للہ اتقاکم"
۱۱۳۳ھ

یہ تمام خانوادہ "امیر خانی سادات" کہلاتا تھا، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ابوالبقا امیر خاں تک توان کا گھرانا، ابوالقاسم خان نمکین کی مناسبت سے "قاسم خانی" کہلایا۔ لیکن اس کے بعد ابوالبقا امیر خان بکھر سے چلے آئے اور بکھر والوں سے الگ ہو کر اپنے آپ کو "امیر خانی" کی نسبت سے مشہور کیا، ٹھٹھہ کے "امیر خانیوں" میں سے کچھ لوگ سیوستان میں بھی چلے گئے تھے، جیساکہ میر ابوالمکارم شہود کے حال سے معلوم ہوا:۔

"ہر چند دریں خاندان دیگر بزرگان و بزرگ زادگان ہم گزشتہ اند و ہستند، اما بندہ بنا بر التزام بچند اسامی مذکور اکتفا کردہ۔"

چند اور امیر خانی سادات

میر ولی اعظم امیر خانی : یہ سیّد بھی امیر خانی سادات میں تھے۔ مقالات الشعراء کے مصنف نے ان کی صلاحیتوں کو بہت سراہا ہے۔ لکھتا ہے کہ :۔

"بہ جودت طبع و سرعت فہم موصوف بود، در حاضر جوابی عدیلے نہ داشت۔"

میر علی شیر قانع نے لکھا ہے کہ ان کے اشعار دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ان کے چند تاریخی قطعے نقل کیے جاتے ہیں، ایک مرتبہ ملّا عبدالرشید تتوی شاہی دربار سے منصب حاصل کر کے شہر میں واپس پہنچا، میر ولی نے جب دیکھا کہ بہت اترا رہا ہے تو کہا :

"عبدالرشید رد شد۔"

اعداد نکالے گئے تو سن ۱۱۲۹ھ سال نکلا، عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جب "میر کرامت تخمیر" نے یہ الفاظ کہے، تو اسی وقت اور اسی جگہ ملّا عبدالرشید کی رُوح پرواز کر گئی۔ ایک دفعہ "یا ابراہیم انصاف" کا فقرہ زبان سے نکلا، اعداد نکالے تو سال ۱۱۴۳ھ نکلا۔ اس طرح کے چند واقعات بیان کر کے آخر میں لکھا ہے کہ :۔

"الحاصل از مسطور چنیں کارہا بسیار منقول است بریں قدر اختصار رفتہ۔"

میر حبیب اللہ : مقالات نے ان کو "معلم چہارم" کے خطاب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے میاں ابوالفضل خوش نویس سے سنا کہ یہ میر ابوالقاسم نمکین کی اولاد میں سے تھے اور نواب مہابت خاں گورنر ٹھٹھہ کے مصاحب و رفیق تھے۔

نمونے کے طور پر ان کا ایک شعر دیا ہے :

چشم مست یار را نازم کزو
خاطرے بے ناوک اندوہ نیست

میر باقر خاں امیر خانی : یہ بھی امیر خانی خانوادہ کے فاضل تھے، ہالہ کندی (ہالا ضلع حیدر آباد سندھ) میں قیام تھا، جود و سخا میں فرد تھے اور کمال عزت واحترام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مقالات الشعراء میں ہے کہ :۔

"آں زمین سر بستہ دراقطاعش بودہ، بسیار جوادو مخیّر می زیست درمرزائی مثل است"

"باقرخانی روٹی" کو میر علی شیر نے اُن کے ساتھ منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ روٹی انہیں کے نام سے اور انہیں کے ذریعہ مشہور ہوئی، واللہ اعلم۔

چند اشعار نقل کیے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

دارد از قوس دوستی پرواز
ناوک آہ من ہوائی نیست
خلق نیکو کند خلق بود
حاجت تخت و بادشاہی نیست
بہ تہ بال خویشتن بنشیں
امن درسایہ ہمائے نیست
مہ تمامی ز روئے نقصاں یافت
چو شکست تو مومیائی نیست

اس زمین میں میر شیر علی قانع نے بھی کچھ اشعار کہے ہیں، جن کو مقالات میں درج کیا ہے۔

حواشی :

(۱) تحفۃ الکرام، ص ۱۲۷
(۲) ماثر الامرا، ج ۳، ص ۴۷
(۳) ذخیرۃ الخوانین قلمی
(۴) آئین اکبری ترجمہ بلاخمن، ج ۱، ص 525
(۵۔۶) ماثر الامرا ج ۳، ص ۴۷
(۷۔۸۔۹) ماثر الامرا، ج ۳، ص ۴۷۔ نمکسر کے متعلق ماثر میں لکھا ہے کہ "نمکسار کوہے است بہ درازی بیست کروہ،، مضافات صوبہ پنجاب در دوآبہ سندھ ساگر (کہ مابین بھت وسندھ بدین نام موسوم است) ازاں پار چھائے نمک بریدہ سداساز ندو برداشتہ بکنار آرند، وآنچہ حاصل شود سہ حصہ از کنندگان ویک حصہ دست مزد برآرندگان، سوداگر از نیم دام تادودام منے خریدہ بدور دستھا برد، ودر ھفدہ من یک روپیہ بہ سرکار دھند" (۴۰ دام کا ایک روپیہ ہوتا ہے)
(۱۰) تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۱۲۷
(۱۱) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۶
(۱۲) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۱۱۹
(۱۳) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۱۱۹
(۱۴) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۳۰۳
(۱۵) مآثر رحیمی، ج ۱، ص ۸۲۷
(۱۶) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۹۳
(۱۷) ماثر رحیمی، ج ۱، ص ۸۲۸
(۱۸) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۱۲۳
(۱۹) طبقات اکبری، ج ۲، ص ۳۰۵
(۲۰) منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۹۴
(۲۱) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۱۲۲ (طبقات اکبری نے ماہ ذی الحجہ لکھا ہے ۲/۳۰۵)
(۲۲) اکبر نامہ، ج ۳ ص ۳۵۳
(۲۳) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۳۵۳
(۲۴) ماثر الامراء، ج ۳، ص ۷۵
(۲۵) ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۱۸
(۲۶) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۴۰۶
(۲۷) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۴۷۵
(۲۸) اکبر نامہ، ج ۳، ص ۵۳۲

(۲۹)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۵۳۳
(۳۰)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۵۵۹
(۳۱)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۶۳۷۔۶۳۸
(۳۲)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۶۳۷
(۳۳)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۶۶۶
(۳۴)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۱۸
(۳۵)طبقات اکبری، ج ۲، ص ۴۵۵
(۳۶)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۷۴۶
(۳۷)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۷۴۸
(۳۸)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۱۹
(۳۹)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۵
(۴۰)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۱۹
(۴۱)ذخیرۃ الخوانین، ص ۱۱۹
(۴۲)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۵
(۴۳)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۶
(۴۴)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۸۱۶
(۴۵)اکبر نامہ، ج ۳، ص ۸۳۹
(۴۶)تزک جہانگیری ترجمہ انگریزی بیورج، ص ۳۱
(۴۷)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۶۔۷۷
(۴۸)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۶
(۴۹)توزک جہانگیری بیورج، ص ۶۷۔۶۸۔ آئین اکبری کے مترجم بلاخمن نے لکھا ہے کہ: "سودھرا جہاں سے خسرو پکڑا گیا، پنجاب میں وزیر آباد کے شمال مشرق میں ہے اور اس وقت وہاں سے چناب کو عبور کیا جاسکتا تھا، گجرات جہاں ابوالقاسم مقیم تھا، تھوڑے فاصلہ پر چناب کے دائیں کنارے پر وزیر آباد کے سامنے تھا۔" ج ۱، ص ۴۵۶
(۵۰)منتخب اللباب ج ۱، ص ۲۵۲
(۵۱)اقبال نامہ جہانگیری، ص ۱۵۔۱۶
(۵۲)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۸۰
(۵۳)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۷
(۵۴)توزک جہانگیری، ج ۱، ص ۱۰۲
(۵۵)توزک جہانگیری، ج ۱، ص ۱۰۳
(۵۶)ماثر الامرا، ج ۳، ص ۷۵

(۵۷)ذخیرہ الخوانین قلمی، ص۱۱۸

(۵۸)ماثر الامرا، ج۳، ص۷۷

(۵۹)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص۱۱۹

(۶۰)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص۱۱۹

(۶۱)ماثر الامرا، ج۳، ص۷۷

(۶۲)تزک جہانگیری، ج۱، ص۳۱

(۶۳)ماثر۔ذخیرہ۔بلاخمن

(۶۴)ماثر الامرا، ج۳، ص۷۷

(۶۵)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص۱۲۰

(۶۶)ماثر الامرا، ج۳، ص۷۷

(۶۷)ماثر الامرا، ج۳، ص۷۷

(۶۸)ذخیرۃ الخوانین قلمی ۴۲۰

(۶۹)تحفۃ الکرام، ج۳، ص۲۰۹

(۷۰)تحفۃ الکرام، ج۳، ص۲۰۹

(۷۱)ماثر الامرا، ج۲، ص۴۰۷

(۷۲)ذخیرۃ الخوانین، ص۱۱۵

(۷۳)ذخیرۃ الخوانین، ص۴۲۹

(۷۴)ماثر الامرا، ج۲، ص۴۰۸۔۴۰۷

(۷۵)تحفۃ الکرام

(۷۶)ماثر الامرا، ج۱، ص۱۷۳

(۷۷)ماثر الامرا، ج۱، ص۱۷۲

(۷۸)بادشاہ نامہ، ج۱، ص۱۲۵

(۷۹)ماثر الامرا، ج۱، ص۲۸۷

(۸۰)شاہ جہاں نامہ، ج۱، ص۱۸۳

(۸۱)بادشاہ نامہ، ج۱، ص۲۸۷

(۸۲)مفصل ذکر تحفۃ الکرام، جلد۳، صفحہ ۹۴ میں ہے۔ تحفۃ الکرام میں میر ابوالبقا کی آمد کا سال ۱۰۳ے لکھا ہے، جو غلط ہے۔ علاوہ ازیں ٹھٹھہ کے گورنروں کی فہرست میں میر صاحب کو عیسیٰ خاں کے بعد ٹھٹھہ کا نواب لکھا ہے، حالانکہ میر صاحب ماثر الامرا کے بیان کے مطابق مرتضیٰ خاں انجو کے بعد آئے۔ میر ابوالبقا ٹھٹھہ میں دو مرتبہ گورنر ہو کر آئے ہیں، لیکن تحفۃ الکرام نے اس کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۹۴۔۹۵، ج۳

(۸۳)ماثر الامرا، ج۱، ص۱۷۳

(۸۴)ماثر الامرا، ج۱، ص۱۷۳

(۸۵)بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۲۳۴

(۸۶)ماثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۸۷)شاہ جہاں نامہ، ج ۲، ص ۳۰۳، صاحب لب تاریخ سندھ نے آپ کے ورود ٹھٹھہ کا سال ۱۰۵۴ھ غلط لکھا ہے اور دوسری مرتبہ ان کا آنا بھی نہیں لکھا۔

(۸۸)ماثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۸۹)شاہ جہاں نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱

(۹۰)شاہ جہاں نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱

(۹۱)مآثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۹۲)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۹۵

(۹۳)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۹۵

(۹۴)اینٹیکنٹیز آف سندھ، از ھنیری کزنس، ص ۱۱۷

(۹۵)ماثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۹۶)ذخیرۃ الخوانین قلمی، ص ۱۲۰

(۹۷)ماثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳، ہندوستان میں انگریزوں کے عہد میں بھی خطابات کے حصول کے لیے ہزاروں لاکھوں کا خرچ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدعت مغلوں کے وقت سے چلی آتی ہے۔

(۹۸)مقالات الشعراء، قلمی ص ۱۷۲

(۹۹)اینٹیکنٹیز آف سندھ، ص ۱۱۷

(۱۰۰)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۹۵

(۱۰۱)مآثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۱۰۲)ماثر الامرا، ج ا، ص ۳۱۰

(۱۰۳)شاہ نواز خان لقب ہے مرزا بدیع الزماں خاں صفوی کا، وہ مرزا رستم خاں صفوی کا لڑکا تھا، ان کی لڑکی دل رس بانو بیگم کا نکاح سن ۱۰۴۶ھ میں اورنگ زیب نے ہوا اور دوسری کا مراد بخش سے (بلاخمن، ص ۵۶۷)

(۱۰۴)ماثر الامرا، ج ا، ص ۱۷۳

(۱۰۵)مقالات الشعرا قلمی، ص ۱۳، تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۹۵

(۱۰۶)مقالات الشعرا، ص ۱۶۵

(۱۰۷)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۶۵

(۱۰۸)تحفۃ الکرام، ج ۳، صفحہ ۸۷

(۱۰۹)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۹۵

(۱۱۰)ماثر الامرا، ج ا، ص ۳۰۴

(۱۱۱)ماثر الامرا، ج ا، ص ۳۱۳

(۱۱۲)ماثر الامرا، ج ا، ص ۳۰۶

(۱۱۳)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۱۴)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۱۵)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۱۶)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۱۷)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۷

(۱۱۸)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۷

(۱۱۹)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۷

(۱۲۰)مقالات الشعرا قلمی،ص۱۶۶

(۱۲۱)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۹۔۳۰۸

(۱۲۲)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۲۳)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۶

(۱۲۴)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۰۹

(۱۲۵)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۱۰

(۱۲۶)ماثرالامرا،ج۱،ص۳۱۰

(۱۲۷)ماثرالامرا،ج۳،ص۱۶۰

(۱۲۸)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۹۶۔۹۷

(۱۲۹)مقالات الشعرا قلمی،ص۱۳۰

(۱۳۰)مقالات الشعرا قلمی،ص۱۳۰

(۱۳۱)مقالات الشعرا قلمی،ص۱۳۰

(۱۳۲)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۲۰۸

(۱۳۳)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۲۰۸،اور مقالات الشعرا،ص۱۳۱

(۱۳۴)مقالات الشعرا،ص۱۳۱

(۱۳۵)مقالات الاشعرا،ص۱۳۲

(۱۳۶)مقالات الاشعرا،ص۱۳۰

(۱۳۷)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۲۰۸

(۱۳۸)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۹۹

(۱۳۹)مرأۃ العلوم،ج۱،سن ۱۹۲۵ء

(۱۴۰)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۱۶۱

(۱۴۱)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۲۲۷

(۱۴۲)لب تاریخ سندھ،ص۹۵

(۱۴۳)تحفۃ الکرام،ج۳،ص۲۰۸

(۱۴۴)مقالات الشعرا، ص ۲۵۶

(۱۴۵)مقالات الشعرا، ص ۲۶۶

(۱۴۶)مقالات الشعرا، ص ۲۵۲

(۱۴۷)ہمارے نسخے میں یہ لفظ "نداشتند" تحریر ہے لیکن صریحاً سہو ہے

(۱۴۸)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۲۴۴

حواشی (از مرتب):

میر ابوالقاسم نمکین اور ان کے خاندان پر یہ مقالہ ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا۔ مصنف نے بعد میں اس خاندان پر ایک مفصل کتاب لکھی۔ یہ کتاب سندھی زبان میں "تذکرہ امیر خانی" نام سے ۱۹۶۱ء میں سندھی ادبی بورڈ نے طبع کی۔ اس طرح میر نمکین اور ان کے خاندان پر تحقیق کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ ہم یہاں نئی تحقیق کے حوالے سے اس نامور خاندان پر، حواشی کی صورت میں کچھ اہم امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

میر نمکین اور ان کی اولاد:

میر نمکین ۹۸۰ھ سے پہلے اکبر کی ملازمت میں داخل ہوا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کے علاوہ ان کو سندھ میں بھی تعینات کیا گیا۔ ایک بار بکھر اور دو بار سیوھن کے عملدار رہے۔ ان کی وفات ۱۰۱۸ھ میں ہوئی۔ مزار آج تک روہڑی میں موجود ہے۔ وہ کثیر الاولاد تھے۔ کچھ نام اس طرح ملے ہیں: میر ابوالبقا امیر خان، یوسف میرک، لطف اللہ، نور اللہ، میرزا کشمیری، میرزا حسام الدین اور میرزا یداللہ۔ انؒ کی ایک بیٹی کا نکاح جمیل بیگ سے ہوا (محمد سلیم اختر: "میر ابوالقاسم نمکین۔ اے کرٹک آف ہز کیریئر اینڈ اچیومنٹس" پاکستان جرنل آف ہسٹری اینڈ کلچر اسلام آباد، جنوری۔ جون ۱۹۸۶ء)۔

نمکین بطور مصنف:

اس مقالے میں راشدی صاحب نے میر ابوالقاسم کی سوانح کے اس اہم پہلو پر کچھ نہیں لکھا۔ میر کی ایک کتاب انشاء کے فن میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، جس کا نام "منشات نمکین" ہے۔ یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی۔ میر نے دوسری کتاب "جوامع الجواہر" کے نام سے تیار کی۔ اس کا موضوع اسلامی فلسفہ ہے (ڈاکٹر مومن محی الدین "دی چانسلری اینڈ پرشین اپسٹولوگرافی انڈر دی مغلز"، ص ۷۳، کلکتہ ۱۹۷۱ء)۔

نمکین کی وفات:

ابوالقاسم نمکین کی وفات ۱۰۱۸ھ میں ہوئی۔ جیسا کہ مزار پر کندہ کتبات سے عیاں ہوتا ہے۔ ایک کتبے پر "داغ داده" کندہ ہے۔ مضمون میں اس مادہ کا سال بھی ۱۰۱۸ھ لکھا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس سے ۱۰۱۹ھ نکلتا ہے (تذکرہ امیر خانی، ص ۵۲)۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نمکین نے ۱۰۱۸ھ میں وفات کی اور ان کو ۱۰۱۹ھ میں دفن کیا گیا۔

ابوالبقا امیر خان:

میر نمکین کے بڑے بیٹے تھے۔ سیوھن کے عملدار رہے اور دو بار ٹھٹھ کے گورنر بھی رہے۔ باپ کی طرح

سیاسی اور فوجی خدمات میں سرگرم زندگی بسر کی۔ سندھ کے اندر مغل مخالف سرگرمیوں کو سختی سے کچلا۔ ان کے بھائی یوسف میرک نے "تاریخ مظہر شاہجہانی" میں ان کی عملی زندگی پر مفصل طور پر لکھا ہے۔ باپ کی طرح کثیر الاولاد تھے۔ اولاد کی تفصیل کچھ اس طرح ملتی ہے: عبدالرزاق، ضیاء الدین یوسف، امیر خان عبدالکریم، شمس الدین، ابوالمکارم شہود، ابوالقاسم، عتیق اللہ، میر کامل بیگ اور ایک لڑکی (نسب نامہ، تذکرہ امیر خانی)۔ راشدی صاحب نے کتاب میں (تذکرہ امیر خانی) ابوالبقا پر تفصیل سے لکھا ہے اور ان کا پورٹریٹ بھی دیا ہے۔

شاہجہانی مسجد ٹھٹہ :

اس مضمون میں دی گئی رائے کے برعکس، راشدی صاحب نے بعد میں لکھا کہ، یہ مسجد میر ابوالبقا امیر خان کی ذاتی دلچسپی اور نگرانی میں تیار ہوئی۔ کام کا آغاز ۱۰۵۴ھ میں ہوا اور اس کی تکمیل ۱۰۵۷ھ میں ہوئی۔ اسی سال میں ابوالبقا کی موت بھی واقع ہوئی۔ راشدی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ یہ مسجد سندھ کے خزانے سے بنی اور مرکزی سرکار نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا (تذکرہ امیر خانی، ص ۱۰۵۔۱۰۶ اور ص ۲۹۶۔۲۹۷)۔ یہ تاریخی مسجد آج تک موجود ہے۔

یوسف میرک :

یوسف میرک کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یوسف بھی میر نمکین کے بیٹے تھے۔ انہوں نے کوئی سرکاری منصب نہیں لیا۔ آپ نے ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں "مظہر شاہجہانی" کے نام سے سندھ کی تاریخ پر ایک منفرد کتاب تیار کی۔ اس طرح نہ صرف سندھ کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہوا، بلکہ اسی کتاب نے میر نمکین اور ان کے خاندان کے متعلق بھی مفید معلومات فراہم کیں۔ اس کتاب کو تلاش کرنے اور ایڈٹ کر کے چھاپنے کا کریڈٹ بھی سید حسام الدین راشدی کو حاصل ہوا۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں سندھی ادبی بورڈ نے شایع کی ہے۔

امیر خان عبدالکریم :

امیر خان عبدالکریم (میر عبدالکریم امیر خان سندھی) کے ایک بیٹے ابوالخیر کا ذکر اس مضمون میں ہوا ہے۔ بعد میں ان کے دوسرے بیٹے میر سید اشرف خان کا بھی پتہ چلا۔ اشرف خان نے وہ خطوط مرتب کیے جو کہ عالمگیر نے ان کے باپ امیر خان عبدالکریم کو لکھے تھے۔ اس کتاب کا نام "رقائم کرائم" ہے اور دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے۔ عبدالکریم نے ۱۱۳۱ھ کے بعد وفات پائی۔ راشدی صاحب نے موت کے علاوہ ان کی مدفن گاہ پر بھی بحث کی ہے اور ساتھ ہی امیر کا پورٹریٹ بھی شایع کیا ہے (تذکرہ امیر خانی، ص ۱۷۱۔۱۸۶)۔

میر ابوالمکارم کی اولاد :

ان کی اولاد اس طرح ہوئی: امین الدین خان حسین، میر رضی الدین محمد فدائی، میر حافظ الدین خان، معین الدین خان حسن، میر عبدالحکیم اور میر علی اکبر (نسب نامہ، تذکرہ امیر خانی)۔

تصانیف میر ابوالمکارم :

پ نے مثنوی "بدیع الجمال و سیف الملوک" لکھنی شروع کی۔ لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ ان کی دوسری مثنوی "پریخانۂ سلیمان" سن ۱۰۶۰ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کا ایک نامکمل نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں ہے (مہران ۱-۲ ۱۹۸۰ء، راشدی صاحب کا مضمون)۔

میر امین الدین خان حسین :

ٹھٹہ کی ایالت پر مقرر ہوئے۔ ۱۱۱۵ھ میں بکھر کی فوجداری ملی۔ گمان غالب ہے کہ ۱۱۲۰ھ تک بکھر میں رہے۔ بکھر میں ایک مسجد بنوائی۔ قطعہ تاریخ میر عبدالجلیل بلگرامی نے کہا۔ میر بلگرامی اس وقت بکھر میں مرکز کی طرف سے وقائع نویسی کے عہدے پر مقرر تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلگرامیوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے (تذکرہ امیر خانی، ص ۳۵۸-۳۶۱)۔

میر امین الدین کی تصنیفات :

ان کی دو کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ ۱۱۲۳ھ میں "رشحات الفنون" مکمل کی۔ ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے (تذکرہ امیر خانی، ص ۱۹۵)۔ دوسرا نسخہ کتابخانہ ملا فیروز بمبئی میں ہے (عزیز اللہ عطاری: "سیری در کتاب خانہ ہائی ہند و پاکستان"، ص ۹۹، ایران ۱۹۹۵ء)۔ تیسرا نسخہ سید عارف نوشاہی کے پاس اسلام آباد میں ہے۔ تہران کے دو کتبخانوں میں بھی "رشحات الفنون" کے نسخے موجود ہیں۔ یہ کتاب ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ میر صاحب کی دوسری تصنیف "معلومات الآفاق" ہے۔ مطبع نولکشور لکھنو نے دوبارہ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۳ء میں یہ کتاب شائع کی ہے۔ اس کا ۱۱۲۰ھ کا با تصویر نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں موجود ہے (تحفۃ الکرام، حاشیہ ص ۳۴۶، سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۷۱ء)۔

مآخذ

۱۔ تحفۃ الکرام (میر علی شیر قانع۔ مطبوعہ بمبئی)

۲۔ " " (" قلمی۔ مملوکہ راقم)

۳۔ مقالات الشعرا (" " ")

۴۔ ذخیرۃ الخوانین (شیخ فرید بکھری " ")

۵۔ مآثر الامرا (شاہ نواز خاں۔ مطبوعہ کلکتہ)

۶۔ اکبر نامہ (ابوالفضل ")

۷۔ طبقاتِ اکبری (نظام الدین ")

۸۔ مآثرِ رحیمی (عبدالباقی ")

۹۔ منتخب التواریخ (عبدالقادر بدایونی ")

۱۰۔ اقبال نامہ جہانگیری (معتمد خان ")

۱۱۔ منتخب اللباب (خافی خان ")

۱۲۔ بادشاہ نامہ (عبدالحمید لاہوری ")

۱۳۔ لبِ تاریخ سندھ (خان بہادر خداداد خاں بکھری مطبوعہ امرتسر)

۱۴۔ قدیم سندھ (در زبان سندھی، از شمس العلما مرزا قلیچ بیگ مطبوعہ)

۱۵۔ سندھ جا ستارا (" " ")

۱۶۔ مراۃ العلوم جلد اوّل فارسی (یعنی فہرست کتب خانہ پبلک لائبریری بانکی پور)

۱۷۔ آئینِ اکبری (ترجمہ انگریزی بلاخمن۔ مطبوعہ کلکتہ)

۱۸۔ تزکِ جہانگیری (" " مسز بیورج۔ ")

۱۹۔ اینٹیکلٹیز آف سندھ (کزنس ")

اردو زبان کا اصلی مولد سندھ

اُردو کو سب سے پہلے تحریر میں لانے کا فخر تو ملک دکن کو حاصل ہوا لیکن یہ اردو وہاں کی پیداوار نہیں تھی بلکہ دہلی سے دولت آباد آئی اور پھر گلبرگہ، بیدر، بیجاپور وغیرہ مقامات میں شائع ہوئی تھی۔ یوں بھی ظاہر ہے کہ ہر زبان پہلے صرف بول چال میں رواج پاتی ہے اور ایک مدّت کے بعد تحریر میں آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری اُردو سب سے پہلے کہاں پیدا ہوئی اور کب بول چال میں آئی۔

یاد رہے کہ اردو، ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزارہا الفاظ ہندی زبانوں میں شامل ہو گئے۔ اور اہلِ ہند، ہندو ہوں یا مسلمان انہیں سمجھنے اور بولنے لگے۔ بے شبہ اردو کو اپنی موجودہ معیاری شکل اختیار کرنے میں بہت مدّت صرف ہوئی اور مختلف مدارج اور مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن اگر اس کے وجود میں آنے کا وہ سبب جو اوپر بیان ہوا، مسلم ہے تو یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں ان کی زبان عربی اور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا۔ لہٰذا یہ ایک واضح امر ہے کہ اردو کا اصلی مولد سندھ ہے۔ آج سے ۵۰ برس پہلے تک اردو کی ابتدا مغل بادشاہوں کے عہد سے منسوب کی جاتی تھی۔ جب مغلوں سے پیشتر زمانے کی دکنی کتابیں مل گئیں تو بعض صاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ زبان بھمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی، درباروں کی ساختہ ہے۔ دو چار آوازیں گجرات کے متعلق بھی بلند ہوئیں، پھر مشہور فاضل حافظ محمود شیرانی مرحوم نے

پنجاب میں اردو لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ غالباً یہ زبانِ عزیز جہلم و چناب کی وادیوں میں پیدا ہوئی اور ستلج اور راوی کی گودیوں میں پلی تھی۔ شیرانی مرحوم کے نظریئے کی بنیاد لسانی تحقیق کے تقابلی اصول پر رکھی گئی ہے اور ہماری تلاش کا یہی راستہ بھی ہونا چاہیے۔ لیکن خود شیرانی صاحب ایک وسطی منزل میں بھٹک گئے ہیں جیسا کہ اوپر گذارش کیا گیا، مسلمانوں کا اہلِ ہند سے مستقل رابطہ وادیٔ سندھ میں قائم ہوا اور یہیں آپس کے میل جول سے لامحالہ ان کی زبانوں میں اختلاط کے عمل کا آغاز ہوا۔ جو حضرات سندھ کی اسلامی فتح اور بعد کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے اس قول کو ماننے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے کہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ سندھ ہے۔ مولانا موصوف نے ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا جو ان کی تقریروں کے مجموعے "نقوشِ سلیمانی" (صفحہ ۱۹ تا ۷۷) میں شائع ہو چکا ہے، اس میں صاف صاف اعتراف کیا گیا ہے کہ 'جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا" (صفحہ ۳۱)۔ لسانیات اور تاریخ کی تفصیلی بحث چھیڑنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ہم بہت ہی مختصر طور پر یہاں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں (یعنی آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) خلافت اسلامیہ سے "سندھ" کے نہایت قریبی اور قوی سیاسی، علمی، تجارتی اور تمدنی تعلقات رہے۔ ملتان اور منصورہ میں (جو شہداد پور کے قریب آباد ہوا اور آزاد عرب ریاست کا بارونق صدر مقام بن گیا تھا) چوتھی صدی ہجری کے آخر تک عربی اور سندھی زبان عام طور پر بولی جاتی تھی جس کی اصطخری، ابنِ حوقل، مسعودی وغیرہ ہم عصر مصنفوں نے شہادت دی ہے۔ اسی زمانے میں اصطخری لکھتا ہے کہ مکران کے شہروں میں فارسی اور مکرانی کا رواج تھا (مسالک الممالک صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۸)۔ چوتھی صدی ہجری میں یہی نئی فارسی جو عربی کا دودھ پی کر پلی اور بڑھی تھی، ایران سے بھی زیادہ ترکستان، خراسان اور غزنین میں نشو و نما پا رہی تھی۔ اسی عربی آمیز فارسی نے آگے چل کر زبان اردو کی دایہ گیری کی خدمت انجام دی ہے۔ عرب کی قوت میں زوال آیا تو سندھ پر پہلے سلاطین غزنین اور ، ر غوریوں کا تسلط ہوا۔ شہاب الدین کے امیر قباچہ نے سندھ میں آزاد حکومت قائم کی تھی مگر اس کی زندگی میں ترکوں کی ایک بڑی سلطنت دہلی میں بنی اور سندھ پر انہی کا قبضہ ہو گیا۔ اگرچہ آئندہ تیموری مغلوں کے آنے تک جب کبھی دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہوتی سندھ کے رئیس خود مختار ہو جاتے تھے۔

ابتدائی دور میں عراق اور عرب سے ہزاروں خاندان سندھ میں آکر بسے اور دیبل سے ملتان تک ان کی بیسیوں چھاؤنیاں اور نو آبادیاں پھیلتی چلی گئیں۔ پھر ان علاقوں سے جو اب افغانستان، بلوچستان اور سیستان میں داخل ہیں، کثیر تعداد میں سپاہی اور کوہی، شہری اور دیہی گروہوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ ان سے بھی بعید اقطاع کے لوگوں کی بڑے پیمانے پر ایک نقل مکانی وہ تھی جو یورشِ تاتار کے نتیجہ میں وقوع پزیر ہوئی اور ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو اپنے شمالی وطن چھوڑ چھوڑ کر سندھ اور آگے ہندوستان کے علاقوں میں پناہ لینی پڑی۔ یہ آنے والے عموماً فارسی یا ترکی زبان کی بولیاں بولتے تھے اور ان کی علمی زبان فارسی ہوگئی تھی۔ مسلمانوں کی آمد اور کئی صدیوں کی سندھ میں بود و باش نے یہاں کی تہذیب و تمدن کا بالکل رنگ بدل دیا تھا اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہاں کی مقامی بولیوں میں ہزاروں الفاظ عربی فارسی کے شامل ہوتے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی یقینی ہے کہ خود نووارد مسلمان اب یہیں کے باشندے ہوگئے اور اپنے گھروں میں ضرور یہیں کی بولیاں بولنے لگے تھے۔ حقیقت میں انہی شمالی ہند کی مخلوط بولیوں کا نام اردو ہے جس کو عرصہ دراز کے بعد سرکاری اور ادبی نثر کی زبان کا مرتبہ دہلی اور لکھنؤ نے نہیں بلکہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے انگریزوں نے عنایت کیا۔

ہندی السنہ کے ایک فاضل گوری شنکر اوجھا نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ "مسلمانوں کی آمد کے وقت گجرات، مارواڑ، وغیرہ میں شمال مغربی (نیز وسط ہند) کے ملکوں میں ایک مخلوط پراکرت بولی جاتی تھی اور 'قدیم ہندی' کو بنانے میں اس کی بگڑی ہوئی بھاشا کا بڑا حصہ تھا" (نقوش سلیمانی صفحہ ۲۴۔ بحوالہ 'قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب)۔ ان ہی قدیم سندھی اور مغربی ہند کی بولیوں نے اسلامی زبانوں کا سب سے پہلے اثر قبول کیا اور کچھ شک نہیں کہ سندھ اور ملتان ہی میں اردو زبان کا بیج پڑا۔ جو پھول پھول کر ایک تناور درخت بن گیا۔ تاریخی طور پر بھی ابتدائی دور کی بول چال کی زبان بن جانے کا سب سے قدیم اور پہلا ثبوت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کا وہ مختصر مکالمہ ہے جو ان کے قریب العصر تذکرہ "سیر الاولیاء" اور دوسری تاریخوں سے ہم تک پہنچا۔ حضرت کی ولادت ۵۶۹ ہجری (۷۳۔۱۱۷۴ء) ہے جبکہ مسلمانوں کا قبضہ سندھ و پنجاب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ملتان کے ایک گاؤں "کھتوال" میں پیدا ہوئے۔ ملتان ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ سندھ کے شہر اچ کی ایک مسجد "جامع حاج" میں آپ کے قیام اور سخت مجاہدات کا تذکرہ آتا ہے (اخبار الاخیار صفحہ ۵۳ وغیرہ)۔ خود ملتان جیسا کہ اہلِ

علوم کو معلوم ہے، خاص ملک سندھ کے صدر مقامات میں شامل تھا۔ پنجاب میں اس کی شمولیت بہت بعد کا حادثہ ہے۔ گنج شکرؒ کے آخری ایام بھی نواح ملتان میں بسر ہوئے۔ ۶۶۴ ہجری (۱۲۶۵ء) میں وفات پائی۔ آپ کے ایک خلیفہ بزرگ شیخ جمال الدین کا ہانسی میں انتقال ہوا تو ان کی حرم جو "مادر موموناں" کے معزز لقب سے مشہور تھیں۔ شیخ جمال الدین کے فرزند کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضرت نے کم سنی کے باوجود ان کے صاحبزادے (شیخ برہان الدین) کو خلافت مرحمت کی۔ مادرِ موموناں نے عرض کی کہ "حضرت خوجا بالا ہے۔" حضرت نے فرمایا۔ "مادر موموناں پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔"

جمعات شاہی، تذکرۃ الاصفیاء، جواہر فریدی وغیرہ بعد کے تذکروں میں اور بھی چند لفظ اور جملے حضرت سے اسی ہندی میں منقول ہیں جو بن سنور کر "اردو" کہلائے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہم نے چند نظمیں اور ایک جھولنا بھی شیخ فریدالدینؒ کی تصنیف سے بہم پہنچایا اور اپنے رسالے "اُردو کی نشوونما میں صوفیاء کا حصہ" میں ان کے کئی شعر نقل کیے ہیں۔ مگر نظم کی نسبت ہمارے خیال میں یہ مختصر مکالمہ جس کی صحت میں کلام کی گنجائش نہیں، اردو کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری ہی میں جبکہ دکن تو کجا دوآبہ گنگ و جمن بھی مسلمانوں کا وطن نہیں بنا تھا۔ اقطاع سندھ کے اونچے طبقوں میں اردو بولی جانے لگی تھی۔

فاضل شیرانی مرحوم لکھتے ہیں کہ "اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے دونوں میں اسماء اور افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترکہ ہے۔ یہاں تک کہ جمع کے جملوں میں ایک ہی قاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں (پنجاب میں اردو، مقدمہ۔ ج)۔

پھر شیرانی مرحوم نے اپنی تحقیقات کو اس پر مرکوز کردیا ہے کہ اس زبان کا سرچشمہ پنجاب کو ثابت کریں جو دسویں صدی ہجری (یعنی مغلوں کے عہد) میں دہلی اور دوآبہ کی زبان بن گئی اور بقول اُن کے وہی آگے چل کر اردو بنی۔ لیکن آٹھویں صدی میں چنگیزی مغلوں نے پنجاب کو بُری طرح تہ وبالا کیا اور شہر لاہور کی ایسی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی کہ پھر اکبر بادشاہ کے زمانے تک یہ شہر نہیں پنپ سکا۔

قطع نظر اس کے شیرانی مرحوم، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سیدھے راستہ پر چلتے چلتے ایک

طرف کو مُڑ گئے ورنہ زمانے کی منزلیں طے کرتے ہوئے، ہم آگے بڑھیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سندھ ہی اردو زبان کا اصلی مولد ہے۔

لسانی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ہماری تحقیقات کا دوسرا باب یوں شروع ہو گا کہ ہم اردو کی ابتدائی نشو و نما کا زمانہ ساتویں آٹھویں صدی ہجری کو قرار دیں جب کہ ممالک ہند میں ترک حکومت اور فارسی زبان کا سرکار، دربار اور مدارس و خانقاہوں میں پورا دخل ہو گیا تھا۔ شمالی ہند کی زبانوں میں فارسی کی آمیزش سے "اردو" کا ترکیب پانا ایسی بات ہے جس سے محدود تحقیق کرنے والے بھی انکار نہیں کریں گے۔ ہم ان صدیوں میں سندھ کے کئی شہروں کو اسلامی علوم و فنون اور صنعت و تجارت کے مراکز اور مغرب سے دہلی جانے کی شاہراہ پر دیکھتے ہیں۔ ان میں ملتان کے علاوہ اچ، بکھر اور ٹھٹھہ زیادہ مشہور ہیں۔ "اخبار الاخیار" میں لکھا ہے کہ سید جلال سرخ جو مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت کے دادا تھے۔ بخارا سے پہلے بکھر آئے۔ پھر اچ میں سکونت اختیار کی۔ یہ ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی پیدائش ۷۰۷ ہجری تحریر ہے۔ اس خانوادے سے سلطان فیروز تغلق کو بڑی ارادت تھی اور حضرت جہانیاں جہاں گشت کئی مرتبہ اس بادشاہ کی درخواست پر دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمارے لیے یہ اہم اطلاع "جمعات شاہی" (ملفوظات حضرت شاہ عالمؒ) میں محفوظ ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی سید راجو قتال کے حق میں یہ کلمہ فرماتے تھے کہ "آسان خو ہے۔ تسان راجے۔" خود حضرت قتال نے فیروز شاہ تغلق کو اردو زبان میں خطاب کیا اور یوں مزاج پرسی کی تھی کہ "ماکا فیروز چنگا ہے۔"

انہی بزرگ نے اپنے بھائی کے پوتے سید برہان الدین کی جو آئندہ قطب عالم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت فرمائی تھی۔ قطب عالمؒ کی اچ میں ولادت کی تاریخ ۷۹۰ ہجری ہے۔ پھر وہ گجرات چلے آئے اور احمد آباد میں انتقال کیا۔ ان کے کشف و کرامات اور سلاطین گجرات کی ان سے عقیدتمندی کے بہت سے قصے تاریخوں میں مذکور ہیں اور ہندی یا اسی اردو میں جو وہ سندھ سے لائے تھے۔ کئی جملے، گیت، اور دوہے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ جن کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ لیکن اس مختصر مقالہ کو ختم کرنے سے پہلے ہم آٹھویں صدی کے ایک اور واقعے کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو راقم الحروف کے نزدیک اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس عہد میں بھی سندھ کی عام زبان "اردو" تھی۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۷۵۱ ہجری میں سلطان محمد تغلق

نے "سومروں" کے صدر مقام 'تتہ' (ٹھٹھ) پر فوج کشی کی لیکن اس زمانہ میں بیمار ہو کر وفات پائی۔ فیروز تغلق نے دس برس بعد اسی شہر پر حملہ کیا۔ سامانِ رسد نہ پہنچنے سے اُسے بھی ناکام ہٹنا پڑا۔ تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عفیف نے لکھا ہے (صفحہ ۲۳۱) کہ اس وقت تتہ والے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ تک بندی کی کہ "برکت شیخ پتھا۔ ایک موا ایک ہٹا۔" (آخری لفظ میں شبہ ہے۔ کلکتے کی طباعت میں 'تہا' لکھا ہے۔ پروفیسر ہوڑی والا نے اسے "بھکا" پڑھا ہے۔ میں اسے "ہٹا" یا "نہٹا" خیال کرتا ہوں)۔ شیخ حسین عرف "شیخ پتھا" سندھ کے مشہور ولی ہیں۔ صاحب "تحفۃ الکرام" نے ان کی ولادت ۵٦٠ ہجری اور وفات ٦٠٦ ہجری تحریر کی ہے (ج ۳ صفحہ ۲۵۲)۔ یہ حضرت تتے میں مرجع خلائق تھے اور شہر سے کچھ فاصلے پر ان کا مزار ابھی تک موجود ہے۔ بہر حال یہ کہاوت جو اوپر ہم عصر و معتبر تاریخ سے نقل کی ہے نہ صرف پرانی اردو کا نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ اس کا عوامی اور پھر زبان زد ہونا صاف صاف بتاتا ہے کہ ان دنوں جنوب مغربی سندھ کی عام زبان اردو نما تھی۔

سندھ کے اُردو شعرا

زبان اردو کی پیدائش میں ملک سندھ کا جو مقدم حصہ ہے اس کی اجمالی کیفیت پہلے ہی پیش کی جاچکی ہے۔ اب ہم ان ادوار پر ایک نظر ڈالتے ہیں جب کہ اردو، شعر شاعری کی زبان بن رہی تھی۔ ہر چند حضرت امیر خسرو وغیرہ سے بعض متفرق اشعار منقول ہیں، جو ابتدائی دور میں عربی بحروں میں کہے گئے ہیں۔ اور خود حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کا کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں، لیکن جہاں تک ابھی تحقیق کی رسائی ہوئی ہے۔ قدیم اردو میں باقاعدہ شاعری کا آغاز قطب شاہی دور میں ہوا اور قلی قطب شاہ (۹۸۸ تا ۱۰۲۰ہجری) پہلا شاعر تھا، جس کا کلام مختلف اصناف میں دکنی اردو میں ہم تک پہنچا ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ٹھیک اسی زمانے میں ہم کو سندھ کے اندر ایک بہت ہی مقبول عام اردو شاعر کا سراغ ملتا ہے۔ اس شاعر کا نام میر محمد فاضل بکھری، تاریخ معصومی کے مصنف میر معصوم بکھری کا چھوٹا بھائی تھا۔ میر فاضل ہندی کا شاعر تھا اور اپنے زمانہ میں اس کا کلام بہت مقبول تھا۔ ذخیرۃالخوانین میں لکھا ہے کہ :

"شعر بزبان ہندی از قسم کافی بکمال
فصاحت میگفت و قبولیت داشتہ"

(ذخیرۃالخوانین مصنفہ شیخ فرید بکھری)

دکنی شعرا کے سوا شمالی ہند کے دوسرے شاعروں کا گیارہویں صدی ہجری (سترہویں عیسوی) تک کوئی دیوان یا مجموعۂ کلام اردو میں نہیں ملتا۔ البتہ اسی صدی کے لواخر اور بارہویں

صدی کے لوائل میں "ولی" گجراتی کے کلام کا غل غلہ بپا ہوا اور دہلی میں آبرو، مضمون، حاتم وغیرہ کا دور آیا، جسے موجودہ زبان اردو کی شاعری کا پہلا دور قرار دیا گیا ہے۔ اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ جب اردو اپنے ارتقا کے روشن تاریخی مرحلے میں داخل ہوئی اور شاعری کے ذریعے "ریختہ" یا "اردو" کے نام سے جداگانہ زبان بنی تو اس وقت بھی شعرائے سندھ سخنوران ہند سے نہ صرف ہم عصری بلکہ ہم چشمی کا دعویٰ رکھتے ہیں اور ادب اردو کی خدمت برابر انجام دیتے رہے۔ جو اپنی قدیم ساختہ پرداختہ زبان سے ان کے دلی لگاؤ اور طبعی تعلق کی دلیل ہے۔

جیسا کہ اردو شاعری کے دور مقرر کیے گئے ہیں۔ میں بھی یہاں کے شعرا کو تین زمانوں میں تقسیم کرتا ہوں

دور اوّل

۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء سے لے کر ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء تک

دور دوم

۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء سے لے کر ۱۲۵۹/ ۱۸۴۳ء تک

دور سوم

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء سے لے کر ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء تک

یہ دور زبان کی تدریجی ترقی پر مبنی نہیں بلکہ میں نے حکومت کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی ہے۔

دور اوّل

۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۰ء سے ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء

ہندوستان کے اندر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اردو شاعری کا یہ ابتدائی دور سمجھا جاتا ہے۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ولی گجراتی اسی دور میں فروغ پاتا ہے۔ دہلی کے وہ مشہور شاعر جنھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ ولی کے طرز پر اردو میں شعر کہنے شروع کیے، یہ تھے۔

آبرو	۱۷۴۷ء
مضمون	۱۷۴۵ء
ناجی	۱۷۵۴ء
مظہر جان جاناں	۱۷۸۱ء

حاتم ۱۷۸۱ء

یہ دور مغلیہ سلطنت کے انحطاط کا دور ہے۔ باوجود اس کے کہ سندھ میں دلی سے گورنر آتے رہے۔ تاہم اس زمانہ میں یہاں کا ایک مقامی خانوادہ برسر اقتدار آچکا تھا اور اس نے اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ یہ "کلہوڑا" خاندان تھا۔ جس کے دو حاکم اس دور میں ہوئے۔

یار محمد خان ۱۱۱۲ھ / ۱۷۰۱ء سے ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء تک

اور

نور محمد خان ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء سے ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء تک

ان کی اپنی زبان سندھ کی "سرائکی" زبان تھی جس کا لب و لہجہ اور الفاظ اردو سے ملتے جلتے ہیں اسے۔ درباری زبان فارسی تھی اور یہاں سینکڑوں اس زبان کے شاعر موجود تھے۔ اس دور میں کئی بلند پایہ کتابیں اس زبان میں لکھی گئیں۔ خدا آباد، بکر، بوبک، روہڑی، سیوھن اور ٹھٹھہ اس وقت اسلامی علوم کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ نادر شاہ اس دور میں ہندوستان جاتے ہوئے یہاں آیا اور واپسی میں بھی یہاں سے ہوتا ہوا ایران گیا۔

ایران کے بڑے بڑے شعرا اس دور میں یہاں پہنچے مثلاً مرزا صائب، شیخ علی حزیں اور والہ داغستانی وغیرہ۔ یہ لوگ یہاں آئے اور مہینوں تک یہاں کی علمی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے۔

ہندوستان سے بھی اس دور میں بلگرامی سادات وقائع نویسی کے سلسلہ میں یہاں تشریف لائے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی، سیّد محمد اشرف، سیّد کرم اللہ، سیّد محمد نوح، سیّد محمد بلگرامی اور سیّد غلام علی آزاد۔ یہ بزرگ اپنے دور میں بڑے عالم اور فارسی شاعری میں یگانۂ روزگار تھے۔ میر عبدالجلیل اور غلام علی آزاد کے اردو شعر بھی ملتے ہیں۔ سندھ میں ان کا زمانہ ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۴ء سے لے کر ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء تک ہے

مغل گورنروں کی وجہ سے ہندوستان سے کچھ لوگ ایسے بھی یہاں پہنچے جو اردو میں شعر کہتے تھے مثلاً سیّد محمود صابر رضوی استر آبادی، دلّی میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۱۴۰ھ مطابق ۱۷۲۷ء میں ٹھٹھہ آکر یہیں مستقل وطن بنالیا۔ مقالات الشعرا میں لکھا ہے کہ

"بزبان ہندی و پارسی دیوانہا متعدد در مرثیہ و بعضے در غزلیات و مناقب درست کرد۔"

محمد سعید راہبر: گوالیار کے تھے اور نواب سیف اللہ خان کے عہد (۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء سے ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) میں ٹھٹھہ آئے۔ یہ حضرت بھی بقول میر علی شیر "شعر ہندی بسیار می گفت وخوب می گفت۔"

میر جعفر علی بے نوا: ہندوستان سے بعہد نواب مہابت خاں کاظم (۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء سے ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء) ٹھٹھہ میں وارد ہوئے۔ غالباً یہی وہ بے نوا ہیں جن کے دو شعر اردو کے تذکروں میں ملتے ہیں۔

ایک مقطعہ یہ ہے:

بے نوا ہوں زکوٰۃ حُسن کی دے
او میاں مال دار کی صورت

سیّد فضائل علی خاں بے قید: یہ صاحب پہلے تو عمدۃ الملک نواب امیر خان کی نیابت میں ٹھٹھہ آئے لیکن دوبارہ خود صوبہ دار ہو کر پہنچے اور یہیں قیام کر لیا۔ اردو کے اچھے شاعر تھے۔ ان کی مثنوی کے اشعار میر حسن اور علی ابراہیم خاں نے اپنے تذکروں میں نقل کیے ہیں۔

محسن شیرازی: سورت سے ہوتے ہوئے سندھ میں آئے اور میر قانع صاحب مقالات الشعرا سے ان کی ملاقات ہوئی اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

"اگرچہ ولایت زابود اما ہندی فصیح یادداشت۔"

عمادالملک نواب غازی الدین خان فیروز جنگ: یہ وہی صاحب ہیں جنھوں نے ۱۷ برس کی عمر میں وزارتِ عظمیٰ حاصل کی۔ دلّی کے عربک کالج کی عمارت ان کی یادگار ہے۔ یہ صاحب بھی ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء میں حسبِ اطلاع گلزارِ ابراہیم سندھ میں آئے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔

یہ تمام حضرات ہندوستان سے سندھ میں تشریف لائے۔ ان کی آمدورفت سے یہاں کے شعرا کا اردو ذوق بڑھا اور یہاں بھی فارسی گو شعرا نے دلّی کی طرح اردو میں بھی شعر کہنا شروع کیا۔ سندھی نژاد اردو شاعر جو اسی دور میں ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

شیخ ورو : سندھی شعرا میں یہ حضرت متقدم ہیں، ٹھٹھہ کے منصب داروں کے قبیلے سے ان کا تعلق تھا۔ صاحبِ مقالات نے لکھا ہے کہ "جوانے صاف طبیعت بودہ" شہر کے قاضی کی ہجو میں کہتا تھا۔ آخر کسی قتل کے الزام میں غالباً اسی قاضی کے فتوے کے ذریعے پھانسی پائی۔ یہ واقعہ نواب سیف اللہ خان کے زمانہ (۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء سے ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) کا ہے۔ مقالات میں ان کا ایک ہی شعر ہے۔ اور وہ قاضی شہر کی ہجو میں ہے مگر اس زمانہ کے معیار سے دیکھئے تو صاف اور شستہ اردو کی شہادت دیتا ہے، کہتا ہے۔

الایا ایہا المفتی شدہ ریش تو جنگھا
اکھاڑوں بال یک یک کر بناؤں خوب کملھا

جنگل اور کمل (کمبل) کا قافیہ خوب لایا ہے۔ یہ شاعر ولی گجراتی کے زمانہ کا اور آبرو مضمون، ناجی، سراج مرزا، مظہر اور حاتم سے متقدم ہے۔

عبدالسبحان فائز ٹھٹھوی : یہ بھی اس زمانہ کا سخن طراز ہے (۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء سے ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء)۔ صاحبِ مقالات کا خیال ہے کہ اس کی فارسی شاعری تو ظرافت اور ہزلہ گوئی کی وجہ سے شعریت سے عاری تھی لیکن

"ایہام ہندی خوب می نویسد" اور "شعر ہندی و پارسی خوب گفتہ اکثر آں در مناقب و مرثیہ واقع۔"

میر حیدرالدین کامل : المتوفی ۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء، میر رضی الدین احمد فدائی (المتوفی ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء) کے صاحبزادے تھے۔ ان کے علم و فضل کے سلسلے میں صاحب مقالات الشعرا رطب اللسان ہے۔ فارسی، سندھی اور ہندی پر قدرت حاصل تھی اور ان تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مقالات میں ہے کہ

"در ایہام ہندی بے مثل و دھرہ و کبت و نکات غریب و صفات عجیب و سائر اقسام، از ایشان بسیار بر زبانہا است۔"

انہوں نے اپنے دوادین اپنے شاگرد خاص میاں محمد پناہ رجا کو ترتیب کے لیے دیے تھے، معلوم نہیں پھر ان پر کیا گزری۔ آج ان کے فقط چند اشعار ہمارے پاس موجود ہیں جو مقالات کے ذریعے محفوظ رہ گئے یعنی صاحب مقالات نے لکھا ہے کہ

"ہر چند اشعار ہندی ایشان عالمگیر است اما فقیر آنچہ یاد دارد می نویسد"

ملاحظہ ہوں :

لبوں دلبر کے میرے قتل کا بیڑا اُٹھایا ہے
خدایا خون سوں میرے تو اسکوں سرخرو کرنا

چاک ناموس کا ہے سینہ میں
نام کا زخم ہے نگینہ میں

خال رخسار کا اچنبا ہے
گال کے کھیت میں اگا ہے تل

سویا پڑا ہے کیا رے نازک بدن اکیلا
خوں جوش دے ٹپکتا جامن اسے اُٹھا دیکھ

عشق اب ڈھول ہے زلیخا کا
اس سوں آگے ہے چاہ میں یوسف

گل گل پگل پگل کے محبت کی راہ میں
پانی ہوئی زلیخا یوسف کی چاہ میں

دوست بخشے کا دوست سب کے
گرچہ عاصی ہوں اس کا عاصی ہوں

یہ شعر اس عہد کے ایہام گو دہلوی اساتذہ سے کسی طرح کم رتبہ نہیں اور اُن کی مقبولیت سُن کر بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سندھ نے نہ صرف اردو کو پیدا کیا بلکہ ایک ہزار برس بعد تک

اس کی ترقی اور نشو و نما میں حصہ لیتا رہا۔

مخدوم محمد معین بیراگی : التوفی ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء یہ بزرگ تمام علوم معقول و منقول کے جامع تھے۔ عربی میں بہت کتابیں لکھیں جن میں سے "دراسات اللبیب" بلند پایہ کتابوں میں سے شمار کی جاتی ہے۔

ہندوستان سے ان کے بہت گہرے روابط تھے۔ شاہ ولی اللہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ میر سعد اللہ سورتی سے جو میر عبدالولی عزت کے والد تھے، بہت گہرے مراسم تھے۔ وہ فارسی کے بہت بڑے شاعر اور تسلیم تخلص کرتے تھے۔ ہندی میں بیراگی تخلص تھا، ان کا دیوان بالکل مفقود ہو گیا۔ ورنہ پتہ چلتا کہ ان کا اندازِ کلام کیا تھا۔

میر حفیظ الدین علی : انتقال بعد از ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء۔ یہ بزرگ میر حافظ الدین کے صاحبزادے اور میر حیدر الدین کامل کے بھتیجے تھے۔ ۲؎

علوم و فنون میں اپنے چچا کے مماثل تھے۔ میر علی شیر کہتے ہیں کہ :

"وہ اپنے چچا کامل کے تمام کمالات کے حامل تھے۔ طبع عالی پائی تھی۔ ہندی زبان کی شاعری میں خسرو ثانی تھے۔ وہ جن خیالات اور معنیٰ کو اپنے دوہرے، کبتوں اور ابیات میں باندھتے ہیں وہ فقط ان ہی کا حصہ ہے۔ فارسی کے مقابلہ میں ان کا کلام ہندی زبان میں زیادہ ہے اور لکھا ہے کہ :

"ایہام کہ از دو سہ و چہار و پنج معنی ہم گاہ گاہے تجاوز دارد"

ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :

اچار ہو کھٹا پاپڑ لینی ہے مچھی
سرکا بنا تو آکے سوی سلونی اچھی

اس ایک شعر میں ایہام گوئی کی صنعت کے ساتھ شاعر کی حیرت انگیز ذہانت اور زبان پر پوری قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے دو مصرعوں میں اچار، کھٹا، پاپڑ، مچھی (مچھلی) سرکا، توا، سوی (سوئیاں کا واحد) اور سلونی، آٹھ کھانے کے مناسب الفاظ جمع کر دیے ہیں۔ ہمیں امید نہیں کہ لکھنؤ کے ضلع جگت کے استاد شاعروں کے ایک شعر میں اتنے تلازمے آسانی سے مل سکیں گے۔ یہ بزرگ ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷ء تک زندہ تھے۔

حضرات! قدیم اور پہلا دور اس بزرگ پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہی دور ہے جس میں ہمارے قومی شاعر شاہ عبداللطیف رحمتہ اللہ علیہ موجود تھے اور سندھ کو اپنے سندھی کلام سے مست اور مسحور کر رہے تھے۔

دوسرا دور

۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء سے ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء

حضرات! اس دور میں سندھ کا دو سلطنتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یعنی کلھوڑا خاندان اور اس کے زوال کے بعد ٹالپوروں کی حکومت۔

نور محمد خاں جیسے زبردست اور عالی ہمت فرمانروا نے نادر شاہ کی باجگزاری سے اپنے ملک کو آزاد کر لیا اور ساتھ ہی مغلوں کے گورنر بھی آنے بند ہو گئے۔ کیونکہ مغلیہ سلطنت "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم" ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ بلا شرکت غیرے سندھ نور محمد خاں کے خاندان کے تحت آ گیا۔ نور محمد خاں کا انتقال ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد مرادیاب سریر آرائے سلطنت ہوا اور اس کے بعد سلسلہ وار اس طرح بادشاہ ہوتے گئے۔

غلام شاہ	۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء	تا	۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء
سرفراز	۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء	تا	۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء
غلام نبی	۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء	تا	۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء
عبدالنبی	۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء	تا	۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء

اس آخری فرمانروا کے ساتھ ٹالپور قبیلہ جو پہلے ان کی پشت پناہ تھا۔ بعض اختلافات کی بنا پر برسرِ پیکار ہوا اور ہالانی کے میدان پر ایک عظیم جنگ نے کلھوڑوں کا پانسا پلٹ دیا اور ٹالپور خانوادہ کو سندھ کا حکمران بنا دیا۔ اس خاندان کی حکومت حیدر آباد سندھ میں ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء سے شروع ہوئی اور ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تک قائم رہی۔ اس خانوادہ کے حکمران افراد مثلاً

میر فتح علی خان	۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء	سے	۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء
میر غلام علی خان	۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء	سے	۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء
میر کرم علی خان	۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء	سے	۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء
میر مراد علی خان	۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء	سے	۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء

میر نور محمد خان ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء سے ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء

میر نصیر خان ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء سے ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء

علم و ادب کے سرپرست رہے۔ فارسی شاعری کا چرچا رات دن اُن کے دربار میں رہتا تھا اور کئی معیاری کتابیں تصنیف ہوئیں۔ یہ سب امیر خود بھی نظم خواہ نثر کے میدان کے شہسوار تھے۔

اس دور میں اردو کے کہنے والے یہاں بکثرت پیدا ہوئے۔ فارسی کتابیں تو بچ گئیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اس دور کا اردو ادب محفوظ نہ رہ سکا۔

میں سندھی نژاد اردو شعراء کا ذکر شروع کروں اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہنوں کو تھوڑی دیر کے لیے ہندوستان کی طرف منتقل کروں تاکہ آپ کی یاد تازہ ہو کہ اس دور میں دہلی اور لکھنؤ میں کون کون شعراء ممتاز تھے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دور کو سندھی تاریخ کے لحاظ سے میں نے ایک صدی کی طویل مدّت تک پھیلایا ہے۔ اس ایک صدی میں ہندوستان میں اردو کے استاد یہ تھے۔

سودا	۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء	سے	۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء
درد	۱۱۳۳ھ / ۱۷۱۹ء	سے	۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء
میر حسن	۱۱۴۹ھ / ۱۷۳۶ء	سے	۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء
میر تقی	۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء	سے	۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء
جرأت			۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء
انشا			۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء
مصحفی	۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۰ء	سے	۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء
نظیر اکبر آبادی	۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء	سے	۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء
رنگین	۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء	سے	۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۴ء
نصیر			۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء

اب میں آپ کو سندھ کے اردو شعراء سے متعارف کراتا ہوں یہ جو اس دور میں ہندوستان کے استادوں کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے لیکن ہمیں ان کی ہمتوں اور بلند حوصلوں کو یقیناً سراہنا چاہیے کہ اس دورِ دراز علاقہ میں جب کہ سندھ کا سیاسی تعلق دہلی سے منقطع ہو گیا تھا۔ وہ اردو کی

خدمت سے غافل نہیں رہے۔

میر علی شیر قانع : یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مقالات الشعراء سے ہم اس مضمون میں مدد لے رہے ہیں۔ تحفۃ الکرام سندھ کی تاریخ میں ان کی بے نظیر کتاب ہے۔ فارسی نظم میں بھی ان کی کئی کتابیں ہیں۔ وہ فارسی کے اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں لیکن اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور اس میں میر حیدر الدین کامل کے شاگرد تھے۔ مقالات میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

"فقیر نیز در حضور آن استاد کامل گاہے فکر ہندی می کرد۔"

فارسی میں پرگو شاعر تھے اور کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں لاتعداد شعر نہ کہے ہوں۔ خود ان کا اندازہ ایک لاکھ شعر کا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پُرگو شاعر نے اردو میں بھی کافی اشعار نظم کیے ہوں گے لیکن افسوس کہ ان کو محفوظ نہیں کیا۔ ایک دو شعر مقالات میں درج کیے ہیں۔ لیکن مخطوطہ کے خراب ہو جانے کے سبب ان کی عبارت نہیں پڑھی جا سکتی۔ ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۸ء میں انتقال کیا۔

منشی پرسرام مشتری ٹھٹھوی : یہ بھی فارسی کے شاعر اور میر علی شیر قانع کے شاگرد تھے۔ اردو میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ فارسی میں مشتری اور اردو میں بیربل تخلص تھا۔ اردو میں اُن کے استاد میر محمود "صابر" رضوی تھے۔ فارسی دیوان کا پہلا شعر یہ ہے۔

الٰہی مدبسم اللہ کن کلک بیانم را
سر دیباچۂ توحید گردان داستانم را

مقالات الشعراء جس وقت میر صاحب لکھ رہے تھے (۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۰ء) اس وقت جوان تھے۔

سیّد ثابت علی شاہ سیوستانی : سندھ میں مرثیہ گوئی کے میدان میں انہیں وہ درجہ حاصل تھا جو ہندوستان میں میر انیس اور مرزا دبیر کو۔ سندھی زبان میں لاتعداد مرثیے لکھے ہیں جن کے متعدد مجموعے موجود ہیں۔ ٹالپروں کے عہد میں کافی شہرت پائی۔ فرینامہ کا مصنف میریار محمد بن میر مراد علی خان ٹالپور کہتا ہے کہ :

"در عہد ش (میر کرم علی خان) دو آدمی عروج کردند۔ ازانہا یکے پیر محمد راشد، دوم ثابت علی نام شاعر، اگرچہ مذہبش قرامطہ بود لیکن شاعر در زبان سندھی بے نظیر بود۔ در مرثیائش کہ در ماتمداری حضرت امامین کرامین خوب مرغوب گفتہ است و تا الیوم در ایام محرم الحرام کہ مرثیات می خوانند من تصنیفات اوست"
(تالیف ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء)۔

ثابت علی شاہ سیوستان کے باکمال شاعر اور عدیم النظیر تاریخ گو مخدوم نورالحق مشتاق اور میاں غلام علی مداح ٹھٹھوی کے شاگرد تھے۔

ان کا اردو کلام مطبوعہ دواوین میں موجود ہے لیکن ان کا نسخہ میرے پاس نہیں تھا۔ لہٰذا نمونہ پیش کرنے سے فی الوقت قاصر ہوں۔ سیّد کا انتقال ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں ہوا اور ان کی پیدائش ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں ہوئی۔

شاہو بن روحل فقیر: خیر پور سے چند میل کے فاصلے پر ایک مشہور صوفی خانوادے کی مسند ہے۔ یہ صوفی شاعر اس مسند کے بانی میاں روحل فقیر کے صاجزادے تھے۔ سندھی اور سرائیکی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہا ہے ایک شعر سنئے ؎

کیا مجھ سوں ہوئی خطا کہ سجن بولتا نہیں
کس بے درد سوں ملا رے سجن بولتا نہیں

سچل سرمست: یہ سندھ کے وہ مشہور سندھی زبان کے صوفی شاعر ہیں جن کے ترانے آج تک سندھ کے گوشہ گوشہ میں گونج رہے ہیں۔ خیر پور ریاست کی حدود میں درازا ایک قصبہ ہے، یہ بزرگ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ان کے دو تین شعر سنئے ؎

سارا خیال تیرا مجھ پر گناہ کیا ہے
تم ہی گواہ رہنا دیگر گواہ کیا ہے
سنو رے آج سر میرے برہ باران آیا ہے
کرم کر کے صدف اوپر ابرِ نسیان آیا ہے
پتھر ہے ایسی زندگی بے عشق ہے شرمندگی
جس کو سجن کا درد ہے رویت اسی کی زرد ہے ؎

میر ضیاء الدین ضیاء ٹھٹھوی : یہ سیّد ٹھٹھہ کے مشہور شیرازی خاندان سے تھے۔ جن کا مورثِ اعلیٰ سیّد محمد حسین المعروف بہ سید مراد بن سیّد احمد الشیرازی المتوفی سن ۸۹۳ھ مطابق ۱۴۸۷ء، سمّہ دور کے آخر میں ٹھٹھہ آ کر بسے تھے۔ آج تک ان کا خاندان شیرازی سادات کے نام سے ٹھٹھہ میں مشہور ہے۔

فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کا دیوان بھی مرتب کیا ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

"فقیر اضعف العباد ضیاء الدین المتخلص بہ ضیا ولد سیّد عزت اللہ الشیرازی ساکن بلدہ ٹھٹھہ از دیوانِ غزلیات در زبان فارسی و قصائد و مناقب بسیار کہ ہندی تصنیف نمودہ۔"

ان کا یہ دیوان میر ٹھارو خان ٹالپور (۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء سے ۱۲۴۹ھ / ۱۸۲۹ء) کے نام معنون ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرپور خاص کا ٹالپور حاکم بھی اردو سے شغف رکھتا تھا۔

دیوان میں غزلیات، مستزاد، ترجیع بند، قصائد، مخمس اور مسدس وغیرہ تمام اصنافِ سخن موجود ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

آج گلشن میں نو بہار آیا
مت کہو کس کون اپنا یار آیا
کسی کی طاقت نہیں کہ دیکھے اُسے
جس نے دیکھا ہے بے قرار آیا
نہ فراموش ہوئے گا دل سوں وہ
نام اُس کا جو یادگار آیا
نظم روشن "ضیاء" کا معنی
سنج گوہر صرف آبدار آیا
رات دلبر کو خواب میں دیکھا
جلوہ تھا ماہتاب میں دیکھا
ہو گی اس کی حدیث طولانی
نسخہ انتخاب میں دیکھا
ہوں پریشاں مو بمو اس کا

زلف کو پیچ و تاب میں دیکھا
نور از جبہ میر ٹھارا خان
جلوہ گر ماہتاب میں دیکھا

عشق کی راہ میں جو کہ باز ہوا
آگے عشاق سرفراز ہوا
ہو کے پروانہ سان بہ محفل راز
شمع مانند جاں گداز ہوا
بہرہ ور ہے گا عشق کی راہ میں
جوں کہ محمود یا لیاز ہوا

خاموش کیا بلبل از نالۂ جاں کا
گلشن میں ہوا شور کس غنچہ وہاں کا
باریک ہوا برگِ سخن کا خجالت
جب ذکر ہوا اُس کے کبھی موئے میاں کا
ہر وقت ضیا رنگ دگر دورِ جہاں ہے
یکجا ہے کہاں ہے فصل بہار لور خزاں کا

یہ شاعر میر علی شیر کے عم زاد بھائی لور میر ٹھارو خان المتوفی (۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء) کے مصاحبِ خاص لور درباری شاعر تھے ۴۔

نواب ولی محمد خاں ولی لغاری : حیدر آبادی ٹالپور امیروں کی حکومت کا امیر الامرا اور بہادر سپہ سالار تھا۔ یہ بزرگ فارسی زبان میں چوٹی کے شاعر تھے۔ ان کی ایک مثنوی "ہیر رانجھا" لور فارسی دیوان ان کے شاعرانہ کمال کا بین ثبوت ہے۔ طب میں بھی "مصالح الامراض" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اردو میں شعر کہتے تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو :

آبِ حیات چشمہ ظلمات کے ہے اندر
مجھ کو ہے آب حیوان چاہ ذقن کا

ان کی وفات ۱۲۴۸ھ، مطابق ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔

میر صوبدار خان میر : المتوفی سنہ ۱۲۶۲ء مطابق ۱۸۴۵ھ۔ یہ میر فتح علی خان ٹالپور والئی سندھ کے صاحبزادے تھے۔ فارسی کے خوش گو شاعر اور شعرائے عصر کے بے حد قدرداں تھے۔ اردو میں بھی اشعار کہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام موجود ہوتے ہوئے بھی مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

خلیفہ نبی بخش خاں : انتقال بعد از سنہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء۔ حضرت پیر محمد راشد علیہ الرحمہ المعروف بہ روزے والا (۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء تا ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء) کے مرید خاص بلکہ خلیفہ تھے۔ حروں کا نام انگریزوں کے مظالم کی وجہ سے آپ کے سمع مبارک تک بھی پہنچا ہوگا۔ حضرت پیر محمد راشد رحمتہ اللہ علیہ اس تحریک کے بانی پیر محمد صبغتہ اللہ شاہ (المتوفی سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء) کے والد تھے اور خیر پور کے قریب اُن کی درگاہ موجود ہے، جس کے آخری سجادہ نشین کو انگریز نے اپنے کوچ کرنے سے چند ہی سال پیشتر پھانسی پر لٹکایا۔ ۵ –

الغرض خلیفہ نبی بخش کا روحانی تعلق اس خانوادہ کے بانی سے تھا۔ سندھی میں ایک دیوان اور ایک مثنوی ان کی یادگار ہے۔ دیوان میں اچھی خاصی تعداد اردو غزلیات کی ہے۔

اے مست شتابی آ میخانہ بلاتا ہے
سر کاٹ لے اُٹھ میں خمخانہ بلاتا ہے (کذا)

شب روز صراحی کو لبریز کیا کیجے
بھر جام سے آ ساقی مستانہ بلاتا ہے

مجھ تشنگی کی آگ بجھانے کوں نہ آیا
بھر جام وصل ساقی پلانے کوں نہ آیا

تجھ عشق کی آتش میں جلتا ہوں سدا میں
ٹک نین بھی نینوں سے ملانے کوں نہ آیا

تیسرا دور

سنہ ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء سے ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء

اب ہم تیسرے دور میں آئے ہیں۔ یہ دور انگریزوں کے سندھ میں ملک گیری سے شروع ہو کر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء پر ختم ہوتا ہے۔

سنہ ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں حیدر آباد کے قریب میانی کے میدان میں ٹالپور خانوادہ کو شکست ہوئی اور سندھ پر انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ نئی زبان اور نئے آئین آئے، پرانے تمدن اور تہذیب کی بساط اُلٹ گئی۔ باقیات الصالحات کچھ رہ گئے، جنہوں نے اپنا چراغ نئی آندھی اور جھکڑ میں بھی اپنی زندگی تک کسی نہ کسی طرح روشن رکھا۔

اس دور میں کچھ تو وہ حضرات ہیں جو میروں کے زمانہ کی پیداوار تھے لیکن ان کا زمانہ انگریزوں کی سلطنت میں گزرا اور کچھ خود انگریزی حکومت میں پیدا ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ میں ان کا ذکر شروع کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پھر ایک مرتبہ آپ کو دہلی کی طرف لے چلوں تاکہ آپ کے ذہن میں وہاں کے شعراء کی یاد تازہ ہو جائے۔

اردو کی تاریخ کا یہ دور "ناسخ" سنہ ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ھ سے شروع ہوتا ہے اور مولانا حالی مرحوم سنہ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کے نامی شعراء یہ ہیں۔

میر ممنون	۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء	سے	۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء
آتش	۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء	سے	۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء
مومن	۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء	سے	۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء
ذوق	۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء	سے	۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء
ظفر	۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء	سے	۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء
غالب	۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۷ء	سے	۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء
حالی	۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷	سے	۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء

اب میں پھر سندھی شعرا کا ذکر کرتا ہوں۔

میاں قادر بخش بیدل روہڑی: اس دور کا آغاز میاں قادر بخش بیدل کے نام نامی سے شروع ہوتا ہے ان کی شخصیت اس دور میں وہی ہے جو پہلے اور دوسرے دور میں شاہ عبداللطیف

اور سچل سرمست کی ہے۔

مذاق شعر و سخن ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ کئی دیوان فارسی اور سندھی میں، ایک دیوان اردو میں مرتب کیا۔ فارسی نثر میں بھی کئی ایک تصانیف چھوڑیں۔ فارسی، عربی، سندھی، سرائکی پر یکساں قدرت حاصل تھی اور اردو بھی جانتے تھے۔ مقام روہڑی جو خیرپور سے ۱۴۔۱۵ میل سکھر کے قریب ہے اس میں یہ بزرگ رہتے تھے اور وہیں دفن ہوئے۔

میروں کے عہد سنہ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے اور انگریزوں کے عہد میں ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا۔ فارسی اور سندھی میں بیدل تخلص کرتے تھے اور اردو میں طالب۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

دل وحدت طلب فارغ زقید جسم و جان ہوگا
کہ بیٹھک عاشقاں دائم بہ ملک لامکاں ہوگا

مرتا ہوں تیرے ناز کا آغاز ہے ہنوز
خونی کفن یہ نازک انداز اور ہے

میں ہوں مشہور عشق بازی میں
خاصہء درد غم مجازی میں

نازنین سب ہیں سنگ دل لیکن
تو ہے ممتاز بے نیازی میں

آج گلشن میں چلو دیکھو کہ چرچا اور ہے
باغ میں گل رخ کے آنے سے تماشا اور ہے

نکہت سنبل بنفشہ کے معطر ہیں دماغ
عطر بیزی شاخ آن زلف پریشان اور ہے۶۔

مخدوم عبدالکریم : مخدوم غلام حیدر ٹھٹھوی کے فرزند اور اردو کے اچھے خاصے شاعر تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے کلام کا نمونہ سر دست دستیاب نہیں ہوا۔ ان کا انتقال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۵ء میں ہوا۔

غلام حسین افضل : نازک خیال شاعر تھے۔ نثر نویسی میں بھی کمال تھا۔ تنبیہ المعاندین، مثنوی نان و نمک، نظم نوروز اور انشائے افضل آپ کی یادگاریں ہیں۔ اردو میں بہت کچھ کہا ہے لیکن میرے پاس ان کا نمونہ موجود نہیں۔ ان کی وفات ۱۴ جمادی الثانی ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں واقع ہوئی۔ آخر عمر میں اسد تخلص کرتے تھے۔

صورت سندھی : یہ صاحب ہندو تھے۔ صورت سنگھ نام تھا۔ ان کا اردو دیوان ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۱ھ میں کراچی کے ودیاونود مطبع میں "پریم تت" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اختتام کتاب پر یہ عبارت ہے۔

الحمد للہ علی احسانہ وافضالہ کہ درین آوان بھجت اقتران این گوہر نایاب بے بہا در مکنون مخفی یکتا اعنی نسخہ ہذا المسمی بہ پریمپرشاد و معروف بہ "دیوان صورت بہار" من کلام بلاغت انجام فصاحت ار تسام شاعر شیریں گفتار رشک شعرائے روزگار دیوان صورت سنگھ بہ انتظام منور برنگ سراج، دیوان لیکھراج، سابقہ مختار کار، حال پنشن بردار، سکنہ شہر حیدر آباد سندھ در مطبع ودیاونود کراچی مطبوع شد۔"

دیوان پر ایک منظوم اردو تقریظ منشی کھیم چند سنگھ صاحب کی ہے۔ چونکہ یہ بھی ایک دوسرے اردو نواز ہندو کی فکر کا نتیجہ ہے اس لیے پہلے اس کے چند شعر سنیئے۔

یہ گلزار بے خار صورت بہار
کھلیں جس میں معنی کے غنچے ہزار
شگفتہ ہیں گل اس میں رنگین نگار
کئی بلبلیں اس پہ ہوتیں نثار
کئی قسم کے رنگ اور اس میں ڈھنگ
ہندوستان پنجاب دکھنی دیار
محبت کے گلبن ہوں جس میں کھلے

صفت صدق کے نہر جاری ہزار

صورت نے اپنے غزلیات و قصائد اور مثنویات کو ہندی موسیقی کے انداز پر لکھنے کی کوشش کی ہے اور جگہ جگہ ہندی راگوں کے اشارات بھی لکھے ہیں۔

دیوان میں فارسی سندھی کا بھی کلام موجود ہے اردو کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

جس دل کو خدا یاد وہ آباد ہمیشہ
آباد ہمیشہ ہے وہ دل شاد ہمیشہ
درویش کی جھولی می خزانہ ہے غیب کا
طوبے ہے رود نیل ہے کاسہ فقیر کا
اپنے مرشد کا فقیروں کا خدا سب کا خدا
دیکھ جاتا ہوں میں دیدار تیرے کوچہ میں

سید غلام علی گدا ہاشمی : معقول و منقول میں آخوند احمدی اور آخوند روشن حیدر آبادی سے تملمذ تھا۔ میروں کے عہد حکومت میں عزت سے بسر کرتے تھے۔ ہز ہائی نس میر حسن علی خاں بہادر کی ڈیوڑھی سے وظیفہ ملتا تھا۔ اردو کا کلام سردست نہ مل سکا۔

ہز ہائی نس میر حسن علی خان : یہ حکمراں خانوادہ کا آخری چشم و چراغ تھا جس کی عمر عسرت اور غریب الوطنی میں گزری۔ شعر و سخن کے قدرداں اور فارسی، سندھی کے بڑے شاعر تھے۔ اردو میں بھی کہتے تھے لیکن مجھے ان کے کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ انہوں نے سکندر نامہ کا بھی سندھی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹھوی : یہ ایک جلیل القدر عالم اور فارسی زبان کے بہت ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ اپنے والد مخدوم عبدالکریم صدیقی نقشبندی سے تعلیم و تربیت پائی اور بعد میں میاں محمد زاہد شاکرانی سے تلمذ حاصل کیا۔ پہلے تخلص مسکین اور بعد میں خلیل کرتے تھے۔ خود لکھتے ہیں۔

"بزبان ہندی ہرچہ کردہ ام دران ہم تخلص مسکین است۔ دزبان ہندی را فقیر نداند مگر از سبب اثر صحبت سیّد غلام محمد گدا تخلص کہ دربلدہ ٹھٹھہ بود و دیوان ناسخ و آتش و

آباد را دیدہ شد از آں ایں قدر اثرے شد کہ چند غزل گفتہ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں ناسخ آتش اور آباد کے دیوان آچکے تھے اور لوگ ذوق سے ان کو پڑھتے تھے۔ مخدوم ابراہیم کے کلام کا کوئی نمونہ ہمیں نہیں ملا۔ انہوں نے میر علی شیر کے مقالات الشعرا کا تکملہ لکھا ہے جس میں انہوں نے (۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۰ھ) کے بعد سے لے کر ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء تک فارسی شعرا کا احاطہ کیا ہے اور یہ پوری ایک صدی کی ہماری ادبی تاریخ ہے جس کا صرف ایک نسخہ لاہور میں موجود ہے۔ ۷ ؎

محمد زمان حبیب : یہ محمد ابراہیم خلیل کے صاحب زادے اور اردو کے دلدادہ تھے۔ کلام کا نمونہ مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ ان کا انتقال سن ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں ہوا ہے۔

قاضی غلام علی جعفری طیاری : المتوفی ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء۔ یہ یحییٰ جعفر کے صاحبزادے تھے۔ ان کا اردو کلام بھی سر دست پیش نہیں کر سکتا۔

پیر حزب اللہ شاہ تخت والا : ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء تا ۱۳۰۸ھ بمطابق ۱۸۹۰ء۔ یہ حضرت بھی پیر پاگارو تھے اور پیر صاحب تخت والا ان کا لقب تھا۔ فارسی اور عربی زبان میں قدرت حاصل تھی۔ خط بہت اچھا تھا۔ شعر و سخن کے ساتھ خاص شغف تھا۔ فارسی میں ایک دیوان یادگار چھوڑا۔ مسکین تخلص کرتے تھے۔ ان کا دربار اپنے دور میں عالموں اور ادیبوں کا ملجا تھا۔ ہندوستان اور ایران سے صاحب کمال ان کے ہاں آئے اور یہ ان کی کفالت فرماتے تھے، ان کے چند اردو کے شعر ملاحظہ ہوں :

آتا ہے چمن میں بت گلفام ہمارا
ساقی بخدا بھر دے مجھے جام ہمارا
گر میں نہ کیا اس بت طناز کو سجدہ
آئے گا کسی کام یہ اسلام ہمارا

من بہ ہجرت رقیب و رد مہلت
برقیباں چنیں کرم مت کر
گرچہ ما خاطئیم پر کھیم

بر گنہگار ملھ بہم مت کر
بندہ درگاہ تستم اے سلطان
اب تو مسکین را جدا مت کر

محمد یوسف خاں ظہیر : یہ سندھی نژاد تھے۔ ملازمت کے سلسلہ میں یوپی میں رہا کرتے تھے۔ غلام محمد خاں خبیر کے شاگرد ہوئے ان کا کلام یادگار ضیغم میں موجود ہے۔

ابراہیم شاہ صوفی : ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جیسے دن سون سجن بچھڑا میری دل تب سے ہے جل جل
وداع کی آگ بجلی جوں ابر چشماں جوں باراں ہے

نظر علی فقیر : کنڈڑی کے مشہور صوفی شاعر میاں روحل کے پوتے ہیں، اردو کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ادھر دل مجھ سے کہتا ہے کہ چل تو یار کے دیرے
ادھر تن مجھ سے کہتا ہے کہ تو دکھ مجھ کو مت دے دے

فتح سندھی : یہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

خدا باقی دگر خاکی بقائی باغ میں جانا
سمجھ سن بات ہو سیانا پکڑ لے راہ ربانی

بہادر سندھی : یہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اتنی نظر مہر کی کرتے بہادر اوپر
پان کا بیڑا صنم تم نے کھلایا نہیں

غالباً پان کا بیڑا کسی لکھنوی شاعر سے ہمارے سندھی شاعر نے مستعار لیا ہے ورنہ سندھ کی معاشرت میں پان کو دخل نہیں ہے۔ ویسے تو سندھ میں پانوں کے استعمال کے سلسلے میں قدیم شہادت ہندو دور کی ملتی ہے کہ راجہ داہر جب محمد بن قاسم کے مقابلہ کے لیے راور کے میدان پر پہنچا تو ہاتھی پر اس کے ساتھ دو کنیزیں بھی پاندان لیے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ہندو دور

میں پان مستعمل ہو گا لیکن اسلامی دور میں یہاں اس کا آج سے پہلے نشان نہیں ملتا۔ ورنہ سندھی شعرا ضرور اس کو بیان کرتے۔

ہز ہائی نس میر عبدالحسین سانگی : حیدر آبادی حکمراں خاندان کے آخری چشم و چراغ تھے جو دور فرنگی میں پنشن پر گزر اوقات کرتے ہوئے سندھی میں شعر کہتے تھے۔ مطبوعہ دیوان میں اردو کی غزلیں بکثرت ہیں کلام بہت صاف اور پختہ ہے۔

جب پریشان صنم زلف دوتا کردے گا
دل دیوانہ کو زنجیر بپا کردے گا
ایک بوسہ جو فقیروں کو عطا کردے گا
اے صنم میرا خدا تیرا بھلا کرے گا

دل عشق لینے والے ہیں
کان میں یار کے جو بالے ہیں
دیکھنے میں جو آئے تارے ہیں
مرے آہوں کے وہ شرارے ہیں

سندھ کی اردو شاعری کا تیسرا دور ختم ہوا۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ھ کے بعد کراچی میں اردو کا نیا دور شروع ہوا۔ انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوئی جس کی وجہ سے کراچی اردو کا مرکز بن گئی۔ خاص اردو کے شاعر کچھ باہر سے آئے۔ کچھ وہاں پیدا ہو گئے تھے اور مشاعروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا جس نے ذوق شاعری کو خوب چمکایا۔ آغا حشر مرحوم بھی ایک عرصہ تک کراچی میں آتے رہے۔ ان کی وجہ سے اردو کی کافی گرم بازاری رہی۔ اس دور کے میر ایوب خاں، مولا بخش ہمدم اور افسر امروہوی صاحب خاص شعرا میں سے تھے جن میں سے پہلے دو نے سفر آخرت اختیار کر لیا اور تیسرے صاحب اس وقت بحمد للہ بقید حیات ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کی نوازشوں کا شکریہ ادا کر کے آپ سے رخصت ہوں، میں اردو کے ایک شاعر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ شاعر شیریں بیان والیٔ خیرپور ہز ہائی نس میر علی نواز خان ٹالپور تھے جنہوں نے اردو زبان کو سندھ میں پہلی مرتبہ درباری زبان بنایا اور اپنی شاعری

کے لیے اردو کا میدان منتخب کیا۔ پنجاب کے مشہور افسانہ نویس احمد شجاع صاحب اور اپنے شاعر حفیظ جالندھری صاحب اپنی عمر کے ابتدائی دور میں انہی کے دربار سے وابستہ تھے۔ دہلی کے آغا شاعر قزلباش مرحوم سے بھی ان کے بڑے مراسم تھے۔ ان کے انتقال کے کئی سال بعد آج پھر خیر پور میں اردو کی چہل پہل نظر آتی ہے اور ہمیں ایک نئی زندگی کا پیغام سناتی ہے۔

حواشی (از مرتب):

۱۔کلھوڑا حکمرانوں کی زبان 'سرائکی' نہیں 'سندھی' تھی۔

۲۔راشدی صاحب نے اپنی کتاب (تذکرۂ امیر خانی) میں لکھا ہے کہ میر حفیظ الدین اور میر حیدر الدین کامل آپس میں چچا زاد بھائی تھے۔

۳۔شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بعد سندھ کی ادبی تاریخ میں سچل سرمست کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جدید تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۱۷۰ھ اور وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔ محمد علی حداد مرحوم نے سچل کے کلام اور سوانح کے حوالے سے ۱۹۸۲ء میں ایک ببلیو گرافی شائع کی ہے۔

۴۔میر ضیاء الدین کا تعلق ٹھٹھہ کے شکر الاھی خاندان سے تھا۔ آپ میر علی شیر قانع کے چھوٹے بھائی تھے۔

۵۔انگریزوں نے پیر صبغت اللہ کو ۱۹۴۳ء میں پھانسی دی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں ان کی گدی بحال ہوئی اور پیر سید شاہ مردان شاہ صاحب دوم سجادہ نشین بن گئے۔

۶۔بیدل کی اردو شاعری کو اختر درگاہی نے مرتب کر کے سال ۱۹۹۷ء میں شایع کیا ہے۔

۷۔یہ تکملہ باہتمام پیر حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ نے سال ۱۹۵۸ء میں شائع کر دیا ہے۔

ابو علی ابن سینا کی تصانیف

(یہ مقالہ تھیوسیفکل ہال کراچی میں خود مضمون نگار نے پڑھ کر سنایا)

مسلمانوں میں جتنے نامور علما اور ماہرین فن گزرے ہیں، ان میں ابو علی ابن سینا کا نام سر فہرست نظر آتا ہے، اس جامعیت کے چند ہی مشاہیر مسلمانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔

ابن سینا ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا جس کو آج پورے ایک ہزار سال ہوتے ہیں، اسی بنا پر اسلامی ممالک میں اس کا جشن ہزار سالہ منایا گیا اور اس تقریب میں مشرق اور مغرب کے مشاہیر اہل علم نے حصہ لیا اور ابن سینا کی زندگی اور اس کے کارناموں پر مقالات پیش کیے۔ اس سلسلہ میں آج یہ جلسہ بھی اس نامور فاضل کی یادگار منانے کے لیے منعقد کیا گیا ہے۔

مجھ جیسے کم علم کج مج بیان اور ہیچمدان سے بھی اس موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کی فرمائش کی گئی، اور آج سے صرف تین روز پیشتر میرے عزیز دوست ڈاکٹر عباس ہمدانی نے کچھ اس ادا اور انداز سے کہا کہ میں باوجود بیحد مصروفیت کے انکار نہ کر سکا، یہ میرے لیے فخر و مسرت کا سبب ہے کہ میں بھی ابو علی سینا جیسے فاضل اجل پر لکھنے والوں کے اُس بین الاقوامی سلسلہ میں شریک ہو رہا ہوں لیکن حضرات آپ بخوبی اندازہ فرماسکتے ہیں کہ اس مختصر وقفہ میں ابو علی سینا پر مفصل اور کسی پایہ کا بھی مضمون لکھنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں، تاہم ایک بہت ہی مختصر سا مضمون اس باکمال شخصیت کے تصانیف پر آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی جرات اور جسارت کر رہا ہوں، اگر آپ جیسے اہل نظر اور اہل قلم بزرگوں کے معیار پر پورا نہ اترا تو میرے

بزرگو! میری علمی کم مائیگی اور وقت کی کوتاہی اس کی ذمہ دار ہے، امید ہے کہ آپ اپنی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کے طفیل مجھے معاف فرمائیں گے۔

ابو علی ابن سینا کے نام سے مجھے بہت ہی کم عمری میں واقفیت ہو گئی تھی، میرے دادا مرحوم اور والد مرحوم دونوں اپنے زمانے کے جید طبیب تھے، انہیں کی زبانی سب سے پہلے شیخ الرئیس ابو علی سینا کا میں نے نام سنا، جب کبھی کوئی طبی مسئلہ ان بزرگوں کے درمیان آجاتا تھا تو میرے بڑے بھائی علی محمد راشدی سے کہا جاتا تھا کہ اندر سے فلاں فلاں کتابیں لے آؤ، حضرات آپ جانتے ہیں، سگ باش برادر خورد مباش، وہ بڑے میں چھوٹا، وہ ۶ عدد ضخیم کتابیں مجھ پر لاد دیتے جنہیں میں زنانہ سے مردانہ میں لے آتا تھا، اور جب ان بزرگوں کے قریب آتا تو وہ پانچ کتابیں خود لے لیتے اور ایک میرے سر پر رہنے دیتے گویا یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ یہ بوجھ وہ میرے اوپر لاد کر لے آئے ہیں، بہر حال جب یہ کتابیں آجاتیں تو پھر شیخ الرئیس ابو علی سینا کے تذکرے شروع ہو جاتے، اس وقت یہی خیال گزرتا تھا کہ یہ بھی حکیم اجمل خاں کے خاندان کا کوئی بہت بڑا حکیم ہے اور حضرات یہ ۶ عدد کتابوں کا پشتارا جو مجھ پر لاد کر لایا جاتا تھا، اکسیر اعظم کی چار جلدوں اور قانون کی دو جلدوں پر مشتمل تھا، جن بزرگوں نے ان کتابوں کی ضخامت دیکھی وہی میری ذہنی مشقت کا بخوبی اندازہ فرما سکتے ہیں۔

یہ دور بھی گزر گیا، جب میں کچھ پڑھنے لکھنے لگا تو ایک کتاب "مجربات بو علی سینا" کے نام سے اُردو زبان میں نظر سے گزری جس میں زیادہ تر ضعف اور جنسی امراض کے نسخے، کچھ عملیات اور تسخیر حُب کے چٹکلے لکھے ہوئے میں نے پائے۔ اس کتاب کو دیکھنے کے بعد کچھ اچھی رائے مصنف کے بارے میں قائم نہیں ہوئی اور خیال یہ ہوا کہ یہ بھی کوئی "مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا" یا "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا" قسم کا کوئی بازاری اور شعبدہ باز حکیم ہو گا۔

زمانہ گزرتا چلا گیا، حضرات یہ بچپنے اور کم عمری کے خیالات تھے، جب ذرا مطالعہ وسیع ہوا اور تاریخ، سیر اور تذکرہ کی کتابیں نظر کے سامنے آئیں اور شیخ کی سوانح پڑھی تو خیالات کی دنیا ہی یکسر بدل گئی، معلوم ہوا کہ یہ تو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، جید عالم اور سائنسدان تھا، نہ فقط کم عمری کے وہ خیالات مٹ گئے بلکہ سچ پوچھئے تو اُس کے علم و فضل کی دل پر ایک دھاک بیٹھ گئی۔

حضرات ابن سینا کے حالات اس کی علمی تصانیف، تحقیقات اور فنی کمالات پر مشرق اور

مغرب میں اس کثرت سے لکھا گیا ہے کہ اس کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر مقالہ لکھنے کے لیے کافی محنت اور وقت درکار ہے، اس لیے اس مختصر وقت میں، میں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس کی علمی تصانیف کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کروں تاکہ مختلف علوم و فنون میں اس کی مہارت اور دستگاہ کا اندازہ ہو سکے، اور اس کے علمی و فنی کمالات کی ایک جھلک نظر آجائے۔

ابو علی حسین، ابن عبداللہ ابن سینا، شیخ الرئیس و معلم الثانی کے علم و فضل کی وسعت ان موضوعات سے ظاہر ہے، جس پر اس نے قلم اٹھایا ہے، کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں اس نے دسترس حاصل نہ کی ہو، چنانچہ الٰہیات، مابعدالطبیعات، نفسیات، منطق، فلسفہ، طب، کیمیا، طبیعیات، ریاضیات، فلکیات، لغت، شعر وغیرہ پر اس کی بے شمار تصانیف موجود ہیں، جن کے مخطوطات یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تمام تصانیف فلسفہ اور حکمت کے دائرے میں محدود ہیں، اور ان علوم و فنون پر مشتمل ہیں جو فلسفہ نظری کی مشہور اقسام کے تحت لی جاتی ہیں، خود شیخ نے اپنے رسالہ ''تقسیم العلوم'' میں اس طرح علوم کی تقسیم کی وضاحت فرمائی ہے۔

(۱) فلسفه عامه: حکمت، فلسفہ، شعر

(۲) فلسفه نظری:

(ا) علوم طبیعیہ، طبیعیات، علم النفس، طب، کیمیا،

(ب) علوم ریاضیہ، موسیقی، فلکیات،

(ج) الٰہیات، مابعدالطبیعات، تفسیر، تصوف،

(۳) فلسفه عملیه:

اخلاق، تدبیرہ منزل، سیاست، نبوت،

(۴) متفرقات:

مختلف مباحث۔

بروکلمان نے اپنی کتاب گشتشے میں شیخ کی تصانیف کو صرف پانچ فنون میں محدود کر دیا ہے۔ لیکن اس کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا، کیوں کہ وہ دنیا بھر کی عربی کتابوں کی فہرست دے رہا تھا اس لیے اس تقسیم کی وضاحت اس کے لیے ناممکن تھی۔

یورپ میں سولھویں صدی سے لے کر اب تک ابن سینا پر کافی لٹریچر جمع ہو گیا ہے۔ اور

صرف اس کے حالات، تصانیف، اور علمی تحصیلات اور فنی کمالات، آراء اور نظریات پر تقریباً ۲۱۰ کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں، لاطینی، جرمنی، فرنچ، اطالوی اور انگریزی وغیرہ میں لکھی گئی ہیں، طب میں اس کی مشہور کتاب "القانون" کا لاطینی ترجمہ جیرارڈ کریموتی نے ۱۴۷۳ء میں شائع کیا، اصل کتاب کا متن، روما سے ۱۵۹۲ء میں چھپا، یورپین مورخین سائنس کا بیان ہے کہ تقریباً چار صدیوں تک سلرنو (Salarno) اور پیڈوا (Padva) کی یونیورسٹیوں میں طب میں ابن سینا کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اسلامی ممالک خصوصاً مصر، شام، اور استنبول میں اس کی مشہور اور امہات تصانیف میں سے شفا، نجات، اشارات اور قانون مدتوں ہوئے کہ چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، اور اہل مشرق و مغرب نے ان سے کافی استفادہ کیا ہے۔ ان بڑی کتابوں کے علاوہ اس کے بے شمار چھوٹے چھوٹے رسائل کے کئی مجموعے مصر اور ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں، یہ مجموعے ۵۰ سے زائد رسائل پر مشتمل ہیں، قانون جیسی ضخیم کتاب کئی بار ہندوستان میں چھپ چکی ہے، نیز اس کا اردو ترجمہ بھی برسوں تک بازار میں بکتا رہا ہے، ابن سینا کے حالات اور اس کی تصانیف کے عربی مآخذ میں قدیم و جدید کتابیں ملا کر ۳۰ کے قریب ہیں، اس کی تصانیف کے خلاصے اور ان پر شرحیں اور حواشی لکھے گئے ہیں ان کی تعداد ان گنت ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان مشاہیر میں شاید ہی کسی صاحبِ علم و فضل کو ابن سینا جیسا قبول عام حاصل ہوا ہو اور اس کے متعلق اس قدر وسیع لٹریچر دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود ہو۔

قفطی نے شیخ کی تصانیف کی تعداد ۴۵ بتائی ہے جس میں ۲۱ بڑی کتابیں اور ۲۴ چھوٹے رسائل ہیں۔ بروکلمان نے اپنی فہرست کتب میں ان کی تعداد ۹۹ دی ہے جن کی فن وار تقسیم یوں کی ہے،

(۱) الٰہیات اور مابعد الطبیعیات پر ۶۸ کتابیں۔

(۲) فلکیات اور فلسفہ عامہ میں ۱۱ کتابیں۔

(۳) طب میں ۱۶۔

(۴) اور شعر میں ۴۔

لیکن جدید تحقیقات کی رو سے نہ قفطی کا ۴۵ کا عدد صحیح ہے اور نہ بروکلمان کی ۹۹ کی تعداد مکمل ہے، بلکہ شیخ کی تصانیف جو اب تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، ان کی تعداد ۳۲۶ ہے۔

یہاں میں علم و فن کے اعتبار سے اس کی تصانیف کی تعداد پیش کرتا ہوں، جن سے اندازہ ہوگا کہ ہر موضوع پر ابن سینا نے کتنی کتابیں لکھی ہیں:

(۱)حکمت ۲۴ کتابیں

(۲)منطق ۲۱ کتابیں

(۳)لغت ۳ کتابیں

(۴)طبیعیات ۲۵ کتابیں

(۵)شعر: اس کے عربی فارسی اشعار کے مجموعے استنبول کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(۶)علم النفس ۳۲ کتابیں

(۷)علم الطب ۴۲ کتابیں

(۸)کیمیا ۶ کتابیں

(۹)ریاضیات ۱۴ کتابیں

(۱۰)مابعد الطبیعات ۳۱ کتابیں

(۱۱) تفسیر القرآن ۶ کتابیں

(۱۲)تصوف ۳۱ کتابیں

(۱۳)اخلاق، تدبیرہ منزل، سیاست، نبوۃ ۱۱ کتابیں

(۱۴)رسائل شخصیہ ۴ کتابیں

(۱۵)متفرقات ۷ کتابیں

کوئی شخص اگر یہ خیال کرے کہ شیخ کو بڑی فراغت حاصل تھی اور تمام ضروری آرام و آسائش کا سامان اس کے لیے مہیا تھا اور اسے سوائے کتابیں لکھنے کے اور کوئی کام نہیں تھا، تو یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ کو زندگی بھر ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ مختلف اوقات میں بے سروسامانی کی حالت میں اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگنا پڑا، بعض اوقات امیروں رئیسوں اور درباریوں سے اسے جان بچانے کے خوف سے اِدھر اُدھر چھپنا پڑا، مگر ان مضطرب حالات میں بھی وہ تصنیف و تالیف کے کام سے غافل نہیں رہا، چنانچہ ابتدائے عمر میں اس نے ۵ سال سے ۲۲ سال کی عمر تک بخارا میں قیام کیا، اس مدت میں اس نے "حکمۃ العروضیۃ" "الحاصل والمحصول" اور "البرّ والاثم" تین کتابیں لکھیں۔ پھر جب بخارا سے خوارزم کر کانج، نسا، اور ابی ورد، اور وہاں سے

طوس، سمن کان اور جاجرم ہوتے ہوئے جرجان پہنچا، تو قامتہ جرجان کے زمانے میں اس نے منطق میں "المختصر الاوسط" لکھی اور کتاب "المبدأ والمعاد" "کتاب الارصاد الکلیہ" تصنیف کیں، اسی زمانے میں اس نے کئی اور کتابیں بھی لکھیں جس میں کتاب "القانون" کا ابتدائی حصہ "مجسطی" کا اختصار اور کئی چھوٹی کتابیں اور رسائل ہیں۔ رے میں اقامت اختیار کی تو کتاب "المعاد" لکھی، ہمدان کے قیام میں جبکہ وہ امیر شمس الدولہ کا وزیر ہو گیا تھا، اس نے "طبیعیات الشفا" کے نام سے کتاب "القانون" کا پہلا حصہ تصنیف کیا اور "الہٰیات الشفاء" اور "منطق الشفاء" کا ایک جزو لکھا، پھر جب قلعہ فرجان میں چار مہینہ تک قید رہا تو اس اثنا میں "کتاب الھدایہ" "حی بن یقظان" اور "القولنج" کے نام کی کتابیں لکھ ڈالیں، اصفہان میں امیر علاء الدولہ کے پاس رہا تو اس زمانہ میں اس نے "الکتاب العلائی" اور "القانون" کے علاوہ "کتاب الشفاء" "المجسطی" "الارثماطیقی" اور "الموسیقی" پر تقسیم کیا، آخر عمر میں اس نے "الانصاف" لکھی اور ہمدان میں ۴۲۵ھ میں وفات پائی۔

ظاہر ہے کہ اس طرح سفر میں، نہایت بے اطمینانی اور بعض دفعہ بے سروسامانی کی حالت میں اس قسم کی خالص علمی تصانیف کا لکھنا کس قدر دشوار بلکہ محال ہے، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شیخ کا دماغ تمام علوم وفنون کا مخزن تھا اور وہ ہر وقت ہر حالت میں علمی و فنی مسائل پر غور و خوض میں مصروف رہتا تھا، اور جہاں بھی ذرا سا موقع ملا، وہ ان مسائل کو قلمبند کرتا تھا۔

یہ شیخ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابو عبید عبدالواحد بن محمد الجورجانی جیسا فاضل شاگرد اور لائق ساتھی مل گیا، جس نے نہ صرف اس کی خود نوشت سوانح عمری کی تکمیل کی بلکہ اس کی اکثر کتابیں اور رسائل مرتب کیے، ایرانی فاضل محمد بن عبدالوہاب قزوینی کی تحقیق کے مطابق شیخ سے اس کی ملاقات ۱۰۱۲ء میں ہوئی، جبکہ شیخ کی عمر صرف ۳۲ برس کی تھی، یہ اسی شاگرد کا طفیل ہے کہ آج ہم ابن سینا کے حالات اور تصانیف سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں، ورنہ شیخ کی لااُبالی اور بے پرواطبیعت کی وجہ سے ہم اس کے تصانیف کی اتنی بڑی نعمت اور علمی دولت سے محروم ہو جاتے، اسی ایک فاضل کی قلمی محنت اور کوشش کی بدولت، شیخ کی تصانیف تلف ہونے سے بچ گئیں، کیونکہ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کے نسخے لوگوں کو دے دیا کرتا تھا، جس کی کوئی نقل اس کے پاس نہیں رہتی تھی، اس نے نہ صرف اپنی ملاقات کے زمانے سے لے کر شیخ کی وفات تک زندگی کے حالات قلمبند کیے بلکہ اس کی اہم ترین فارسی کتاب "دانش نامہ علائی" کو مکمل کر دیا، اور اس کی تمام چھوٹی بڑی تصانیف کو جمع کیا جو اس نے اپنی زندگی میں بے پروائی سے اِدھر اُدھر منتشر کر دی تھیں اور لوگوں کو دے ڈالی تھیں۔

جب شیخ ہمدان کے فرمانروا، علاء الدولہ کے دربار میں وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدے پر پہنچا، تو اس نے امورِ سلطنت اور سیاسیات میں پڑنے کے باوجود اپنی علمی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا، ان دنوں میں وہ ہمیشہ صبح ہونے سے پیشتر اُٹھ کر "کتاب الشفا" کے دو صفحے روزانہ لکھ لیا کرتا تھا، علی الصباح اس کے شاگرد اور احباب اس کے پاس آجاتے تھے، صبح کی نماز تک وہ ان کو درس دیا کرتا تھا، ہر نماز کے بعد امور سلطنت کی طرف توجہ دیتا، جب وہ رئیس کے دربار یا ایوان حکومت کی طرف چلتا تو داد خواہوں اور ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر اس کے ساتھ ہو لیتا تھا، کبھی کبھی اس کی تعداد دو ہزار تک بھی پہنچ جاتی تھیں، وہاں پہنچ کر وہ لوگوں کے مقدمات فیصل کرتا، غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کرتا، اور داد خواہوں کا انصاف کرتا تھا، دوپہر کا کھانا بھی وہ اپنے دفتر میں ہی کھا لیتا تھا، اور وہیں قیلولہ بھی کرتا تھا، پھر بیدار ہو کر رئیس کے پاس جاتا، مغرب کے وقت اپنے گھر واپس آتا اور پچھلی رات تک عیش و تفریح میں مصروف رہتا (۱)۔

اسی کثرتِ کار اور شب بیداریوں نے اس کی صحت کو بگاڑ دیا، اور سخت ترین قولنج کے درد میں مبتلا ہو گیا، آخر میں قولنج نے سرطانِ معدہ کی صورت اختیار کرلی۔ اور ۵۸ برس کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا، ان حالات اور اس پروگرام کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۱۶، ۱۷ برس کی عمر سے لے کر ۵۸ برس کی عمر تک یعنی صرف ۴۲ برس میں اس نے کثرتِ اشغال کیا۔ درباری مصروفیتوں اور متواتر سفر میں رہنے کے باوجود، اس کثرت سے اور علوم کے اتنے کثیر اور دقیق شعبوں پر کس طرح کتابیں تصنیف کر ڈالیں اگر اس نے لمبی زندگی پائی ہوتی تو نہ جانے علوم اور فنون کی اور کتنی بڑی دولت سے ہمارے دامنوں کو مالا مال کر جاتا۔

حضرات! ابن سینا خود اپنی ذات سے ایک "انجمن" تھا، علم و ادب کی انجمن اور فضل و کمال کی محفل! اس کی فلسفیانہ اور سائنسی تحقیقات نے تجربہ اور تحقیق کی دنیا میں ایک نیا باب کھول دیا، یورپ نے اُس کے خرمن سے بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے۔

ابن سینا نے علم و حکمت اور فضل و معارف کے جو خزانے چھوڑے ہیں وہ اس کی علم دوستی، وسعتِ مطالعہ، عمیق تفکر اور بلند خیالی کے شاہد ہیں، علم و فن کے مستقبل کا کوئی دور اُس کی تصانیف کے استفادہ سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

---

(۱) اسی لیے تو اقبال نے کہا ہے:

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

اس شعر میں حکیم الامت اور شاعر مشرق نے ابن سینا اور مولانا روم کے معتقدات اور نظریوں کے علاوہ ان دونوں کے کردار کے فرق کو واضح کیا ہے۔

میرزا غازی بیگ ترخان

سندھ کے ترخان دودمان کے آخری خود مختار سلطان میرزا جانی بیگ نے سن ۱۰۰۰ھ میں شکست کیا کھائی بلکہ بڑی جدوجہد کے بعد مجبوراً سندھ کی مملکت کو میرزا عبدالرحیم خان خاناں کے حوالے کر دیا اور خود فاتح سپہ سالار کے ہمراہ اکبری دربار کی طرف چلا۔

میرزا جانی جیسا کہ ملّا عبدالباقی نہاوندی نے لکھا ہے (۱)، ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۰۱ھ کو دربارِ اکبری میں پہنچا، کچھ تو خان خاناں کی تعریف اور سفارش سے اور کچھ جانی بیگ کی خود اپنے گفتار اور کردار سے بادشاہ اتنا متاثر ہوا کہ سندھ کی حکومت کو پھر انہیں کی جاگیر قرار دے کر ان کے سُپرد کر دیا۔

جانی بیگ خود تو وہیں رہا اور اپنے امرا کو سندھ کی طرف روانہ کیا تاکہ مملکت کا انتظام کریں اور اس کے اکلوتے فرزند میرزا غازی بیگ کی تربیت اور تعلیم کا بندوبست کریں، چنانچہ شاہ قاسم ارغون، خسرو خاں چرکس، بھائی خاں، ملّا گدا علی، عرب کوکہ اور ملّا جمال الدین "لشکرِ کثیر" کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔

نواب خان خاناں میرزا عبدالرحیم سندھ سے واپس ہوتے ہوئے دولت خان کو قائم مقام حاکم بنا کر گئے تھے، جس وقت جانی بیگ کے امرا نیا فرمان لے کر سندھ کی حدود میں داخل ہوئے تو دولت خان، بکھر میں تھا، وہیں فرمان اس کے حوالے کیا گیا اور حکومت سندھ کا جائزہ اس سے لے لیا گیا۔

حکومت گردی کی وجہ سے ملک کی حالت خراب ہو گئی تھی، خون ریزی، آتشزدگی اور

مسلسل جنگ و جدل سے کئی شہر ویران اور منہدم ہو چکے تھے، خود دار السلطنت ٹھٹھ بھی ان اثرات سے نہ بچ سکا تھا۔ شاہی محل، امرا اور شرفا کی حویلیاں برباد ہو گئی تھیں۔ مرزا جانی بیگ کے امرا نے انتظام ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے خراب شدہ شہروں کی اصلاح اور ٹھٹھ میں حویلیوں اور شاہی محلات کی درستگی کا بندوبست کیا، جیسا کہ تاریخ طاہری کے مصنف نے لکھا ہے:

''بوطن اصلی ہر کس متوطن گردیدہ، خانہ و حویلی سوختہ و خراب گشتہ را آباد نمودہ، موافق فرمودۂ صاحب خود پرداخت ولایت نمودہ گرفتند،،(۲)۔

میرزا جانی تقریباً آٹھ برس زندہ رہا اور سندھ کا انتظام اس کے امرا غائبانہ چلاتے رہے اور میرزا غازی کی تربیت اور تعلیم بھی ہوتی رہی۔ طاہری نے لکھا ہے:

''مدّت ہشت سال بدین منوال باہشت ہزار، میرزا در بندگی حضرت کہ شرف و سعادت بزرگان پاستان ایشانست بود، و متعلقاں در ملک حکومت، ملازمت والا گہر ارجمند میرزا غازی بیگ ترخان داشتند''(۳)۔

میرزا جانی کا انتقال ۷ ۲رجب سال ۱۰۰۹ھ میں برہان پور میں ہوا اور اس کی لاش لا کر ٹھٹھ میں دفن کی گئی(۴)۔

میرزا کے انتقال کے بعد بقول مآثر رحیمی:

''شاہ قاسم خاں ارغون، کہ امیر الامرا بود، و خسرو خاں چرکس کہ از ممالیک میرزا جانی بود، و منصب وکالت میرزا جانی بہ او متعلق بود، باتفاق اعیان سندھ، میرزا غازی را کہ در سن چھار سالگی (؟) بود بساعت میمون وطالع سعید بہ سلطنت برداشتہ''(۵)۔

میرزا غازی کی مسند نشینی کے سلسلے میں ایک روحانی بزرگ کے ارشادات گرامی بھی سننے کے قابل ہیں۔ مخدوم نوح رحمتہ اللہ کے ملفوظات (دلیل الذاکرین مصنفہ حاجی پنھور) میں لکھا ہوا ہے کہ ایک دن مخدوم نوح کے فرزند ارجمند مخدوم اوھم ثانی نے حاضرینِ مجلس سے پوچھا کہ:

''میرزا جانی رختِ حیات بدار البقا فرستاد، بجائے او بر تخت سلطنت کدام شخص اجلاس خواہد کرد۔''

اور تو کسی صاحب نے کچھ نہ کہا لیکن شیخ سید یحییٰ لکعلوی جو ''خوارق میں مشہور اور

معروف" تھے، دو زانو ہو کر ادب کے ساتھ مخدوم ادھم کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور بولے :

"دستارِ سلطنت این دیار از خدمت رسالت پناہ میرزا غازی یافت" (۶)۔

میرزا جانی کی وفات پر ملک میں بہت تشویش انتشار اور انتظار کے حالات پیدا ہو گئے تھے، جب ان کی نعش فرمانِ شاہی کے مطابق خواجہ محمد قور بیگی، برہان پور سے ٹھٹہ لایا تو اس وقت تاریخ طاہری کے مصنف نے لکھا ہے :

"مردم سپاہی و شہری، کہ ہنوز از حادثۂ ماضی آرام و آسائش نہ یافتہ بودند، مضطرب و متفکر گشتند، کہ بازچہ بلا و محنت بریں مردم رو خواہد آورد، ہر یک مرگ میرزا مردن خود پنداشتہ" (۷)۔

اس سے ظاہر ہے کہ میرزا جانی کے انتقال کے بعد ملک میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ملک کے روحانی پیشوا بھی تشویش ظاہر کر رہے تھے، چنانچہ یہی سبب تھا کہ مخدوم ادھم ثانی نے تشویش کا اظہار فرمایا اور سید یحییٰ لکعلوی نے میرزا غازی کی تخت نشینی کی نوید سنائی۔

میرزا غازی کے حق میں اکبر بادشاہ کی طرف سے بھی حکم صادر ہوا، جیسا کہ مآثر رحیمی میں ہے کہ :

"در برہان پور، نیز خلیفۃ اللّٰہی فرمان واجب الاذعان بنام میرزا غازی عنایت نمودند، کہ بدستور میرزا والی سندھ بودہ باشد" (۸)۔

حکم ہوا کہ یہ فرمان بابا طالب اصفہانی بطور ایلچی کے ٹھٹہ لے جائے اور میرزا غازی اور اس کے امرا کو نوازشات اور عنایات شاہی سے جا کر سرفراز کرے اور واپسی میں میرزا غازی کو اپنے ساتھ لیتا آئے تاکہ وہ نوجوان حاکم آ کر بادشاہ کی آستاں بوسی سے بھی معزز اور مکرم ہو، ملّا عبدالباقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ سعید خاں کو بھی بادشاہ نے بیس ہزار فوج کے ساتھ میرزا کو لینے کے لیے روانہ کیا۔

بابا طالب اصفہانی اور سعید خاں کی روانگی کو ملّا نہاوندی نے ایک ساتھ "فرمان شاہی" کے سلسلے میں ملا دیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں جدا جدا سندھ میں آئے اور الگ الگ اغراض کے ماتحت سندھ میں ان کی آمد ہوئی، جیسا کہ آئندہ صفحات میں آئے گا، اکبر نامہ کے مصنف نے اس فرمان اور غازی کی تخت نشینی کا ذکر ۱۰۰۹ھ کے واقعات میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"گیتی خداوند، از قدر دانی، اُلکائے اورابہ پورلو، میرزا غازیانہ باز گذاشت، و منشور والا، و گرانمایہ خلعت فرستاد" (۹)۔

یہ "منشور" اور "گرانمایہ خلعت" باباطالب سندھ میں لایا تھا۔

میرزا غازی کی عمر: ملا عبدالباقی نہاوندی نے میرزا جانی کی وفات ۲۸ رجب ۱۰۰۷ھ بتائی ہے جو کہ غلط ہے اور تخت نشینی کے وقت میرزا غازی کی عمر "چہار سالگی" لکھی ہے (۱۰)۔ باقی مورخ اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی لکھتے ہیں، ممکن ہے کہ عبدالباقی کے اس عبارت میں کتابت کی غلطی نے "چہاردہ سالگی" کو "چہار سالگی" کردیا ہو، میرزا جانی کی وفات جیسا کہ صاحب لب تاریخ سندھ اور اکبر نامہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے ۱۰۰۹ھ میں ہوئی اور غالباً اس سال میرزا غازی تخت نشیں ہوا اور اگر ۱۴ سال اس وقت اس کی عمر مان لی جائے تو اس کا سال ولادت ۹۹۵ھ یا ۹۹۶ھ ہوگا۔

مآثرالامرا نے سعید خاں کی بکھر میں آمد ۱۰۱۱ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ میرزا غازی اس کے ہمراہ ۱۰۱۳ھ میں بعمر ۱۷ سال بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، اگر ۱۰۱۳ھ میں اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی تو اس لحاظ سے بھی اس کی ولادت کا سال ۹۹۵ھ ہونا چاہیے۔ میرزا غازی کے تمام سوانح نویس سوائے ایک مآثرالامرا کے جس نے اس کی وفات کا سال غلطی سے ۱۰۱۸ھ لکھا ہے متفق ہیں کہ ۱۰۲۱ھ میں بعمر ۲۵ سال میرزا غازی نے انتقال کیا، اس لحاظ سے اس کا سال ولادت ۹۹۷ھ ہوا (۱۱)۔

بہر حال میرزا غازی کی ولادت ۹۹۵ھ اور ۹۹۷ھ میں کس سال ہوئی اور سندھ کی فتح کے وقت وہ ۴ یا ۵ سال کے تھے۔ تخت نشینی کے زمانے میں ان کی عمر ۱۳ یا ۱۴ برس کی تھی اور ۲۵ برس کے سن میں ان کا انتقال ہوا۔

ابتدائی مشکلات: میرزا غازی کو صغیر سن کی وجہ سے تخت نشین ہوتے ہی اندرونی مشکلات سے سخت ترین سابقہ پڑا۔ میرزا جانی کے اُمرا جو ۷، ۸ برس تک بلا شرکت غیرے سندھ پر حکومت کر چکے تھے، اس نا تجربہ کار اور کم عمر حاکم کو بے دست و پا کر کے اپنے ہاتھ کا کھلونا بنانا اور حکومت کو بدستور سابق اپنے تصرف میں رکھنا چاہتے تھے چنانچہ اس کو تخت نشیں کرتے ہی سازشوں کے جال اور دھڑے بندیوں کی بساط بچھ گئی۔

امرا کو سازشوں میں مصروف دیکھ کر ملک کے زمیندار اور عوام بھی گروہوں میں تقسیم

ہو گئے۔ مملکت کے باشندے ایک تو مسلسل مصیبتوں کی وجہ سے پہلے ہی پریشان تھے، اب اس کم سن حاکم کو دیکھ کر اور زیادہ دل گیر ہو گئے۔ میرزا غازی کی نا تجربہ کاری اور عمر کو دیکھ کر ان کے اور خود ملک کے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا سخت مشکل تھا، ملک پر سلطنت کے قدیم امرا کا اثر تھا، لہٰذا عوام نے یہی سمجھا کہ ممکن ہے انہی میں سے کوئی امیر صاحبِ اختیار بن جائے، انہوں نے بھی اُمرا کی طرح سازشوں اور دھڑے بندیوں کو ملک کے نجات کا حل سمجھ کر اپنے آپ کو اس میں مصروف کر لیا۔

ان سازشوں میں ترخان خاندان کا قدیمی ملازم اور امیر، خسرو خاں چرکس اور دربار کا بااثر امیر شاہ قاسم ارغون سب میں پیش پیش تھے، ان کی دیکھا دیکھی سلطنت کے چھوٹے چھوٹے بااثر ارکان اور اہل کار بھی ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے، مثلاً ملا گدا علی، بھائی خاں وغیرہ۔

میرزا غازی کا بخت اگر یاور نہ ہوتا تو جو طوفان ملک میں اُٹھا تھا، وہ اس کم عمر نا تجربہ کار اور بے یار و مددگار حاکم کو تنکے کی طرح اُڑا لے جاتا۔

تاریخ طاہری کے مصنف نے ان تمام حالات کو مفصل لکھا ہے۔ امرا کی فتنہ پردازیوں اور میرزا کی دُشواریوں کو جزئیات کی حد تک بیان کیا ہے، اس وقت جو ماحول تھا۔ اس کے متعلق اس تاریخ سے چند عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں تاکہ حالات کا صحیح نقشہ ذہن میں آجائے:

میرزا جب اپنے امیروں سے تنگ آ گیا تو اس نے سوچا کہ:

"اگر کسے قابل امیر امور ملکی بہم رسد و امعاملات ملک و مہلک کہ از پدرش مانده، سپارد، واز چنگِ آن کہنہ گرگاں، یعنی وکیلان پدر، بدر آورد، چرا کہ چنیں صاحبزادہ تیز فطرت را از بیدانشی خود، خورد سال پنداشتند در نظر نمی آورد۔"

بے اعتنائی اور خود سری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ معمولی ملازم بھی نافرمانی کرتے ہوئے شرماتے نہیں تھے اور اس کی انتہا یہ تھی کہ میرزا کے مویشیوں اور گھوڑوں تک کو وقت پر گھاس اور دلنہ نہیں دیا جاتا تھا اور بے زبان جانور چار چار دن تک بھوکے پیاسے اصطبلوں میں بندھے رہتے تھے، مصنف لکھتا ہے کہ:

"در ابتدائے کار، وکیلان پدرش کہ میرزا خورد پروردہ بودند، چناں می پنداشتند کہ ایں طفل ناداں باشد، از وہیچ نخواہد شد، بلکہ عار از خدمت او میداشتند۔"

ایک روز کا واقعہ لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ:

"یکروز عرب کوکہ ــــ ایشاں رادر سواری دید، وخود بطواف میرزاجانی بیگ آمدہ بود، باز گردیدہ در کنار مسجد در آمدہ بہ بھانہ نماز نشست و میرزانیز از فرط فترت، دریافت کہ ایں کدام فوج سواراں از من خودرادر گوشہ گرفتہ روبرو نیامدہ از ہمیں راہ عبور داشت۔"

بتانے والوں نے بتایا کہ یہ فلاں شخص ہے جس نے اس طرح دانستہ تجاہل کیا۔

بھائی خاں اور ملاّ گدا علی جوان کے باپ کے زمانے کے امیر تھے اور آگرہ سے بھی انہوں نے اپنا وکیل اور مختار بنا کر بھیجا تھا، ان کی کیفیت یہ تھی۔

"از رعونت و نخوت در مہم و معاملات دخل نمی کرد کہ عمر عزیز راچگونہ بدین طفل ناآزمودکارناہموار رامصروف نماید۔"

اور امیروں نے اپنی طرف سے ایک شخص احمد بیگ مہرنگ نامے کو مقرر کردیا کہ :

"اوبااحوال میرزاپرداختہ باشد، معاملات جزوی بدانش وقوف خودسرانجام نمودہ بسمع مامی رسیدہ باشد، ومہام کل، اگر میرزانیز حکم فرماید تاازیں استفسار نمایند، درانصرام آں نہ کوشد، کہ صاحبزادہ خورد سال چہ از کار بزرگ می داند، موجب برہم زدگی حکومت وولایت خواہد بود۔"

میرزا احمد بیگ کا تقرر : ان تمام معاملات نے میرزاغازی کو پریشان کردیا، ملک سے روز بروزان کااثر زائل ہورہا تھا، روپے کی آمدنی کم ہوتی جارہی تھی، فوج اور ملازم تنخواہیں نہ ملنے کی وجہ سے سُست، کاہل اور نافرمان ہوگئے تھے۔ ان مشکلات کی بناپر آخر کار میرزاغازی نے اپنے ایک ہی خواہ امیر، میرزا احمد بیگ کو سلطنت کا مختار اور وکیل کل بنا کر تمام سیاہ وسفید کا مالک بنادیا اور اس کو حکم دیا کہ :

"شمارا موافق معاملات امور ملکی ومالی پنداشتہ، مہام کلی وجزوی در ولایت علی الاستقلال حوالۂ ایشاں فرمودیم، نوعی کمر اخلاص بستہ بانصرام مساعی آرند، کہ آں واقعہ طلبان چند، انگشت اعتراض برکار ایشاں دراز ندارند، ورخنہ در حکومت می اندازند، انشاء اللہ تعالیٰ، آنچہ مدعائے خاطر آں دولت خواہ خواہد بود، ھمچناں نمودہ خواہد شد، اماایں ہمہ خودبیناں راچناں درپاحساب آوردہ شرمسار وشرمندہ دارند کہ از ما ملاحظہ پیدا نمایند۔"

احمد بیگ نے عرض کیا کہ:

"اگر سایۂ اقبال شما بریں بندۂ بے مقدار عاطفت گستر خواہد بود، والتفات روز بروز افزوں خواہند فرمود، بتوجہ عالی، بماشبہ پرداخت مہام خواہد شد، کہ سپاہی درست و خزانہ وولایت بمرتبہ معمور خواہد گشت، کہ صاحب بدولت آفریں خواہند فرمود، کسے کہ ازیں نادولت خواہاں، جریان امر ایشاں نخواہد شد، بسزائے وجزائے شائستہ خواہد رسید، انشاء اللہ تعالیٰ این بدگمان بے اعتقاد ناموافق منافق چندرا چناں روزھا خواہد انداخت کہ از کردار ناہموار منفعل و شرمسار گردیدہ، بر صائب رائے صاحب تدبیر و معاملات ملک و فترت بعضے بندگان تربیت طلب دیدۂ حیرت و حسرت خواہند کشاد۔"

میرزا احمد بیگ نے اس کے بعد ایک اور بھی درخواست کی اور کہا کہ:

"غرض گویاں ازروئے غرض درباب بندہ عرض نمایند، تا تفحص و تمیز نشود، مسموع نہ فرمایند، ونوشتہ بدست خاص بدین مضمون مرحمت شود کہ در سخن صلاح دید او کسی دیگر دخل ندارد۔"

تاریخ طاہری کے مؤلف نے لکھا ہے کہ جب نیا تقرر عمل میں آیا اور احکام صادر ہوئے اور "اُن گرگوں کو پتہ چلا، جو ملک کو بکری کی طرح اپنے اپنے چنگال" میں کیے بیٹھے تھے، یکلخت "خوابِ خرگوش" سے بیدار ہو کر متحیر اور متفکر ہو گئے۔ سب سے زیادہ آگ بھائی خاں کے لگی اور "ازپائے تا سر بآتش حسرت و حیرت سوخت۔" وہ نافذ شدہ حکم ہاتھ میں لے کر دیوان خانہ میں پہنچا اور میرزا احمد بیگ کو کہا۔ "اس بیوقوف صاحبزادہ" کے کہنے پر تم نے اپنے آپ کو کیسے بیوقوف بنایا ہے کہ احکام صادر کرنے لگے ہو۔" احمد بیگ نے مناسب اور موزوں جواب دیا تو بھائی خاں نے تن کر کہا کہ:

"او طفل نادان است، از معاملات ملک چہ خبر دارد، این مہمات وابستہ مامردم است، پدر شما ہم اورا وہم ولایت بمایاں سپردہ بود، کہ در آنچہ خیریت و خیراخواہی این سلسلہ دانستہ باشد، آنچناں نمایند۔"

احمد بیگ نے جمعیت خاطر اور بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ:

"ملک میراث اوست، نہ میراث شما، بہر کہ سپارد، بخود میداند، فرد انیک و بد ازو

درخواست خواہد فرمود۔"

بھائی خاں نے کہا کہ :

"مگر مامردم راعزل دانستہ ترانصب کردہ است ؟"

جواب ملا کہ :

"از بندگی ایشاں استفسار باید داشت تا معلوم مفہوم شود۔"

اس وقت ایک خادم مولہ نامی کو جو دربار سے دولت رائے کا خطاب حاصل کر چکا تھا، بھائی خاں نے میرزا کی خدمت میں دریافت حال کے لیے بھیجا، وہاں سے جواب لایا کہ :

"شمار اور مہام خود تصدیعہ نمی توانیم داد، کہ بسیار خدمت میرزائے مرحوم نمودہ اید، الحال از دولت ما فراغت دارند کہ حکم حکم ماست، بہر کہ دستور ستوری می فرائیم، دیگراں را متابعت او داشتنی باید، کہ بندگاں را بجز اطاعت و حکم برداری مجت و قدرت نیست، صلاح دولت خود درین دیدہ ایم کہ بہ جمیع معاملات ولایت بدست اومی رسیدہ باشد و شاھم متابعت نمایند، کہ اختیار ما بدست لوست۔"

یہ کورا لور غیر متوقع جواب پا کر نہ فقط بھائی خاں ہوش میں آیا لور حالات سے مایوس ہوا بلکہ تمام خود سر امیر لور بے پروا اہلکار بھی بقول صاحب تاریخ طاہری، "از گوش پنبۂ غفلت بر آوردہ بہوش آمدند۔"

اب بظاہر تو یہ لوگ سر دست خاموش ہو گئے لیکن اندر خانہ سازشوں لور تفرقہ بازیوں کی تاک میں رہے، تا کہ :

"اگر تفرقہ و پریشانی و قصور و فتور پدید آید، واز جائے فتنہ قائم شود، متانت و برتری ما بر میرزائے خود کام و خورد سال بظہور رسد۔"

ملکی معاملات کی اصلاح : ابتدائی مشکلات پر قابو پانے کے بعد میرزا احمد بیگ نے فوراً ملکی معاملات کی طرف توجہ دی، فوج کو از سر نو دُرست کیا، تنخواہیں جو ایک عرصہ سے وقت پر ملنا بند ہو گئی تھیں، باقاعدگی کے ساتھ جاری کیں، عوام کو خوش حال بنانے کی تجاویز عمل میں لایا، ملک لور درالسلطنت کے شرفا اور مستحق لوگوں کے وظائف پھر سے جاری کیے لور ایوانِ حکومت کا پروگرام اس طرح بنایا کہ ہر عرضی گزار لور داد خواہ معروضہ پیش کرنے کے بعد تین

دن کے اندر اندر اپنے مقصد اور مطلب کو پہنچ جاتا تھا۔

جاگیرات کا نظام بھی نئے سرے سے دُرست کیا۔ قبل ازیں تمام جاگیر دار آمدنی صاف کر جاتے تھے اور سرکاری لوازم کی ادائیگی بھی "خرابیٔ فصل" کے بہانے سے ٹال جاتے تھے، اس قسم کے لوگوں اور اہلکاروں کی جاگیریں ضبط کر کے خالصۂ سرکاری میں شامل کر دیں اور باقی جو جاگیر دار بچ گئے وہ خوف کی وجہ سے آئندہ کے لیے دیانت دار اور ایماندار بن گئے۔

ان تمام نئے اور موثر انتظامات کی وجہ سے ملک میں سکون محسوس کیا جانے لگا، ملک کی سرسبزی اور عوام کی خوشحالی بڑھنے لگی، سب رعایا میں جان آگئی، ناامیدی مایوسی اور اس کی وجہ سے جو انتشار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ دُور ہونے لگی، مملکت پر اپنے نوجوان حاکم کے تدبّر اور حکمرانی کے انداز کا سکہ بیٹھنے لگا۔

میرزا غازی ان حالات کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور اپنے باتدبیر اور نیک نہاد وزیر کو سلطان کے لقب سے سرفراز کیا۔

بغاوتوں کی ابتدا: معزول شدہ امرا اور بیدخل کارندے پہلے تو خاموش اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ سوائے ان کے برباد شدہ سلطنت کا انتظام نہ میرزا سے سنبھلا اور نہ اس کے مختارِ کل احمد بیگ سلطان سے سنبھلے گا لہٰذا مجبور ہو کر جلد ہی پھر انہیں کو عنان اختیار و اقتدار سونپی جائے گی لیکن جب گاڑی بڑے زور سے چلتی ہوئی نظر آئی اور کافی عرصہ تک ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تو انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ اگر زیادہ وقت یوں ہی گزر گیا اور انتظام ملکی کی بنیادیں پختہ ہو گئیں تو پھر یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گلدستۂ طاق نسیاں ہو جائیں گے، لہٰذا انھوں نے از سرِ نو اپنے آپ کو منظم کیا اور ایک دفعہ پھر انتشار اور فتنہ پھیلانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

ملک میں مواد موجود تھا، خود میرزا کے خاندان میں دو افراد ایسے تھے جو سلطنت حاصل کرنے کی دبی دبی آرزو دل میں رکھے ہوئے تھے، ایک میرزا عیسیٰ ترخاں جو وہیں ٹھٹھہ میں موجود تھا اور سمیجہ قبیلہ جو والدہ کی طرف سے ان کا عزیز ہوتا تھا اور بہت طاقت ور تھا، ان کی پُشت پر تھا، اور دوسرا میرزا مظفر بن میرزا باقی ترخاں جو ایک عرصہ سے کچھ کے راجہ کے پاس مقیم تھا اور میرزا کا چچا ہوتا تھا۔

ان دو کے علاوہ امرا کا ایک اور خاندان بھی میرزا غازی کی عدم التفات کی وجہ سے اپنا اقتدار

کھو چکا تھا اور دوبارہ اختیار حاصل کرنے کا آرزو مند تھا، وہ شاہ قاسم خاں ارغون کا خاندان تھا۔

شاہ قاسم خاں خود اور اس کا بیٹا امیر ابوالقاسم سلطان دونوں عہدِ ترخانی کے بااثر اور ذی اقتدار فوجی جرنیل امیر اور جاگیر دار تھے، گزشتہ دور میں اس خاندان نے بڑے بڑے فوجی اور ملکی کارنامے انجام دیے تھے۔ میرزا جانی کے زمانے میں عمر کوٹ کے راجہ سودرھ کو شاہ قاسم نے مغلوب کر کے عمر کوٹ کو حاصل کیا تھا۔ نصرپور کا علاقہ بھی سالہا سال سے ان کی تحویل اور جاگیر میں چلا آرہا تھا، علاوہ ازیں خود فرمانروا افراد سے رشتہ داری کا قریبی تعلق رکھتے تھے۔ میرزا غازی کے والد میرزا جانی بیگ نے شاہ قاسم خاں ارغون کی صاحبزادی سے عقد کیا تھا، جس کے بطن سے میرزا ابوالفتح پیدا ہوا اور ابوالقاسم سلطان کی لڑکی پہلے ابوالفتح سے منسوب ہوئی اور اس کے انتقال کے بعد میرزا غازی کے عقد میں دی گئی تھی۔

ابوالقاسم سلطان بے پناہ شجاع اور بہادر جنگجو تھا، تاریخ طاہری میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

"بہر طرف کہ رجوع می داشت فتح می گردید، الحق جائے آں داشت کہ ازاں حین باز کہ حسام در دست گرفتہ ہیچ جا شکست نخوردہ بود، وکارہا کرد کہ دراں عہد میاں نواحی کسی یاد نداشت، چنانچہ در حیات میرزاے مرحوم سودھائے عمر کوٹ راشکست دادہ، بیدخل ساختہ، در قلعہ ایشاں در آمدہ چند شبانروز خانہ ہائے راجپوتاں مع زناں آنہا تقسیم نمودہ بنوکران خود داد، وگاوکشی بمرتبہ داشت کہ تمام چاہ و تالاب ہندواں از جیفۂ آں مالامال ساخت۔"

پھر لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی بہادری، مردانگی اور سپاہیانہ فن کاری کی دھاک ایسی بٹھادی تھی کہ:

"اگر باتفاقاً یک طرف میل سواری میداشت، ہر طرف مردم ملاحظہ می کردند۔"

یہ بہادر اور ذی وقار خاندان جس نے ایوانِ حکومت کو قائم رکھنے میں ہمیشہ سے ستون کا کام دیا تھا میرزا غازی سے رُوگرداں ہو گیا تھا۔ خسرو خاں، چرکس، بھائی خان اور گدا علی وغیرہ تو احمد بیگ کے تقرر کے بعد حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے تُلے ہی بیٹھے تھے، چنانچہ تاریخ طاہری کا مؤلف انہی کے لیے لکھتا ہے کہ:

"حسودان چند، کہنہ کار از تشویر خجالت، خود را معزول پنداشتہ، شروع شورش در

اطراف وجوانب ولایت ساختند۔"

ملک میں جب تک فتنہ و فساد پھیلے، اس وقت تک ان لوگوں نے خود ٹھٹہ کے شہر میں بلوے کرانے شروع کر دیے تاکہ دارالسلطنت کا امن وامان سب سے پہلے غارت ہو جائے اور اس کے اثرات سے یہ ملک میں فائدہ اُٹھائیں۔ چنانچہ ایک دن ندیم کوکہ اور قاسم علی کوکہ کو ایوانِ حکومت کے احاطہ میں دیوان خانے کے اندر محمد علی، سلطان کابلی، اس کے بیٹے محمد معین اور خالو صبور علی نے بلاوجہ اور بے قصور دن دھاڑے شدید زخمی کر دیا، اس حرکت کے بعد وہ دیوان خانہ سے نکل کر اپنے گھر تک چلے گئے لیکن کسی کو مجال نہ ہوئی کہ ان کو گرفتار کر لے۔

میرزا غازی نے جب ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا تو دو ٹوک جواب دے کر اس کو واپس کر دیا، شہر میں انتشار پھیل گیا۔ لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے اور باہم دست بہ گریباں ہو گئے۔ میرزا کے آدمی بڑی مشکل سے حالات پر قابو پا سکے اور آخر مجرموں کو ان کی حویلی کے قریب قتل کر دیا گیا۔ اس طرح چند ایک اور بھی اس قسم کے واقعات شہر میں رونما ہوئے، جس کی وجہ سے انتظام میں خلل پیدا ہو گیا۔

میرزا غازی جو سلطان احمد بیگ کو مقرر کر کے خود :

"در محل "عشرت گاہ" و "دلکشا" کہ دراں حین نو بنا فرمودہ بودند، بہ دلبران دلخواہ و ندیمان غم کاہ، گاہ بیگاہ بعیش وطرب۔"

مشغول ہو گیا تھا، ان واقعات سے چونک اُٹھا اور چاہا کہ ان تمام شورہ پشتوں کا ایک ہی دفعہ قلع قمع کر دے، چنانچہ سب سے پہلے خسرو خاں چرکس کو ختم کرنے کا ارادہ بلکہ اہتمام کیا، لیکن میرزا عیسیٰ ترخاں کے ذریعے جو اس اہتمام کے وقت موجود تھا، خسرو خاں اطلاع پا کر بچ گیا۔ میرزا نے عیسیٰ ترخاں کو تہ تیغ کرنا چاہا لیکن وہ بھی ٹھٹہ سے نکل کر سمیجہ قوم کے قبیلہ میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ :

"امروز فردا فتنہ قائم خواہد گشت و مرا نیز از ملک یک گوشہ بدست آید۔"

میرزا غازی ابھی مقامی امرا کے قلع قمع کرنے کی تدبیر کر ہی رہا تھا کہ نصرپور کے علاقے میں ابوالقاسم سلطان نے بغاوت کا علم بلند کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

ابوالقاسم سلطان کی بغاوت : ابوالقاسم نے دیکھا کہ اگر اس وقت اور موقع سے فائدہ

اُٹھاؤں تو کسی کی مجال نہیں کہ میرے مقابلے میں منظم ہو کر آئے کہ اور :

"تمام حکومت ملک بدست ماخواہد آمد، کدام کسے است کہ روبروئے ماشمشیر خواہد کشید۔"

فتح کے بعد جو پروگرام ذہن میں تھا، اس کا نقشہ صاحب تاریخ طاہری نے یوں کھینچا ہے :

"میرزا فرزند ماست چند دیہہ بدو جاگیری می سازم و پیش خود نگاہ میدارم، باقی یک سر بہ تحت تصرف ماخواہد شد، غلاماں مع حویلی و فرزنداں واملاک بنفراں و خاصہ خیلاں خویش می بخشیم۔"

یہ تمام پروگرام بنا کر بغاوت کی ابتدایوں کی کہ ایک تاجروں کا قافلہ ٹھٹھہ سے جیسلمیر کی طرف جارہا تھا، جب وہ نصر پور کے قریب سے گزرا تو تمام مال واسباب لوٹ کر ان کو واپس ٹھٹھہ روانہ کر دیا۔ قافلے نے شہر میں پہنچ کر میرزا سے داد خواہی چاہی، میرزا نے ایک خط لکھ کر ان کو تنبیہ کی اور مال واپس کرنے کی تاکید کی اور لکھا کہ :

"این نوبت ازیں فعل ناہموار ایشاں در گذشتیم و من بعدہ، مردم خود را منع از بد فعلی خواہند داشت کہ لائق نیست۔"

اس خط کا کیا اثر ہونا تھا، مال اسباب واپس کرنے کے بجائے لکھا کہ "آپ کے اور میرے درمیان آئندہ "ایں بارگاہ" کی سرحد حدِ فاصل ہے، اس طرف میری حکومت اور اُس پار آپ کا عمل رہے گا، اگر آپ نے زیادہ ہاتھ پاؤں نکالے تو میں اپنی سرحد "کنار علی جان" تک لے آؤں گا۔" اس کے بعد اس نے وہ ہنگامہ بپا کیا کہ آمد ورفت کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

میرزا غازی کے تحصیلداروں اور تمام شقہ داروں کو وہاں سے خارج کر دیا۔ تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ :

"فتنہ بمرتبہ قائم ساخت وحادثہ بمرتبہ انداخت کہ راہ آمد و شد کشتی و خشکی مسدود ساخت، امن واماں از مفتونیٔ آں فتاں در گوشۂ کماں ودم شمشیر نہاں گردیدہ۔"

شہر کی ہیجانی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"چوں در مردانگی ودلاوری از خوردی باز علم والف بود، شہری وسپاہی خورد و بزرگ، از تاخت بیدریغ اور دریغ بر حال خویش می خوردند، کہ الحق اگر بے اختیار تاخت بدین صوب آرد کیست کہ روبروئے او گردیدہ از عہدۂ مصافش بر آمد۔"

ٹھٹھہ اور ملک کے دوسرے گوشوں میں جتنے شورہ پشت امیر اور امراتاک میں تھے سب

نے سمجھا کہ :

"نان مادر روغن افتاد، الان وقت ماست، میرزا را زبون خواہیم ساخت۔"

ان حوصلہ شکن حالات میں، بلکہ چاروں طرف مخالفت اور بغاوت کے حالات پیدا ہو چکے تھے اور سپاہیوں اور شہریوں کے حوصلے خوف وہراس سے پست ہو چکے تھے۔ میرزا غازی اپنے لشکریوں کو لے کر باغی کی سرکوبی کرنے محل "دلکشا" اور "عشرت گاہ" سے برآمد ہوا۔

شاہی فوج کی تعداد مورخ نے نہیں بتائی جو کچھ تھی وہ افتاں و خیزاں نصر پور کی طرف قدم اُٹھا رہی تھیں۔ ٹھٹھ سے لے کر "میرن کا تیار" تک اس فوج نے یلغار کرتے ہوئے جس شان سے راستہ طے کیا ہے ان کی تصویر تاریخ طاہری میں یوں مرقوم ہے :

"منزل بمنزل، خندق کناں، واحاطہ کناں، از بیم ویاس آن فتان یطاقی وچوکی نشان میرفتند، ہر شب ہراس از حدمی داشتند، کہ مبادا اودرراہ شب خون آرد۔"

مورخ نے اپنی طرف سے ابوالقاسم سلطان کے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"واقعی انسانیت ودبدبہ دلاوری بجائے بود کہ چنین کارھا، از انگشت چپ، ترکش بند، فروترین لوی آمد، اکثر مردم عام وچہ خاص نیز از رعب چنین می پنداشتند کہ اگر نیم شب از یک طرف تاخت نمود، حاجت تردد دیگر نبود از بس کثرت لشکر باہم دیگر می افتادند۔"

ابوالقاسم سلطان کو جب معلوم ہوا کہ بادشاہی لشکر شب خوں کی وجہ سے سخت ہراساں ہے تو میرن کا تیار کی منزل پر کہلا بھیجا کہ :

"ابوالقاسم ازین قسم زبوں نیست کہ از جمعیت لشکر شما اندیشیدہ بہ شب خوں کوشش نماید، ازین وجہ تا حال شب خوں نیاوردہ کہ صف جنگ خواہد نمود ودر روز روشن میدان از خون یلاں رنگارنگ خواہد ساخت۔"

قلعہ شاہ گڑھ کے سامنے شاہی لشکر نے جا کر پڑاؤ ڈالا اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، ابوالقاسم سلطان پر شاہی لشکر کوئی اثر نہیں تھا، وہ بدستور اپنے لاف گزاف میں مصروف تھا، تاریخ طاہری میں ہے کہ :

"ابوالقاسم سلطان نیز در عین ہوا پیش گاہ صبوحی زدہ، بر برج بارہ می نشست وبہ نزدیکان خود از مستی شراب ونخوت جواز ہمیں سخن لاطائل می پیمود کہ والدہ میرزا جانی

بیگ اگر مع ولایت درکابین ما آید مابعقد پدر خود شاہ قاسم خاں بر آریم، ودیگر دختران محمد باقر و جمیع ترخاں کہ در محل ایشانست بر براوراں و خویشاں قسمت نمودہ می دہیم و زناں مقرباں او بہ نزدیکاں خویش بر سپاریم۔"

ابھی جنگ شروع نہ ہوئی تھی مگر حالات روز بروز جنگ کو قریب تر لا رہے تھے۔ ابوالقاسم سلطان کے بوڑھے دور اندیش اور تجربہ کار باپ شاہ قاسم خاں نے جنگ کو ٹالنے اور صلح صفائی کرانے کی کوشش شروع کی، ان کے لیے یہ وقت سخت مشکل کا تھا، ایک طرف اپنا سر پھرا لڑکا، جو بادشاہت کے خواب دیکھ رہا تھا اور دوسری طرف ان کے ولی نعمت کا نورِ نظر، بقول صاحب تاریخ طاہری:

"اگر طرف داری فرزند خود نماید، در ہمہ عالم شہرت حرام نمکی یابد، واگر تماید، مردود طعون آں حق ناشناس شود۔"

بہت بڑی کوشش کے بعد آخر شاہ قاسم صلح لانے میں کامیاب ہوا اور شرطیں یہ طے پائیں کہ پچھلے تمام قصور نظر انداز کیے جائیں گے، ابوالقاسم کی جان بخشی کے ساتھ ساتھ ان کے متعلقین کے قصور بھی معاف ہوں گے۔ یہ شرطیں قرآن مجید پر طے پائیں، اس کے بعد ابوالقاسم اپنے باپ اور بھائی مقیم سلطان کے ساتھ میرزا کے حضور میں آیا، لیکن:

"از بس دماغ در عونت ہا در سر او جبلی واقع گشتہ بود، در مجلس کہ در آمد، ہیچ کس را از جملہ انسان نمی شمرد۔"

بظاہر تو ملک خانہ جنگی سے بچ گیا لیکن نہ ابوالقاسم کے دماغ سے رعونت گئی اور نہ میرزا غازی کے دل کا میل گیا، کلام اللہ درمیان میں آگیا تھا اس لیے میرزا کو کیا کلام ہو سکتا تھا۔ شاہی پڑاؤ ابھی اس جگہ پر موجود تھا، ابوالقاسم کبھی کبھی میرزا غازی کی خدمت میں سرسری طور پر حاضر ہو جاتا تھا لیکن کروفر، نخوت اور پندار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرزا نے اس دوران میں اس کی جبلت کا اندازہ لگا لیا اور فیصلہ کیا کہ یہ کانٹا کسی طرح سے ہٹا دینا چاہیے، جان لینا تو اب اس کے بس کی بات نہیں تھی البتہ اُس کی آنکھوں میں سلائی کرانے کی تجویز اُس کے ذہن میں آئی تا کہ اُس کو بینائی سے محروم کر کے ہمیشہ کے لیے بیکار بنا دے۔

ابوالقاسم کی بینائی ختم کی گئی: تیراؤ کے ساتھ ہر ایک ندی بہہ رہی تھی۔ میرزا غازی

ایک دن کشتی میں سوار ہو کر دوسرے کنارے کی سبزہ زار میں جا کر بیٹھا اور ابوالقاسم کو کہلا بھیجا کہ اپنی تصنیف "چنیسر نامہ" لے کر آئے تاکہ شعر و سخن کی مجلس قائم کریں۔

آدمی تاک میں تھے، جب سلطان کشتی میں سوار ہو کر درمیان میں پہنچا، اس وقت بابا علی یا باغ علی (۱۲)، نامی ایک تنومند شخص نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، دوسرے نے اُن کے سر سے دستار اُتار کر اُس کی مشکیں کس لیں، تیسرے نے اُس کے کمر سے شمشیر اور خنجر نکال لیا اور وہیں کشتی میں سلاخیں گرم کر کے اس کی آنکھوں میں پھیر دی گئیں۔

محمد علی سلطان نے اس سازش کے متعلق ایک خط کے ذریعے اس کو مطلع کیا تھا مگر بد بختی آچکی تھی، قسمت پلٹ گئی تھی۔ وہ خط راستہ میں اُسے ملا اور بغیر پڑھے اُس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد میرزا کے حکم سے سرکاری سپاہی سلطان کے لشکر پر ٹوٹ پڑے اور تمام لشکر کو تہ وبالا کر دیا، سوائے ایک جعفر علی ارغون کے جو بہادری سے لڑتا ہوا گرفتار ہوا، باقی سارے کا سارا لشکر بغیر مقابلہ کیے، جدھر رستہ ملا، بھاگ کھڑا ہوا۔

ابوالقاسم اور اس کے ساتھی جعفر علی ارغون کو میرزا کے حکم سے عرب کوکہ کا ملازم دریا خاں ٹھٹھ لے گیا اور وہیں جا کر اپنے قید میں رکھا۔ ابوالقاسم کی تلاشی سے محمد علی سلطان کابلی کا وہ رقعہ بھی نکلا جس میں اُس نے ابوالقاسم کو اس سازش کی اطلاع دی تھی، چنانچہ میرزا نے اُسی وقت اس کو توپ کے سامنے رکھ کر اُڑوا دیا۔

جب یہ ہنگامہ ختم ہوا، اس وقت جتنے شورہ پشت تھے مایوس ہو کر بیٹھ گئے اور میرزا عیسیٰ ترخان جو ایک عرصہ سے اس فتنہ و فساد میں اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا، ناامید ہو کر سمیجہ قبیلے سے نکل کر، سیدھا آگرہ کی طرف اکبری دربار میں پناہ لینے کے لیے چل دیا۔

میرزا جب اس کارروائی سے فارغ ہو کر ٹھٹھ پہنچا تو بقول صاحب تاریخ طاہری:

"مردم کہ اورا خورد سال پنداشتہ در نظر نمی آوردند، چوں بید از بیم .... لرزیدن گرفتند۔"

بابا طالب اصفہانی کی آمد: میرزا جب اس انتشار میں مبتلا تھا اور ابوالقاسم کی مہم پر ٹھٹھ سے غیر حاضر تھا اس وقت بابا طالب اصفہانی ٹھٹھے پہنچا۔ اسے اکبر بادشاہ نے خلعت، پروانہ اور

اُمرا کے لیے انعامات دے کر روانہ کیا تھا۔ اکبر نے ان کو یہ بھی کہا تھا کہ واپسی میں میرزا کو ساتھ لیتا آئے تاکہ وہ خورد سال شاہی دربار میں حاضر ہو کر مزید نوازشات اور مراحم خسروانہ سے فیض یاب ہو، جیسا کہ ماٰثر رحیمی کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"بابا طالب اصفہانی را برسم ایلچی گری مقرر نمودہ کہ بہ تتہ رود، و میرزا غازی و وکلائے اورا بنوازشات بادشاہی سرفراز ساختہ بدربار آورد" (۱۳)۔

بابا طالب ٹھٹہ میں میرزا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا، طاہری کے مصنف نے لکھا ہے:

"بابا طالب ایلچی، دریں اوقات از دارالخلافہ رسیدہ بود، و تمام ایں واقعات بحضور او گذشت، و ہمیشہ استعجال بر آمدن با اعلیٰ حضرت می نمود اما چوں می دانست کہ معاملات ملک ایں مرد آدمی ابتر و پریشان است، رعایت نیز نگاہ می کرد، بلکہ دستش از ین قسم نمی رسید کہ اورا تحکم نمودہ بر آرد۔"

اس خلفشار میں میرزا کے تقریباً دو برس ضائع ہو گئے، ۱۰۰۹ھ میں عنان حکومت ہاتھ میں لی اور ۱۰۱۱ھ تک مہمات ملکی میں مصروف رہا۔ جب ابوالقاسم کی بغاوت ختم ہوئی اس کے بعد قدرے سکون ہوا اور دوبارہ اپنے ملک کی نظم و نسق کی طرف توجہ دی چنانچہ طاہری میں لکھا ہے کہ:

"در دو سال بعد از فوت پدر رونق ولایت بہ مرتبہ داد، کہ اہلِ سند را۔ از داد و دھش.... آباد ساخت۔ اکثر اوقات شبہا در شہر مخفی سیر می کرد و احوال ہر یک از نیک و بد معلوم نمودہ با احوال او می پرداخت۔"

اس دوران میں ایک اور چھوٹی سی بغاوت ملک کے ایک حصے میں نمودار ہوئی۔ جام ہالہ کھور ولد جام دیسر ککرالہ کا جاگیردار بلکہ ایک طرح سے خود مختار حاکم تھا۔ سندھ کا یہ حصہ ٹھٹہ اور کچھ کے درمیان تھا۔ جام نے ملکی انتشار سے فائدہ اُٹھا کر شورش شروع کی۔ خوش قسمتی سے جام کا ایک عزیز جام داؤد اُس سے کٹ کر میرزا غازی کی طرف آ گیا جس کی امداد سے غازی کے لشکر نے جام کی بغاوت کا فور اُسدِ باب کر دیا اور اس کو ختم کرنے کے بعد میرزا نے اس علاقے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک جام داؤد کو اس کی خدمات کے صلے میں دیا اور باقی دو حصے سرکاری خالصہ میں شامل کر دیے۔

میرزا غازی کی خوش بختی اور اقبال مندی تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی جلد کامیاب ہو گیا

ورنہ کم عمری اور ناتجربہ کاری کے ساتھ ساتھ جب کہ تمام درباری، پُرانے امیر، ذاتی ملازم اور ملک کے سربرآوردہ لوگ مخالفت پر تیار تھے تو یہ امکان سے باہر تھا کہ وہ اس آسانی کے ساتھ سب پر قوی اور قادر ہو جائے گا۔

سعید خاں چغتہ کی آمد : یہ تمام واقعات جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے ۱۰۱۱ھ تک کے ہیں۔ بابا طالب اصفہانی کو ٹھٹہ میں رہتے ہوئے ایک مدّت ہو چکی تھی۔ غازی کی جائز اور ضروری مصروفیتیں دربار کی حاضری سے روک رہی تھیں۔ اُدھر دربار میں اس غیر حاضری کی وجہ سے چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ غالباً میرزا عیسیٰ ترخان جو سندھ سے بھاگ کر آگرہ دربار میں پہنچ چکا تھا، اُس نے بھی کچھ نہ کچھ سرگوشیوں سے کام لیا ہوگا۔ چنانچہ بادشاہ کی خاطر میں غبار آیا اور غازی کی غیر حاضری کو نافرمانی پر محمول کر کے سعید خاں چغتہ کو لشکر کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ حالات کا جاکر جائزہ لے اور فوراً میرزا کو دربار میں لے آئے۔ یہ ۱۰۱۱ھ کا واقعہ ہے، جیسا کہ مآثرالامرا کی اس عبارت سے ظاہر ہوگا :

> "در سنہ ۱۰۱۱ھ میرزا غازی در تھتہ بعد مردن پدر خود جانی بیگ خیال خود سری پیش گرفت، عرش آشیانی ملتان و بکھر را بجاگیر سعید خاں تنخواہ فرمود، اورا بر سر میرزا تعین کرد" (۱۴)۔

"خیال خود سری" اور "بر سر میرزا تعین کرد" کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دربار کی فضا میرزا کے حق میں مکدر ہو چکی تھی۔ مآثر رحیمی کے الفاظ یہ ہیں :

> "سعید خاں چغتائی کو کہ را بابیست ہزار سوار مقرر نمودند کہ رفتہ میرزا غازی را بپایہ سریر خلافت میسر آورد" (۱۵)۔

اس عبارت میں "بیست ہزار سوار" اور "میسر آورد" کے تیور درباری جذبات کی غمازی کر رہے ہیں۔

سعید خاں کے ساتھ ساتھ غالباً میر ابوالقاسم نمکین کے نام جو کہ اس زمانے میں بکھر میں موجود تھا، میرزا کو لانے کے لیے فرمان جاری ہوا۔ اکبر نامہ کا مصنف سال ۱۰۱۱ھ (۴۷ سال اکبری) کے حالات میں لکھتا ہے کہ :

> "باابوالقاسم نمکین فرمان نافذ گشت میرزا غازی را باخسرو خاں غلامے کہ معتمد اوست

روانہ درگاہ والا سازد"(۱۶)۔

بادشاہ ابھی تک اس خیال میں تھا کہ خسرو خاں غلام میرزا کا معتمد ہے، اس کو کیا خبر تھی کہ اس معتمد غلام نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اپنے فرائض منصبی کو کس طرح نبھایا ہے۔

بہر حال بابا طالب اصفہانی ابھی تک ٹھٹھہ میں فروکش تھا کہ ۱۰۱۱ھ میں سعید خاں چغتہ بھی بیس ہزار سواروں کے ساتھ یلغار کرتا ہوا بکھر میں پہنچ گیا، تاریخ طاہری نے اس کی آمد کی اطلاع یوں دی ہے :

"درین وقت خبر آمدن سعید خاں اشتہار یافت کہ بگر فتن ایشاں از آن جا متعین گردیدہ، اگر بطوع وطور خویش دریافت او نمودہ۔ ملک و مردم او مامون خواہند ماند والا بازولایت پائمال لشکر ہند خواہد گشت۔"

کم عمر اور مصیبت کا مارا امیر زا غازی پریشان ہو گیا، اکبر کی ایک فوج ملک کو روند کر اس کے باپ کو لے کر گئی تھی، ابھی اس پائمالی کے اثرات دُور ہونے نہیں پائے تھے کہ دوسری فوج اس کو لینے کے لیے سرحد پار کر آئی۔ دربار کے صحیح احکام اور سعید خاں کی آمد کا اصلی مطلب ابھی معلوم نہیں تھا۔ ملک نے اور خود میرزا نے بھی اس کی آمد کو دوسری جنگ کا پیش خیمہ سمجھا۔

جنگ کی حالت میں میرزا نے خیال کیا کہ "لکی" کے پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ بنا کر اپنی حفاظت کی جا سکتی ہے لیکن اس میں بہت بڑے خرچ کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں مقابلے کے لیے پامردی اور استقلال بھی لازمی تھا جس کے لیے نہ ملک تیار تھا اور نہ میرزا کی خواہش تھی کہ ان حالات میں ملک اور رعایا کو مصیبت میں مبتلا کرے۔

دربار میں روانگی کی تیاری : بکھر سے سعید خاں چغتہ کے آمد کی جب اطلاع پہنچی تو میرزا نے وہیں اس کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بکھر سے وہ ٹھٹھہ کے لیے اس لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوا تو ملک لشکر زدگی میں برباد ہو جائے گا۔ لہٰذا میرزا فوراً وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

مملکت کا انتظام چار و ناچار خسرو خاں چرکس کے حوالے کیا اور عرب کوکہ اور والہ قلی دیوان کو لشکر تحویل میں دے کر ملک کی حفاظت کے لیے چھوڑا، شاہباز خاں، احمد بیگ سلطان،

لطف اللہ سلطان، خواجہ امیر بیگ بخشی اور خسرو خاں کے بیٹے بھائی خاں کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کیا۔

آخری طور پر روانہ ہونے سے قبل چند روز کے لیے "فتح باغ" میں آکر ٹھیرا اور وہیں سے بیٹھ کر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہوا۔

ابوالقاسم کا فرار : ابوالقاسم سلطان عرب کوکہ کی حویلی میں قید تھا، دریا خان کو اس کے پہرے اور نگہبانی کا انتظام سپرد تھا۔ حویلی بے حد مضبوط تھی اور چوکی پہرے کا بھی انتظام مناسب طریقہ پر کیا گیا تھا، تاریخ طاہری نے لکھا ہے کہ عرب کوکہ :

"دریا خاں افغان خدمت گار خویش را با جماعت دیگر بروپاسباں گزاشت۔ باوجود خانہائے چناں محکم کہ طبقہ دو طبقہ در در داشتہ، دروں و بروں چوکی گماشتند۔"

اس کے ساتھ قیدی سے بہت بہتر سلوک بھی روا رکھا جاتا تھا۔ اس کے آرام و آسائش کا لحاظ بھی ہر طرح کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ :

رعایت آں فتنہ وقت ازیں قسم می داشتند کہ بدان کورے خواہ عورت و مرد اگر طلب می کرد، کسے مانع نمی شد۔"

پھر لکھا ہے کہ :

"اگرچہ چون باز چشم دوختہ، محبوس منزل بود، اما ز نشاط و طرب کہ دلش می خواست کمی و کوتاہی نداشت۔

روزانہ رات کو ان کی بہن "شاہ بیگم" جو میرزا جان مرحوم کی محل تھیں شیرینی بھیجا کرتی تھیں۔

جب میرزا "فتح باغ" میں جا کر ٹھہرا تو اس بہادر نابینا کو قید سے رہائی پانے اور ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کی سوجھی، چنانچہ میرزا ابھی فتح باغ میں مقیم تھا کہ اس نے اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنادیا۔

قید سے رہائی اس طرح پائی کہ روزانہ رات کو فیرنی کی آنے والی قاب میں بجائے فیرنی کے ایک دن رسّی منگوائی۔ اس کو بادگیر میں باندھا اور کمرے سے باہر کی طرف نکل گیا، "پنبہ واہی" میں کشتی اور اس کے دوسرے کنارے دو اونٹوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا، چنانچہ قید و بند سے رہائی پاکر راہِ فرار اختیار کی۔

طاہری کے مؤلف نے حیرانی کے ساتھ لکھا ہے کہ :

"کسے در خاطر ایں خطرہ ہرگز نہ بود، کہ آں بے چشم تنہا تواند ازیں خانہا کہ سر بفلک بودہ اند بجز باد گیر کہ ازاں گربہ باحیلۂ روباہی می بر آید وراہ دیگر ندارند، تواند بر آمد۔"

جمعہ کی رات کو یہ فراری ہوئی، دوسری صبح کو جب ہندو پُوجاپاٹ کے لیے وہاں سے گزرے تو باد گیر سے لٹکتی ہوئی رسّی پر ان کی نظر جا پڑی۔ ان کو شک گزرا، جب ان کی اطلاع پر آ کر دیکھا گیا کہ وہاں قیدی تو ندارد تھا البتہ ایک چارپائی دیوار سے لگی ہوئی تھی جس پر یہ پاؤں رکھ کر باد گیر تک پہنچا تھا۔

ابوالقاسم کی چابکدستی کا کمال یہ تھا کہ نہ فقط خود رہائی حاصل کی بلکہ اپنے ساتھ اپنے دوسرے ساتھی جعفر علی ارغون کو بھی دوسری حویلی سے جس میں وہ بند تھا نکال کر اپنے ساتھ لیتا گیا۔

میرزا غازی کو "فتح باغ" میں یہ اطلاع پہنچی، بہت پریشان ہوا۔ ملک کا انتظام خسرو کے ہاتھ میں دے چکا تھا، ابوالقاسم آزاد ہو گیا تھا، خود ملک سے باہر جا رہا تھا جہاں سے واپسی کے متعلق کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ان حالات میں مملکت کا حشر کیا ہوتا وہ ظاہر تھا۔

ابوالقاسم کے فرار ہونے سے میرزا غازی کو تو تشویش ہوئی لیکن شہر کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ طاہری میں ہے کہ :

"از رعب آن بے بصر، صاحب دبدبہ، اضطراب در سپاہی و شہری چناں پیدا گشت کہ گویا ہزار لشکر ہمیں زماں از جائے بر شہر خواہند ریخت۔"

دریاخاں جس کی تحویل سے قیدی فرار ہوا تھا اس کی حالت یہ تھی کہ :

"آن بیچارہ از ہم خوردن خانمان متفکر و حیراں بود۔ کہ اگر اورا بدست نخواہد آورد، اہل و عیالش را بدیگراں خواہند بخشید و خود خوراک کدام سگاں تشنہ خوں می گردد۔"

شہر میں پھیلی ہوئی افواہوں اور چہ می گوئیوں کی اپنے آنکھوں دیکھی ہوئی اور اپنے کانوں سنی ہوئی روئداد مصنف نے یوں لکھی ہے :

"فقیر بگوش خود، از مردم شہر پگاہ آں روز ہمیں استماع می داشت کہ امثال ابوالقاسم شر بر را حوالہ روباہاں می سازد و ہر چہ از زبان اہل بازار و اصناف می آمد، می گفتند و پگاہ کہ او را بدست آورد، ہماں مردم بداں زباں صد انواع مدح او می گفتند کہ چہ خوش بہادرو

دلورے و مردلنہ بود کہ اورا گرفتہ آوردہ، آرے عزو خواری قہر ولطف ارادہ باری است، دریک ساعت خوار را عزیزے۔ سازدو عزیز را خوارے گرداند، کسے را مجال ویارائے دم زدن نیست۔"

دریاخاں غریب مفرور قیدیوں کی تلاش میں دیوانوں کی طرح نکلا 'ساموی' کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس طرف چار شتر سوار ابھی ابھی گئے۔ آخر بہت دوڑ دھوپ سے تلاش اور جستجو کے بعد ان کو جالیا، جعفر علی تو مقابلہ کرتے ہوئے وہیں مارا گیا، ابوالقاسم سلطان گرفتار ہوا لیکن بہت حیلوں اور کوششوں کے بعد۔

جعفر علی کے سر کو نیزہ پر رکھ کر شہر میں تشہیر کی گئی اور ابوالقاسم کو لاکر بڑی نگرانی کے ساتھ قید میں رکھا گیا۔ میرزا غازی نے سجدۂ شکر ادا کیا، سروپا معہ اسپ خاصہ عرب کوکہ کے حصّہ میں آئی اور دریاخاں کی تنخواہ میں اضافہ کے ساتھ خلعت بھی آئی نیز اسے آئندہ کے لیے اپنی ملازمت خاص میں رکھ لیا۔

سعید خاں سے ملاقات : چار باغ سے کوچ کر کے میرزا بکھر میں آکر سعید خاں چغتہ سے ملا اور ملاقات کے دوران میں اپنی مشکلات کی تمام تفصیلات سے اس کو آگاہ کیا۔ سعید خاں اس نوجوان کے حالات، خلوص اور سعادت مندی سے بہت متاثر ہوا۔ سعید خاں کے تاثر کو صاحبِ تاریخ طاہری نے یوں بیان کیا ہے :

"نواب آن بخت مسعود را بچشم فرزندی دیدہ تلطف و سلوک پدرانہ بنوعے و بہجے کردن گرفت، کہ بیم خاطر اور مبدل باُمید گردیدہ وبفرزند رشید خویش سعد اللہ خاں کہ نامیۂ دولت او چوں آفتاب اندر چرخ چہارم رخشاں و تابان است، می درخشید، چناں اشارت عیاں و پنہاں فرمود کہ بدین گوھر بحر خاندانی احسانات و آدمیت یاری و برادری، صوری و معنوی ہمیشہ و ہمہ وقت از اندازہ افزوں میداشتہ باشد، تا غمگین و دل گیر نباشد، ہمہ وقت ہر دو گلدستہ باغ جوانی و جوان بختی شاخسار ھر بار کامگاری و کامیابی بشکار و چوگاں بازی شغل بیشہ می داشتند۔"

ہمارے مایوس مورخ کو جسے سخت خطرہ تھا کہ بکھر پہنچ کر نہ جانے میرزا غازی پر کیا گزرے گی، سعید خاں کے اس سلوک کو دیکھ کر وجد آ گیا ہے، عبارت آرائی اور تلازموں کے

گل کھلائے ہیں۔

تحفۃ الکرام نے بھی اس حقیقت کو رقم کیا ہے لیکن محتاط انداز اور شائستہ الفاظ میں :

"خان مذکور بحالش متوجہ تمام گردیدہ بفرزند خود میرزا سعد اللہ گفت از ناصیہ ایں جوان آثار اقبال جلوہ گراست، وترابا او عقد اخوت بسم، باھم برلوری صوری و معنوی مھد نمائید" (۱۷)۔

ماثرالامرا کا مصنف بھی اس کی تصدیق ان الفاظ میں کرتا ہے :

"وباسعد اللہ خاں پسرش (کہ خالی از کمال نہ بود) صحبت مرزا کوک شدہ۔"

دربار کی طرف روانگی : چند روز بکھر میں یہ دونوں جواں بخت صاحبزادے سیر و شکار میں مصروف رہے تا آنکہ وہاں سے کوچ کرنے کا وقت آیا، جانے سے پیشتر میرزا نے اپنی مملکت کے انتظام کو بدلنا چاہا۔ خسرو خاں چرکس کی تحویل میں مملکت کا انتظام چھوڑنے کے بجائے اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا، کیوں کہ اس کو خطرہ تھا :

"اگر بجا گیر خواھد بود، آیا بعد از ما نفاذ امر دار دیانہ۔ کہ بحضور ما نیز موافق رائے خویش کار می نماید۔ در غیبت ازین بتر خواھد کرد۔"

میرزا احمد بیگ سلطان جس کو میرزا غازی خسرو کے بجائے اپنا قائم مقام کرنا چاہتا تھا اُن کی کیفیت یہ تھی کہ :

"اگر از رکاب صاحب خدمت ٹھٹہ اختیار خواھم نمود۔ رسوا خواھیم گشت کہ مردم بومیہ ھمہ بخان وابستہ اند و عاقبت معاملۂ صاحب نیز معلوم نیست کہ کجا خواھد انجامید۔ پس لائق چنانکہ از رکاب محروم نماند۔"

خسرو جانے پر رضامند نہیں تھا اور سلطان بیگ ان کے ساتھ جانے پر مصر تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ خسرو خاں ٹھٹہ میں قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتا رہے لیکن ساتھ ہی احمد بیگ بھی وہاں رہے اور فوج داری اور مالی معاملات کی نگہداشت کرتا رہے جس میں خسرو خاں کو دخل کا حق نہیں۔

دربار میں باریابی : غازی میرزا ۱۰۱۳ھ میں آگرہ پہنچا، مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ ۱۷ سال کی عمر تھی جب وہ شرف اندوز ملازمت ہوا (۱۸)، تاریخ طاہری اور لب تاریخ سندھ کے مصنف نے بھی ان کا دربار میں پہنچنا ۱۰۱۳ھ میں بتلایا ہے۔ اکبر نامہ سال ۱۰۱۳ھ (۵۰ سال

اکبری) کے واقعات میں لکھتا ہے کہ :

"چہاردھم مہر ماہ الاھی۔ سعید خاں با پور خود۔ و ابوالقاسم نمکین ملازمت نمود۔ و میرزا غازی پور میرزا جانی ترخاں از ٹھٹھہ آمدہ جبین بسجود آستاں اقبال نورانی ساخت۔ و گزیدہ پیش کش بہ نذرلنہ گزرانید۔ ھیودھم بہ میرزا غازی و ابوالبقا اوزبک گوھر مرصع وبہ عابدی خواجہ جمدھر مرحمت شد"(۱۹)۔

تاریخ طاہری کا مولف دربار میں باریابی کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے :

"در ہزار و سیزدہ سن جلوس، بخاکبوسی قبلہ راستان اعلیٰ حضرت عرش آشیاں بہ دارالخلافہ آگرہ، مشرف شد، افتخار کونین و مباھات کائنات حاصل داشت، جون آن والئے ولایت حقیقی و مجازی بصورت و معنی اوراز جملہ صادقاں اخلاص آئیں یافت منظورِ نظر کیمیا اثر فرمودہ شمشیر خاصہ بدو عنایت نمودہ از یمن الطاف و مرحمت بمصب پدر ممتاز و سرفراز داشتہ دستور سابق صوبہ سندھ بجاگیر او مقرر و مفوض فرمودہ۔"

میرزا غازی کو ابھی وہاں چند مہینے نہیں گزرے تھے کہ اکبر بادشاہ کا انتقال ہوا اور جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

خسرو خاں کی بے راہ روی : خسرو خاں نے میرزا کی غیبت میں پھر اپنی سابقہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں، اسے احمد بیگ سلطان کا وجود کھل رہا تھا اور کسی نہ کسی طرح سے یہ کانٹا راہ سے ہٹا کر اپنے لیے میدان صاف کرنا چاہتا تھا۔

اپنے داماد شیخ کالہ اور قاسم خاں چرکس سے مشورہ کیا۔ طے یہ پایا کہ ارغوں اور ترخاں قبیلہ کو برانگیختہ کر کے احمد بیگ کو اس طرح ذلیل اور رُسوا کرایا جائے کہ پھر کسی کو ہمارے ہوتے ہوئے یہاں رہنے کی ہمت اور جرأت نہ ہو۔

ان سب کا خیال یہ تھا کہ میرزا غازی کا آفتاب اقبال دربار میں پہنچ کر غروب ہو جائے گا اور سندھ کی سرزمین اُن کی ریشہ دوانیوں کے لیے وقف رہے گی، لہٰذا کسی غیر شخص کی موجودگی اپنے اغراض کے خلاف سمجھ رہے تھے۔

شیخ کالہ اور قاسم چرکس نے بقول تاریخ طاہری :

"جماعت ارغون و ترخاں شباشب پیش خود طلب داشتہ۔ چنیں قرار نمودند کہ اگر ایشاں در اینجا راسخ قدم خواہند گشت و مہام ملک دخل پیدا خواہند داشت۔ از جاگیر ہر یک چہارم حصہ موافق ضابطہ کہ از ہشت مایہ سالیانہ۔ ششماہ۔ قرارداد آمدہ اند۔ خارج خواہند ساخت۔ لائق آنکہ فردا فتنہ قائم سازند کہ کار ایشاں بکرسی نہ نشینند۔"

دوسرے دن صبح کو جب میرزا احمد بیگ میرزا جانی بیگ مرحوم کی والدہ کے سلام سے فارغ ہو کر دیوان امارت میں واپس آ رہا تھا اس وقت اُس پر حملہ ہوا۔ احمد بیگ نے حالات دیکھ کر وہاں سے اپنی حویلی کی راہ لی۔ فسادی وہاں بھی پہنچ گئے۔ آخر جب کوئی چارہ اسے بچنے کا نہ رہا تو قاسم خاں ارغوں کی امداد طلب کی۔ شاہ قاسم اُن کی حویلی میں آیا اور ان کو ساتھ لے کر اپنی جاگیر نصرپور کی طرف چلا گیا۔

احمد بیگ وہاں سے عمرکوٹ اور جیسلمیر کا راستہ لے کر آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا، خسرو کے آدمیوں نے وہاں تک تعاقب کیا لیکن وہ باعافیت تمام منزل بمنزل طے کرتا ہوا اپنے ولی نعمت کے پاس آگرہ پہنچ گیا۔

جہانگیر کا عہدِ حکومت

ترخان نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ :

"بعد از اندک مدّت حضرت اکبر بادشاہ متوجہ ملک بقاشد، و حضرت نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ بر سریر سلطنت و خلافت جلوس فرمودہ، اوّل کسے کہ بسعادت مبارک بادی استعادیافت میرزا غازی بود، بعد ازاں امرائے دیگر" (۲۰)۔

جہانگیر کے حضور میں میرزا غازی کی پیشی کچھ ایسی ساعت سعید میں ہوئی کہ اس کے بعد بادشاہ کی خاص توجہ اور عنایات ہمیشہ میرزا پر قائم رہیں۔

خسرو کی بغاوت : جہانگیر کو اپنی حکومت کے پہلے ہی سال شہزادہ خسرو کی بغاوت سے سابقہ پڑا۔ غازی ابھی تک دربار میں موجود تھا، ایک روز جب کہ بادشاہ بغاوت فرو کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا، درباریوں سے کہا کہ میرزا غازی بھی حکمران خانوادے کا فرد ہے اور جہاں بانی سے واقف ہو گا کیوں نہ اس سے بھی اس مسئلہ میں رائے لی جائے۔ تجربہ کار اور پرانے امیروں نے کہا کہ ابھی وہ بچہ ہے، تجربہ نہیں، کیا مشورہ دے گا۔ جہانگیر نے فرمایا :

"آخر والی زادہ است، ھر آئینہ رایش منحرف از صواب وثواب نخواھد بود۔"

غازی میرزا سے بلا کر پوچھا:

"غازی میرزا دریں مہم چہ گوئی؟"

غازی نے کہا:

"ہرچہ رائے عالی تقاضا فرماید ھماں جواب باشد۔"

فرمایا:

"آخر بگو ترا چہ بخاطر می رسد۔"

عرض کیا:

"قبلہ دین و دنیا! ہر گاہ ایں کہتریں غلاماں را از راہ نوازش بایں خصوصیت مختص می فرمایند، آنچہ بہ خاطر می رسد و تقے عرض کنم کہ یکجائے مبارک در رکاب آرند۔"

بادشاہ خود عزم سفر کیے ہوئے تھا، جب میرزا نے بھی یہی اشارہ کیا تو فرمایا:

"دیدید! آخر والی زادہ است، ھرچہ می گوید صلاح دولت ھمانست" (۲۱)۔

یہی صفات تھیں جن کی وجہ سے میرزا غازی کے ساتھ جہانگیر کی دلچسپی بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچی کہ اس کو اپنی 'فرزندی' میں داخل کیا، جو نہایت غیر معمولی اعزاز تھا کہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ:

"حضرت جنت مکانی، جہانگیر بادشاہ میرزا غازی بیگ را مخاطب بہ فرزندی ساختہ، ہفت ہزاری ذات و سوار سہ اسپہ و دو اسپہ منصب دادہ، صوبۂ ملتان ھم بجاگیر ایشان تنخواہ نمودند و فرمان بخط خاص باایں عبارت می نوشتند کہ "فرزند ارجمند، سر بلند بابا غازی بیگ بہادر ترخان۔" و روز بروز مراحم خسروانہ بحال او در تزاید بود" (۲۲)۔

ترخان نامہ کا مصنف سید محمد جمال بن سید جلال الدین حسینی شیرازی جس نے اپنی کتاب میرزا غازی کے انتقال کے ۴۰۔۴۵ سال کے بعد میرزا محمد صالح بن میرزا عیسیٰ خاں ترخان ثانی کے کہنے پر لکھی تھی اور اس سلسلہ میں مستند ہے۔ میرزا اور جہانگیر کے تعلقات کو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے:

"حضرت جہانگیر، بادشاہ جرأت و چستی و چالاکی میرزا غازی پسندیدہ، بسر عنایت و

عاطفت آمده اور ابخطاب فرزندی، منصب پنجهزاری و دوازده ہزار سوار سر فراز فرمود۔ برولایت ٹھٹہ ، مملکت قندھار در جاگیر لواضافہ فرمود......."(۲۳)۔

خسرو کے تعاقب میں جہانگیر لاہور آیا۔ میرزا غازی بھی دوسرے امرا کی طرح اس کے جلو میں لاہور تک پہنچا اور اس سلسلے میں اس نے نہایت شائستہ خدمات انجام دیں۔ طاہری میں ہے کہ :

"بادشاہے چہار دانگ ھند تعاقب او (خسرو) فرمود، میرزا آنچہ لازمہ بندگی، بندگان یک رنگ بید رنگ از دل و جان بجا آوردہ خود را در سلک خاصان ایں بارگاہ منسلک ساخت و سرانجام کار بہ نتیجہ نیک رسید"(۲۴)۔

همشیرہ کی نسبت خسرو کے ساتھ : جہانگیر ۸ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو تخت نشین ہوا، غازی کو کئی مہینے آئے ہوئے ہو چکے تھے، تخت نشینی کے بعد خود میرزا کی خواہش ہوگی کہ اب وطن واپس جائے اور اس کے لیے اجازت حاصل کرلے۔ تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید خاں چغتہ، جو میرزا کو سندھ سے لایا تھا، میرزا نے اس کو اپنا ذریعہ بناکر جہانگیر تک اپنے مدعا کو پہنچایا، چنانچہ جہانگیر نے اپنے پہلے سال ؁ کے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ :

در ہمیں ایام عرض داشت سعید خاں بر رُخصت میرزا غازی کہ حاکم زاد، ولایت ٹھٹہ بود رسید، فرمودم کہ چوں پدر من ہمشیرہ اورا بفرزندی خسرو نامزد نمودہ اند انشااللہ تعالیٰ چوں این نسبت بوقوع آید، اورا رُخصت خواھم نمود"(۲۵)۔

یہ نسبت غالباً میرزا جانی کی زندگی میں ہوئی ہوگی اور عقد ابھی نہیں ہوا تھا کہ میرزا جانی کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد میرزا غازی اپنی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دربار میں اس وقت حاضر ہوا جب کہ خود اکبر رختِ سفر باندھے دنیا سے کوچ کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

اب چونکہ غازی موجود تھا، لہٰذا جہانگیر نے چاہا کہ عقد ہو جانے کے بعد میرزا وطن واپس جائے لیکن بعد ازیں معلوم نہیں کہ یہ عقد ہوا یا نہیں کیوں کہ اس عرصے میں خود خسرو نے جہانگیر سے سرکشی کی اور جہانگیر "چہار دانگ ہند" میں اس کے تعاقب میں مصروف تھا۔

وطن کی طرف واپسی : ہمارا خیال ہے کہ میرزا غازی کی وطن کی طرف واپسی عمل میں ہی نہیں آئی تھی کہ خسرو کی بغاوت شروع ہوگئی۔ تزک جہانگیری، تحفۃ الکرام اور طاہری کی

مندرجہ بالا عبارات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سعید خاں کی درخواست پر جہانگیر نے خسرو کے عقد تک غازی کو ٹھیرے رہنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد خسرو کی بغاوت فرو کرنے کے لیے جب بادشاہ سفر کی تیاری کر رہا تھا تو غازی سے مشورہ کیا۔ جب آگرہ سے نکلا ہے تو غازی بھی اس کے ہمراہ چلا اور بقول طاہری اس سلسلے میں شائستہ خدمات انجام دیں۔ ۱۰۱۵ھ میں قندھار پر ہمسایہ قبیلوں نے لشکر کشی کی اس وقت بادشاہ لاہور میں مقیم تھا میرزا غازی کے تذکرے میں ایک جگہ آیا ہے کہ :

"اما دریں راہ کہ میرزا محل خود (دختر برادر شریف خاں آتکہ) در ملتان متمکن ساختہ، متوجہ بدین صوب (یعنی قندھار) گشت۔"

ملتان کا صوبہ جہانگیر نے بطور جاگیر کے غازی کو عنایت کیا تھا اس لیے جب قندھار جانے کا حکم صادر ہوا اس وقت میرزا اپنے محل کو ملتان چھوڑ کر خود قندھار کی طرف گیا۔

تزک میں جہانگیر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"آخرالامر بہ آگرہ آوردہ (یعنی غازی) کہ بشرف پابوسی والد بزرگوارم سرفراز گردانید، در آگرہ بود کہ حضرت عرش آشیانی شنقار شدند، و من بر تخت دولت جلوس نمودم، بعد ازانکہ خسرو را تعاقب نمودہ، بہ لاہور داخل شدم، خبر رسید کہ امرائے سرحد خراساں جمعیت نمودہ، بر سر قندھار آمدہ اند و شاہ بیگ حاکم آنجا در قلعۂ قبلی شدہ، منتظر کمک است، بان ضرورت فوجی بہ سرداری میرزا غازی و دیگر امراو سرداران بہ کمک قندھار تعین شدند" (۲۶)۔

اس عبارت سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ سن ۱۰۱۳ھ میں غازی آگرہ پہنچا، لاہور تک جہانگیر کے ساتھ رہا تا آنکہ ۱۰۱۵ھ میں قندھار کی شورش فرو کرنے کی کمک روانہ ہوئی اس میں میرزا غازی کو بھی شریک کیا گیا، اور انہوں نے اپنی زوجہ کو جو غالباً اس دوران میں ان کے عقد میں آئی ہو گی، ملتان چھوڑ کر قندھار کی راہ لی۔

قندھار کی روانگی : مغل سلطنت کی طرف سے اس زمانہ میں قندھار کے صوبے پر شاہ بیگ حکومت کر رہا تھا، قندھار کے ہمسایہ سرداروں نے ۱۰۱۵ھ میں وہاں شورش پیدا کی اور قندھار کا محاصرہ کر لیا، جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے کہ :

"چہار شنبہ نہم محرم (بقول ترجمہ بیورج ۸ محرم) جشن اوّلین نوروز، بہ مبارکی بہ قلعہ لاہور در آمدم، جمعے از دولت خواہاں، معروض داشتند کی مُعاودت بدار الخلافت آگرہ دریں ایام کہ فی الجملہ خللے در صوبہ گجرات، دکھن و بنگالہ واقع است، بہ صلاح دولت اقرب خواھد بود، ایں کنگاش پسند خاطر من نیفتاد، چہ از عرائض شاہ بیگ خاں حاکم قندھار، بعضے مقدمات معروض افتادہ بود، دلالت براں می کرد، کہ امرائے سر حد قزلباش برافساد، چندے از بقایائے لشکر میرزلیاں آنجا کہ ہمیشہ محرک سلسلہ خصومت و نزاع اند، و ترغیب نامجات، درگرفتند، قندھاریاں، طائفہ می نویسند، حرکتے خواھد نمود، بخاطر رسید کہ مباد اشتقار شدن حضرت عرش آشیانی، و مخالفت بے ھنگام خسرو، داعیہ آنہارا تیز ساختہ، بر سر قندھار یورش نمایند، بحسب اتفاق آنچہ بخاطر آفتاب اشراق پر تواند اختہ بود، از قوۃ بفعل آمد، حاکم ہرات وملک سیستاں، و جاگیر داران ایں نواحی بہ کمک و مدد حسین خاں حاکم ہرات بر سر قندھار متوجہ گشتند۔"

پھر لکھتا ہے:

"شاباس بر ہمت و مردانگی شاہ بیگ خاں کہ مردانہ قائم کردہ قلعہ رامضبوط و مستحکم ساختہ وخود بالائے ارک سیوم از قلعۂ مذکور چناں نشست کہ بیرونیاں، علانیہ با مجلس اورامی دیدند، و در مدّت محاصرہ میان نہ بستہ، سروپا برھنہ، مجلس عیش و عشرت ترتیب می دادے وھیچ روزے نبود کہ، فوجے در برابر لشکر غنیم از قلعہ بیرون نمی فرستاد، وکوششھائے مردانہ بتقدیم نمی رسانید، تادر قلعہ بود، چنیں بود۔ لشکر قزلباش طرف قلعہ رااحاطہ نمودہ بودند۔"

اس طرح تقریباً ایک سال قندھار میں شورش رہی اور جس وقت یہ واقعات جہانگیر کو لاہور میں معلوم ہوئے اس وقت شاہ بیگ قلعہ میں محصور تھا اور قلعہ کے چاروں طرف غنیم کی فوجیں محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ جہانگیر لکھتا ہے کہ جب میں نے واقعات کی اطلاع پائی۔

"چوں ایں خبر در لاہور رسید ظاہر شد کہ توقف دریں حدود اقرب و اصلح بودہ، در حال فوجے کلانے بسرداری میرزا غازی و ہمراہی جمعے از منصب داران و بندہ ہائے درگاہ مثل قرابیگ کہ بخطاب "قراخانی" و تختہ بیگ کہ بہ خطاب "سردار خانی" سرفراز گردیدہ بودند، معین گشتند" (۲۷)۔

یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو میرزا غازی نے جہانگیر کی غیر معمولی توجہ اور عنایت خاص کی بدولت پرانے تجربہ کار امیروں اور بڑے بڑے سپہ سالاروں کی موجودگی میں پایا۔ قندھار کی مہم معمولی نہیں تھی، بہت سے سردار اور سپہ سالار موجود تھے جو کہ اس مہم پر جاسکتے تھے، میرزا غازی ان کے مقابلے میں بچہ تھا، اس کی کسی جنگی صلاحیت کا مظاہرہ بھی جہانگیر کے علم میں نہیں تھا لیکن پھر بھی انتخاب اس کا ہوا اور ساتھ ہی منصب اور نقارہ وغیرہ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ :

"میرزا غازی را بمنصب پنجہزاری ذات و سوار، سرفراز ساختہ، و نقارہ عنایت کردہ"

اس سلسلے میں جہانگیر میرزا غازی کے حالات بھی بیان کرتا ہے کہ :

"میرزا غازی ولد میرزا جانی ترخاں، کہ بادشاہ ملک ٹھٹہ بود، و بہ سعی عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار، در عہد حضرت عرش آشیانی، آں دیار مفتوح و ملک ٹھٹہ در جاگیر او کہ، منصب پنجہزاری ذات و سوار مقرر گشتہ بود، تفویض یافت، و بعد از فوت او، میرزا غازی پسر ش، بہ منصب و خدمت پدر سرفراز بود، آباو اجداد ایشاں از اُمرائے سلطان حسین میرزا بائقرا والی خراساں بودند، در اصل از سلسلہ امرائے صاحب قرآن اند۔"

اس کمک کے سلسلے میں جو انتظامات کیے گئے ان کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"خواجہ عاقل بخدمت بخشی گری ایں لشکر مقرر گشت، چہل و سہ ہزار روپیہ مدد خرچ گویان بہ قراخان و پانزدہ ہزار روپیہ بہ نقدی بیگ و قلیچ بیگ کہ از ہمراہان میرزا غازی بودند، مرحمت شد۔"

اور اس کے بعد لکھتے ہیں :

"بہ جہت رفع ایں خدشہ، ارادہ سیر کابل توقف لاہور را بخود قرار دادم" (۲۸)۔

قندھار کی طرف روانگی : میرزا غازی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، ملتان میں اپنی زوجہ کو چھوڑ کر قندھار کی طرف چلا۔

چند سال وطن سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے ملکی انتظام درہم برہم ہو گیا تھا، خسرو چرکس نے احمد بیگ سلطان کو نکلوا دیا تھا، مالی خواہ انتظامی امور اب اس کے اور اس کے متعلقین کے قبضے میں تھے، روپیہ پیسہ سب کا سب وہیں خورد بُرد ہو رہا تھا، میرزا غازی کے طلب کرنے

پر بھی اس کو حسب ضرورت روپیہ نہیں بھیجا جاتا تھا۔

جس وقت قندھار کی مہم پیش آئی اس وقت بھی وہ مالی مشکلات میں مبتلا تھا۔ تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ:

"از بے سر انجامئے کہ، ہنوز از جاگیر نہ خزانہ ونہ لشکر باایشاں رسیدہ بود، آزار بسیار می کشید، علی الخصوص در آنوقت کہ قرہ خاں از روئے ہزل وہزیان ہمیں می گفت کہ میرزا بدین مددے واستعداد، روبروے ترکمان خواہد شد" (۲۹)۔

میرزا کی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بے سروسامانی، نہ روپیہ نہ پیسہ، نہ اپنا لشکر ساتھ، اس پر ستم یہ کہ قرہ خاں کا تمسخر اور مذاق، غرض ایک عجیب کشمکش کی حالت میں قندھار کی طرف کوچ کر رہا تھا اور ہر منزل پر اپنے لشکر اور خزانے کا انتظار تھا۔

جب مقام دکی جونیانی میں میرزا کا پڑاؤ تھا، اس منزل پر اچانک قرہ خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے خیال کیا کہ اب اس کی فوجی جمعیت اور اس کا روپیہ واپس لے جا کر اس کے بیٹے کے حوالے کر دیں، جو اس وقت بکھر میں اپنی جاگیر میں مقیم تھا۔

میرزا غازی نے دیکھا کہ اگر یہ لشکر اور یہ خزانہ بھی ہاتھ سے گیا تو پھر قندھار کی مہم سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکے گا، بہت کچھ کہا سنا لیکن قرہ خاں کے آدمیوں نے نہیں مانا، میرزا نے مہم کی اہمیت بتائی اور یہ بھی کہا کہ میرا خزانہ اور لشکر ابھی تک پہنچا نہیں سردست قرہ خاں کا لشکر اور روپیہ میرے تصرف میں دیا جائے تو یہ مہم سرانجام ہو اس کے بعد جب میرا خزانہ آ جائے گا تو رقم ادا کر دی جائے گی، اور لشکر بھی واپس کیا جائے گا۔ لیکن کسی صورت سے وہ لوگ آمادہ نہیں ہوئے۔ آخر میرزا غازی نے قندھار کی طرف کوچ کا نقارہ بجوایا اور خود ہی روانہ ہو گیا۔ اس وقت قرہ خاں کے آدمیوں کو احساس ہوا اور اُنہوں نے بھی میرزا کا ساتھ دیا۔

قندھار کی فتح: میرزا غازی قندھار سے ابھی ایک آدھ منزل دُور تھا کہ غنیم کو اس کی اطلاع پہنچ گئی، اس وقت اتفاقاً شاہ عباس والئے ایران نے بھی تمام واقعات سے مطلع ہو کر شورش کرنے والوں کی طرف اپنا ایلچی حسن بیگ روانہ کیا اور حکم بھیجا کہ فوراً محاصرہ اُٹھا کر اپنے اپنے حدود میں چلے جائیں۔

ایک طرف سے میرزا غازی کی آمد کی اطلاع اور دوسری طرف سے شاہ ایران کا فرمان لے

کر حسن بیگ کا آنا۔ شورش پسندوں نے جب یہ حالات دیکھے تو ایک رات کو اچانک محاصرہ اُٹھا کر چپکے سے اپنے گھروں کی راہ لی۔

میرزا غازی کی خوش قسمتی تھی کہ بغیر ایک قطرہ خون بہائے قندھار میں داخل ہو گیا۔

مقالات الشعرا میں لکھا ہے کہ جب میرزا قندھار کے شہر میں داخل ہوا تو ایک شاعر نے ذیل کا قطعۂ تاریخ موزوں کیا:

نواب شاہ غازی چوں سوئے قندھار
نہضت نمود با سپہ بے حد و عدد

باموکب جلال درآمد بہ مولتان
دست دعا بہ دامن میمون شیخ زد

فتح و ظفر نمود بہ یمن رضائے پیر
و زخیل بدسگال مخالف نہ شد احد

تاریخ آں ز عقل چو کردم شبے سوال
بشگفت و گفت "پیر ولایت شدہ مدد" (۳۰)۔

۱۰۱۶ھ

ملتان کے جس پیر اور شیخ کی طرف اس قطعہ میں اشارہ ہے ان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

جہانگیر کو اس کی اطلاع ۲۲ ذوالقعدہ ۱۰۱۵ھ کو لاہور میں ملی۔ اپنے تزک میں دوسرے سال جہانگیری کے پہلے دن (مطابق ۲۲ ذی قعدہ ۱۰۱۵ھ = ۱۰ مارچ ۱۶۰۷ء) لکھتا ہے کہ:

"در ہمیں ایام روز مبارک از عرائض قندھار بموقف عرض رسید کہ لشکرے کہ بہ سرکردگی میرزا غازی ولد میرزا جانی بہ کمک شاہ بیگ خاں تعین یافتہ بودند، در دوازدھم شہر شوال سنہ مذکور داخل بلدۂ قندھار میشوند، و طائفہ قزلباش چوں خبر رسیدن عساکر منصورہ را پیش منزلے بلدۂ مذکور میشنوند، سراسیمہ و پریشاں و پشیماں تا کنار آب ہلمند کہ پنجاہ و شصت کروہ بودہ باشد عناں باز نمی کشند۔"

اس کے ساتھ پھر جہانگیر اس شورش کا مفصل تذکرہ کرتا ہے، آخر میں لکھتا ہے کہ :

"دریں ایام رایات جلال کہ بہ تعاقب خسرو از دار الخلافہ آگرہ حرکت نمودہ بود، در لاہور نزول اجلال داشت، بمجرد شنیدن ایں خبر بلا توقف فوج کلانے از امراء منصب داراں بہ سردارے میرزا غازی فرستادہ شد، پیش ازانکہ میرزائے مذکور بقندھار رسد، ایں خبر بہ شاہ (شاہ عبّاس) رسید کہ حاکم فراہ با بعضے از جاگیرداران ایں نواحی قصد ولایت قندھار نمودہ اند، ایں معنی را لائق ندانستہ بہ قدغن، حسن بیگ نامی را از مردم رُوشناس خود می فرستد، و فرمانے باسم آنہا صادر میگردد کہ از کنار قلعہ قندھار برخاستہ متوجہ جاو مقام خود شوند کہ بسبب محبت و موالات آبائے کرام باسلسلۂ علیہ جہانگیر بادشاہ قدیم است۔ آں جماعت پیش ازاں کہ حسن بیگ برسد و حکم بادشاہ بہ ایشاں رساند تاب مقاومت عساکر منصورہ نیاوردہ، مراجعت را غنیمت می شمارند، حسن بیگ مذکور آں مردم را ملامت نمودہ روانہ ملازمت شد، در لاہور سعادت خدمت دریافت و ایں معنی را اظہار نمود کہ ایں جماعت بے عاقبت کہ بر سر قندھار آمدہ بودند، بغیر از فرمودۂ شاہ عبّاس ایں حرکت از آنہا بوقوع آمد، مبادا کہ در خاطر ازیں امر گرانی راہ یافتہ باشد" (۳۱)۔

جب غازی میرزا کا لشکر شہر میں داخل ہوا تو جہانگیر نے لکھا ہے کہ ہمارے حکم کے مطابق اُس نے قلعہ سردار خاں کے حوالہ میں دیا اور کمکی لشکر کے ہمراہ شاہ بیگ کو واپس درگاہ والا کی طرف روانہ کیا۔

قندھار میں قحط : جس وقت میرزا غازی کا لشکر قندھار میں پہنچا ہے اُس وقت علاقے میں سخت قحط تھا۔ تقریباً ایک سال علاقہ کشت و خون اور مسلسل محاصرے میں مبتلا رہا للہٰذا اس مصیبت کا آنا لازمی امر تھا۔ چنانچہ میرزا غازی کے لشکر کو بھی سخت مصیبت اور تکلیف پیش آگئی، تحفۃ الکرام میں ہے کہ :

"مردمان میرزا غازی بسیار تلف و سواراں پیادہ شدند" (۳۲)۔

تاریخ طاہری کا مصنف محمد طاہر نسیانی، اس زمانے میں وہیں تھا اور اس خزانہ اور لشکر کے ساتھ پہنچا تھا جو ٹھٹھہ سے میرزا غازی کے فرمان پر بھیجا گیا تھا اور جس کے آنے میں تاخیر کی بدولت میرزا غازی قرہ خاں کے تمسخر کا حدف بنا تھا۔

نسیانی اپنے چشم دید حالات یوں لکھتا ہے :

"فقیر نیز دراں کومک کہ از خطہ بملازمت ایشاں می آمد تعین گردیدہ بود، بعد از داخل شدن ایشاں سپاہ مذکور رسید۔

قحط سالی بمرتبہ دید کہ اکثر غربائے آں سرزمیں گوشت چہارپائے اسپ وشتر می بریدند ومی خوردند، روزے از اینان استفسار داشت کہ ایں محض حرام است چرا می خورند۔ جواب دادند کہ بعد از سہ فاقہ حرام را حلال ساختہ اند و ما مردم راہفت و نہ فاقہ می گزرد، چوں چیز دیگر بہم نمی رسد بہمیں آرام نفس بے آرام می نمائیم، الحق ھمچناں وقت بود۔

ما و یک یار، محمد ہاشم نام ہم منزل داشتیم، آنچہ محاصرہ می بود باتفاق تناول می کردیم چوں سفر گزراندہ در قندھار حضر داشتیم، آذوقہ کہ ہمراہ برداشتہ بودم، تمام گردیدہ کار بر خریدن افتاد، یاراں کہ در آنجا بودہ اند، بہتر می دانستہ باشند، کہ روپیہ سیر روغن گندہ بود و روپیہ را سیر آرد و برنج، بحیلہ بہم می رسید، آں عزیز را پارہ روغن در دبلہ ماندہ بود، چوں دانست کہ روغن سرکار ما خوب است، ہم سفرگی فقیر بر طرف ساخت، عاقبت معاملۂ او بجائے کشید، کہ طعام از یاران کہ ہم جوار بودیم، نہاں کردہ در طہارت خانہ می خورد۔ روزے یاران برائے رسوائے وشرم ساری آں کم ہمت نفران جاسوس ماندہ، ہمیں کہ سفرہ دران نجاست جا گسترد، وخود بہ بہانۂ طہارت در آمدہ براں نشست، حاضر گردیدند، و اورا طعن ولعن نمودند، اما چہ سود۔ کہ چوں ترک آنجا داشت، چادر در برکشیدہ، لخت گوشت دھان پیش نہادہ پہلو افتادہ می خورد، چنداں کہ یاراں برابر محاضرہ خویش طلب داشتند نمی آمد، یوسف علی خاں یارے بود، روزے چادر از روئے آں تن پرور برداشتہ گرمحت، ویاران گوشت ونان مانند سگ از روئے ہزیان، کشیدہ گرفتند، آخر ہاشم سگ مشہور گشت۔"

میرزا غازی کے لشکر اور آدمیوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آخر میں مصنف نے لکھا ہے :

مردم میرزا بسے پریشاں وخراب ازیں قسم گشتند، کہ اکثر پیادہ ماندند و زیر بار قرض چوں گاو و خر در خلاب افتادند" (۳۳)۔

یہ تو ہوا میرزا کے لشکریوں کا حال، لیکن خود میرزا کی پریشاں حالی کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ معلوم ہوا کہ وہ خود سردار خاں اور میر بزرگ بن میں میر معصوم بکھری سے قرض لے کر اپنا گزارہ کر رہا ہے، جب سپاہی بھوک سے تنگ آ کر اس کی حویلی پر جاتے تو اُن کے حالات ملازم سُن لیتے، لیکن میرزا کی تنگدستی کو دیکھ کر اس کے سامنے پیش نہیں کر سکتے تھے، سپاہیوں کو دلاسہ دے کر بالا بالا ٹال دیا کرتے تھے۔ آخر ایک دن میرزا نے از خود حالات کا اندازہ کیا اور حکم دیا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ لے جا کر غریب سپاہیوں میں بانٹ دو۔

جب حالات نازک تر صورت اختیار کر گئے تو مجبور ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔

بکھر میں آمد: جہاں گیر کی طرف سے میرزا کو قندھار میں حکم پہنچا کہ وہ اپنے حالات اور لشکر کے ساز و سامان کو دُرست کرنے کے لیے قندھار چھوڑ کر بکھر کی طرف چلا آئے اور جب تک کہ دوسرا حکم نہ صادر ہو، بکھر میں قیام کرے۔ چنانچہ میرزا فوراً بکھر پہنچا اور اپنے ملکی اور ذاتی حالات کو دُرست کرنے میں مصروف رہا۔

سال اوّل کے ماہِ ربیع الثانی کے روزنامچہ میں جہانگیر نے لکھا ہے کہ میرزا غازی کو ۳۰ لاکھ دام بطور انعام دیے گئے (۳۴)، غالباً یہ انعام میرزا کو مہم قندھار کو خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کرنے کے صلے میں وہاں قحط کی وجہ سے جو نقصان ہوا، اس کی تلافی کے لیے دیا گیا ہوگا۔

دربار میں غلط فہمی: قندھار کی مہم ختم ہونے کی اطلاع پا کر جہاں گیر لاہور سے کابُل کی طرف سیر و تفریح کے لیے گیا، میرزا بدستور بکھر میں مقیم رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد جہاں گیر کے دربار میں میرزا کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی اور بادشاہ پر یہ اثر ڈالا گیا کہ میرزا اب اپنے وطن سے واپس نہ ہوگا چنانچہ دربار سے فوری طلبی کا فرمان صادر ہوا۔

یہ اطلاع تاریخ طاہری کی ہے لیکن، ترخاں نامے کا مؤلف لکھتا ہے کہ جب قندھار کی حکومت میرزا غازی کے سُپرد ہوئی اور اس نے وہاں جا کر اپنے آپ کو اتنا مقبول اور مؤثر ثابت کیا کہ ایک طرف ایران کے بادشاہ نے اس کے ساتھ ربط ضبط بڑھایا اور اس کو فرزند کے لقب سے یاد کرنے لگا، دوسری طرف شعرا اور علما کی آمد سے اس کا دربار شہنشاہوں کے دربار سے ٹکر کھانے لگا، رعایا اور لشکری اس پر جان دینے لگے تو حاسدوں نے بادشاہ کے کان بھرے اور کہا

کہ:

"میرزا غازی ہوائے باغی گری در سر دارد، بوالئے ایران اہل گردید، امروز فردا، سرکشی آغاز خواہد کرد"(۳۵)۔

پھر لکھا ہے کہ:

"بنا بر آں امتحاناً فرمان طلب بمیرزا غازی صادر گشت کہ بڈاک چوکی خودرا بملازمت رساند۔"

میرزا غازی فرمان کے پہنچتے ہی "اخلاص درست" کے ساتھ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور ۷ دن کے اندر قندھار سے لاہور اپنے آپ کو پہنچایا، جہاں بادشاہ سلامت شکار گاہ میں مقیم تھے۔

بادشاہ اسے دیکھ کر بہت مسرور اور متاثر ہوا۔ چغل خوروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بادشاہ سلامت نے انعام واکرام کے ساتھ، پنجاب کے چند علاقے بھی اس کو بطور جاگیر کے دیے اور قندھار بھی اس کے پاس رہنے دیا۔

اصل واقعہ تاریخ طاہری کا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ صاحب ترخاں نامہ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیوں کہ پنجاب میں ملتان کی جاگیر آگرہ سے آنے کے بعد قیام لاہور کے زمانے میں بادشاہ نے عنایت کی۔ وہاں سے قندھار کی مہم پر گیا، قحط کی وجہ سے سردار خاں کی سُپردگی میں قندھار دے کر حسبِ فرمان شاہی بکھر میں آکر مقیم ہوا۔ اس زمانے میں درباری امرا نے سرکشی اختیار کرنے کے خطرات بیان کر کے بادشاہ کی طبیعت کو مکدر کرنا شروع کیا اور بادشاہ نے اس کو بکھر سے بلایا، جب غازی میرزا بکھر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نہ فقط خوش ہوا بلکہ اس کو قندھار کا صوبہ بطور انعام دے کر وہاں روانہ ہونے کا حکم دیا جیسا کہ آئندہ آرہا ہے۔ والیِ ایران وغیرہ سے تعلقات اور درباریاں، یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔

بہر حال حسبِ اطلاع تاریخ طاہری میرزا غازی آستانۂ خلافت کی طرف چلا، اور:

"خلیفۂ روزگار از صوبہ کابُل بازگشتہ، قریب فردوس ثانی بلدۂ لاہور تشریف ارزانی فرمودہ بودند، رسیدہ، سر از سجدۂ قبلہ صوری خداوند مجازی سر افراز داشتہ، از آلام دوری و محن مہجوری مخلصی یافت۔"

تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ شعبان ۱۰۱۶ھ کو میرزا آستاں بوس ہوا، جہانگیر نے لکھا ہے کہ:

"روز دوشنبہ دوازدھم (۱۰۱۶ھ) میرزا غازی، کہ در سرداری لشکر قندھار مصدر خدمات پسندیدہ گشتہ بود ملازمت نمود، وعنایات بسیار نمودم"(۳۶)۔

ان "عنایات بسیار" کی شرح صاحب تاریخ طاہری یوں کرتا ہے:

"میرزا بموجب عقیدہ دُرست خویش از عنایت و اخلاص حضرت شاہنشاہی سربلند گردیدہ، ترقی منصب وجاگیر دیدہ، بصاحب صوبگی قندھار منصوب گشت۔"

گویا ٹھٹہ کی مملکت تو اس کو ابتدا سے تھی ہی، ملتان، آگرہ سے لاہور پہنچ کر عطا ہوا۔ قندھار کی مہم پر جاتے وقت "پنج ہزاری ذات سوار اور نقارہ" عنایت ہوا، قندھار سے واپسی کے وقت ۳۰ لاکھ دام انعام ملا اور اب ٹھٹہ، بکھر، ملتان کے ساتھ ساتھ قندھار کے صوبہ کی حکومت بھی میرزا کے سپرد کی گئی۔

قندھار کی صوبہ داری

قندھار کی حکومت: ہندوستان کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے قندھار کا صوبہ اس زمانہ میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، علاوہ ازیں وہاں کے قرب وجوار کے امیروں نے جو فتنہ اور فساد اُٹھا رکھا تھا، ان کی وجہ سے خاص طور پر قندھار کی طرف سے بادشاہ کو اطمینان نہیں تھا۔ شاہ بیگ قندھار کی گورنری سے واپس بلایا گیا تھا۔ عارضی طور پر حکومت سردار خاں کے حوالہ کی گئی تھی۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ قندھار پر مضبوط حاکم بھیج کر اس طرف سے اطمینان حاصل کرے اور اس کے بعد ہندوستان کے جن علاقوں میں شورشیں پیدا ہو رہی تھیں، ادھر توجہ کی جائے۔

جہانگیر، غازی میرزا کو دل سے پسند کرتا تھا۔ فرزندی کا خطاب فقط اسی ایک سردار کو عنایت کیا گیا تھا، علاوہ ازیں ابھی ابھی قندھار کی مہم میں "خدمات شائستہ وپسندیدہ" انجام دے کر آیا تھا، اس بنا پر اس علاقہ کی حکومت کا قرعہ اس بلند اقبال نوجوان کے نام پر پڑا، جہانگیر ۱۰ رمضان ۱۰۱۶ھ (سال دوئم جہانگیری) کے روزنامچہ میں لکھتا ہے کہ:

"روز پنج شنبہ، دھم ماہ، میرزا غازی را بہ منصب پنج ہزاری ذات و سوار، سرفراز ساختہ، باآنکہ کل ولایت ٹھٹہ بجاگیر او مقرر بود، پارای از صوبہ ملتان نیز بہ جاگیر او مقرر گشت و حکومت قندھار و محافظت آن ملک کہ سرحد ہندوستان است، بہ عہدہ کاردانی وحُسن سلوک او مقرر گردید، وخلعت وشمشیر مرصع عنایت کردہ رخصت

دادم" (۳۷)۔

صاحب ترخان نامہ اس کی تفصیل فراہم کرتا ہے:

"حضرت جہانگیر بادشاہ، جرأت و چالاکی، میرزا غازی پسندیدہ بسر عنایت و عاطفت آمدہ، اور اخطاب فرزندی، و منصب پنج ہزاری و دوازدہ ہزار سوار سر افراز فرمود، و حکومت بر ولایت ٹھٹھہ۔ مملکت قندھار در جاگیر او اضافہ فرمود، و حکومت قندھار بہ او تفویض فرمودند، و فرمان بدستخط خاص صادر شد کہ "فرزند غازی امیدوار بودہ، بداند کہ اور اخطاب فرزندی سرفراز ساختم و آنچہ کہ لوازم شہزادہ ہاہست از سلام و قور و فیل جنگی وغیرہ میکردہ باشد، و حکم فرمود کہ از بندھائے ما تا ہزاری دیوان روز پیش او دست بستہ ایستادہ باشد، و از ہزاری بالاتر از مسند شاہ وزیر با ادب بنشیند، و زمام اختیار حل و عقد و عزل و نصب آں مملکت و مرد تعینات آنجا بید اقتدار او دادہ ایم، اگر احدی را ہزاری و ہزاری را احدی بکند، منظور است" (۳۸)۔

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرزندی کا خطاب قندھار کی حکومت تفویض کرتے وقت اس کو شہنشاہ نے عنایت کیا اور اس حکومت کے ساتھ لوازم شاہزادگی اور دیگر اختیارات لا انتہا سے بھی اس کو سرفراز کیا گیا، گویا حکومتِ قندھار کی ایک طرح خود مختاری دی گئی، جو اس زمانہ میں انتہائی اعزاز تھا۔

وطن کی طرف روانگی: دربار جہانگیری سے انعام و اکرام، خطاب و مناصب، جاگیر اور اختیار لے کر غازی بیگ، ملتان پہنچا۔ طاہری رقم طراز ہے کہ:

"چوں از حضور حضرة مرخص گردیدہ در بلدۂ ملتان رسید، صلاح دولت دریں یافت کہ معاملات آنجا را فیصل دادہ، بحال مددے پردازد، صاحب دخلاں را طلب نمودہ۔"

ملتان کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد پھر اپنا وطن اصلی یاد آیا، اور چاہا کہ قندھار جانے سے پیشتر سندھ جاکر انتظامات دُرست کرے اور موجودہ انتظامی انتشار کو ہمیشہ کے لیے رفع کردے اور جب تک وہ وہاں قیام کرے، اس مدّت کے لیے قندھار میں اپنا قائمقام بھیج دے۔ میرزا بہرام ولد محمد امان ترخان کو جوان کے اپنے خاندان کا فرد تھا، قندھار کی نیابت کے لیے منتخب کیا اور

"یک فیل، چند اسپ، مع فراش خانہ و اسباب مطبخ و دلچہ، و علم کہ عرف ایشاں از پاستان شدہ آمدہ بود، با فوج سپاہ منتخب ارغوں و ترخاں تیار فرمودہ۔"

بہرام خاں پہلے تو جانے کے لیے رضامند ہوا لیکن جب روانگی کا وقت آیا تو اس نے ٹھٹہ جانے کی اجازت طلب کی تاکہ :

"پسر از دہقان زن سندی کہ جاگیر او بود، داشت،۔۔۔۔۔۔ اور احوالہ بمادرش داشتہ، بعد ازاں ہر خدمت کہ برجوع فرمایند بجان بر جا خواہد بود" (۳۹)۔

نہ صرف میرزا غازی اس جواب ناصواب سے ششدر رہ گیا، بلکہ بقول طاہری :

"ندمای لطیفہ گو در چناں لطیفہ گوئی در آمدند، کہ دایہ پسر خود داشت پستانش خواہد داد، و در گہوارش پرورش نمودہ۔"

میرزا نے بہت افسوس کیا :

"بسے افسوس و آوخ خوردن گرفت کہ ابنائے جنس ما چنیں کساں مانند۔"

اس کے بعد میرزا احمد بیگ سلطان کو "اعتماد خان" کا خطاب عطا کر کے بہرام خاں کی جگہ قندھار کے لیے نامزد کیا اور

"آنچہ برائے آں کم ہمت، تیار نمودہ بودند، بدو مرحمت فرمودہ۔۔۔۔۔۔ روانہ آں صوب ساخت تا رسیدن میرزا معاملات ملک را بنوعے تربیت داشت کہ رعیت و سپاہ، ہمہ از سلوک و ساخت او راضی گشت، خرابی کہ بموجب لشکر بیگانہ ہنوز رو بہ آبادی نیاوردہ بود، آباد گردیدن گرفت۔"

بکھر میں قیام : میرزا غازی، احمد بیگ کو قندھار روانہ کر کے، خود ملتان کی جاگیر کا انتظام مکمل کرنے کے بعد، بکھر آیا اور وہاں کچھ عرصے قیام فرمایا، ٹھٹہ کا انتظام بہت خراب ہو چکا تھا، خسرو اور اس کے ہم مشرب سارے ملک اور آمدنی پر قابض تھے، جب جی میں آیا کچھ میرزا کو بھیج دیا ورنہ سب کچھ خود کھا پی لیا۔ تاریخ طاہری نے نئے انتظامات کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھا، فقط اتنا لکھا ہے :

"ولی نعمت والدہ کلاں، خود مع صاحب دخلان ٹھٹہ، طلب داشتہ، فیصل مہام ملک دادہ، علی القدر احوال ہر یک از ملازمان و متعلقات پرداختہ، بعضے را بر کاب حکیم نمودہ،

بعضے را رخصت فرمودہ، از محل ہر کہ ہمراہ داشت وانکہ از ٹھٹہ طلبیدہ بود، ہمہ بازبداں جافرستاد"(۴۰)۔

معلوم نہیں کن کو ساتھ رکھا اور کن ملازموں کو ملازمت سے سبکدوش کردیا اور کن امرا کی تحویل میں ملک کی عنان اختیار سونپی، آئندہ حالات سے اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو چرکس حسبِ سابق صاحب اختیار رہا اور اس کے متعلقین بھی وہیں رہے، البتہ خسرو کے بیٹے بھائی خاں کو غازی ساتھ لیتا گیا۔ باوجود مسلسل بدعنوانیوں، نافرمانیوں اور بددیانتی کے، حیرت ہوتی ہے کہ میرزا نے پھر اسی آدمی کے رحم و کرم پر رعایا اور ملک کو چھوڑ دیا؟ قیاس ہوتا ہے کہ یا تو میرزا کے پاس آدمی نہیں تھے یا پھر خسرو کے اثر اور اقتدار کی وجہ سے کوئی دوسرا آدمی حکومت کی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا تھا۔ احمد بیگ سلطان سے جو سلوک میرزا کی غیبت میں ہوا تھا، اس وجہ سے دوسرا کوئی جرأت نہ کرسکا اور میرزا مجبور تھا کہ انتظام پھر اس قابوچی کے ہاتھ میں رہنے دے۔

بہرحال بکھر کے قیام میں انتظام کے سلسلے میں جو کچھ بنا وہ کیا۔ ولی نعمت والدہ کلاں کو جو غالباً میرزا جانی بیگ کی والدہ تھیں، رُخصت کیا، اپنے محلات میں سے کچھ تو ٹھٹہ واپس کردیں اور بعض کو ساتھ لیا اور قندھار کی طرف رُخصت ہوا۔

روانگی قندھار : تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ میرزا بکھر سے، سیوی اور گنجاوہ کے راستے قندھار پہنچا، توزک میں میرزا کے جانے کی اطلاع، تیسرے سال جہانگیر کے وقائع میں جو (دو ذوالحجہ روز پنج شنبہ سال ۱۰۱۶ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۶۰۸ء) کو شروع ہوا، یوں درج ہے۔

"در ۱۴ ماہ مذکور (رجب ۱۰۱۷ھ) حکم کردم کہ میرزا غازی متوجہ قندھار شود، از اتفاقات حسنہ بمجرد آنکہ میرزائے مشار الیہ از بکھر روانہ ولایت مذکور گردد، خبر فوت سردار خان حاکم آنجا میرسد، سردار خان از ملازمان مقرر و رُوشناس مرزا محمد حکیم عم مزبور، تختہ بیگ اشتہار داشت"(۴۱)۔

میرزا کا تقرر ۱۰ شعبان ۱۰۱۶ھ کو ہوا، تقریباً ۱۱ ماہ میرزا تیاریوں کے سلسلے میں ملتان اور بکھر میں مقیم رہا، ۱۴ رجب ۱۰۱۷ھ کو بادشاہ نے وہاں جانے کے لیے حکم صادر فرمایا۔

میرزا اس حکم کے صادر ہونے کے بعد کس تاریخ کو بکھر سے چلا، تاریخ طاہری میں

بھی نہیں لکھا۔ اندازہ یہی ہے کہ حکم پہنچتے ہی میرزا اس ماہ رجب کی کسی تاریخ کو قندھار کی طرف چلا ہو گا، سردار خاں جو وہاں قائم مقام حاکم تھا، اس اثنا میں انتقال کر چکا تھا، جسے جہانگیر نے "اتفاقات حسنہ" سے تعبیر کیا ہے۔

قندھار میں ورود کے بعد : قندھار میں پہنچتے ہی میرزا غازی نے سب سے پہلے توجہ فتنہ و فساد کے مٹانے اور امن و امان قائم کرنے کی طرف کی۔ تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ :

"در اطراف و پیرامون آں صوبہ مردم عمدہ خویش معین ساخت، بھائی خاں و لطف اللہ سلطان را، بر افغان فرستاد کہ دود از دمار آن بد کردار بر آوردہ مطیع، و مال گزاری از ماضی در حالی افزوں ساخت، رائے مانک چند ولد مہتہ رائے گھوریہ را بر حیدر متفنی معین داشت، چنانچہ او بر یز ملک غلبہ نمودہ بود، ہمچناں بر قلعہ ھائے او غالب گردیدہ، بنوعے مغلوبش ساخت، کہ از کینہ دیرینہ سینہ صاف داشتہ صلاح پزیر گشت۔"

تھوڑے ہی عرصہ کے اندر فتنہ و فساد کی جڑیں اُکھڑ گئیں اور پھر کسی کو سر اُٹھانے کی جرأت نہ رہی۔ امن و امان قائم ہو گیا اور ملک فارغ البالی اور اطمینان کی طرف لوٹنے لگا، طاہری کا بیان ہے کہ :

"تا راست دروازۂ قندھار ہر جا کہ بدکارۂ ناہموار در ہزن واقعہ طلب بود، ہمہ را ہموار و تابع الامر ساختہ، چمن بے خار و خار بن نمودہ.... بمقصد گاہ رسید۔"

اس سے ظاہر ہے کہ بکھر سے آتے ہوئے، بھی راستہ میں جو سرکش ملا یا جس سے اندیشہ تھا سب کو صاف کرتا ہوا قندھار تک پہنچا تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد انتظامات میں اور بھی درستی کر دی۔

والئے ایران کے ساتھ تعلقات : قندھار کا صوبہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، ہندوستانی حکومت کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ جہاں قندھار کے لیے ایک ہوشمند اور مضبوط حاکم کی ضرورت تھی، وہاں یہ بھی ضروری تھا کہ والئے ایران کے ساتھ تعلقات دُرست ہوں تاکہ آئے دن جو ایرانی حدود کے رئیس قندھار پر ہلہ بولتے رہتے تھے ان کا سدِّ باب ہو جائے ، جہانگیر کی یہی بھی خواہش تھی، اور میرزا نے بھی وہاں پہنچ کر اس امر کی اشد ضرورت محسوس کی، ویسے بھی ایران کے صفوی خانوادے کے ساتھ مغلوں کے تعلقات بہت پہلے سے دوستانہ

چلے آ رہے تھے، جس کی ابتدا حسین میرزا بایقرہ حاکم خراساں کے زمانے میں ہوئی تھی۔ میرزا حسین، بابر کا خالو تھا بعد میں اسی بنا پر شاہ طہماسپ نے ہمایوں کا بُرے دنوں میں خیر مقدم کیا تھا۔

اگر مغل بادشاہ تعلقات کو برقرار رکھنے کا آرزومند تھا۔ تو دوسری طرف ایران کا صفوی حکمران شاہ عبّاس بھی یہی چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے قندھار کے محاصرہ کو ختم کرانے کے بعد اپنے ایلچی کو جہاں گیر کے دربار میں بھیجا تا کہ اس محاصرہ سے اگر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو دُور ہو جائے۔

جب میرزا غازی قندھار پہنچا، اس وقت دونوں مملکتوں کے تعلقات خوشگوار تھے لیکن میرزا نے دُور اندیشی سے خوشگوار تعلقات کو اور بھی استوار کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ وہاں پہنچ کر اس نے سیّد عبداللہ سلطان (۴۲)، کو امیر خاں کا خطاب دے کر بطور سفیر، بیش بہا اور کثیر تحائف کے ساتھ، شاہ عبّاس کی خدمت میں روانہ کیا، یہ پہلی سفارت تھی جو قندھار کی صوبائی حکومت کی طرف سے والیٔ ایران کے دربار میں پہنچی۔ شاہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا اور اس کے جواب میں وہاں سے بھی ایک سفیر تحفہ تحائف لے کر قندھار پہنچا۔

سفارتوں کی آمدورفت نے سیاسی روابط کے ساتھ ساتھ شاہ عبّاس اور میرزا غازی کے درمیانی ذاتی محبت اور اخلاص کے تعلقات بھی پیدا کر دیے اور آئندہ کے لیے دونوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

ترخان نامہ کے مصنف نے ان تعلقات کی وجہ ایک اور بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ میرزا غازی کی داد و دہش اور حُسنِ سلوک نے ایرانی علما فضلا اور صاحبِ اثر لوگوں کو کثرت سے اپنا مدّاح اور گرویدہ بنا لیا تھا اور انہی لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے اُن کا دربار شاہی دربار کی ٹکر کا ہو گیا تھا لہٰذا۔

"والیٔ ایران از و اندیشہ ناک بود ایلچیاں درمیاں آمدورفت می کردو میرزا غازی را والئے ایران نیز فرزند خود گفتہ، تحائف آنجا یاد میفر مود" (۴۳)۔

ممکن ہے ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے میں ایک سبب یہ بھی ہوا ہو لیکن زیادہ تر مرزا غازی کے اخلاق و اوصاف اور ذاتی جاذبیت کو اس میں دخل تھا، جہانگیر کو جس کشش نے اس کی طرف کھینچا تھا وہی کشش شاہ ایران سے ان تعلقات کا بھی موجب بنی۔

بہر حال جس سبب سے بھی یہ تعلقات ہوئے ہوں لیکن وہ اس طرح استوار ہوئے کہ نہ فقط سلسلۂ پیام و سلام قائم ہو گیا بلکہ شاہ عبّاس نے جہانگیر کی طرح "فرزند" کا خطاب بھی دیا اور کئی بار بیش بہا خلعت اور تحائف بھی بھیجتا رہا۔ مآثرالامرا کا مؤلف لکھتا ہے کہ :

"بادشاہ عبّاس طریقہ مراسلت سلوک نمود، گویند شاہ مکرر خلعت فرستاد" (۴۴)۔

ذخیرۃ الخوانین نے بھی دو دفعہ خلعت آنے کا اور ذاتی مراسلت کا ذکر کیا ہے (۴۵)۔

میرزا غازی بیگ نے شاہ عبّاس کی مدح میں قصیدہ بھی کہا تھا جس کا ایک شعر ذخیرۃ الخوانین میں محفوظ رہ گیا ہے :۔

ز زہر مار زمان دراماں بود آنکس
کہ شاہ مہرۂ مدح تو در دھن گیرد (۴۶)۔

قیام قندھار کی برکتیں : مرزا ۱۴ رجب ۱۰۱۷ھ کے بعد قندھار پہنچا اور اپنی وفات (صفر ۱۰۲۱ھ) تک وہاں رہا۔ مگر اسی مختصر مدّت میں اس نے اپنے آپ کو بے حد مقبول بنانے کے بہت احسن اقدام کیے مثلاً ہمسایوں کے ساتھ تعلقات استوار رکھے، رعایا کے ساتھ ہمیشہ حُسنِ سلوک سے پیش آتا رہا، ملک میں امن و امان قائم کیا، عمال اور سپاہ کو خوش حال اور سر سبز اور شاداب رکھا۔ ملکی اور غیر ملکی اہلِ علم و ہنر کو داد و دہش کی وجہ سے اپنا مدّاح اور ہوا خواہ بنایا۔ اپنے دربار کو ایسے لوگوں سے اس طرح سجایا کہ تمام مورخ بیک آواز اس کی تعریف اور توصیف کرتے ہیں اور اس کے دربار کو شاہی دربار کے مماثل بتاتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان دربار آرائیوں، فیاضیوں اور حُسنِ سلوک کی وجہ سے ملک کے تمدن و تہذیب اور زندگی پر بہت خوشگوار اثر پڑا تھا۔ صاحب "مے خانہ" جو اُس کا معاصر تھا۔ لکھتا ہے کہ :

"باوجودیکہ در قندھار اندک زمانے حکومت کردہ، فاما آثار خوب ازو بسیار ماندہ" (۴۷)۔

ذخیرۃ الخوانین کا مؤلف اس کا ہم وطن اور ہم عصر تھا۔ اس کا قول ہے کہ :

"مرزا در صوبہ داری قندھار نامے گذاشت۔ و "نادر قندھار" بود سلوک با متردّدین بعنوان پسندیدہ کرد۔ خود را بہ نیک نامی علم ساخت" (۴۸)۔

اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے مآثر رحیمی کا مصنف رقمطراز ہے کہ :

"درایام بودن قندھار مجمع آوردن اہل استعداد، در قندھار رغبت نمود" (۴۹)۔

مآثر الامرا کا قول ہے کہ :

"درانجا بہمت وحُسنِ سلوک بامتر ددین عراق (کذا) بر آورد۔ گویند در قندھار مجلس میرزا مجمع صاحب کمالاں بود" (۵۰)۔

صاحب ترخاں نامہ نے تفصیل کے ساتھ اس طرح اس کی تعریف کی ہے :

"روز بروز شان و شوکت میرزا غازی زیادہ می شد۔ و آن جوان بخت دست ہمت و سخاوت وجود کشادہ مانند ابر زر افشانی می نمود۔ ازین جھت فضلا و شعرا از ایران و توران رجوع بخدمت او نمودند، و مجلس بہشت آئین او، مجمع فضلا و شعراء روزگار بود، و ہمیشہ بعیش و طرب می کوشید، چنانچہ ہر روز سپاہ و رعیت روز عید و ہر شب شبِ برات از دولت آن جوان بخت داشتند، و غائبانہ اکثر مدرسان و شعرا و گوشہ نشینان ایران را نام بنام سالیانہ مقرر فرمودہ بود، کہ ہر سال بآنہا میرسید، ازیں ممر ہمہ مردم مداح او بودند، و دربار او نمونۂ بادشاہی بود، و ضبط و ربط آں مملکت نوعی نمود کہ مردم ایران را نیز مطیع خود ساختہ" (۵۱)۔

یہ تو مدح و ثنا مورخوں نے کی ہے لیکن خود جہاں گیر بھی اس کے حُسنِ انتظام سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کی وفات کی خبر لکھتے ہوئے اس کو لکھنا پڑا کہ :

"درین مرتبہ قندھار را اضافہ ٹھٹہ نمودہ، میرزا غازی مرحمت نمودم، ازان تاریخ تا زمانہ رحلت در آنجا بہ لوازم حفظ و حراست قیام و اقدام می نمود، سلوک او بامتر ددیں بہ عنوان پسندیدہ بود" (۵۲)۔

جہاں گیر کے یہ مختصر الفاظ میرزا کے انتظام اور حُسنِ سلوک کے بخوبی شاہد ہیں۔

شاہ خرچیاں : قندھار میں میرزا نے حکومت کرنے کا جو رنگ ڈھنگ اور طور طریق اختیار کیا تھا، داد و دہش، جود و سخا اور درباری کا جو انداز ڈالا تھا اس کے لیے ظاہر ہے کہ بہت روپے کی ضرورت تھی۔ قندھار کی آمدنی محدود تھی، جاگیر اور ٹھٹہ کی ریاست خسرو خاں اور اس کے ساتھیوں کے تصرف میں تھی، وہاں سے باوجودیکہ بار بار لکھا جاتا تھا لیکن روپیہ پیسہ آنے کے بجائے ہمیشہ حیلے حوالوں کی طویل اور پیچ در پیچ داستانیں وصول ہوتی تھیں۔ تاریخ طاہری کا

مؤلف لکھتا ہے کہ :

"از بس کہ علی القدر دخل خرج نمی داشت، وافرلط از اندازہ، افزوں می کرد، باوجود ایں کہ جاگیر کہ بدونسبت تمام ٹھٹہ و قندھار و پارۂ اقطاع صوبۂ ملتان و سیوھان داشت، ہمیشہ قلاش و قرضدار بود۔"

کبھی کبھی اخراجات کی تنگی حد سے زیادہ بڑھ جاتی تھی تو میرزا غازی مرکزی حکومت سے روپیہ منگالیتا تھا، ایک دفعہ روپیہ بھیجنے کا ذکر جہاں گیر نے تزک میں (۵ سال جہاں گیری میں جو ۲۴ ذوالحجہ ۱۰۱۸ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۶۱۰ء) شروع ہوا لکھتا ہے کہ :

"میرزا غازی بیگ ترخاں بجہت سامان آذوقہ قندھار و ماہیانہ برقندازان مذکور درخواست نمودہ بود، فرمودم کہ دولک روپیہ از خزانہ لاہور روانہ قندھار سازند" (۵۳)۔

اس حکم کا اجرا صفر المظفر ۱۰۱۹ھ کی غالباً ۹ تاریخ کو ہوا ہے یعنی پانچویں سال کے شروع ہونے کے ۴۶ دن بعد۔

ٹھٹہ کی حکومت میں ابتری : قندھار آنے سے پیشتر جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے میرزا غازی ایک دفعہ پھر سندھ کا نظام دُرست کر چکا تھا، خسرو چرکس اور اس کے حوالی موالیوں کو کافی تنبیہ ہو چکی تھی لیکن اِدھر غازی میرزا قندھار پہنچا اُدھر انہوں نے حسبِ سابق حرکتیں کرنی شروع کیں۔ خسرو نے اپنے تمام متعلقین کو مملکت کے مختلف حصّوں پر مسلط کر دیا جنہوں نے گدھوں کی طرح اپنے پیٹ بھرنے کے لیے ملک کو نوچنا شروع کر دیا۔ جب حالات ابتر سے ابتر ہو گئے اور میرزا غازی کے خزانہ میں اپنے ملک سے ایک پھوٹی کوڑی نہیں پہنچی تو بعض مقربوں نے گزارش کی :

"در صوبۂ ٹھٹہ گنجایش بسیار است، ہمہ تحت تصرف خسرو خاں میرود، از بے پروائی صاحب فترت معاملات آں ملک ابتر گردیدہ، شیرازہ بندی از جملہ ضرور است، یک کس تعین است تا در سپاہ نظر نماید، کہ فوتی و فراری، حاضر و غائب، بسیار و بیشمار است، جاگیرات آں ھارا خالصہ صاحب نماید، دیگر آنچہ از جاگیر و خالصہ اضافہ بر اصل واصل میگردد، داخل جمع نمی سازد۔"

یہ معروضات تو ندیموں اور مقربوں نے کیں لیکن ملک سے بھی کئی آدمی فریادی آئے جنھوں نے بیان کیا کہ:

"او (خسرو خاں) خود را گماشتہ شامی پندارد، نواسہائے خود را، در صوبہ باسر انجام تمام صاحب صوبہ ساختہ کہ ہر یک تقلید شامی وارد، الحق همچناں بودہ است۔"

خسرو نے محمد بیگ ولد رستم بیگ نامی اپنے نواسے کو نیرون کوٹ کا والی بنا دیا تھا، جس کی کیفیت وہاں کے لوگوں کی زبانی یہ معلوم ہوئی کہ:

"از غرور جوانی و نخوت کامرانی بہ نوعے دماغ بہم رسانیدہ، کہ اکثر بر ارغوں و ترخان زورے میداشت و کیسہ بدیدن او می آمد، بجائے دست دادن، پا در ازمی کرد۔"

فتح اللہ ولد لطف اللہ بھائی خاں کو بدین کا حاکم کیا تھا جس کی حرکات ناشائستہ کی وجہ سے تمام رعایا نالاں تھی۔ شیخ عبدالباقی ولد شیخ کالہ جو خسرو خاں کی بیٹی کا لڑکا تھا، اُس کے متعلق صاحب تاریخ طاہری کا بیان ہے کہ:

"باوجود، اصالت و آدمیت کہ جبلی در شان خاندان غوث العالم، مخدوم شیخ بہاء الدین ذکریا بودہ ہست، چنیں بے رسمی پسند داشتہ و روا داز یں قسم ناشائستگی ہائے گردیدہ کہ امثال عبدالعزیز نجاست در صحبت او و یاران مذکور می ریحت، کہ در عین معرکہ گوزھا میزد، وایشاں از ذوق خندہ فرحت حاصل می داشتند۔"

ایک مرتبہ ہندوؤں کے کسی میلے میں، ایک خوب صورت عورت پر نظر پڑی، شیخ صاحب کے ہم جلیسوں نے بڑھا چڑھا کر تعریفیں کیں۔ عبدالباقی نے عبدالعزیز کو کہا کہ اگر پسند ہے تو اس کو اُٹھا لے جا اُس "تشنہ تفت حرارت بے شرمی ' ملحد گرسنہ جوع بے ناموسی" نے اسی وقت عورت کو ان کے عزیزوں کے سامنے سے زبردستی اُٹھا لیا اور کسی گوشہ میں لے جا کر "کار دیگر" کیا۔ مجمع میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں میں اس قسم کی رائے زنی اور گفتگو ہونے لگی:

"در آن وقت از زبان اہلِ عبرت چہ ہندو چہ مسلمان بر آمد، و آخر ہمچناں بچشم معائنہ دیدہ شد، کہ الٰہی این حکومت و حاکمان با صاحب خویش نگون ساز، کہ آوارہ روزگار گردیدہ، چون ناموس غربا برہم می زدند، همچنان خود بے ننگ و نام (شوند)۔ مردم بر افعال ناپسندیدہ چنیں بزرگ زادہ کہ باعث بدیں کار برہم زنندہ ہنگامہ ایشان و حکم صاحبش بود خوں میگریستند۔"

رعایا کی تو یہ قیل و قال اور جذبات تھے لیکن ظالم طبقہ :

"خود چنیں عار و عیب را ہنر پنداشتہ چوں گل می خندیدند"

الغرض خسرو چر کس اور اس کے آدمیوں کی وجہ سے تمام ملک بیزار ہو چکا تھا۔ ملک میں روزانہ ناگفتہ بہ واقعات رُونما ہو رہے تھے، کچھ لوگ ٹھٹہ سے چل کر قندھار پہنچے تاکہ میرزا سے فریاد کریں اور داد طلبی کریں، انہی میں مرشد خاں تھا جس کی عزت اس کے علم و فضل کی وجہ سے فتح اللہ کے باپ، بھائی خاں سے بھی زیادہ میرزا کرتا رہتا تھا اور کبھی اس کے سامنے ناشائستہ لفظ میرزا کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔ ایک مرتبہ عید کے دن فتح اللہ نے اس کو اس کی جاگیر سے بلایا۔ وہ جب پہنچا تو اس کے ساتھ اتنا بُرا اور ناروا سلوک کیا کہ وہ بیچارہ ہکا بکا رہ گیا اور جب فتح اللہ ہاتھی کی پالکی میں بیٹھ کر عیدگاہ کی طرف گیا تو مرشد خاں سخت شرمندہ ہو کر اپنی جاگیر کی طرف لوٹ آیا اور وہاں سے قندھار کی طرف چلا گیا۔ جب میرزا غازی نے اس سے سندھ کی خیر خیریت دریافت کی تو مرشد خاں نے جواب میں ایک ہی شعر ایسا پڑھا جو اُس وقت کی ساری حالت کا مرقع اور میرزا کے لیے نشتر کا حکم رکھتا تھا۔ اس نے کہا۔

"لب شیریں بکام خسرو شد
جان بے ہودہ می کند فرہاد"

مرزا سُن کر بے قرار ہو گیا اور اُسی وقت رائے گھوریہ کے داماد سائیں ڈنہ کو ہندو خاں کا خطاب دے کر اور شہباز خاں کے خسر رائے مانک چند کو ٹھٹہ روانہ کیا تاکہ حکومت کی عنان خسرو اور اس کے لوگوں سے چھڑا کر اپنے ہاتھ میں لیں اور خسرو کو اُس کے نواسوں، اہل کاروں اور دیگر چھوٹے بڑے چرکسوں کے ساتھ جنہوں نے سندھ میں ایک آفت مچا رکھی تھی فوراً معزول کر کے قندھار روانہ کریں۔

غازی مرزا سخت برافروختہ تھا، ان لوگوں کو ٹھٹہ روانہ کرنے کے بعد اپنے اُمرا سے کہا کہ :

"ہمہ غلاماں حرام نمک را کہ پا از گلیم بیروں آوردہ و سر از اندازہ بدر بردہ مارا بنظر نمی آورند، بدیں عقوبت خوار و رسوا خواہم ساخت، کہ خسرو خاں را چوب در دست دادہ، دربان کنیزاں چندگہ در کار بست می نمائیم، فتح اللہ و لطف اللہ بہائی خاں را کہ حاکم بدین شدہ، آفتابچی می سازم کہ پدرش در جرگہ نشستہ باشد و لو آب بر دست آں

کساں بریزد کہ آں را از جملہ نوکراں خود نمی پنداشت۔ محمد بیگ کہ بسیار نازک و بیشتر تقلید ما می دارد جلاجل جلوداراں در کمرش می بندیم و در جلو میدوانیم تا بداند کہ صاحب ماست و نتیجہ بددیانتی خود می یابد۔"

فتح اللہ خسرو کا پوتا اور لطف اللہ بھائی خاں کا بیٹا تھا۔ بھائی خاں کو مرزا غازی اپنے ہمراہ قندھار لیتا آیا تھا۔ محمد بیگ رستم بیگ کا لڑکا اور خسرو خاں کا نواسہ تھا، نیرون کوٹ اس کی تحویل میں تھا اُس کے نخوت اور پندار کی یہ حالت تھی کہ اگر کوئی ملنے آتا تو اُس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بجائے اس کی طرف پاؤں پھیلا دیتا تھا۔

یہ طور طریقہ ان لوگوں نے محض مرزا غازی کے مروت، شرافت نفسی اور ان کے کرداروں پر بار بار چشم پوشی کرنے کی وجہ سے اختیار کیا۔ اگر وہ ابتدائی کارناموں کو نظر میں رکھتے ہوئے اُن سے اُسی وقت کڑی باز پُرس کرتا اور سزائیں دیتا تو شاید اُس کی غیر حاضری میں ملک اور خود اُس کے خزانے کی اس طرح بربادی نہ ہوتی بہر حال آخر مرزا نے ان کی معزولی کا حکم صادر کیا اور اُن کے رُسوا کرنے کا مندرجہ بالا منصوبہ سوچا۔

ہندو خان اور مانک چند کا حشر: قندھار سے چل کر ہندو خان اور رائے مانک چند سب سے پہلے نصرپور میں آئے۔ جہاں شاہ قاسم خاں ارغون کی اولاد جاگیرداری کر رہی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ نصرپور کا انتظام کر کے اور اگر ممکن ہو تو شاہ قاسم کی اولاد کو ہموار کر کے پھر ٹھٹے جائیں۔

شاہ قاسم کا لڑکا مقیم سلطان وہاں موجود تھا اُس نے بجائے اس کے کہ جاگیر کا انتظام والیٔ ملک کے فرمان کے رُو سے اُن کے سُپرد کرتا، اُن کو قلعہ میں بند کر دیا۔ خسرو چرکس کے تعلقات اس خاندان کے ساتھ بہت گہرے تھے۔ علاوہ ازیں دونوں یکساں ملک پر قابض تھے اور دونوں اپنے ولی نعمت سے رُوگرداں تھے۔ مقیم سلطان نے یہ رویّہ بھی خسرو کے ایما سے ہی اختیار کیا تھا۔

ہندو خاں پریشاں ہوا لیکن رائے مانک چند نے قلعہ سے نکل کر مقیم سلطان سے گفت و شنید کی، دوران گفتگو میں سخت کلامی تک نوبت پہنچی اور مقیم کے آدمیوں نے جو پہلے سے تیار تھے رائے مانک چند اور اُس کے ساتھی میرک محمد سلطان ولد قاسم علی سلطان کو قتل کر دیا۔

رائے مانک چند کا لڑکا رائے سنگھ سندھ میں موجود تھا، جب اسے معلوم ہوا تو وہ دندناتا ہوا وہاں پہنچا اور للکار کر کہا کہ باپ کی لاش بعد میں جلاؤں گا پہلے اس کے قتل کا انتقام لوں گا، چنانچہ طرفین میں دست بدست لڑائی ہوئی، مقیم سلطان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور بے شمار مال و دولت اور ہاتھی رائے سنگھ کے قبضہ میں آگئے۔ رائے سنگھ نے اس کے بعد اپنے باپ کی لاش جلائی اور پھر قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرزا غازی، رائے سنگھ کی بہادری اور شجاعت سُن کر بہت خوش ہوا۔ منصب کے ساتھ ساتھ باپ کی امارت بھی اسے مرحمت فرمائی اور دوبارہ سندھ کی طرف روانہ کیا۔

خسرو کی بید خلی: ہندو خاں ملک میں موجود تھا۔ رائے سنگھ بھی قندھار سے آکر اس کے ساتھ شریک ہو گیا، دونوں نے خسرو خاں کو بید خل کیا اور اس کے ساتھیوں سے علاقہ چھڑا کر اپنے آدمی مقرر کیے، طاہری نے لکھا ہے:

"خاں را از معاملات ملک، بید خل ساخت، در ہر صوبہ عمّال تعین داشتہ، بہ تحصل مال و معاملہ مشغول گشتند۔"

خسرو اپنے دوستوں، رفیقوں اور اہل کاروں کو ساتھ لے کر چار و ناچار، قندھار کی سمت روانہ ہوا اور چلتے ہوئے باقی ماندہ اپنے آدمیوں کو سکھا پڑھا گیا:

"ہمہ را بموجب برہمزدگی معاملات اشارت نمود کہ از و رُو گردانیدہ، در مال گزاری فصل، تا توانند، تقصیر دارند، ہر طرف فتنہ برپا نمودہ شورش پیدا نمایند، تا میرزا بداند کہ بے وجود فلانے چنیں حادثہ ذرما مون جا ہویدا گشتہ۔"

میرزا کی وفات: خسرو خاں کی بید خلی کا واقعہ ۱۰۲۱ھ کا ہے، کیونکہ وہ ابھی قندھار جاتے ہوئے ہالہ کنڈی تک پہنچا تھا کہ میرزا کے انتقال کی اطلاع قندھار سے آئی، اس واقعۂ جانکاہ کو اس نے اپنے لیے نیک فال سمجھا اور اپنے طالع کی یاوری کا کرشمہ خیال کیا اور اس خیال کے ساتھ واپس ہوا کہ:

"آن ہندوئے جاں نشیں خود را بہ کیفر و مکافات چناں رساند کہ عبرت دیگران شود۔"

سندھ اور قندھار کی حکومت: خسرو نے رائے سنگھ اور ہندو خاں سے کیا سلوک کیا، یہ

تو معلوم نہ ہو سکا لیکن آتے ہی اس نے بقول صاحب ترخان نامہ :

"میرزا عبدالعلی بن میرزا فرخ، بن میرزا شاہ رُخ بن میرزا باقی کہ از نبائر میرزا محمد باقی همون مانده بود، برائے گفت و شنود، بر مسند حکومت ٹھٹہ نشانده، ملک و حکومت بدست خود آورده" (۵۴)۔

اس بچے کو تخت پر بٹھا کر اس نے پھر ملک کو اپنے قبضے میں کیا اور حسب سابق اپنے عمال ہر حصے پر بھیج دیے۔ اس کا خیال تھا کہ، چونکہ میرزا عبدالعلی میرزا مرحوم کے ہی خاندان کا چشم و چراغ ہے لہٰذا دستور سابق کے طور پر جہانگیر بادشاہ بھی اس کی مسند نشینی کو تسلیم کر لے گا۔ نیز ملک میں بھی کوئی شورش اس لیے نہیں ہو گی کہ حکومت اسی خاندان کی میراث میں رہے گی۔ عبدالعلی نا سمجھ بچہ ہے، مسند پر اس کا قبضہ اور ملک پر خسرو کا قبضہ قائم رہے گا مگر خسرو کا یہ منصوبہ نہ چل سکا۔ دربار جہانگیری میں جب معلوم ہوا کہ :

"خسرو خاں غلام مرزا غازی بے حکم اقدس از ابنائے مرزا محمد باقی خورد سالہ را بدست کرده باغی شده۔ مرزا رستم قندھاری را صاحب صوبۂ ٹھٹہ با چند امرائے دیگر بر سر خسرو خاں تعین فرمودند" (۵۵)۔

مرزا رُستم قندھاری کے تقرر کے ساتھ میر عبدالرزاق معموری کو بھی بخشی بنایا گیا اور رُستم مرزا کے پہنچنے سے پہلے ٹھٹہ روانہ کر دیا گیا تاکہ خسرو خان کو معزول کر کے ملک کو ضبط کرے۔ چنانچہ میر صاحب نے جاتے ہی احکام پر عمل در آمد کیا۔ مرزا رستم بھی اس کے پیچھے پیچھے ۱۰ محرم ۱۰۲۱ھ کو ٹھٹہ پہنچ گیا، نظم و نسق کو ٹھیک کرنے کے بعد میر عبدالرزاق مرزا عبدالعلی، خسرو خاں دیگر ارغون اور ترخان نیز میرزا غازی کے اہل و عیال کو لے کر دربار جہانگیر کی طرف چلا۔ دربار میں پہنچنے پر اس کو "مظفر خاں" کا لقب دیا گیا۔ عبدالعلی، خسرو خاں اور ان کے لڑکے کو جیل خانہ میں رکھنے کا حکم صادر ہوا، میرزا غازی کے اچھے اچھے ملازموں اور متعلقین کو ملازمتیں اور مناصب دیے گئے، مرزا کے عیال کے لیے مدد معاش مقرر کی گئی، باقی جتنے ارغون اور ترخان سردار اور سپاہی آئے تھے وہ سب نواب مرزا عیسیٰ ترخان کی سرکار میں بھیج دیے گئے۔

نواب مرزا عیسیٰ ترخان، مرزا غازی کے زمانے میں جب ابوالقاسم سلطان گرفتار ہوا تو سندھ سے بھاگ کر اکبری دربار میں آ گیا تھا اور اس کے بعد وہیں رہا۔ جہانگیر نے جب ان

لوگوں کو اس کے سپرد کیا تو بقول صاحب ترخاں نامہ :

"نواب موی الیہ از کمال ہمت پرداخت نمودہ، ہر کس را در خور استعداد، در خدمت خود نگاہ داشت" (۵۶)۔

خسرو خاں کا جیل خانے میں انتقال ہو گیا، میرزا عبدالعلی اور بھائی خاں لطف اللہ کو نور جہاں بیگم کی سفارش پر بندیخانہ سے رہائی ملی اور عبدالعلی کا روزینہ مقرر کر کے آصف خاں کے حوالے کیا گیا۔ جب جوان ہوا تو اس کو جزوی منصب عنایت کیا تا آنکہ ۱۰۴۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

قندھار میں میرزا کے انتقال کے بعد بھائی خاں نے غالباً صوبہ پر اپنا قبضہ کرنے کی ٹھانی تھی، جس کی اطلاع ترخاں نامہ کی اس عبارت سے ملتی ہے :

"بھائی خاں ولد خسرو خاں بعد از رحلت میرزا خیال فاسد قائم مقامی میرزا بخاطر رسانیدہ لواہائے جنگ نمود، اورا متہم داشتند کہ از روئے حرام نمکی خود رانقہ کرد، واللہ علم بالصواب" (۵۷)۔

میرزا غازی کے انتقال پر ممکن ہے وہ یہ خیال خام اپنے دل میں لایا ہو، لیکن جہاں گیر کے فرمان پر وہ بھی قندھار سے دربار میں لایا گیا پہلے تو جیل خانہ میں رہا، بعد میں نور جہاں بیگم کی شفاعت پر رہائی حاصل کر کے پانصدی منصب پر گزارا کرتا رہا۔

قندھار کی حکومت ابوالنبی اوزبک کے تفویض کی گئی، تزک میں جہاں گیر لکھتا ہے کہ :

چوں عیوضی میرزا غازی سردارے بہ قندھار، بایست فرستاد، ابوالنبی اوزبک را کہ در ملتان و آں حدود واقع بود بدیں خدمت مامور ساختم" (۵۸)۔

ماآثرالامرا میں ہے کہ

"در سال ہفتم از اصل و اضافہ منصب سہ ہزاری وسہ ہزار سوار و خطاب "بہادر خانی" امتیاز اندوختہ از انتقال میرزا غازی بحکومت قندھار چہرۂ بلند پائگی برافروخت" (۵۹)۔

سندھ کی حکومت سال ۹۶۲ھ میں ارغونوں سے ترخانوں کے ہاتھ آئی تھی پورے ۳۸ سال ان کی حکومت قائم رہی، ۱۰۰۰ھ میں مغلوں کا قبضہ ہوا لیکن اکبر نے اس کے بعد بھی یہ ملک انہیں کے واگذاشت کر دیا۔ مگر ۱۰۲۱ھ میں میرزا غازی کی وفات پر نہ فقط سندھ کی خود مختاری ختم ہوئی بلکہ ترخانی خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا، سندھ دوسرے صوبوں کی طرح مملکت ہند کا ایک جزو بن گیا اور مرکز سے اس پر گورنر آتے رہے۔

حواشی:

(۱)مآثر رحیمی، ج۲، ص۳۷۶
(۲)طاہری سوانح میرزا جانی بیگ
(۳)طاہری سوانح میرزا جانی بیگ
(۴)لب تاریخ سندھ، ص۸۰، کتبہ مزار مکلی
(۵)مآثر رحیمی، ج۲، ص۳۴۹
(۶)دلیل الذاکرین قلمی، ص۱۲۲۔۱۲۳
(۷)تاریخ طاہری حالات جانی بیگ
(۸)مآثر رحیمی، ج۲، ص۳۵۰
(۹)اکبر نامہ، ج۳، ص۷۸۳
(۱۰)مآثر رحیمی، ج۲، صفحہ ۳۵۰
(۱۱)ماثر الامرا، ج۳، ص۳۴۶
(۱۲)تحفۃ الکرام، ج۳، صفحہ ۸۰ میں بابا علی اور طاہری میں باغ علی کا نام لکھا ہے غالباً باغ علی درست ہوگا۔
(۱۳)مآثر رحیمی، جلد۲، ص۳۵۰
(۱۴)ماثر الامرا، ج۲، ص۴۰۴
(۱۵)ماثر رحیمی، ج۲، ص۳۵۰
(۱۶)اکبر نامہ، ج۳، ص۸۱۶
(۱۷)تحفۃ الکرام، ج۳، ص۸۲۔۸۳
(۱۸)ماثر الامرا، جلد۳، صفحہ ۳۴۶
(۱۹)اکبر نامہ، جلد۳، صفحہ ۸۳۹
(۲۰)ترخان نامہ، نسخہ برٹش میوزیم O.R. ۱۸۱۵ ورق ۴۷
(۲۱)تحفۃ الکرام، ج۳، ص۸۳
(۲۲)ذخیرۃ الخوانین، قلمی ص۱۶۱
(۲۳)ترخان نامہ، نسخہ برٹش میوزم O.R.۱۸۱۵ ص۴۷
(۲۴)طاہری قلمی، ذکر مرزا غازی
(۲۵)تزک، نول کشور، صفحہ ۹۔۱۰، بیورج ۳۰
(۲۶)تزک، نول کشور ۱۱۰، بیورج ۲۲۳
(۲۷)تزک، نول کشور ۲۴
(۲۸)تزک، ۳۴۔۳۵، بیورج ۷۱۔۷۰
(۲۹)طاہری، ذکر کمک قندھار

(۳۰)مقالات الشعرا، قلمی ۳۰۲۔بہ تصحیح اشعار
(۳۱)تزک، ۴۲۔۴۳، بیورج ۸۶۔۸۵
(۳۲)تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۸۴
(۳۳)طاہری، کمک قندھار
(۳۴)تزک ۴۷، بیورج ۷۵
(۳۵)ترخان نامہ، قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق ۴۸
(۳۶)تزک، ۶۳، بیورج ۱۳۱
(۳۷)تزک، ص ۶۴۔ بیورج، ص ۱۳۳
(۳۸)ترخان نامہ، قلمی برٹش میوزیم ورق ۴۷
(۳۹)طاہری، ذکر صاحب صوبگی قندھار
(۴۰)تاریخ طاہری، نزول بکھر
(۴۱)تزک، ۴۷، بیورج ۱۰۱
(۴۲)تحفۃ الکرام ۳، ص ۸۵۔۲۳۹
(۴۳)ترخان نامہ، مخطوطہ برٹش میوزیم، ص ۴۸
(۴۴)مآثرالامرا، ج ۳، ص ۳۴۶
(۴۵)ذخیرۃ الخوانین، قلمی ۱۶۲
(۴۶)ذخیرۃ الخوانین، قلمی ۱۶۲
(۴۷)مے خانہ، عبدالنبی، ۲۲۹
(۴۸)ذخیرہ، قلمی صفحہ ۱۶۱
(۴۹)مآثر رحیمی ۲، صفحہ ۳۵۳
(۵۰)مآثرالامرا، ج ۳، صفحہ ۳۴۶
(۵۱)ترخان نامہ، مخطوطہ برٹش میوزم ورق ۴۸
(۵۲)تزک، ص ۱۱۰، بیورج ص ۲۲۳
(۵۳)تزک، ص ۱۱۰، بیورج ص ۲۲۳
(۵۴)ترخان نامہ، مخطوطہ ورق ۴۸
(۵۵)ترخان نامہ، مخطوطہ ورق ۴۸
(۵۶)ترخان نامہ، ورق ۴۸
(۵۷)ترخان نامہ، ورق ۴۸
(۵۸)تزک، ۱۱۰، بیورج ۲۲۳
(۵۹)مآثرالامرا، ج ۱، ص ۴۰۱

تاریخِ سندھ کے ماخذ

سندھ ایک قدیم تمدن، تہذیب اور تاریخ کا حامل ہے، لیکن افسوس ہے کہ آج اُس کی تاریخ اور آثار پر صدیوں کے گرد و غبار نے اس طرح پردے ڈال دیے ہیں کہ اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ سندھ کیا ہے اور دنیا کے تہذیب و تمدن تاریخ اور آثار میں اس کا کیا مقام ہے؟ تو اسے یقیناً مایوس ہونا پڑے گا، کیونکہ ہمیں کوئی ایسی جامع مکمل اور مسلسل تاریخ نہیں ملتی جو ہماری رہنمائی کرے۔

یہ خطہ ہمیشہ سے انقلابات کا گہوارہ رہا ہے، تاخت اور تاراج، اندرونی خواہ بیرونی، روزِ اوّل ہی سے اس کے نصیبوں میں ہے، انسانی دست و برد اپنوں کی عدم توجہی اور فقدان ذوق کی وجہ سے، یہاں کے آثار مٹ گئے، علمی ذخیرے منتشر ہو گئے اور تاریخ کے اوراق اس طرح اُڑ اُڑا گئے کہ آج ان کا سمیٹنا بھی دشوار بلکہ کسی حد تک ناممکن ہے، سندھ پر ویسے بھی کچھ کم ہی لکھا گیا تھا، لیکن جو کچھ سرمایہ موجود تھا وہ بھی دسترس سے باہر ہو گیا۔

جو کچھ آج میسر ہے، وہ ہماری تشنگی کو دور کرنے کے قابل نہیں، کچھ عربی میں منتشر اجزا ملتے ہیں، چند حوالے ایرانی تاریخوں میں مل جاتے ہیں، اور چند صفحات ہندوستان میں لکھی ہوئی تاریخوں میں محفوظ ہیں جو مغل سلاطین سے تعلق رکھتی ہیں۔ سندھ پر سندھیوں نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بہت کچھ غائب ہو گیا اور اگر کچھ موجود ہے تو وہ قدیم رنگ میں ہے، تحقیق کم اور روایات زیادہ، اس لیے مطالعہ اور علم کے نئے تقاضوں کا وہ مواد متحمل نہیں ہو سکتا۔

سندھ جغرافیائی جائے وقوع کی وجہ سے ایک الگ تھلگ خطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایرانی

مورخین اس لیے کترا گئے کہ یہ ان کے حدودِ اربعہ سے باہر تھا۔ ہندوستانی تاریخ نویسوں نے چند صفحات یا ضمنی مباحث سے زیادہ اہمیت یوں نہیں دی کہ ہندوستان سے یا تو یہ جدا مملکت کی حیثیت سے الگ رہا، اور اگر اتفاق سے ایک خاص عرصہ کے لیے اس وسیع دنیا میں کبھی مل بھی گیا تو جغرافیائی نقطۂ نظر سے اتنا دور اور ایک ایسے آخری گوشہ میں تھا کہ مورخوں کی زیادہ توجہ اور مناسب التفات کا کبھی مرکز نہ بن سکا۔ عربی مورخوں کی نگاہ سے تو یہ چوتھی صدی کے وسط میں ہی او جھل ہو گیا تھا لیکن جب عرب سلطنت کا حصہ بھی تھا تو اس وقت بھی اُنہوں نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں فرمایا، مدائینی کی تاریخ آج ناپید ہے، فتوح البلدان بلاذری، تاریخ یعقوبی اور کامل بن اثیر یا چند عربی جغرافیئے اور سفر نامے نہ ہوتے تو سندھ کا عربی دور بھی آج اسی طرح ہماری نظروں سے او جھل رہتا جیسا کہ غیر اسلامی دور ہمارے لیے سربستہ راز ہے۔

میرے اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ سندھ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے سندھ کا تاریخی مواد پیش کروں، جس کو میں نے ۵ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) تاریخ سندھ کا وہ مواد جو سندھ کے اندر مرتب کیا گیا ہے۔

(۲) سندھ پر وہ تاریخی مواد جو ہندی اور ایرانی مورخین کی کتابوں میں ملتا ہے۔

(۳) سندھ پر وہ تاریخی مواد جو عربی میں ملتا ہے۔

پہلے دو حصے فارسی زبان میں لکھی ہوئی تاریخوں پر مشتمل ہیں، تیسرا عربی زبان کے ماخذوں پر مشتمل ہوگا، بقیہ دو حصوں کے عنوان یہ ہیں:

(۴) سندھی میں تاریخ سندھ پر کیا لکھا گیا۔

(۵) انگریزوں نے تاریخ سندھ پر کیا لکھا۔

پہلا حصہ آج کی صحبت میں پیش کر رہا ہوں، میں نے خدا جانے کہاں کہاں سے تنکے جمع کیے ہیں جب کہیں جاکر یہ خاکہ تیار ہوا ہے، امید کرتا ہوں کہ تاریخ سندھ میں دلچسپی لینے والے بزرگانِ علم و فن کے لیے میری یہ محنت کسی قدر کارآمد ثابت ہوگی۔

(۱) چچ نامہ: مولف علی بن حامد بن ابو بکر الکوفی سال تالیف تخمیناً، ۶۱۳ھ / ۷۔۱۲۱۶ء۔

یہ سندھ کی پہلی تاریخ ہے، اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ علی بن حامد نے تقریباً ۶۱۲ھ میں کیا۔

کتاب کا اصلی مصنف ڈاکٹر داؤد پوتا کے خیال میں خواجہ امام ابراہیم ہے، کیونکہ صفحہ ۱۵۱

میں یہ نام مرقوم ہے، علی بن حامد جب کوفہ سے ہجرت کر کے اُچ میں آیا تو اُس کو سندھ کی تاریخ کا خیال ہوا۔ اس خیال سے وہ سندھ کی قدیم دار السلطنت اکور میں پھونچا۔ قاضی اسمٰعیل بن علی الثقفی نے اس کو منہاج الدین والملک کے نام کی عربی کتاب حوالے کر دی اور کہا کہ یہ ان کے ایک بزرگ کی تصنیف کی ہوئی ہے، علی بن حامد نے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں کر ڈالا، اور اس کو والیٔ سندھ ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین حسن بن ابی بکر الاشعری کے نام معنون کیا، کتاب کے مختلف نام ہیں، چچ نامہ، تاریخ نامہ، فتح نامہ، تاریخ ہندو سندھ، تاریخ قاسمی وغیرہ، خواجہ نظام الدین نے اس کا نام منہاج المسالک لکھا ہے۔

ڈاکٹر داؤد پوتا کا خیال ہے کہ چونکہ چچ نامہ کی روایات مدائنی سے ماخوذ ہیں اور مدائنی ۲۱۵۔ ۲۲۵ھ کے درمیان فوت ہوا اس لیے کتاب اس کے فوراً بعد تصنیف ہوئی۔ اور ۲۵۵ھ سے پہلے ختم ہوئی کیونکہ اسی سال بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی کتاب فتوح البلدان ختم کی۔

یہ پہلی کتاب ہے جو سندھ کی تاریخ پر لکھی گئی۔ برہمن، بدھ اور رائے خاندان کے حالات پر بھی فقط یہی ایک کتاب ہے، عربوں کے فتوحات، محمد بن قاسم کے حالات نیز بنی امیہ اور بنی عباس کے گورنروں کے نام اور واقعات اس کتاب سے ہمیں معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ بعض واقعات تحقیق سے نہیں لکھے گئے تاہم کتاب کی اہمیت پر ان معمولی فروگزاشتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ڈاکٹر داؤد پوتا نے اس کتاب کو انجمن مخطوطات فارسی، حیدر آباد دکن کی طرف سے، مقدمہ، تعلیقات اور مفید حواشی کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں شایع کیا ہے، کتاب معہ دیباچہ، فہرست، مقدمہ، متن اور انڈکس کے ۲۹۱ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ مرزا قلیچ بیگ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو تاریخ سندھ کے ضمن میں پہلی جلد کے طور پر ۱۹۰۰ء میں کراچی سے شائع ہوا، سندھی ادبی بورڈ نے اس کا سندھی ترجمہ کرا کر شائع کیا ہے[۱]۔

(۲) تاریخ معصومی: مصنف میر محمد معصوم نامیؔ بن سید صفائی ترمذی البکھری (متوفی ۱۰۱۹ھ) تصنیف ۱۰۰۹ھ۔

میر معصوم کے تاریخ دانی کے تمام تذکرہ نگار اور مورخ قائل ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد بخشی (متوفی ۱۰۰۴ھ) جب طبقات لکھ رہا تھا تو میر معصوم بطور مددگار اور مشیر کے ان کے

ساتھ رہے۔

تاریخ سندھ اور تاریخ معصومی اس کتاب کے نام ہیں، کتاب چار جز پر مشتمل ہے:

جزاوّل، فتح سندھ، بنی امیہ اور بنی عباس کے گماشتگان کے حالات پر مشتمل ہے۔

جز دوم، ان سلاطین کے حالات میں ہے کہ جنہوں نے بنی عباس کے بعد سندھ پر حکومت کی۔

جز سوم میں ارغونی اور ترخانی حکمرانوں کے حالات ہیں۔

جز چہارم، فتح سندھ اور اکبری دور پر مشتمل ہے۔

اس تاریخ کا قدیم ترین مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے جن کی کتابت کا سال ۱۰۱۷ھ ہے، گویا مصنف کے زمانے میں اس کی کتابت ہوئی اور تصنیف کے ۸ سال بعد اس کو نقل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر داؤد پوتا نے کتاب کو بھنڈارکر اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ۱۹۳۸ء میں مفید حواشی، تعلیقات، انڈکس، دیباچہ اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر G.G. Malet نے ۱۸۵۵ء میں شائع کیا، سندھی ترجمہ منشی نند یرام نے ۱۸۶۱ء میں کراچی سے شائع کیا، حال ہی میں اس کا دوسرا سندھی ترجمہ مولوی امیر احمد صاحب نے کیا، جس کو سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا ہے[۳]۔ چچ نامہ اور تاریخ معصومی کے درمیان ساڑھے چار صدیوں کا طویل خلا موجود ہے۔ اس دور میں سومرہ اور سمہ مقامی حکمران گزرے ہیں۔ علاوہ ازیں ایرانی قوموں نے بھی سندھ کو بار بار تاراج کیا ہے اس دور میں کوئی کتاب غالباً سندھ کے تاریخ پر نہیں لکھی گئی تمام حالات تاریکی میں ہیں۔

تاریخ معصومی، ارغون، ترخان اور اکبری دور کے حالات پر از حد مفید اور معتبر ہے۔

(۳) بیگلر نامہ : مصنف ادراکی بیگلاری ٹھٹوی (سال تصنیف ۱۰۱۷ھ)۔

مصنف کے حالات معلوم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ سندھ کے ارغون قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے ولی نعمت، خان زمان، امیر شاہ قاسم خان بن امیر شاہ قاسم بیگلار کے حالات اور جنگی کارناموں میں یہ کتاب لکھی۔ سال تصنیف ۱۰۱۷ھ ہے لیکن مصنف نے ۱۰۳۴ھ تک کے حالات اس میں بڑھائے ہیں۔ چنیسر نامہ کے نام سے مصنف نے ۱۰۱۰ھ میں ایک عشقیہ مثنوی بھی لکھی۔

ارغونی اور ترخانی دور کے سلسلہ میں یہ تاریخ بیحد مفید اور قیمتی ہے، ابھی تک چھپی نہیں اس کے قلمی نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ میرے پاس بھی ایک مخطوطہ ہے جس کو میں نے نقل کرلیا ہے۔[۳]

(۴) تاریخ طاہری: مصنف میر طاہر محمد نسیانی بن سید حسن ٹھٹوی، سال تصنیف ۱۰۳۰ھ۔

مصنف مرزا غازی بیگ بن مرزا جانی بیگ ترخان (متوفی ۱۰۲۱ھ) کا ملازم تھا۔ مرزا غازی کے انتقال کے بعد ٹھٹھہ میں اقامت اختیار کی اور یہ کتاب مرزا شاہ محمد بیگ عادل خان (ولد شاہ بیگ خان ارغون ثانی) گورنر قندھار (۱۰۰۲ھ، ۱۰۲۸ھ) و گورنر سندھ (۱۰۲۸ھ) کی فرمائش پر لکھی۔

اس کتاب میں ارغونی اور ترخانی دور کے واقعات ہیں، ترخانوں کے حالات ۱۰۲۱ھ تک ہیں یعنی مرزا غازی کے وفات تک، مصنف نے ۱۰۲۱ھ میں اس کو لکھنا شروع کیا اور ۱۰۳۰ھ میں ختم کیا۔

کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی، مخطوطے ملتے ہیں، میرے پاس ایک نسخہ ہے جو میں نے خود نقل کرلیا ہے، کتاب کے ۴۶۳ صفحات ہیں اور ہر صفحہ ۱۲ سطروں کا ہے۔[۴]

(۵) مظہر شاہ جہانی: مصنف، میرک یوسف بن میر ابوالقاسم نمکین البکھری سال تصنیف ۱۰۴۴ھ۔

سندھ کی تاریخ پر اب تک جو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں ان سب میں فقط بادشاہوں کے حالات، امراء کا بیان، لڑائیوں کے داستان اور ملک گیریوں کے قصے ملتے ہیں، ضمناً کہیں کہیں ملک کے اقتصادی، تمدنی، معاشرتی، جغرافی اور عوامی حالات بھی مل جاتے ہیں، جو کہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اور اس قسم کی چند سطریں یا ضمنی اشارے صحیح جائزے اور اندازے کے لیے کسی طرح بھی کارآمد نہیں ہوتے۔

مظہر شاہجہانی فقط ایک ایسی کتاب ہے جس میں شاہوں اور امیروں کے قصے کہانیوں کو کوئی دخل نہیں۔ پوری کتاب سندھ کے جغرافیائی حالات، ملکی، معاشرتی اور تمدنی کیفیات پر حاوی ہے، قوموں کا تفصیلی تذکرہ، محاصل، زراعت، پانی، جھیل، آب رسانی کے طریقے شرح

وتفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ سندھ کے ہر ایک صوبہ پر الگ باب لکھا گیا ہے، جس میں تمام تر انہیں موضوعات پر بحث کی گئی ہے، الغرض اس قسم کے معلومکات کا یہ غیر محدود اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔

میں نے جو نسخہ دیکھا ہے وہ دراصل ڈاکٹر آذر مرحوم کی ملکیت تھا اب شاید وہ پنجاب یونیورسٹی کی ملک ہے، میں نے دنیا کے تمام کتب خانوں کی فہرستیں دیکھیں لیکن کسی میں بھی اس کتاب کا سُراغ نہیں ملا، دنیا میں غالباً یہی ایک نسخہ ہے جس کی کتابت ۱۰۴۴ھ میں ہوئی اور مصنف نے اس پر اپنے قلم سے نوٹ کیا ہے کہ "میں یہ نسخہ اپنے بڑے بھائی ابوالبقاء امیر خان کے بیٹے ضیاء الدین یوسف کے حوالہ کرتا ہوں۔" اس عبارت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کاپی مصنف کی ملک میں رہ چکی ہے اور غالباً اس کی دوسری نقل نہیں کی گئی۔

کتاب کا سائز ساڑھے آٹھ x ساڑھے پانچ ہے، ۶ صفحے پر فہرست ہے اور ۸۱۴ صفحات پر متن ہے، ہر صفحہ پر ۱۴ سطریں ہیں، کتاب چونکہ نادر اور نایاب ہے اس لیے اس کے مضامین کی فہرست یہاں درج کرتا ہوں۔

کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلا حصہ ۲۲۸ اوراق میں ہے دوسرا حصہ ۲۲۸ ورق سے شروع ہو کر ۴۰۱ ورق پر ختم ہوتا ہے، کتاب شاہجہاں کے نام پر معنون کی گئی ہے اور پہلے حصے میں، بادشاہ کو مخاطب کر کے دستور ملک رانی اور سیاست بادشاہی کے رموز اور نکات بیان کیے گئے ہیں، فہرست یہ ہے۔

قسم اوّل (ورق ۱ تا ۲۲۸):

در آنچہ بادشاہان را مجملاً در کار است، و ایں قسم مشتمل بر چہار باب است

باب اول: در ترغیب و ترہیب کہ متعلق اند بہ سلطنت و ایں باب منجر بر دو فصل است

فصل اول: در ترغیب بہ امارت و سلطنت

فصل دوم: در ترہیب کہ متعلق بہ سلطنت است

باب دوم: در آنچہ بادشاہاں مردم را، امراء بدقت نظر فہمید بکنند

باب سوم: در رعایت ملک و تربیت خدم و حشم و ایں باب منجر بہ چہار فصل شد

فصل اول: در رعایت ملک

فصل دوم: در تربیت خدم و حشم و آدابِ ایشان

فصل سوم: در تربیت صاحبِ صوبہ

فصل چہارم: در تربیت خدم و حشم۔

باب چہارم: در خلقت ہائیست کہ بادشاہان اولولامر را حق جل و علیٰ عنایت کردہ و ایں باب منجر بہ بیست فصل است

فصل اول:	در توکل	فصل یازدہم:	در مشاورت
فصل دوم:	در علوِ ہمت	فصل دوازدہم:	در حزم
فصل سوم:	در عزم	فصل سیزدہم:	در غیرت
فصل چہارم:	در جد و جہد	فصل چہاردہم:	در سیاست
فصل پنجم:	در ثبات	فصل پانزدہم:	در تیقظ و خبرت
فصل ششم:	در عدالت	فصل شانزدہم:	در فراست
فصل ہفتم:	در الیرات و مبرات	فصل ہفدہم:	در کتمان اسرار
فصل ہشتم:	در شفقت و مرحمت	فصل ہزدہم:	در اغتنام فرصت و طلب نیکنامی
فصل نہم:	در سخاوت و احسان	فصل نوردہم:	در صحبتِ اخیار
فصل دہم:	در انجاحِ حاجات	فصل بستم:	در دفعِ اشرار

اس "قسم" میں مصنف نے مثال کے طور پر کئی سندھ کے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی بھی تاریخ میں موجود نہیں ہیں اس کے علاوہ کئی ایک ایسے واقعات لکھے ہیں جو ان کے چشم دید ہیں یا ان کے بھائی امیر ابوالبقا امیر خان صوبہ دار سندھ (متوفی ۱۰۵۷ھ) کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سندھ کے کئی صوبہ داروں کے اچھے اور بُرے حالات بیان کیے ہیں، مالگزاری، لگان، زراعت، جمع بندی اور وصولی وغیرہ کے اعداد و شمار ایسے دیے ہیں جو اس کتاب کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔

قسم دوم (ورق ۲۲۸ سے شروع ہو کر ۲۴۰ پر ختم ہوتی ہے):

در بیانِ احوال ولایت سندھ و ایں قسم منجر بہ چہار باب شد

باب اول : دربیانِ احوال ملک بکھر
باب دوم : دربیان احوال ملک سیوی
باب سوم : دربیان احوالِ ملک ٹھٹھہ
باب چہارم : دربیان ملک سیہوان وایں باب مشتمل بر پنج فصل است
فصل اول : دربیانِ احوال پرگنجات ایں ملک ازروئے اجمال
فصل دوم : دربیان متمردان ومفسدان ایں ملک
فصل سوم : دربیان سبب خرابئ رعیت ملک سیحوان وقوت گرفتن متمردان
فصل چہارم : درتربیت ملک سیحوان ازروئے اجمال
فصل پنجم : درتربیتِ فرونشاندن آتش تمردومفسدان ملک سیحوان

یہ "قسم" سندھ کی تاریخ پر مفصل ہے۔ قوموں کے حالات، پیداشدہ فسادات کے اسباب، قبیلوں کے انساب، قبائلی سرداروں کو رام کرنے کی ترکیبیں، صوبوں اور ان کے پرگنوں کی مالگزاری، زراعت، موسم، جمع بندی، وصولی، آب رسانی وغیرہ، نیز عوام کے بودوباش کے حالات پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب سے ملک کی اندرونی سیاست اور تمدنی ومعاشرتی صورت حال کا ایک آئینہ سامنے آجاتا ہے، مغل دور پر اس سے ماقبل اور مابعد کی ملکی تاریخ پر یہ بیش بہا اور نادر کتاب افسوس ہے کہ دنیا کی نگاہوں سے تین سو سال تک چھپی رہی(۵)

(۶) ترخان نامہ : مصنف سید میر محمد بن میر جلال الدین حسینی الشیرازی الٹھوی تصنیف ۱۰۶۵ھ۔

مصنف نے یہ کتاب مرزا محمد صالح ترخان بن مرزا عیسیٰ ترخان ثانی کی فرمائش پر ۱۰۶۵ھ میں لکھی۔ مرزا محمد صالح کے پاس ارغون اور ترخان خانوادہ کی قدیم تاریخ "ترخان نامہ" کے نام سے تھی لیکن وہ گم ہوگئی۔ اس لئے مصنف سے کہہ کر اسی نام سے دوسری تاریخ تیار کرائی، مصنف نے خاندانی روایات اور کتبِ تاریخ کے وساطت سے اس کو لکھا، ارغون اور ترخان قبیلہ کی ابتدائی تاریخ سے لے کر مرزا عیسیٰ ثانی کی وفات ۱۰۶۱ھ تک کے حالات قلمبند کیے۔ یہ کتاب اس دور کی تاریخ کے لیے ازحد مفید اور کارآمد ہے۔

کتاب کے مخطوطے بہت نادر ہیں، برٹش میوزیم میں دو نسخے موجود ہیں جن کی میکروفلم میرے پاس موجود ہے(۶)

(۷) منشات نمکین : مرتبہ، میر ابوالقاسم نمکین متوفی ۱۰۱۸ھ تصنیف ۱۰۰۶ھ۔

میر ابوالقاسم نمکین اکبری دور کا امیر تھا، سندھ میں بطور صوبہ دار دو مرتبہ یا اس کے لڑکے اور پوتے بھی آخری سلاطین مغلوں کے زمانہ تک بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ ابوالبقا امیر خان نمکین کا فرزند اکبر اور اس کا بیٹا عبدالکریم امیر خان بھی سندھ کا صوبہ دار رہا ہے۔ سرکاری مراتب اور اعزاز کے علاوہ یہ پورا خاندان علم و فضل کا سرچشمہ رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک فرد نے بلندپایہ تصانیف چھوڑی ہیں، رقائم کرائم اور مظہر شاہ جہانی کا ذکر اس مضمون میں ہو رہا ہے۔

میر ابوالقاسم نے منشاتِ نمکین میں انشا کی تاریخ بیان کی ہے اور آخر میں اکبری عہد کے مکاتیب بھی دیے ہیں۔ ان مکاتیب میں سے بعض ایسے ہیں جو سندھ کی تاریخ سے متعلق ہیں۔
اس کتاب کا ایک نسخہ نمبر ۱۵۳۵ پر انڈیا آفیس میں ہے جس کی کتابت ۱۰۱۲ھ میں یعنی تصنیف کے ۶ سال بعد کی ہے، ۴۱۲ صفحہ کی کتاب ہے اور ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں (۷)

(۸) ذخیرۃ الخوانین : مصنف شیخ فرید بن شیخ معروف صدر بکھری فاروقی (سال تصنیف ۱۰۶۰ھ)۔

یہ ماثرالامرا کے طرز کا ایک بلندپایہ تذکرہ ہے جس میں اکبری، جہانگیری اور شاہ جہانی دور کے ۵۱۳ مشاہیر کا مستند اور مفصل تذکرہ لکھا گیا ہے، مصنف نے یا تو اپنا آنکھوں دیکھا حال ذاتی تاثرات اور مشاہدات بیان کیے ہیں یا پھر حالات کے سلسلہ میں ان لوگوں کی روایات پر بھروسہ کیا ہے جن کو صاحب سوانح کے ساتھ ذاتی تعلق تھا۔ انداز بیان دلچسپ اور ایسے ایسے واقعات کو خاص طور پر لیا گیا ہے جو ہمیں دوسرے کسی تذکرہ میں دستیاب نہیں ہوتے۔
جن سندھی مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ نواب مرزا رستم خان، شیخ مبارک ناگوری سیوستانی سندھی، نواب محمد خان نیازی، محبوب علی خان پسر میر خلیفہ، مرزا جانی بیگ، میر معصوم بکھری، میر ابوالقاسم نمکین، مظفر خان معموری، سید محمد میر عدل، نواب مرزا غازی ترخان، مرزا عیسیٰ بیگ ترخان، اسد خان معموری، سید بھوہ دیں دار خان، سادات خان بکھری، عبدالعلی ترخان، میرزا بزرگ ولد میر معصوم، میر قندھاری ولد میر بزرگ اور علی محمد ٹھٹوی۔

سندھ کے صوبہ دار جو مغلیہ دور میں یہاں آئے، سندھ میں جن کو جاگیریں ملی، یا سندھ کے ساتھ کسی طرح کا بھی تعلق رہا ان سب کا تذکرہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں کے ساتھ جتنے بھی فوجی جرنیل یا مشاہیر سندھ میں لڑنے آئے تھے، ان سب کا تفصیلی ذکر اس میں موجود ہے۔ شیخ فرید بکھری خود وسیع تعلقات رکھنے والا آدمی تھا، بہت سے مشاہیر اور امراء ایسے اس کتاب میں نظر آتے ہیں جن سے اس کا ذاتی تعلق تھا، سوانح نگاری میں جزئیات کی حد تک گیا ہے، نیز ہر ایک کی جہاں خوبیاں بیان کی ہیں وہیں ان میں جو کوتاہیاں تھیں یا جو نقائص تھے ان کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مثلاً میر معصوم کی سوانح لکھتے ہوئے تعریف کرتے کرتے بالکل آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ "بایں ہمہ صفاتِ حسنہ دو صفتِ ذمیمہ واشت لولاً چغل دوست بود، دوم شدید العداوت۔" نواب صف شکن خان کی تمام خوبیاں بیان کرنے کے بعد اختتام پر یہ دو لفظ بھی نظر آتے ہیں "مرد متقلب الحال طفل مزاج بود۔" سیرۃ نگاری اور کیریکٹر کو نمایاں کر کے رکھ دینے میں شیخ کو کمال حاصل ہے۔

ماثرالامرا اور میر غلام علی آزاد کا اہم ترین ماخذ یہی کتاب ہے۔ افسوس ہے کہ کسی نے اس کے شائع کرنے کی طرف کبھی تک توجہ نہیں کی، اس وقت سندھی ادبی بورڈ اس کو ایڈٹ کرا رہا ہے۔ شاید آیندہ سال تک نکل آئے[۸]۔

اس کے چار نسخے اب تک معلوم ہو سکے ہیں، ایک مولانا عبدالحق کے کتب خانہ میں ہے۔ ایک حبیب گنج کی لائبریری میں ہے جس کی کتابت ۱۲۵۹ھ کی ہے، ایک نسخہ میرے پاس ہے اور ایک نسخہ سید معین الحق نے ابھی ابھی خریدا ہے۔ آخری نسخہ غالباً قدیم ترین ہے۔

(۹) برہان الاخوان: مصنف نامعلوم، ناقص اوّل و آخر (تصنیف ۱۱ صدی)۔

یہ ایک ۱۵۰ صفحہ کا تذکرہ ہے جس کے ابتدا اور آخر کے اوراق گم ہیں۔ اس میں بکھر کے علماء، امراء اور مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ تاریخی واقعات ضمناً کثرت سے آگئے ہیں۔ گمان ہے کہ معصومی وغیرہ سے واقعات لیے گئے ہیں۔ پیر صاحب جھنڈو کے کتب خانہ میں، میں نے دیکھا ہے۔

(۱۰) حدیقۃ الاولیا: مصنف سید عبدالقادر بن سید محمد ہاشم بن سید محمد الحسینی الٹھٹوی (تصنیف آخر ۱۱ صدی)۔

یہ سندھ کے علماء، صلحاء اور بزرگان دین کا تذکرہ ہے، خاص طور پر ٹھٹھہ کے مشاہیر علم

ودین پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ ۱۴ بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔ جن کی فہرست یہ ہے۔ شیخ بہاء الدین ملتانی، شیخ رکن الدین، مخدوم لعل شہباز، شیخ پٹھ، شیخ حماد جمالی، شیخ جیہ، شاہ مراد، سید علی شیرازی، سید نظام بکھری، شیخ نوح بکھری، مخدوم حسام الدین، مخدوم بلال، قاضی ڈتا سیوستانی، درویش احمد و محمد ولدان شیخ ہوتی، درویش حسن مقری، مخدوم ساہڑ لنجار، مخدوم عربی دیانہ، مخدوم نوح ہالائی، درویش وہیہ، مخدوم اسمٰعیل سومرہ، درویش رکن الدین، درویش راجو، شیخ برکیہ کاتیار، درویش چرکس، شیخ موسیٰ آہیدانی، درویش صدر، پنیہ نارجہ، درویش سعتہ، درویش ابراہیم، درویش علاء والدین، قاضی صدہو، درویش یحییٰ، قاضی خیر الدین، یعقوب پلیجہ، شیخ مغل چاچک، شیخ پریہ، درویش عمر بودلہ، درویش آکو۔ برٹش میوزیم میں ایلیٹ صاحب کے جو فائل ہیں ان میں سے ایک فائل (O.R. ۲۰۷۳) میں ٹھٹھہ کے کتب خانوں کی فہرست ہے اس فہرست میں حدیقۃ الاولیا کے جس نسخہ کا ذکر آیا ہے وہ ۲۱ ذی قعد ۱۰۶۸ھ کا کتابت شدہ ہے۔ اوراق ۸۷ ہیں، میرے پاس ناقص نسخہ ہے، سندھ یونیورسٹی لائبریری میں مکمل نسخہ موجود ہے اور ایک نسخہ پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اب معلوم نہیں کہ وہاں ہے یا غائب ہو گیا۔(۹)

مصنف کا ذکر میر علی شیر نے کیا ہے، مصنف کے والد سید محمد ہاشم مرزا جانی (متوفی ۱۰۰۹ھ) کا ہمعصر تھا۔ سیر السلاطین اس کی تصنیف ہے۔

(۱۱) تذکرۃ المراد : مصنف حاجی محمد حسین صفائی ٹھٹوی (۱۰ اصدی)۔

ٹھٹھہ کے ایک بزرگ سید محمد حسین ولد سید احمد الشیرازی المعروف بہ سید مراد متوفی ۸۹۴ھ کے حالات اور ملفوظات اس میں لکھے گئے ہیں، ضمناً تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، نیز اس دور کے دوسرے مشاہیر کے حالات بھی دیے گئے ہیں، اس کتاب سے اس دور کے درویشانہ اور صوفیانہ ماحول کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، کتاب نایاب ہے، ایک نسخہ مولانا محمد ابراہیم صاحب گڑھی یاسینی کے پاس ہے۔

(۱۲) تاریخ سندھ : (فی التحقیق بنا امصار السندھ) مصنف سید محبت اللہ بن سید احمد شاہ واعظ، بن سید محمد شاہ الملقب بہ سیار الحسنی الحسینی الحموی الدہلوی القادری الاصلاً، سندھی مولداً لوہروی مسکناً (تصنیف ۱۳ اصدی)۔

اس کتاب میں سندھ کے مشہور مقامات کے سرسری حالات ہیں گویا یہ ایک چھوٹا سا گزیٹیر ہے، تقریباً ۲۰۰ صفحات چھوٹی سائز کے ہیں، ایک کاپی پنجاب یونیورسٹی میں ہے اور ایک نسخہ مولانا محمد ابراہیم صاحب گڑھی یاسینی کے پاس ہے۔

(۱۳) معلومات الآفاق : مصنف میر امین الدین خان (متوفی ۱۱۲۷ھ) بن میر سید ابوالمکارم شہود (متوفی ۱۰۷۳ھ) بن میر ابوالبقاء امیر خان (متوفی ۱۰۵۷ھ) بن میر ابوالقاسم نمکین البکھری (متوفی ۱۰۱۸ھ)۔

یہ ایک جغرافیہ کی کتاب ہے جو ایک سندھی امیر نے لکھی ہے، مغل دور کے صوبوں کا جغرافیہ اور ان کے حالات نیز اُس زمانہ میں جو مناصب تھے ان کی تفصیل اور ان کے مراتب اور درجہ وغیرہ سب تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ سندھ پر دس صفحے اور ملتان پر تیرہ صفحے لکھے ہیں، کتاب ۱۱۲۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ بانکی پور کا نسخہ جس کی کتابت کا سال ۱۲۷۳ھ ہے ۱۵۲ اوراق پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۱۹ سطریں ہیں۔ اسی مصنف نے "رشحات الفنون" کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی لکھی ہے۔[۱۰]

(۱۴) رقائم کرائم : مصنف میر سید اشرف خان محمد الحسینی بن عبدالکریم امیر خان (متوفی بعد ۱۱۳۰ھ) بن میر ابوالبقا امیر خان (متوفی ۱۰۵۷ھ) بن میر ابوالقاسم نمکین (متوفی ۱۰۱۸ھ) تصنیف بعد ۱۱۳۱ھ۔

یہ عالمگیر کے رقعات کا مجموعہ ہے اس میں بہت سے خطوط وہ ہیں جو مرتب کے والد امیر خان عبدالکریم کے نام عالمگیر نے لکھے ہیں۔ اس مجموعے کو سید اشرف خان نے والد کے انتقال کے فوراً بعد اس لیے مرتب کیا کہ بہت سے گم ہو چکے تھے اور باقی بھی گم ہو جاتے اگر ان کو مرتب نہ کیا جاتا۔ عبدالکریم امیر خان سندھ کا کئی مرتبہ صوبہ دار رہا اور عالمگیر کا مقرب خاص تھا۔

اس کتاب کے مخطوطے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، برٹش میوزیم میں جو نسخہ موجود ہے، وہ فلسکیپ کے ۶۳ ورقوں پر ہے اس میں ۲۴ خط، ۱۳۰ رقعے اور ۵ فرمان ہیں۔ میرے پاس اس نسخے کا میکرو فلم ہے۔

امیر عبدالکریم کے نام جو خطوط ہیں وہ ٹھٹھہ اور سیوستان کے صوبہ داری کے زمانہ کے

ہیں ان سے سندھ کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

(۱۵) نامۂ نغز: مصنف باغ علی خائف (تصنیف ۱۱۵۵ھ)۔

شاہ نامہ اور سکندر نامہ کی طرز پر سندھ کے کلہوڑا دور کی منظوم تاریخ ہے، کتاب کو مصنف نے میاں نور محمدؒ (متوفی ۱۱۶۷ھ) کے زمانہ میں ۱۱۵۵ھ میں تصنیف کیا، جیسا کہ خود لکھا ہے۔

بہ عہدِ خدا یار خان شیر نر
پھدار عباسیٔ نامور
ہزار و صد و سال و پنجاہ و پنج
کشیدم سہ سال اندریں نامہ رنج

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خائف نے یہ کتاب ۱۱۵۳ھ میں لکھنی شروع کی اور ۱۱۵۵ھ میں ختم کی لیکن مصنف بعد میں بھی اس میں اضافہ کرتا رہا چنانچہ نادر شاہ کی وفات (۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء) کا بھی ذکر کیا ہے۔ کتاب میں کل ۱۶۲۴۹، اشعار ہیں اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب کلہوڑا عہد پر مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، نادر کے حملہ اور درّانیوں کے تاخت و تاراج کے چشم دید حالات اس میں مرقوم ہیں، اشعار اگرچہ کمزور ہیں لیکن تاریخی واقعات شعری نقائص پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ کتاب کا ایک قلمی نسخہ سندھ کے قومی کتب خانہ میں ہے۔ اور اس نسخہ کی ایک نقل سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے۔

(۱۶) گلدستۂ نورس بہار: مرتب منشی عبدالرؤف سیوستانی (متوفی قبل ۱۱۸۰ھ)۔

عبدالرؤف قوم کا سھتہ تھا، بکھر کے قریب ایک قصبہ ہنگورجہ کا باشندہ تھا، پہلے بختیار خان حاکم خان پوروسیوی کے پاس ملازم ہوا، بعد میں میاں نور محمد کے پاس منشی کے طور پر کام کرنے لگا، اپنے لکھے ہوئے مکاتیب کے تین چار مجموعے تیار کیے تھے جو اسی زمانہ میں عام اور مشہور ہوگئے۔ "گلدستۂ نورس بہار" میں یار محمد (۱۱۱۱۔۱۱۳۱ھ) اور میاں نور محمد (۱۱۳۱۔۱۱۶۷ھ) کے مکاتیب جمع کیے ہیں جن سے اس دور کا بیشتر تاریخی مواد ملتا ہے۔ کتاب تین لطیفوں پر مشتمل ہے اور چھوٹے سائز کے ۳۵۸ صفحوں پر ہے، فن انشا میں منشی عبدالرؤف

ہندوستان کے صفِ اوّل کے انشانویسوں میں بھی ممتاز اور یگانہ نظر آتا ہے، بے تکلف سادہ عبارت میں مطلب کو ادا کرتا ہے۔ اس نے اپنے دور کے طرزِ نگارش سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نیا رستہ نکالا، سادہ عبارت اور بے تکلف فقروں میں انتہائی دل نشینی، دل کشی اور پختگی ہے، فارسی زبان کو مادری زبان کی طرح عالمانہ انداز میں لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے کہ پاک و ہند کے فارسی نویسوں میں شاید ہی کوئی اس کے ٹکر کا نکلے، منشی عبدالرؤف کا انتقال میر علی شیر قانع، جس وقت تحفۃ الکرام (۱۱۸۰ھ) لکھ رہا تھا اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

کتاب کا نسخہ میرے پاس موجود ہے اوراق کی تعداد اوپر دی گئی ہے، یہ نسخہ بہت ہی بدخط ہے، نیز مکتوب الیہ کے نام بھی اس میں نہیں دیے گئے ہیں۔ لیکن خط کے متن میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اس سے نام معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے اس کو ایڈیٹ کر رہے ہیں۔

(۱۷) مجموعہ منشآت : میاں عبدالرؤف منشی و میاں ہارون (تصنیف قبل ۱۱۶۷ھ)۔

میرے پاس مکاتیب کا یہ مجموعہ ہے جس میں متفرق خطوط، مختلف اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں نمبر ۱ سے لیکر نمبر ۱۰ تک کے خطوط نیز نمبر ۲۷، ۳۴ اور ۳۵ کلہوڑوں کے سلسلے کے ہیں، خطوط اسلوب نگارش اور دوسرے واقعات کی بنا پر منشی عبدالرؤف کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مجموعہ کے آخر میں "خلاصۃ المکتوبات" کے نام سے ایک اور مجموعہ شامل ہے جو میاں ہارون اور منشی عبدالرؤف کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ کتاب کا حاشیہ کٹ چکا ہے اس لیے پورے مکاتیب پڑھے نہیں جاتے، لیکن یہ سب کے سب کلہوڑہ دور کے تاریخ سے وابستہ ہیں۔

(۱۸) منشور الوصیت فی دستور الحکومت : مصنف میاں نور محمد عباسی والی سندھ (۱۱۳۱ھ۔۱۱۶۷ھ) (تصنیف بعد ۱۱۵۲ھ)۔

میاں نور محمد کی یہ اپنی لکھی ہوئی وصیت ہے جس سے تاریخی واقعات کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق اور حکومت کے متعلق ان کے ذاتی تصورات کا علم ہوتا ہے۔ یہ نادر کے حملہ سندھ (۱۱۵۲ھ) کے بعد اور میاں صاحب کے وفات (۱۱۶۷ھ) سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا محمد ابراہیم گڑھی یاسینی کے پاس ہے اور ایک نسخہ میرے پاس ہے جو میرے بزرگ بھائی پیر علی محمد راشدی نے مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔(۱۱)

(۱۹) مکلی نامہ : مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹوی (متوفی ۱۲۰۳ھ)(تصنیف ۱۱۷۴ھ)۔

میر صاحب نے مکلی کے قبرستان کی تاریخ اور اس قبرستان میں جو مشاہیر مدفون ہیں ان کے حالات اور تعریف میں ۵۴ صفحات پر ۱۵۰۰سو اشعار کی یہ مثنوی لکھی ہے۔ مکلی میں جو خوبصورت مقابر اور بہترین عمارتیں ہیں، ان کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب نایاب اور نادر ہے ابھی تک کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔(۱۲)

(۲۰) مقالات الشعرا : مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹوی (متوفی ۱۲۰۳ھ) (تصنیف ۱۱۷۴ھ)۔

یہ سندھ کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے، اس میں ان شعرا کا بھی ذکر ہے جو بیرونی ممالک خاص طور پر ہندوستان اور ایران سے آ کر یہاں متوطن ہوئے یا یہاں سے گزرے۔ جملہ ۷۱۹ شعرا کی سوانح بیان کی گئی ہے، کتاب ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے، کتاب نایاب ہے۔ کہیں کہیں نسخے دستیاب ہوتے ہیں، ایک نسخہ جو خود مصنف نے اپنے قلم سے لکھا ہے، مولانا وفائی مرحوم کی ملک تھا اب سندھی ادبی بورڈ نے اس کو خرید لیا ہے۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ اس کی نقل ہے، ایک نسخہ جو میر کرم علی خان والیٔ سندھ نے نقل کرایا تھا، برٹش میوزیم میں ہے اس کی میکرو فلم میں نے حاصل کی ہے۔

شعرا کے تذکرہ کے علاوہ اس میں بیشمار تاریخی واقعات آ گئے ہیں، یہ کتاب نہ فقط سندھ کی ادبی تاریخ کا بنیادی ماخذ ہے بلکہ عام سیاسی اور ملکی تاریخ کے لیے بھی بیش بہا دستاویز ہے(۱۳)

(۲۱) تاریخ عباسیہ : (نظم) مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹوی متوفی ۱۲۰۳ھ (تصنیف ۱۱۷۵ھ)۔

میر علی شیر جس وقت عباسی دربار سے وابستہ ہوا۔ اس وقت یہ کتاب شاہنامہ کی طرز پر لکھنی شروع کی، غالباً اس میں فقط میاں نور محمد کلہوڑا کے دورِ حکومت کو بیان کیا ہے، کتاب نامکمل رہ گئی، اس کے اقتباسات مسٹر ایلیٹ کے فائلوں میں موجود ہیں (برٹش میوزیم نمبر O.R.۲۰۷۳)

(۲۲) تاریخ عباسیہ (نثر) : مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹوی متوفی ۱۲۰۳ھ (تصنیف ۱۱۷۵ھ)۔

میر علی شیر نے اسی زمانہ میں ایک تاریخ نثر میں بھی عباسی عہد کے حالات میں لکھنی شروع کی تھی، مسٹر ایلیٹ کا فہرست نگار لکھتا ہے کہ :

"دربیان میاں صاحبان کلہوڑہ، از ابتدائی آمدن شان در سندہ معہ تحقیقات نسبت اوشان، و تقرر زمینداری آں فرقہ در سندھ، وبدست رسیدن بآنہا حکومتِ سندھ واحوال واقعات آں ایام" ۔

(فہرستِ کتب خانہ ٹھٹھہ برٹش میوزیم نمبر O.R. ۲۰۷۳) یہ تاریخ بھی نامکمل رہ گئی اور کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔

(۲۳) تحفتہ الکرام : مصنف میر علی شیر قانع ٹھٹوی متوفی ۱۲۰۳ھ (تصنیف ۱۱۸۰ھ)۔

میر صاحب نے یہ کتاب تین جلدوں میں لکھی ہے۔ تیسری جلد خالص سندھ کی تاریخ پر ہے۔ یہ آخری جلد سندھ کے سلسلہ میں بیش بہا اور نادر معلومات کا ایک گنجینہ ہے۔ فتح سلام سے لے کر کلہوڑہ عہد تک تاریخ لکھی ہے، اس کے بعد سندھ کے ہر بڑے اور چھوٹے شہر کے حالات دیے ہیں اور ان شہروں کے ضمن میں وہاں کے اولیاء، علماء، شعراور مشاہیر کا ذکر کیا ہے۔ یہی ایک کتاب ہے جو معصومی کے بعد سندھ کے مشاہیر کے سلسلے میں ہمیں ملتی ہے۔ معصومی نے ترخانی اور ارغونی عہد کے مشاہیر کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ تحفتہ الکرام نے سیکڑوں مشاہیر کا مفصل ذکر ان کے انساب کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کلہوڑہ عہد کی تاریخ نہایت مستند ہے کیونکہ مصنف خود اس دور کا آدمی ہے۔

میر صاحب نے یہ کتاب ۱۱۸۰ھ میں لکھنی شروع کی ۱۱۸۱ھ میں ختم کی لیکن ۱۱۸۸ھ تک اس میں اضافہ کرتے رہے۔ پوری کتاب ۱۳۰۴ھ میں مطبع ناصری دلی میں شائع ہوئی تھی، لیکن بالکل غلط اور نامکمل ہے۔ مرزا قلیچ بیگ نے اس کی تیسری جلد کا سندھی ترجمہ "قدیم سندھ" کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں برطانوی قبضہ تک حالات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے اور ترتیب بھی بدل دی ہے۔ انگریزی اقتباسات، بنگال ایشیاٹک جرنل میں شائع ہو چکے ہیں۔ فارسی متن اور جدید طرز پر سندھی ترجمہ سندھی ادبی بورڈ شائع کر رہا ہے (۱۴)۔ مخطوطے یورپ اور پاک وہند کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ مصنف کا اپنا قلمی مخطوطہ مولانا محمد شفیع، خان بہادر کے پاس ہے، میرے پاس بھی ایک مخطوطہ اور برٹش میوزیم میں جو مصنف

کے قلمی نسخے تھے۔اس کے میکروفلم موجود ہیں۔

(۲۴) تحفتہ الطاہرین : مصنف محمد اعظم ٹھٹوی (تصنیف ۱۱۹۴ھ)۔

اس کتاب میں ان بزرگوں کے حالات ہیں جو مکلی اور ٹھٹھہ میں مدفون ہیں، ۱۱۹۴ھ میں تصنیف ہوئی۔ ٹھٹھہ کے مشاہیر کو محلہ وار تقسیم کیا ہے اور ہر محلہ میں جو جو بزرگ دفن ہیں ان کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں اس کتاب سے ملک کے سیاسی حالات کا پتہ نہیں چلتا لیکن تذکرہ کے نقطۂ نظر سے بہت ہی مفید ہے، نیز اس سے شہر ٹھٹھہ کی تاریخ پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے، میرے پاس ایک مخطوطہ موجود ہے، ایک مخطوطہ مولانا محمد ابراہیم گڑھی یاسینی کے پاس ہے، ایک قلمی نسخہ شیرانی کلیکشن (پنجاب یونیورسٹی لائبریری) میں موجود ہے جس کی کتابت ۱۱۹۴ھ میں ہوئی جو اس کتاب کا سال تصنیف بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسخہ مصنف ہی کا ہو۔ ایک نسخہ سید غلام محمد مرتضوی ٹھٹوی کے پاس ہے۔(۱۵)

(۲۵) مکتوباتِ شاہ فقیر اللہ علوی : مصنف، شاہ فقیر اللہ بن شاہ عبدالرحیم بن شاہ شمس الدین علوی شکارپوری المتوفی ۳ صفر ۱۱۹۵ھ۔

یہ بزرگ اصل جلال آباد کے تھے لیکن بعد میں ۱۱۵۰ھ کو شکارپور (سندھ) میں آکر مقیم ہوئے، اپنے دور کے جلیل القدر عالمِ دین اور بلند منزلت ولی اللہ تھے، احمد شاہ ابدالی آپ کا خاص حلقہ بگوش تھا، شاہ صاحب کے مکاتیب کا یہ مجموعہ لاہور سے چھپا ہے۔(۱۶)

وقت کے اکابر سیاست اور اکابرِ علم و فضل سے ان کی خط و کتابت رہی ہے، زیادہ تر اصحاب علمی اور دینی مسائل آپ سے پوچھتے تھے، ضمناً جوابات میں تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، تمام خطوط بڑے کام کے ہیں۔ خاص طور پر یہ خطوط تو تاریخ سندھ کے سلسلہ میں بہت مفید ہیں،

احمد شاہ ابدالی (۱۱۶۰۔۱۱۸۷ھ) کے نام	۴ خط
میر نصیر خان والی قلات کے نام	۲ خط
شاہزادہ سلیمان شاہ بن احمد شاہ کے نام	۳ خط
میاں سرفراز کلہوڑا کے نام (۱۱۸۶۔۱۱۸۹ھ)	۳ خط
شاہ ولی خان وزیر اعظم احمد شاہ	۲ خط
مخدوم محمد معین ٹھٹوی متوفی ۱۱۶۱ھ	۵ خط

(۲۶) قصیدہ بمدح عبدالنبی خان : مصنف میر علی شاہ، شائق (تصنیف قبل ۱۱۹۸ھ)۔

میاں عبدالنبی کی مدح میں یہ قصیدہ کہا گیا ہے، عبدالنبی ۱۱۹۱ھ سے لیکر ۱۱۹۸ھ تک ایک وقفہ کے ساتھ سندھ کا حکمران تھا، قصیدہ میں ۴۹۵ اشعار ہیں، قصیدہ میں دربار کے حالات، امرا، جرنیل، وزراء، درباری مشاہیر کے نام آگئے ہیں اور عہدوں کی فہرست بھی اسی قصیدہ سے معلوم ہوتی ہے، عنوان یہ ہیں، در وصف کشورِ سندھ۔ در مدح جناب قلندر، مدح میاں عبدالنبی، صفت شہر خدا آباد، صفت مہران (دریائے سندھ)۔ مدح جناب شہباز قلندر، در وصفِ عمارات درگاہِ قلندر، در وصف خدام درگاہ، اشتغال بمدح نواب خدیو زمان۔ شاہنواز خان، معزالدولہ، فیروز جنگ میاں عبدالنبی۔ وصف صاحبزادگان والا تبار، وصفِ انساب تجمل بندۂ والا شان، وصف اسلحہ خاص، وصف جماعہ خاص۔ وصف حضارِ خدمت۔ وصف ناظران خدمتگار۔ وصف رتبہ متصدیان، وصف اصحاب دفاتر، وصف توشکیان۔ وصف وکلاء عالی جاہ۔ وصف صاحبزادہ شاہ محمد جیو۔ وصف کلہوڑہ ہائے نامدار۔ وصف میر ناصر الدین بخاری و شیخ حامد گنج بخش۔ وصف مردم جونیجہ۔ وصف سید عابد شاہ و قاضی احمدیؒ۔ وصفِ علما و فقہا۔ وصف میاں نامدار۔ وصف مردم بروھی و بلوچان کوھی۔ وصف مردم داؤد پوتا و بھاول پور۔ وصف راجھائے اھل نیاز۔ وصفِ فقیرانِ سعادت اندیش۔ وصف امراءِ نامدار۔ مدح میر بجار۔ عرضی احوال خود در خدمت میر صاحب در اتمام سخن دعائے دولت بندگان۔ تاریخ خلعت از تیمور شاہ۔ نعت و مدح خلفاءِ و مدح خلفاءِ اربعہ۔

کلہوڑہ عہد کی تاریخ میں یہ بہت ہی کار آمد قصیدہ ہے۔

(۲۷) ھیئت العالم : مصنف محمد اعظم ٹھٹوی (تصنیف ۱۲۰۰ھ)۔

تحفۃ الطاہرین کے مصنف کی تصنیف ہے۔ جغرافیہ پر لکھی گئی ہے، سندھ کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں، اس کا ایک نسخہ سندھی ادبی بورڈ میں موجود ہے[۱۴]

(۲۸) معیارِ سالکان طریقت : میر علی شیر قانع ٹھٹوی متوفی ۱۲۰۳ھ (تصنیف ۱۲۰۲ھ)۔

میر علی شیر نے اس کتاب کو ۶۳ برس کی عمر میں لکھا، سندھ کے تمام مشاہیر دین اور

مشاہیر علم و فن کا بقید مکان و زمان تذکرہ ہے۔

میر صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے مشاہیر کا تذکرہ پہلے بھی لکھا ہے (تحفتہ الکرام میں)۔ لیکن اب جبکہ ۶۳ برس کی عمر ہو چکی ہے، خیال ہوا کہ بزرگانِ دین اولیاءِ کرام اور مشاہیر علم کا تذکرہ بقید مکان و زمان لکھوں، میر صاحب نے انتہائی کوشش سے صحیح حالات جمع کیے ہیں تاریخ ولادت اور وفات بھی مہیا کی ہے اور جہاں تاریخ نہ مل سکی وہاں زمانے کا تعین کر دیا ہے۔ ۱۴۱۱ ایسے مشاہیر ہیں جن کی تاریخیں یا زمانہ معلوم ہو سکا ہے، آخر میں ان بزرگوں کا ذکر ہے جن کے دور کا تعین نہ ہو سکا، کتاب چونکہ نادر ہے اس لیے ضروری ہے کہ علم دوست حضرات کی آگاہی کے لیے اصحاب سوانح کے ناموں کی فہرست یہاں دیدوں: شاہ وجیہ الدین، سید محمد مکی بکھری اور ان کی اولاد، سید بدر الدین بکھری اور ان کی اولاد، سید خطیب، سید صدر الدین، شیخ نوح بکھری، حاجی منکہ، مخدوم محمد عثمان عرف لعل شہباز، شیخ ریحان جنگلی، درویش پنیو ناریجہ، درویش علاؤالدین بجیہ، قاضی صدھو، قاضی شکر اللہ شیرازی، مخدوم اسحٰق بھٹی ہالہ کندی، مخدوم احمد، مخدوم فتح اللہ، مخدوم محمد، مخدوم عبد الرشید، درویش ذکریا، مخدوم یوسف تونیہ، جلال خان، شاہ جہانگیر ہاشمی، شیخ عبد اللہ متقی، سلطان شاہ جلال الدین قریشی، مخدوم رکن الدین، مخدوم میران، مولانا یونس سمرقندی، شاہ قطب الدین محمد، مخدوم عربی دیانہ، قاسم کاہی، درویش رکن الدین، مخدوم نوح ہالہ کندی، مخدوم محمد امین، مخدوم سلطان، مخدوم میران، میاں جلال، میاں ابراہیم، میاں لطف اللہ، سید ظہیر الدین والاسلام جادم، مولانا ضیاء الدین یوسف، مولانا عبد الغفور لاری، مخدوم اسمٰعیل سومرو، شیخ برکیہ، حاجی ویسر، شیخ صدر الدین، شاہ اجن، پیر آسات، شیخ جندہ پاتنی، شیخ ابو بکر، شیخ مغل چاچک، شیخ موسیٰ، قاضی شیخ محمد ہروی اُچی، سید جلال، سید علی انجوی، سید علی ثانی ولد سید جلال، مخدوم جمعہ، درویش الہ دین سومرہ، سید منصور، شیخ ابراہیم، شیخ ریکھن، مخدوم یعقوب پلیجہ، شیخ حافظ اللہ گجراتی، شیخ اسمٰعیل، قاضی ابوالخیر، قاضی عبد الرحمٰن، سید خواجہ مسکین مودودی، درویش صالح، مخدوم صدر الدین راھوتی، مخدوم مراد، قاضی منور، درویش حسن مقری، مخدوم بلال، سید حیدر سنائی، درویش چرکس، میر سید کلاں، قاضی عبد اللہ، شیخ خضر، شیخ زین الدین، محمد داؤد، شاہ دیوانہ اور درویش قاسم، سقائی چغتا، مخدوم نجم ویل، درویش قطب، میاں عبد الرشید، مخدوم صابر سومرہ، مولانا ضیاء الدین، شیخ عبد اللطیف، درویش بارہ، سلطان کھمر، مہتہ فقیر، مخدوم اسحٰق، سید احمد

جعفر، سید محمد ہاشم رضوی، مخدوم شیخ عبدالقادر، سید محمد حسین قادری، سید عبداللہ، سید کمال، سید جمال، سید منیر، درویش وریہ، درویش اچی، درویش داؤد، سید علیم، میرک شیخ محمود، میرک بایزید، مخدوم اعظم، حاجی محمد، شیخ احمد بن قاضی نصر اللہ الدیلی تتوی السندھی، شیخ برہان الدین شطاری، درویش وھیہ چانیہ، درویش لدہ، مولانا عباس، شیخ صدھو نوہریہ، درویش عمر بودلہ، شیخ عیسیٰ سندھی، شیخ عبدالستار بن شیخ عیسیٰ سندھی، شیخ عبداللہ شطاری، سید جلال، سید عبدالکریم، سید دین محمد، درویش عبداللطیف، مخدوم ضیاء الدین، درویش لہنہ، میاں عبدالقدوس، میاں عبداللہ، درویش ہارون، درویش الھڈنہ زرگر، مہرار ٹھریہ، شیخ میاں میر، مخدوم صد ہولانگاہ، ملا آجب، ساجن سوائی، سید بھلے ڈنہ، سید ابراہیم، سید رحمت اللہ بخاری، سید جلال ثانی البخوی، بھرکیہ لنگ، خلیفہ عبدالوہاب، میر محمد یوسف رضوی، سید ابراہیم، سید عبدالرزاق، سید اسحٰق، سید جعفر، آدم شاہ کلہوڑہ، درویش احمد رونجھ، قاضی حسن، درویش جونہ، درویش حسن سہار، سید بایزید بخاری، سید محمد ملوک، شیخ کالہ قریشی، قاضی قاضن، مخدوم فیض اللہ، مخدوم حاجی حمزہ واعظ، مخدوم آدم، میاں آدم متقی، میاں عبدالنبی خائف، میاں محمد اشرف، خلیفہ ابو برکات، شیخ محمد یعقوب، شیخ عثمان، میاں ملک شاہ، درس للیہ، درس امین محمد، کبیر محمد نقشبندی، مخدوم ابراہیم نقشبندی، قاضی مسعود، میاں عبدالقدوس، سید عالی، میرک محمد حسین، میر محمد تقی، سید رحمت اللہ، حاجی محمد طاہر، درویش لدھ، سید نور محمد، سید محمد شفیع، سید سھابہ، شیخ برخوردار حسینی، خلیفہ قلندر، سید کبیر، سید میران، سید عنایت اللہ، مخدوم طالب اللہ، دطایہ مجذوب، پیر لاکھا، پیر شیخ عالی، شیخ محمد واصل، شیخ ابن شاہ، سید فیروز، شیخ فاضل شاہ، شیخ شہر اللہ، درویش بدین، مخدوم نورنگ سومرہ، مخدوم عبدالحمید، مخدوم الیاس، مخدوم بایزید، مخدوم رحمت اللہ، شاہ ابوالقاسم، شیخ محمد یعقوب، شاہ نعمت اللہ، شاہ عبدالرحیم، ــ تتوی، میر میرزا جان، شیخ محمد ماہ، میر محمد کاظم، حافظ ابوالقاسم نقشبندی، سید عبداللہ، سید محمد ناصر، میاں عبدالباقی واعظ، میاں عبدالوالی، مخدوم میدنہ، میاں محمد نبیرہ، مخدوم آدم تتوی، میاں میر عزت اللہ، محمد زمان میاں، میاں گل محمد، مخدوم عبدالرحیم منگریہ، برہان فقیر، سید سلطان شاہ، درس بلال، درس عبدالرحیم، مخدوم عنایت اللہ بصیر واعظ، میر محمد عرف سید؟ میر علی اصغر، میر حیدرالدین ابوتراب کامل، شاہ عنایت صوفی، شاہ غلام محمد، سید جان شاہ رضوی، شاہ اسد اللہ، شاہ مسعود، شاہ عبداللطیف صوفی، شیخ عبدالواسع صوفی، سید

یاسین، شاہ عبدالرسول خدا نما، سید سعد اللہ سورتی، شاہ عبداللہ مرید شاہ کلیم، حافظ بہادر قادری، شاہ نور، مخدوم عبدالحمید، حاجی مخدوم محمد ہاشم، سیدیار محمد، مخدوم نعمت اللہ، تاج محمد کھلیدہ، درویش صابر، سید ہارون، درس اسحٰق منگریہ، میاں چھتہ، سید سعد اللہ شیخ، عبدالرحمٰن حقانی نصرپوری، شیخ ابوالحسن، میاں عبداللہ عرف موریہ، میاں عبدالقادر، میاں محمد حفیظ، خلیفہ شیخ زین العابدین، حاجی حافظ دریہ، میاں نور محمد، سید محمد، مخدوم محمد امین، مخدوم عبدالرؤف، مخدوم نعمت اللہ، مخدوم محمد یوسف، نہال شاہ مداری، مظفر شاہ، محب شاہ، شاہ عبداللطیف، شیخ ورو، میر لطف اللہ، عرف شاہ لدہ، سید حبیب شاہ، شاہ عبداللطیف، محمد عالم، مخدوم محمد معین، حاجی شاہ فقیر اللہ، سید پیر شاہ ولد سید صلاح الدین لکعلوی، شیخ مکھن، سید بال شاہ، سید محمد شجاع، سید محمد فاضل، شیخ محمد صابر، درس عبدالرحیم، سومار بٹارہ، ملا ابراہیم، ملا عثمان، درس عبدالکریم، محمد رضا، فخر الدین، میرزا غلام اولیا، سید امین محمد، میاں احمد عطائی، سید یونس، سید عبداللہ، درس چھتو، حبیب شاہ، سید قاسم سنیاسی، نور شاہ، میاں عبدالقدوس، الھڈنہ، حسین، چھتہ، چھٹو، لونگہ، بولہ، لایضدنہ، شاہ ابراہیم، شاہ حسین نیلپوش، شاہ لطف اللہ، درس امین ساند، میاں محکم الدین، سید محمود، مولوی خیر الدین، شاہ ولی اللہ واعظ، الیاس فقیر، شیخ عمر افغان، شیخ غلام محمد۔

ان بزرگوں کے بعد ان مشاہیر کا تذکرہ ہے جن کا زمانہ مصنف کو معلوم نہ ہو سکا۔

یہ کتاب بڑے سائز کی ایک خوبصورت جلد میں ہے، اس کی ابتدا میں "تحفۃ الکرام" (جلد اوّل ورق ۱ سے شروع ہو کر ۱۸۵ پر اور جلد دوم ورق ۱۸۶ سے شروع ہو کر ۲۵۳ پر ختم ہوتی ہے، جلد سوم ورق ۲۵۴ سے شروع ہو کر ۴۳۸ پر ختم ہوتی ہے)۔ اس کے بعد "معیار سالکانِ طریقت" ہے (ورق ۴۳۹ سے شروع ہو کر ۴۴۷ پر ختم ہوتی ہے)۔ آخر میں "مقالات الشعرا" ہے (جو ورق ۴۴۸ سے شروع ہو کر ۵۵۰ پر ختم ہوتی ہے)۔ یہ نسخہ میر مراد علی خان حاکم سندھ (۱۲۴۴ھ۔ ۱۲۴۹ھ) کے لیے لکھا گیا۔ کاتب کا نام علی حسین ہے، کتاب کی ۱۲۴۵ھ میں کتابت ہوئی اور کسی انگریز نے ۱۱، اکتوبر ۱۸۵۶ء کو خرید کر برٹش میوزیم کو دی۔ بہترین نستعلیق خط ہے اور طلائی کام سے آراستہ ہے، میرے پاس اس پوری کتاب کی میکرو فلم ہے۔ برٹش میوزیم کا نمبر ۲۱،۵۸۹۔ ADD ہے۔ (۱۹)

(۲۹) شجرۂ اہلِ بیت : میر علی شیر قانع ٹھٹوی متوفی ۱۲۰۳ھ (تصنیف ۱۲۰۲ھ)۔

یہ کتاب میر صاحب نے سندھ کے سادات کے حالات اور انساب پر ۱۲۰۲ھ میں لکھی۔ کتاب کے کسی نسخہ کا اب تک سراغ نہیں ملا، کتاب کا پورا نام "شجرۂ اہل بیت سندھ" ہے جو تاریخی نام ہے۔

(۳۰) فتح نامہ : مصنف میر عظیم الدین ٹھٹوی، بن سید یار محمد، بن سید عزت اللہ (المتوفی ۱۱۶۱ھ) بن محمد سعید بن محمد مقیم ظہیر الدین جادم ثانی شکر الٰہی (تصنیف ۱۲۰۹ھ)۔

یہ شاہنامہ کی طرز پر مثنوی ہے جس میں کلہوڑوں کے زوال تالپور اور کلہوڑوں کی رزم و پیکار اور تالپوروں کے فتوحات کا ذکر ہے، میر فتح علی خان فاتح سندھ و حاکم اول تالپوری (۱۱۹۷۔ ۱۲۱۷ھ) کے نام پر معنون ہے۔ مصنف میر فتح علی خان ہی کے دربار سے وابستہ تھا، یہ پہلی تاریخ ہے جو تالپوری عہد میں تصنیف ہوئی۔ ڈاکٹر برنز نے لکھا ہے کہ یہ کتاب اس دور میں بے حد مقبول تھی اور اس کے اشعار لوگوں کے زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اسی مصنف کا ایک دیوان اور ایک مثنوی ہیر رانجھا بھی ہے(۱۹)

کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں ایک اچھا نسخہ میرے پاس ہے، سندھ میں کئی اور نسخے بھی ملتے ہیں، پنجاب اور یورپ کے کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے محفوظ ہیں۔

(۳۱) مجمع البلغا : مصنف سید غلام علی مائل بن میر علی شیر قانع (تصنیف ۱۲۱۸ھ)۔

میر علی شیر قانع کے صاحبزادے نے سندھ کے شعرا کا تذکرہ لکھا ہے بے حد جامع اور مستند ہے، مسٹر ایلیٹ کے فائیلوں میں جو ٹھٹھہ کے کتب خانوں کی فہرست ہے اس میں اقتباس موجود ہے، کل اوراق ۶۳۹ فی صفحہ ۱۷ سطریں۔

اس میں ابتدائے عہد ارغون سے لے کر تالپوری عہد تک کے فارسی گو شعرا کو لیا گیا ہے، اس کے علاوہ جو بیرونی شعرا سندھ میں آئے ان کے حالات بھی دیے گئے ہیں۔ مقالات الشعرا میں میر صاحب کے زمانہ یعنی کلہوڑہ عہد تک کے شعرا ہیں۔ مجمع البلغا میں ان شعرا کو لیا گیا ہے جن کا ذکر مقالات میں نہیں آیا اور تالپوری عہد کے شعرا کا تذکرہ جو اس میں موجود ہے وہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔

(۳۲) انشاء عطارد : مصنف، منشی شیوک رام عطارد (متوفی قبل ۱۲۴۴ھ)۔

منشی عطارد فارسی کا اچھا غزل گو شاعر تھا، اصل ٹھٹھہ کا باشندہ اور محمد محسن ٹھٹوی کا شاگرد

تھا، میر علی شیر قانع سے خاص اخلاص ورابطہ تھا۔ ابتداء میں میاں غلام شاہ کے دربار سے وابستہ ہوا (۱۱۷۰ھ۔ ۱۱۸۶ھ)۔ اور بعد میں جب اس کا بیٹا محمد سرفراز خان تخت نشین ہوا تو اس کا مشیر خاص ہو گیا۔

دیوان اور مثنوی ہیر رانجھہ کے علاوہ ان کے مکاتیب کا یہ مجموعہ سندھ کی تاریخ کے لیے بیش بہا ماخذ ہے، کتاب ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، اسلوب نگارش میں تکلف زیادہ ہے، شیرینی اور دلآویزی کم۔ میاں غلام شاہ (۱۱۷۰ھ۔ ۱۱۸۶ھ) میاں سرفراز (۱۱۸۶ھ۔ ۱۱۸۹ھ) اور میر بجار (شہید ۱۱۹۴ھ) کے سلسلہ میں کئی خطوط قیمتی معلومات سے پر ہیں، عطارد کا انتقال میر کرم علی خان تالپور کے دور (۱۲۲۷۔ ۱۲۴۴ھ) میں ہوا۔ کتاب کا ایک نہایت ہی بدخط نسخہ میرے پاس موجود ہے۔

(۴۳) تواریخ عباسیان : مصنف نامعلوم (تصنیف ۱۲۲۶ھ قبل)۔

مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا، اس کتاب کا مسٹر اسٹوری نے ذکر کیا ہے، انڈیا آفس میں ایک نسخہ موجود ہے، ابتدائی ورق گم ہے اس لیے مصنف کا نام غائب ہے، اس میں ۱۲۲۶ھ تک کے حالات ہیں، یعنی میاں محمد علی خان بن میاں محمد عارف خان بن میاں عبدالنبی کے سال وفات (۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء) تک کے حالات ملتے ہیں۔ غالباً مصنف نے کلہوڑہ خاندان کے آخری حکمران میاں عبدالنبی (۱۱۹۸ھ) کے پوتے میاں محمد علی خان کی فرمائش پر یہ کتاب تصنیف کی ہے، انڈیا آفس کے نسخہ کا نمبر D.P.۷۵۵ ہے۔

(۴۴) کلہوڑوں کے حالات : مصنف مظہر علی (تصنیف سال نامعلوم)۔

اس تاریخ کا ذکر بھی مسٹر C.A.Story نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کے مخطوطہ کا کہیں پتہ نہیں چلا، البتہ فارسی سے انگریزی میں اس کا ترجمہ Cap.Pagan نے کیا ہے جو کلکتہ میگزین کے (۱۸۳۱ء) پرچہ میں شائع ہوا ہے (میگزین کے صفحات ۲۷۲ تا ۲۸۸)۔

(۴۵) فتح نامہ : مصنف، معزالدولہ، معین الملک، فیروز جنگ، میر صوبہ دار خان المتوفی ۱۲۶۲ھ بن میر فتح علی خان تالپور فاتح سندھ و حاکم اول (۱۱۹۸ھ۔ ۱۲۱۷ھ) (تصنیف ۱۲۵۴ھ)۔

میر صوبہ دار خان مصنف جدائی نامہ کی فارسی تاریخ ہے جو میر فتح علی خان کی سوانح اور

ابتدائی رزم آرائیوں کے حالات میں ہے، تالپوری عہد کی یہ مستند تاریخی دستاویز مصنف کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں تصنیف ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ میر محمد بخش خان تالپور (حیدر آباد) کے کتب خانہ میں ہے۔ میر صوبہ دار نے سیف الملوک کے نام سے ایک مثنوی اور ایک جدائی نامہ کے عنوان سے مثنوی لکھی، مکاتیب کا مجموعہ بھی مرتب کیا اور ایک دیوان بھی چھوڑا۔

(۳۶) جدائی نامہ : مصنف میر صوبہ دار خان تالپور (المتوفی ۱۲۶۲ھ)۔

برطانوی تسلط کے بعد دوسرے تالپور افراد حکومت کے ساتھ میر صاحب بھی گرفتار ہو کر کلکتہ گئے "جدائی نامہ" اس غریب الوطنی کے دور کی یادگار ہے جس میں جلاوطنی، حکومت کے جانے اور اس کے بعد جو مصائب نازل ہوئے ہیں اس کے پورے واقعات اس مثنوی میں دیے گئے ہیں۔ کتاب کا ایک نسخہ میر علی احمد خان صاحب تالپور کے کتب خانہ میں ہے۔

(۳۷) مکاتیبِ میر صوبہ دار خان : مصنف میر صوبہ دار خان تالپور (متوفی ۱۲۶۲ھ)۔

یہ ان مکاتیب کا مجموعہ ہے جو میر صاحب نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھے ہیں۔ تالپوری عہد اور برطانوی تسلط کی تاریخ میں یہ مکاتیب بہت ہی کار آمد ہیں، اس کا ایک نسخہ میر علی بخش خان صاحب مرحوم (متوفی ۱۳۷۲ھ) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۳۸) فہرست تاریخ سندھ : مصنف محمد حسین قادری السیوستانی۔

یہ ۲۴ صفحہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں سندھ کے حکمرانوں کے نام سلسلہ وار دیے گئے ہیں، ایک ایک دو دو سطروں میں ان کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں، اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے جو ۱۲۴۷ھ کا مکتوبہ ہے، ہر صفحہ میں ۱۳ سطریں ہیں، نیز تاریخ معصومی کا جو مخطوطہ میرے پاس ہے اس کے آخر میں بھی بطور ضمیمہ یہ رسالہ شامل ہے، برٹش میوزیم میں معصومی کا جو نسخہ (O.R. ۱۷۸۸) ہے اس میں بھی یہ رسالہ موجود ہے اور اس میں ۹۱۹ھ سے ۱۳۰۹ھ تک کے حالات ہیں۔

(۳۹) تاریخ تازہ نوائے : مصنف مرزا عطا محمد شکار پوری۔

مصنف شکار پور سندھ کا باشندہ تھا، فارسی میں یہ برطانوی عہد کی تاریخ لکھی ہے، شاہ

شجاع الملک کے حالات نہایت ہی تفصیل سے دیے ہیں، اس کا ایک نسخہ پیر علی محمد راشدی کے پاس ہے، ایک نسخہ ڈاکٹر داؤد پوتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے (۲۰)۔

(۴۰) خزائن تاریخ: مصنف مرزا عطا محمد شکارپوری۔

تاریخ تازہ نوائے کے مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں مسٹر چارلس نیپیر کے اس حملہ کا ذکر ہے جو اس نے ۱۲۶۱ھ میں بلوچوں کے خلاف کیا تھا۔ اس کے اقتباسات برٹش میوزیم کے مجموعہ (O.R۱۹۸۱) میں شامل ہیں۔

(۴۱) نظارۃ السندھ: مترجم بشن نرائن (تصنیف ۱۸۵۸ء)۔

یہ انگریزی کتاب The Personal observations on Sindh, By T.Postans London, 1843 کا فارسی ترجمہ ہے۔ مترجم نے ۱۸۵۸ء تک کے حالات اپنی طرف سے بڑھائے ہیں، اس کا ایک مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ۱۸۶۔ ۳۱۷ پر موجود ہے، یہ نسخہ ۱۸۵۹ء کا کتابت شدہ ہے۔

(۴۲) فریئر نامہ: مصنف میر یار محمد خان بن میر مراد علی خان تالپور (تصنیف ۱۲۷۹ھ)۔

یہ تاریخ میر یار محمد خان کی تصنیف ہے، خود مصنف بھی تالپوروں کے آخری چویاری کا ایک رکن تھا، برطانوی تسلط (۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء) کے وقت گرفتار ہو کر کلکتہ گیا، میر صاحب نے ہزاری باغ میں جا کر قیام کیا۔ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء میں ان کو واپس وطن آنے کی اجازت ملی، رجب ۱۲۷۲ھ (فروری۔ مارچ ۱۸۵۶ء) میں حیدر آباد واپس آگئے اور یہیں انتقال کیا (۲۲ رمضان ۱۲۸۷ھ)۔

مصنف نے لکھا ہے کہ "۱۲ جمادی الآخر ۱۲۷۹ھ (۵ دسمبر ۱۸۶۳ء) کو سر بارٹل فریئر کمشنر سندھ میری کوٹھی پر تشریف فرما ہوئے اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تالپوری عہد کی تاریخ لکھوں، کیونکہ میرے بعد کوئی ایسا نہیں جو ان چشم دید حالات کو قلم بند کر سکے۔

میر صاحب نے اس کتاب کو تین مقالوں میں تقسیم کیا ہے۔

مقالۂ اوّل۔ کلہوڑوں کے عہدِ حکومت کے متعلق

مقالہ دوم۔ تالپوری دور پر

مقالہ سوم۔ سرکار انگلشیہ کا تسلط

کتاب ۲۶۹ صفحات پر ہے۔ ابتدائی حصہ کی بنیاد میر عظیم الدین کے فتح نامہ پر رکھی ہے اور باقی دو مقالوں کو اپنے چشم دید واقعات کی بنا پر لکھا ہے، یہ تاریخ کلہوڑوں اور تالپوری عہد کے سلسلے میں نہایت قیمتی ہے، کیونکہ کلہوڑوں کے رقیب خاندان کا نقطۂ نظر اس میں موجود ہے، علاوہ ازیں تالپوری عہد کے چشم دید واقعات اس میں آگئے ہیں اور حکمران خاندان کے ایک جلیل القدر حاکم کی مرتب کردہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر داؤد پوتہ کے پاس ہے۔

(۴۳) تاریخ سندھ : مصنف، منشی ٹوپن مل۔

یہ تاریخ منشی صاحب نے نواب فتح محمد خان خلف نواب ولی محمد خان لغاری (المتوفی ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء) کی فرمائش پر لکھی، نواب ولی محمد خان لغاری، تالپوری عہد کا بہادر جرنیل اور بلند مرتبہ امیر تھا۔

یہ ۱۵۲ صفحات پر تاریخ سندھ کا ایک سرسری خاکہ ہے لیکن اس میں بعض واقعات ایسے بھی آگئے ہیں جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں ہوتے، کتاب میں ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تک کے واقعات ہیں اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔

حصہ اوّل۔ ورق ۲۵ تاریخ مغول از تیمور تا ۱۲۱۹ھ

حصہ دوم۔ ورق ۲۵۔ ۴۷ تاریخ سندھ شروع سے لے کر برطانوی قبضہ تک ۱۲۵۹ھ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، جس کی کتابت کی تاریخ ۲۶ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ ہے۔

(۴۴) تکملۂ مقالات الشعرا : مصنف محمد ابراہیم خلیل صدیقی نقشبندی ٹھٹوی۔ یہ مقالات الشعرا مصنفہ میر علی شیر قانع کا تکملہ ہے، اس میں مصنف نے زیادہ تر تالپوری دور کے فارسی شعرا کو لیا ہے اور اپنے دور یعنی برطانوی دور کے شعرا کے حالات بھی دیے ہیں۔ ضمناً تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، سندھ کے ادبی تاریخ کا یہ اہم ماخذ ہے۔

اس کی ایک کاپی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے اور ایک کاپی جناب خالدی صاحب ٹھٹوی کے پاس ہے۔ (۴۱)

(۴۵) لب تاریخ سندھ : مصنف خانبہادر خداداد خان بکھری (تصنیف ۱۳۱۸ھ)۔

فارسی زبان میں سندھ پر یہ آخری کتاب ہے جو ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) تک کے حالات پر

مشتمل ہے۔ مصنف سرکاری ملازم اور معزز جاگیر دار تھا، "لب تاریخ سندھ" میں بعض واقعات ایسے آئے ہیں کہ کسی اور تاریخ میں نہیں ملتے، خاص طور پر کلہوڑہ تالپوری اور برطانوی عہد کے واقعات مستند ہیں۔ مصنف کو سندھ کی تاریخ سے بہت ہی شغف تھا، انہوں نے سندھ کے کتبات کو دو جلدوں میں مرتب کیا تھا، افسوس ہے کہ یہ دونوں جلدیں ضائع ہو گئیں اور آج بہت سے کتبے جو اس کتاب میں نقل کیے تھے، موجود نہیں۔

لب تاریخ سندھ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں امر تسر سے شائع ہوئی ہے لیکن آج یہ مطبوعہ کتاب بھی نایاب ہو گئی ہے (۲۴)

(۴۶) جام جہان نما: مصنف مخدوم محمد عاقل کھڑوی (خیر پور اسٹیٹ)۔ متوفی ۱۳۳۷ھ۔

یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے، غالباً آخری جلد تاریخ سندھ پر ہے، مصنف کا ایک بہت عظیم المرتبت بزرگ خانوادہ سے تعلق تھا خود بھی بہت بڑا عالم دین تھا، کلہوڑہ اور تالپوری عہد میں یہ خاندان مذہبی پیشوائی کرتا رہا۔ مخدوم محمد عاقل نے اس تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات جمع کیے ہیں جو کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ تاریخی واقعات اور سیاسی حالات کے علاوہ اس تاریخ سے دینی، مذہبی اور روحانی تحریکات کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

کتاب کا فقط ایک ہی نسخہ ہے جو اس وقت اسی خانوادہ کے سجادہ نشین کے پاس بالکل محفوظ "یوں ہے کہ وہ بزرگ کسی کو دکھانا تو کجا بلکہ مخطوطہ کو ہوا تک لگنے نہیں دیتے۔"

(۴۷) تذکرہ مخادیم کھڑا: مصنف مخدوم اللہ بخش بن مخدوم محمد عاقل کھڑوی۔

یہ تاریخ جام جہان نما کے مصنف کے پورے خاندان کا تذکرہ ہے جو اس کے بیٹے مخدوم اللہ بخش نے لکھا ہے، کلہوڑہ عہد اور تالپوری عہد کے تاریخ پر بعض قیمتی معلومات اس سے حاصل ہوتی ہیں۔

کتاب کا اصل نام "فوز الاخلاف من فیض الاسلاف" ہے۔ ۳۲۳ فل اسکیپ صفحات پر لکھی ہوئی ہے، میرے پاس جو نسخہ ہے وہ میرے بزرگ بھائی پیر علی محمد راشدی کا نقل کردہ ہے۔

یہ سب کتابیں وہ ہیں جو اب تک دستیاب ہو چکی ہیں یا معلوم ہو چکی ہیں، سندھ کے ذاتی کتب خانوں کا اگر جائزہ لیا جائے۔ پرانے خاندانوں کے پاس جو دستاویزات اور نوادرات موجود

ہیں ان کو دیکھا جائے تو ممکن ہے سندھ کی تاریخ پر ہمیں اور بھی زیادہ مواد مل جائے۔

سندھ کی سرحد کسی زمانہ میں ملتان تک رہی ہے اور اس طرف سے بلوچستان کا بھی بہت سا علاقہ سندھ میں شامل تھا، اُچ اور بھاولپور بھی سندھ کے حصے تھے، بھاولپور کا حکمران خاندان حقیقت میں وہی داؤد پوتہ ہیں جو کلہوڑہ عہد میں لکھی اور شکارپور کے زمیندار تھے جن کو میاں نور محمد کے زمانہ میں سندھ سے نکالا گیا۔ بھاول خان اول نے یہاں سے نکل کر بھاولپور کو جاکر آباد کیا اور ایک جداگانہ ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی ابتدائی تاریخ کو تاریخ سندھ کا ایک ضمیمہ سمجھنا چاہیے، اسی بنا پر ذیل میں بھاولپور کی ان تاریخوں کا ذکر کرتا ہوں جو ابتدائی دور میں لکھی گئی ہیں اور سندھ کے تاریخ کا بہت بڑا حصہ ان میں محفوظ ہے۔

(۴۸) مرات دولت عباسیہ : مصنف لالہ دولت رائے بن لالہ عزت رائے۔

لالہ دولت رائے کے والد نواب محمد مبارک خان کے ملازم تھے، بھاول خان ثانی کے زمانہ یعنی (۱۱۸۶۔ ۱۲۲۴ھ) میں مصنف دربار سے وابستہ ہوا، کچھ عرصہ کے بعد ملازمت چھوڑ کر ملتان میں مقیم ہو گیا، میر کرم علی خان اور میر مراد علی خان کے دور میں حیدر آباد سندھ آکر ان کی ملازمت اختیار کی، پھر دوبارہ بھاولپور جاکر محمد صادق خان (۱۲۲۴۔ ۱۲۴۱ھ) کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور ۱۲۴۶ھ میں وہیں انتقال کیا۔

یہ تاریخ مصنف نے ۱۲۲۴ھ میں شروع کی اور ۱۲۲۷ھ میں ختم کی، کلہوڑہ دور اور تالپوری عہد پر اس میں مفصل حالات ملتے ہیں۔ اگرچہ اس کے واقعات تاریخی حیثیت سے تمام تر مستند نہیں ہیں تاہم یہ تاریخ کثیر معلومات کی حامل ہے۔

۱۸۵۱ء میں یہ کتاب ۴۷۶ صفحات پر دہلی سے شائع ہوئی تھی مگر آج کل بہت ہی نایاب ہے۔

(۴۹) تاریخ بھاول خان : مصنف وڈیرو جان محمد خان معرفانی۔

یہ بھاول خان (۱۱۸۶۔ ۱۲۲۴ھ) کی سوانح ہے، سندھ کے حالات اس میں ملتے ہیں۔

(۵۰) مقصود اعظم : مصنف محمد اعظم اسدی ہاشمی۔

یہ محمد صادق خان ولیِ بھاولپور کی سوانح ہے، لیکن ضمناً اور خاندانی واقعات میں سندھ کے حالات آگئے ہیں، برٹش میوزیم میں اس کا ایک مخطوطہ O.R.۵۸۸۵ نمبر پر ہے۔

(۵۱)خلاصۂ تواریخ عباسیہ : مصنف نامعلوم۔ یہ تاریخ ایک مقدمہ اور تین اقسام پر مشتمل ہے۔

قسم اوّل۔ سلطان احمد ثانی سے مبارک خان کی وفات تک

قسم دوم۔ محمد بہاول خان ثانی کے حالات میں(۱۱۸۶۔ ۱۲۲۴ھ)

قسم سوم۔ محمد صادق خان کے حالات میں(۱۲۲۴۔۱۲۴۱ھ)

(۵۲)اقبال نامۂ سعادت آیات : مصنف محمد اعظم بن مولوی محمد صالح اسدی الہاشمی فاروقی۔

مصنف صادق محمد خان کے دوسرے سال(۲۶۔۱۲۲۵ھ) میں بہاولپور سے بطور سفیر کے تالپوروں کے دربار میں حیدر آباد آیا، نواب کو اُس وقت تالپوروں کی طرف سے ملتان اور بہاولپور پر حملہ کا خطرہ تھا۔

اس تاریخ میں ۱۲۳۰ھ سے لے کر ۱۲۴۱ھ تک کے مفصل حالات ہیں سندھ کے حالات مصنف نے ضمناً بیان کیے ہیں۔

(۵۳)تاریخ بہاولپور : مبارز الدولہ پیر ابراہیم خویشگی قصوری۔

مصنف ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا ۱۸۱۷ء میں رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم ہوا، وہاں زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکا، وہاں سے طب کی تعلیم حاصل کرنے دہلی چلا گیا، ۱۸۴۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور بطور ایجنٹ کے بہاولپور آیا، پہلی سکھ لڑائی میں بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے، خلعت اور خطاب خان بہادری اس صلہ میں ملا، ۱۸۴۸ء میں بہاولپور سے فوج لے کر مسٹر ہربرٹ ایڈورڈ کی امداد میں ملتان پہنچا، مسٹر ایڈورڈ نے (A year on the panjab frontier 1848) میں ان کی بہت تعریف کی ہے۔ ۱۸۵۱ء میں لندن گیا لیکن ۱۸۵۲ء میں بیمار ہو کر واپس آگیا۔ بہاولپور پہنچنے پر اس کو مبارز الدولہ کا خطاب ملا اور اس نے ۱۸۵۶ میں انتقال کیا۔

کیپٹن کنگھم کی فرمائش پر پیر ابراہیم خویشگی نے یہ تاریخ مرتب کی۔ شہامت علی نے اسی تاریخ کا انگریزی ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۴۸ء میں لندن سے شائع ہوا، سندھ کی تاریخ پر اس میں مواد ملتا ہے۔

(۵۴) جواہر عباسیہ : محمد اعظم بن مولوی محمد صالح اسدی الہاشمی الفاروقی۔

یہ بہاول پور کی تاریخ ہے، ۱۸۰۹ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان لکھی گئی ہے، اس کا ماخذ مراۃ دولت عباسیہ ہے۔ کتاب ۱۷۴ صفحات پر مشتمل اور نایاب ہے، ایک نسخہ مولانا مہر کے پاس ہے۔

بلوچستان پر فارسی میں کم لکھا گیا ہے میری نظر سے صرف دو تاریخیں گزری ہیں جن میں بلوچستان کے ساتھ سندھ کا بھی ذکر ہے۔

(۵۵) کیچ نامہ : مصنف کمالان بن میر ہاشم گچکی (پنج کور) یہ کیچ مکران کی تاریخ ہے جس میں تالپوروں کے حالات اور برطانوی تسلط کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں (۱۸ اورق چھوٹے سائز نمبر O.R. ۱۶۲۰) پر ہے۔

اسی مصنف نے ایک اور کتاب بھی لفظ "بلوچستان" کے نام سے ۸ رجب ۱۲۹۰ھ کو لکھی ہے جس میں بلوچی الفاظ جمع کیے ہیں، کمالان کمال خان کا بگاڑ ہے یہ امیر ہاشم کا بیٹا تھا جو ملک دینار کے چوتھی پشت میں تھا اس کا قبضہ کیچ اور مکران پر تھا اور میر نصیر خان والیِ قلات کے ہاتھ سے مارا گیا۔

کمالان نے یہ تاریخ کرنل راس ROSS کی فرمائش پر لکھی اس تاریخ پر بمبئی جاگرافیکل سوسائٹی کی اٹھارویں جلد میں صفحہ ۶۱ پر ایک نوٹ ہے۔

(۵۶) تذکرہ سلاطین کیچ مکران : مصنف ملا حاجی۔

کیچ مکران کی تاریخ ہے جس میں سندھ کے واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس ۳۰۳ نمبر پر ہے۔

حواشی (از مرتب):

۱۔ چچ نامہ کا سندھی ترجمہ مخدوم امیر احمد نے کیا۔ یہ ترجمہ سندھی ادبی بورڈ نے سال ۱۹۵۴ء میں شایع کیا، جب کہ اردو ترجمہ اختر رضوی نے کیا، جس کو بھی اسی ادارے نے ۱۹۶۳ء میں شایع کیا۔ اس کتاب کا ایک جدید فارسی ایڈیشن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے تیار کر کے اسلام آباد سے ۱۹۸۳ء میں شایع کیا۔ یہ ایڈیشن ادارۂ تاریخ و ثقافت و تمدن اسلامی، اسلام آباد نے نشر کیا ہے۔ اس ایڈیشن کی تیاری میں "چچ نامہ" کا قدیم ترین نسخہ بڑا معاون بنا۔ یہ نسخہ ۱۰۶۱ھ کا کتابت شدہ ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

۲۔ سندھی ادبی بورڈ نے اس کتاب کا اردو ترجمہ (اختر رضوی) سال ۱۹۵۹ء میں چھاپ دیا ہے۔ جبکہ تاریخ معصومی کے ارغون ترخان ابواب کا ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی نے مفید حواشی کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ "ہسٹری آف دی ارغونس اینڈ ترخانس آف سندھ" کے نام سے سندھ یونیورسٹی / سندھولاجی نے ۱۹۷۲ء میں شایع کیا ہے۔ تاریخ معصومی کا قدیم ترین نسخہ جامعہ پنجاب میں موجود ہے۔ اس نسخے کے کاتب حبیب اللہ کوریجو ہیں۔ یہ نسخہ کتاب مکمل ہونے کے صرف آٹھ سال بعد ۱۰۱۷ھ میں تیار ہوا۔ اب تک اس نسخے کو علمی دنیا نے استعمال نہیں کیا۔

۳۔ یہ کتاب بہ اہتمام ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۸۰ء میں شایع کی ہے۔ مثنوی "چنیسر نامہ" بسعی و اہتمام سید حسام الدین راشدی ۱۹۵۶ء میں شایع ہو چکی ہے۔ ناشر سندھی ادبی بورڈ۔

۴۔ تاریخ طاہری، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سندھی ادبی بورڈ نے سال ۱۹۶۴ء میں شایع کر دی ہے۔

۵۔ یہ کتاب بہ اہتمام سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۲ء میں شایع کی ہے۔ جبکہ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ایم سلیم اختر نے "سندھ انڈر دی مغلز" کے نام سے، اسلام آباد کے تاریخ و ثقافت و تمدن کے مرکز اور کلچر ڈپارٹمنٹ حکومت سندھ کے تعاون سے 1990ء میں شایع کیا ہے۔

۶۔ سندھی ادبی بورڈ نے سال ۱۹۶۵ء میں "ترخان نامہ" نشر کر دیا ہے۔ اس ایڈیشن کے محقق سید حسام الدین راشدی مرحوم ہیں۔

۷۔ منشات نمکین، ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ حال میں اس کے ایک اور نسخے کا پتہ چلا ہے۔ یہ نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لٹن ذخیرہ میں نمبر 3/26/,3/27 پر موجود ہے (مومن محی الدین "دی چانسیلری اینڈ پرشین اپسٹولوگرافی"، ص ۱۰۳، حاشیہ ۱، کلکتہ ۱۹۷۱ء)۔

۸۔ ڈاکٹر سید معین الحق نے اس تذکرے کو ایڈٹ کیا اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کی طرف سے تین جلدوں میں ترتیب وار سال ۱۹۶۱ء سال ۱۹۷۰ء اور سال ۱۹۷۴ء میں شایع ہوا۔

۹۔ یہ تذکرہ راشدی صاحب نے ایڈٹ کیا اور سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۷ء میں شایع کیا۔

۱۰۔ معلومات الآفاق، ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۳ء میں مطبع نولکشور سے چھپی۔ رشحات الفنون کے متعدد نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

۱۱۔ یہ کتاب سید حسام الدین راشدی نے ایڈٹ کی اور سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۴ء میں طبع کی ہے۔

۱۲۔ مکلی نامہ، سال ۱۹۶۷ء میں سندھی ادبی بورڈ نے شایع کیا ہے۔ یہ کتاب سید حسام الدین راشدی نے

بڑی محنت و محبت سے ایڈٹ کی اور اس پر مفصل حواشی لکھے۔

۱۳۔ مقالات الشعراء بھی سید حسام الدین راشدی نے مرتب کیا اور سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

۱۴۔ تحفۃ الکرام کا سندھی ترجمہ (مخدوم امیر احمد) سال ۱۹۵۷ء میں اور اردو ترجمہ (اختر رضوی) سال ۱۹۵۹ء میں سندھی ادبی بورڈ نے چھاپ دیا ہے۔ سید حسام الدین راشدی نے بڑی کاوش کے ساتھ "تحفۃ الکرام" کے فارسی ایڈیشن کے تاریخ سندھ کے حصے کو ایڈٹ کیا۔ یہ ایڈیشن سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے۔

۱۵۔ بدر عالم درانی کی سعی سے "تحفۃ الطاہرین" سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۶ء میں چھاپ دیا ہے۔

۱۶۔ شاہ فقیر اللہ علوی کے خطوں کا ایک منتخب "گزیدہ ئی از مکتوبات" وزارت تعلیم کابل (افغانستان) نے سال ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے۔ یہ انتخاب عبداللہ سمندر غوریانی اور عبدالحئ حبیبی کی محنت سے مرتب ہوا ہے۔

۱۷۔ اس کتاب کے سندھ سے متعلق مواد کو بدر عالم درانی نے "تحفۃ الطاہرین" میں بطور ضمیمہ ۱۹۵۶ء میں چھاپ دیا ہے۔

۱۸۔ میر علی شیر قانع کا یہ نادر تذکرہ ڈاکٹر سید خضر نوشاہی نے ایڈٹ کیا ہے اور ادارۂ معارف نوشاہیہ، ساہن پال شریف (پنجاب) نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔

۱۹۔ فتح نامہ، بہ اہتمام شیر محمد نظامانی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ دیوان عظیم، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے مرتب کیا اور ۱۹۶۲ء میں طبع ہوا۔ جب کہ مثنوی "ہیر ورانجھا" مثنویات کی ایک جلد میں (ہیر ورانجھا) حفیظ ہوشیار پوری نے ۱۹۵۷ء میں مرتب کیا۔ عظیم کی یہ کتابیں سندھی ادبی بورڈ نے شائع کی ہیں۔

۲۰۔ یہ تاریخ "تازہ نوای معارک" کے نام سے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۹ء میں شائع کی ہے۔ اس کو عبدالحئ حبیبی افغانی نے مفید حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔ ایک اور ایڈیشن انجمن تاریخ افغانستان کی طرف سے "نوای معارک" نام سے ۱۳۳۱ش / ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کا مدار ایک خطی نسخے پر ہے جو کہ موزۂ کابل میں موجود ہے۔ یہ ایڈیشن ڈاکٹر محمد ادریس سومرو کے پاس قاسمیہ لائبریری کنڈیارو میں ہے۔

۲۱۔ بہ اہتمام سید حسام الدین راشدی، یہ تذکرہ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۸ء میں چھاپ دیا ہے۔

۲۲۔ لب تاریخ سندھ، کا جدید فارسی ایڈیشن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے مرتب کیا اور سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۵۹ء میں طبع کیا۔ اس کا روسی ترجمہ محمدی صافولوف نے ماسکو سے شائع کیا ہے۔

غالب اور خادم

منشی محمدی متخلص بہ خادم مہاراجہ بردوان کے استاد تھے۔ وطن بردوان ہی تھا، یا محض ملازمت کی خاطر وہاں قیام پذیر تھے، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال مہاراجہ کی استادی اور معاش، بردوان میں مستقل اقامت کا سبب رہی ا؎

دیوان: حضرت خادم فارسی کے شاعر تھے اور تقریباً تمام اصناف سخن پر ان کا ضخیم دیوان حاوی ہے، جو کہ اس کے بیٹے نجم الحق نے مرتب کر کے سال ۱۳۰۲ھ میں کلکتہ سے شائع کیا۔ سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

دیوان خادم

تصنیف

منشی محمدی صاحب المسمٰی بہ خادم

۱۳۰۲ھ

حسب فرمایش جناب مصنف صاحب ممدوح بہ اہتمام جناب ناخدا صاحب باخدا جناب محمد عمر صاحب ناخدا در مطبع قادریہ واقع کلکتہ۔ میری نظر سے کئی سال ہوئے پنجاب یونیورسٹی کا مملوکہ نسخہ گزرا تھا، جس کا نمبر P.Vi-295 ہے۔ اس زمانے میں کچھ اقتباس لیے تھے جو میرے اس مختصر مضمون کا اساس ہیں۔

دیوان، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، حضرت خادم کے بیٹے نے اپنے باپ کی اجازت سے ترتیب دے کر شائع کیا تھا۔ دیباچے میں لکھا ہے:

"از حقیر سراپا تقصیر نجم الحق، بر ناظرینان والا فطرت، واضح باد کہ غزلہائی حضرت والد امجدم، خوش نویس منشی محمدی کہ متخلص بہ خادم، در جزدان انتشار افتادہ بود۔ دردل آمد کہ اگر اینہا را یکجا کردہ، دیوانے ترتیب دادہ شود، تا خوانندگان را فوائدے دست دھد۔"

اس مفید خیال کے آتے ہی نجم الحق نے اپنے والد سے اجازت طلب کی:

"روزے بخدمت شاں عرض کردم: اگر بفرمایند تا غزلہائی جناب را کہ متفرق افتادہ است (ص ۴) یک جا کردہ، دیوانے باترتیب طبع کنانم کہ موجب اشتہار گردد۔"

منشی محمدی خادم نے حسب دستور پہلے تو کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے دو شعر پڑھے، جن میں "طائر مضمون" کو "محتاج شہپر" ہونے سے بچانا چاہا:

"من نخواہم شہرت حسن کلام، از مطبعی طائر مضمون کجا، محتاج شہپر می شود؟ نباشد شعر من مشہور تاجاں در بدن باشد کہ بعداز مرگ آھو، نافہ کشتن می دھد بورا۔

لیکن آخر میں فرمایا کہ:

"خیر! اگر ارادہ، تصمیم می دارید، مضائقہ نیست۔ اللہ التوفیق بھذالمدام"

اس کے بعد ہی نجم الحق نے "کمر ہمت" کس کر باندھی اور دیوان کو مع قصائد وغیرہ ترتیب دے کر اس زمانے کے مشہور ناشر، محمد عمر ناخدا کے مطبع میں چھپوا کر، "پڑھنے والوں کے لیے استفادہ" کا سامان مہیا کیا تاکہ بعداز مطالعہ "ان کے اپنے حق میں دعائے خیر" کی جائے۔

حالات: نجم الحق نے اپنے والد کا مختصر شرح حال جو دیوان کے دیباچے میں دیا ہے، وہ بس اتنا ہے کہ: مہاراجہ بردوان، مہاراجہ مہتاب چند بہادر ان کے شاگرد تھے اور ان کے ہاں اُن کو بہت ہی تعظیم اور تکریم حاصل تھی۔ خوش نویس تھے، خاص طور پر خط نستعلیق میں مشاق تھے، بلکہ خوش نویسی ہی کی نسبت سے مشہور بھی تھے۔

جس زمانے میں (۱۳۰۲ھ) ان کا دیوان شائع ہو رہا تھا، اس وقت وہ شعر و سخن کی طرف کم مائل تھے۔ دوست و احباب کا اصرار ہوتا تو کبھی کبھار کچھ کہہ لیتے ورنہ چند گھنٹے بردوان میں مہاراجہ کے قائم کردہ سرکاری اسکول میں طلبہ کو درس دے کر باقی وقت گھر میں بسر کرتے تھے۔ اور گھر میں وقت گزاری کے لیے زیادہ تر خط نستعلیق کی مشق میں

اپنے آپ کو مصروف رکھا کرتے تھے۔

نجم الحق کی اپنی طبیعت بھی شعر کی طرف مائل تھی لیکن ان کے والد منع کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ :

"این کم بخت فن، مردم رااز دیگر امورات باز داشتہ متوجہ بخود می دارد"

اور بجائے شعر گوئی کے وہ چاہتے تھے کہ ان کا لڑکا خط نستعلیق کی مشق کیا کرے :

"اگر توانید بمشق حروف نستعلیق پر دازید"

نجم الحق انجینئر ہو گلی کے آفس میں ملازم تھے جہاں ان کو "سر کھجانے کی بھی فرصت" نہیں ملتی تھی۔ اس لیے وہ پورے طور پر تو اس طرف توجہ نہ دے سکے، لیکن پھر بھی والد اور دوستوں کے کہنے سننے کی وجہ سے، اس شغل کے لیے کچھ وقت نکال ہی لیا کرتے تھے۔

پٹیالہ کا سفر : مہاراجہ مہتاب چند بہادر نے ایک مرتبہ مہاراجہ پٹیالہ کی شادی کی دعوت پر، اپنی نیابت میں ضروری اسباب اور سپاہی ساتھ دے کر منشی محمدی خادم کو روانہ کیا۔ نجم الحق بھی ان کے ہم رکاب تھے۔

نجم الحق لکھتے ہیں کہ :پورے پچیس دن وہاں قیام کرتے ہوئے گزر گئے لیکن مہاراجہ پٹیالہ از راہ محبت واپسی کو آج کل پر ٹالتے رہتے تھے۔ بہر حال "بہزار منت" آخر جب اجازت ملی، تو مہاراج بہادر نے تیس روپیہ یومیہ کے حساب سے نقد رقم اور "خلعت نوپارچہ گراں بہا معہ جیغۂ مرصع و سلک مروارید۔" نیز اس پر دو سو روپیہ دعوتانہ (ضیافت خشک) رکھ کر، منشی صاحب کو رخصت کیا۔ چلتے ہوئے نجم الحق کو بھی ایک دوشالہ عنایت کیا۔

واپسی اور دہلی میں قیام : دونوں باپ بیٹے پٹیالہ سے چلے تو راستے میں علی گڑھ ٹھہر گئے۔ آب و ہوا پسند آئی اس لیے ایک ہفتے تک وہاں قیام کیا۔ وہاں سے کوچ کیا تو راستے میں منزلیں کرتے ہوئے دہلی پہنچے، جہاں ایک ماہ تک قیام پذیر رہے۔

مرزا غالب سے ملاقاتیں : نجم الحق نے لکھا ہے کہ دہلی میں زیادہ تر، میرزا نوشاہ (نوشہ) نواب اسداللہ خاں سے ملاقاتیں رہیں اور راہ و رسم محبت اور اخلاص اس حد تک بڑھا کہ جب منشی محمدی خادم کو مرزا غالب دور سے آتے ہوئے دیکھتے تو استقبال کے لیے

کھڑے ہو جاتے اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بیا بیا کہ! براہ تو چشم وا دارم

اور جب رخصت ہوتے تو ہمیشہ اظہارِ محبت فرما کر کہتے کہ:

"محبتِ صاحب، در دلم جا کردہ است"

مرزا صاحب ایک مرتبہ دیوان خادم ہاتھ میں لے کر پڑھنے لگے۔ جب اس شعر پر پہنچے:

بہر تعظیم، خیالش کہ چو آمد، ز ادب
اشکم، از دیدہ بروں آمد و برخاک نشست

اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور باآواز بلند فرمایا:

بارک اللہ!

رخصت: نجم الحق نے لکھا ہے کہ ان کو وہ دن اور ساعت یاد ہے جب ان کے والد آخری بار مرزا سے وطن کی طرف واپسی کے لیے رخصت ہو رہے تھے اور مرزا صاحب نے آنکھوں میں آنسو لا کر یہ شعر پڑھا تھا:

وقت رخصت، بررخ احباب، نتوانست دید
چشم می پوشم ویاراں را وداعے می کنم

غالب سے مراسلت: خادم نے اپنے گھر پہنچنے کے ایک ماہ بعد، مرزا غالب کی خدمت میں خط لکھا اور ساتھ ہی ایک غزل بھیجی جس کا مطلع اور مقطع یہ تھا:

ہوائے، آں حریم جنت آسائے، کشد مارا
ز باد صبح می خواہیم، افزون تیزیٔ پا را
ہوائے دہلی و گلگشت باغ و سیر بازارش
چو خادم! یاد آید! بس کہ از جامی بردمارا

غالب کی تاریخ وفات: باپ کے حالات اور غالب کے ساتھ ان کے راہ و رسم کے متعلق، نجم الحق نے دیوان خادم کے دیباچے میں اتنا کچھ لکھا ہے۔ دیوان کے صفحہ ۲۴۳ پر غالب کی وفات پر خادم نے جو تاریخ کہی تھی وہ اس طرح مرقوم ہے:

یکتائے دہر، غالب جادو بیان ما

گوئے سخن بہ ملک سخن بود بادشاہ
روز دوشنبہ دوم ذیقعدہ از جہاں
درباغ خلد رفت، کہ در رحمت الٰہ
خادم زسال رحلت او، فکر چوں نمود
آمد ندا ز غیب کہ 'غالب' بمرد آہ!'

۱۲۸۵ھ

حواشی:

۱۔ نساخ نے سخن شعرا میں (ص ۱۴۶) فقط اتنا لکھا ہے کہ "خادم منشی محمدی راجہ بردوان کی سرکار میں متعلق ہیں، فارسی بیشتر کہتے ہیں:

اشک کوئی دم میں لب لاتا ہے منہ پر دل کی بات
طفل سے ممکن نہیں ہے ضبط کرنا راز کا"

ڈاکٹر عترت حسین زبیری

یہ سال ۱۹۵۸ء کی بات ہے، مارچ کی ۲ تاریخ تھی۔ ہمیں بھمبور جانا تھا۔ بھمبور کو تو اب غالباً سب ہی جانتے ہیں لیکن اُس وقت سوائے ایک مخصوص حلقے کے کسی کو اس کی طرف نہ توجہ تھی اور نہ خبر۔ آج اس کی کھدائی کا افتتاح ہونے والا تھا۔

کراچی سے صبح تقریباً ۸ بجے ہمارا قافلہ چلا۔ جناب ممتاز حسن صاحب فائنس سیکریٹری، مسٹر کوریل ڈائریکٹر محکمۂ آثارِ قدیمہ، یہ نیاز مند اور ایک جرمن خاتون ڈاکٹر انمیری شیمل، جو اب تو شاہ لطیف اور علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھنے کی وجہ سے پاکستان بھر میں بہت معروف و معزز ہیں، لیکن اُس وقت پہلی بار کراچی تشریف لائی تھیں۔ ہمارے قافلے میں ایک اور بھی معزز شخصیت شامل تھی۔ طویل قامت، سفید رنگ، شباہت شریفانہ اور خوبصورت، ڈاڑھی منڈھی ہوئی، مونچھیں چھوٹی، آنکھوں میں چمک، آواز نرم سنجیدہ اور باوقار۔ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے دوست نما، کشادہ دل اور مستانہ اداؤں کی حامل۔ سر پر ڈھیلی ڈھالی چھاتہ نما فلیٹ ہیٹ بڑے پائنچے والی کھلی کھلی پینٹ، فرغل نما کوٹ، لباس کی وضع قطع اور تراش و خراش سے قطعی بے نیاز۔ یہ تھے مرکزی حکومت کے تعلیمی مشیر ڈاکٹر عترت حسین زبیری۔

غالباً اُن سے میری ملاقات کا یہ پہلا دن تھا۔ بھمبور تک پہنچتے پہنچتے ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے اور جو کمی تھی وہ ممتاز حسن صاحب نے ایک دوسرے سے تعارف کراتے وقت اپنے دلکش اندازِ بیان سے پوری کر دی۔ بھمبور کی پہاڑی پر جب ہم نے قدم رکھا تو ہم دونوں دوست تھے۔ ایک دوسرے کے قریب آچکے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے دل میں گرمی محسوس

کر رہے تھے، اور باہمی ربط بڑھانے کے لیے اپنے اپنے دلوں میں ایک کشش محسوس کر رہے تھے۔

کھدائی کا افتتاح خود ممتاز حسن صاحب نے زمین پر پہلا پھاوڑہ چلا کر کیا۔ اس سے پہلے کہ اس قدیم تاریخی دفینے کے سینے میں شگاف کیا جائے ہم نے بڑے خلوص کے ساتھ دعا مانگی، یہ دعا بارگاہِ خداوندی میں عترت حسین زبیری نے پڑھی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"خلیفہ الواثق باللہ کا زمانہ کیا ہے؟"

"۲۲۷ھ سے ۲۳۲ تک!"

"اچھا تو آپ فوراً چلے آئیں!"

یہ ممتاز حسن صاحب کا فون تھا۔ اُن کی آواز اضطراری تھی جس سے میں نے یہ سمجھا کہ کوئی بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے۔

جب بھی کوئی اہم بات ہوتی، کوئی دلچسپ چیز دریافت طلب ہوتی، کوئی مخطوطہ ملتا، میوزیم کے لیے کوئی چیز خریدنے کے لیے سامنے آتی، تاریخی دستاویز مل جاتی، کسی بہت بڑے علمی کام کا پروگرام بنانے یا کسی علمی انجمن کا قیام مقصود ہوتا، تو ممتاز حسن صاحب کی آواز ٹیلیفون پر اس طرح تیز، اضطراری اور گھبراہٹ آمیز ہو جاتی ہے، کہ گویا شہر میں آگ لگ گئی ہو اور وہ فائر بریگیڈ کو اطلاع دے رہے ہیں یا کسی مرگ ناگہانی کی افسوسناک اطلاع ان کے اعزا تک پہنچا رہے ہوں۔ یوں بڑے صاحب صبر و تحمل ہیں، بڑے تجربے کار اور گہرے ہیں۔ ایک پیاری بچی مر گئی تو اپنے انداز سے کبھی اضطراری کیفیت پیدا نہ ہونے دی۔ چھوٹے موٹے اور بھی ایسے مسائل زندگی میں پیش آئے جو کافی گھبراہٹ پیدا کر سکتے تھے، لیکن یہ شخص کسی طرح بے قرار نہیں ہوا۔ یہ بیقراری یہ اضطراب اور یہ ہیجانی کیفیت فقط اُس وقت ظاہر ہو جاتی تھی جب کوئی علمی مسئلہ یا معاملہ درپیش ہوتا تھا۔ یہ کیفیت اس وقت سے اور بھی بڑھ گئی تھی جب سے عترت حسین زبیری نے ایجوکیشن کا چارج لیا تھا، دونوں ہم مذاق تھے، دونوں علم دوست تھے اور دونوں ہم کیش و ہم مشرب تھے، لہٰذا دونوں ہم نفس بن چکے تھے، اور دونوں پاکستان کے لیے کچھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ اضطراری کیفیت اور جلد بازی، زبان اور عمل میں پھر تو لازمی تھی۔

سینٹرل سیکرٹیریٹ میں فائنس سیکریٹری کے دروازے پر چپراسی میرا منتظر تھا، جیسے ہی

میں اندر داخل ہوا میں نے دیکھا کہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایسے فاتحانہ انداز میں مسکرائے، جیسے انہوں نے کوئی بڑا راز دریافت کرلیا ہو یا انہیں کسی بہت بڑے دفینے کا سراغ مل گیا ہو یا ایک ایسے مسئلے کو انہوں نے سلجھالیا ہو جس کو سلجھانے کے لیے پوری اُمت چودہ سو سال سے سر مار رہی تھی۔

میں جب کرسی پر بیٹھا اس وقت زبیری صاحب نے اپنی جیب سے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک لفافہ نکالا، زبیری صاحب جب مسکراتے تھے تو اُن کی دلی شگفتگی کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہو جاتے تھے، پیشانی جو کشادہ تھی، اُس پر نازک سی شکنیں پڑ جاتی تھیں جو بہت خوبصورت اور دل نشین معلوم ہوتی تھیں، دانت بہت ہی اچھے تھے، جیسے موتی جڑے ہوئے ہوں۔ مسکراتے وقت دانتوں کا توازن اور جڑاون دیکھنے والے کو مسحور کرلیتا تھا۔ لفافہ دیتے وقت جو مسکراہٹ اُن کے چہرے پر لہرائی وہ مجھے بہت بھائی اور اب بھی جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو دل کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔

لفافے سے ایک سونے کا سکہ نکلا۔

"کہیے جناب!" ممتاز حسن اور زبیری صاحب کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

یہ کیا ہے؟

"واثق باللہ کا سکہ ہے!"

"کہاں سے ملا؟"

"بھمبور سے!"

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ طلائی دینار دنیا میں یکہ و تنہا ہے۔ زبیری صاحب اور ممتاز حسن کے لیے اس سے زیادہ اور کیا دولت ہو سکتی تھی؟ دونوں خوش تھے۔

اس کے بعد دونوں ثقافتی علمی اور کلچرل تحریکات میں اور زیادہ سرگرم ہو گئے۔

یہ بھی ۱۹۵۸ء کی ہی بات ہے، صبح دس بجے کا وقت تھا، وہی فائنس سیکریٹری کا آفس وہی ممتاز حسن اور وہی عترت حسین زبیری۔ ایک صحبت آج کے سلسلے کی پہلے بھی ہو چکی تھی۔ ہم نے بجلم سرکار اردو ڈیولپمنٹ بورڈ کراچی کی بنیاد ڈالی۔ ممتاز حسن کی تحریک تھی اور زبیری صاحب کی تائید، ایک اسکیم بنانے والا اور دوسرا بے دریغ روپے دینے والا، پھر کیوں نہ اسکیمیں بنتیں اور کس طرح اجرا نہ ہوتا، آج اردو ڈیولپمنٹ بورڈ کی اساسی کمیٹی کا دوسرا اجلاس تھا، یاد نہیں

کہ میرے سوا اس وقت اور کون کون ممبر حاضر تھے۔

اس میٹنگ میں زبیری صاحب نے لغت کے اصول اور لغت نویسی کے فن اور لوازمات پر ایک بلند پایہ علمی مقالہ پڑھ کر اجلاس کا افتتاح کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ مقالہ کیا ہوا، اب ان کے کاغذات میں ہے بھی یا نہیں۔ اگر وہ شایع ہو جائے تو کیا کہنا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔

اسی اجلاس اور اسی میٹنگ میں طے پایا کہ ادارہ اردو کی مبسوط تاریخی لغت مرتب کرے۔ مولوی عبدالحق، بابائے اردو مرحوم و مغفور لغت کے رئیس بنائے گئے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کا علمی مشیر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس کے متعدد اجلاس سندھی ادبی بورڈ کے دفتر میں اور میرے گھر پر منعقد ہوئے جن میں سے ضابطے اصول اور دفتری قوانین وضع کیے گئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اس کمیٹی کے رُکن تھے۔

ڈاکٹر عترت حسین زبیری غالباً مشرقی پاکستان کی کسی یونیورسٹی سے مرکزی حکومت کے تعلیمی مشیر ہو کر آئے تھے، بڑے جذبے کو لے کر اور بہت کچھ کرنے کی ٹھان کر پہنچے تھے۔ ممتاز حسن جیسے صاحبِ فضل و دانش اور علم پرور مشیر کے ساتھ اشتراکِ عمل نے اُن کے جذبے کو اور بہت کچھ کرنے کے عزم کو اور جلا بخشی اور قوت پہنچائی۔

دونوں کا خیال تھا کہ ایک ملک، ایک ملت، ایک قوم اور ایک حکومت کی عزت و آبرومندی کا انحصار چند جدید قسم کی عمارتوں اور قیمتی سوٹوں میں ملبوس کارندوں پر نہیں ہوتا بلکہ ایک قوم اس وقت آبرومند بنتی ہے اور ایک ملک دنیا میں اس وقت عزت پاتا ہے جب اس کے پاس تاریخ کا سرمایہ وسیع پیمانے پر محفوظ ہو۔ قدیم آثار کا سلسلہ مرتب اور منظم ہو۔ کتب خانے، میوزیم اور علمی انجمنیں افراط سے ہوں۔ اپنی تاریخی وراثت اور ثقافتی روایات کی عظمت کی بنیادیں، فقط مستحکم تر نہ ہوں بلکہ ان پر شعور کے ساتھ پندار بھی ہو۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ دنیا کی دوسری معزز قومیں اپنی قدیم روایات ہی کی بنا پر دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ دولت کی افراط، بڑی بڑی کوٹھیاں، صوفے اور ریفریجریٹر، ایک ملت کو "نو دولتا" تو بنا سکتے ہیں، لیکن عظمت اور وقار نہیں بخش سکتے۔ اس وقار اور عظمت کی دیواریں فقط ثقافتی ورثے کی بنیادوں پر اُٹھتی ہیں۔ عترت حسین زبیری نے آنے کے بعد ممتاز حسن صاحب سے مل کر مذکورہ بالا اصول کے تحت اس نئے ملک کو اپنی وراثت سے آشنا کرانے کے لیے تیز تیز

قدم اُٹھانے شروع کیے تھے۔ اُن کی راہ میں کوئی کانٹا حائل نہیں تھا۔ دونوں کی شخصیتیں حرف گیری سے بالاتر تھیں۔ دونوں کے کردار انگشت نما سے مبرا تھے۔ اس لیے انہوں نے مل کر بہت سے کام کیے اور کئی علمی ادارے بنائے۔ آج جو تھوڑی بہت ثقافتی عزت حاصل ہے وہ انہیں کارناموں کی رہین منّت ہے۔

غالباً ۱۹۵۸ء کے نومبر کا مہینہ تھا، میں ستمبر سے اپنے گھر میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ شام کو آٹھ نو بجے کے درمیان یہ دونوں دوست میرے پاس آئے۔ ممتاز حسن کی یہ عادت ہے کہ جب انہیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو بظاہر ضبط سے تو کام لیتے ہیں، لیکن اندر ایک الاؤ جلتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جب انہیں کوئی دل خواہ دوست مل جاتا ہے تو اکثر و بیشتر شعر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، اور ضبط کے باوجود آنکھیں بھی بھر آتی ہیں، کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھرنے لگتے ہیں اور آنکھ بچا کر آنکھوں کی تری بھی خشک کرتے رہتے ہیں۔

عترت حسین زبیری انگریزی کے جیّد عالم تھے۔ ایسے عالم اور ایسے استاد کہ خود اہلِ زبان کے درمیان بھی انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اپنا مقام پیدا کر لیا تھا، لیکن وہ باوجود اس کے بھی چونکہ نو دولتے نہیں تھے، وہی مشرقی، وہی مسلمان، وہی عبادت گزار اور وہی عالمانہ کسرِ نفسی اور سادہ دلی۔ ڈھیلے ڈھالے انگریزی لباس میں ایک مشرقی جسم اور مسلمان کی رُوح چھپی ہوئی تھی۔ انہیں انگریزی اشعار اور ضرب الامثال کے ساتھ ساتھ فارسی اور اردو کے شعر بھی ازبر تھے، اور موقع بموقع اشعار کا استعمال کرنا خوب جانتے تھے۔

مجھے قلب کی بیماری تھی۔ یہ دونوں دوست احتیاط کرتے تھے کہ میرے سامنے کسی تکلیف دہ واقعے کا اظہار نہ ہونے پائے۔ ممتاز حسن صاحب کی بچی کا انتقال ہو چکا تھا، دل پر آرے چل رہے تھے، گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا لیکن جب پرسش احوال کے لیے میرے پاس آتے تو کوشش یہی ہوتی کہ مجھ پر اُن کے اندر کی کیفیت ظاہر نہ ہونے پائے۔ لیکن کہاں تک؟ وہ مومن ہیں اس لیے باوجود ہزار ضبط اور تحمل کے بھی، ان کے دل کی کیفیت ان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ ہزار چھپائیں لیکن چہرہ رازداں کبھی نہیں بن سکتا۔

اُس شام کو وہ غیر معمولی طور پر مضطرب تھے۔ میں نے دیکھا کہ عترت حسین زبیری صاحب بھی ملول ہیں۔ میں تاڑ گیا لیکن جرأت نہیں ہوئی کہ پوچھوں۔ میں خود بھی ڈر رہا تھا۔ اگر کوئی ایسی ویسی خبر ہوئی تو نہ جانے کیا حال ہو۔ دونوں نے اشعار پڑھنا شروع کیے دونوں کے

چہروں پر رنگ آتے جاتے رہے لور ممتاز حسن نے کئی بار آنکھ بچاکر آنسو بھی پونچھے۔

کسی اسکیم کے متعلق میں نے بات نکالی تو میں نے دیکھا کہ دونوں دوست دستور کے مطابق گرمجوشی سے اس طرف متوجہ نہیں ہوتے، ہاں ہوں کر کے ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہر حال کوئی ایک بات ایسی تھی کہ جواب دیے بغیر ان کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں مجبور تھے۔ اس وقت راز کھلا کہ جناب عترت حسین زبیری اپنے عہدے سے عنقریب سبکدوش ہونے والے ہیں لہٰذا اب وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ سارے عزائم اور تمام پروگرام ختم حوصلے سرد پڑ چکے تھے۔

ممتاز حسن جب کسی روحانی لذیت میں مبتلا ہوتے ہیں تو فوراً کسی دل خواہ دوست کا گھر "پناہ" کے لیے ڈھونڈتے ہیں لور کچھ ساعتیں بیٹھ کر دل بہلا کر پھر چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا اس وقت بھی زبیری صاحب کے سبکدوش ہونے سے سخت روحانی کوفت اور اذیت میں مبتلا تھے اور انہیں پناہ کی ضرورت تھی۔

بات تھی بھی نازک لور دُکھ دینے والی۔ ابھی تو پاکستان کے علمی لور ثقافتی استحکام اور عظمت کے لیے یہ دونوں حضرات جو کچھ کرنے والے تھے اس کی فقط ابتدا ہوئی تھی۔

زبیری صاحب کو اس کا دُکھ نہیں تھا کہ وہ اپنے عہدے سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں ع

ہائے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست

صاحبِ علم تھے، صاحبِ عمل تھے، اُن کو خدا نے وہ دولت عطا کی تھی جو نہ زوال پذیر ہونے والی تھی لور نہ ختم ہونے والی چیز تھی۔ جہاں جاتے وہیں عزت پاتے۔ شیر جس جنگل میں پہنچتا ہے وہیں اپنا شکار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی۔ وطن سے نکلے لوگوں نے سمجھا غریب الوطن ہو گئے، لیکن وہ غیروں میں گئے لور اپنوں سے زیادہ سرفرازی پائی۔

عترت حسین زبیری سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ پھر وہ یورپ چلے گئے اور میں منیلا پہنچ گیا۔ ایک دوسرے کی خبر نہ رہی۔ ایک مرتبہ ممتاز حسن کے پاس ان کے خطوط دیکھے، دوستوں کی یاد لور وطن کی محبت میں کئی دل دوز اشعار لکھے ہوئے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان کا جسم تو جہاں وہ ہیں انتہائی آرام سے ہے، لیکن ان کی روح بے قرار ہے۔ دوستوں کے لیے اور وطن کے لیے۔

ایک دن شام کو میں پرانی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ بھمبور کے اس سفر میں، میں نے جو تصویریں کھینچیں تھیں وہ سامنے آگئیں۔ ممتاز حسن، ڈاکٹر انمیری شمل، رول کوریل اور ڈاکٹر عترت حسین زبیری، چھاتہ نما ٹوپی، ڈھیلا ڈھالا انگریزی لباس، چوڑی پیشانی، شگفتہ چہرہ، کئی لمحوں تک ان پرانی یادوں میں ڈوبا رہا۔

دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ عترت حسین زبیری غریب الوطنی میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے، یہ وہی دن تھا، جس دن میں ان کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔

موت برحق ہے، ہر ایک کو مرنا ہے۔ ایک موت انفرادی موت ہوتی ہے، ایک موت وہ ہوتی ہے جو خاندان پر اثرانداز ہوتی ہے، جس کا اثر پورے قبیلے پر پڑتا ہے لیکن ایک موت ایسی بھی ہوتی ہے جس کا اثر اجتماعی زندگی اور پورے معاشرے پر پڑتا ہے۔ یہ ایک عالم کی موت ہوتی ہے جس سے پوری ملت کو نقصان پہنچتا ہے، عترت حسین زبیری کی موت فرد کی موت نہیں ہے، یہ موت وہ نہیں جس کا اثر فقط خاندان پر پڑے یا قبیلہ متاثر ہوا ہو، یہ موت وہ ہے جو پورے ملک اور تمام ملت کے لیے نقصان کا موجب ہوئی۔

عترت حسین زبیری روز روز قوموں میں پیدا نہیں ہوتے۔ قوموں کو ایسے افراد کے اُٹھ جانے سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس کا احساس بہت دیر میں ہوتا ہے لیکن اس احساس کے اثرات عارضی نہیں، بلکہ ابدی ہوتے ہیں، زخم جب ٹھنڈا ہوتا ہے اسی وقت اس میں درد کی شدت پیدا ہوتی ہے۔

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

مرنا بر حق ہے جو آیا ہے اسے جانا ہے لیکن نیاز صاحب کا اس جہاں سے گزر جانا کچھ اس طرح کا سانحہ سا ہے کہ جن کی سوزش قرنوں تک اصحاب و علم و فکر محسوس کرتے رہیں گے! اور ایک ایسا چرکا سا ہے کہ جس کا زخم لیاموں تک رستا رہے گا۔

وہ گونا گوں خوبیوں اور بوقلموں خصوصیتوں کا حامل رہا تھا۔ وہ اردو کے عہدِ زرین کا آخری نشان تھا۔ وہ ایسا رجال تھا کہ اب اس کا مثال ملنا ممکن نہیں۔ کہنے کو تو وہ اردو کا ادیب اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھا لیکن عربی، فارسی، ہندی، یورپی اور انگریزی زبان اور ادب پر ان کی نگاہ کیا کم عمیق اور گہری تھی؟ علوم اور فنون کا کون سا ایسا شعبہ یا گوشہ تھا جس پر انہیں دسترس کامل حاصل نہیں تھی۔ تاریخ ہو کہ جغرافیہ، فلسفہ ہو کہ مذہب، ادب ہو یا سائنس، علوم جدیدہ ہوں یا قدیم۔ وہ سب پر یکساں طور پر قادر اور قابض تھے۔ ان کی معلومات دنیا کی طرح وسیع اور عریض تھیں۔ ان کا مطالعہ سمندر کی گہرائیوں کے برابر گہرا اور عمیق تھا۔ جس چیز پر قلم اُٹھایا چاروں سمت پھول اور کلیاں بکھیر کے رکھ دیں۔ مضمون پاماں اور موضوع کتنا ہی مردہ سہی لیکن جب بھی ان پر قلم آن پہنچا تو ان کی انشاپردازی نے اس میں جان ڈال دی، ایسے زندہ کر کے رکھ دیا، پڑھنے والے چکاچوند ہو کے رہ جاتے تھے۔

ساٹھ پینسٹھ برس تک وہ علم و ادب کے مختلف میدانوں میں شہسواری کرتے رہے۔ شہسواری کیا بلکہ درحقیقت جادوگری کرتے رہے۔ ان کے شخصی اور ذاتی خصوصیات کا کیا کہنا۔ وضع داری، رکھ رکھاؤ، تحمل اور بردباری، مروّت اور دیانت داری، فرض شناسی اور زندگی کا ضبط و

نظم، کون سی ایسی انسانی وصف ہے جو ان میں نہیں تھی۔ محفل اور مجلس کتنی ہی بے تکلفانہ سہی لیکن کیا مجال کہ رکھ رکھاؤ اور وقار کے آن بان میں فرق آنے پائے۔ فرض شناسی اس طرح کہ جس کام کا ذمہ لیا اسے اپنا ہی سمجھ کے پورا کیا۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات ان کی جچی تلی اور اٹل ہوتی تھی۔ جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم کہ ایک عالم ان کے قدموں کے نشانوں پر اپنی اپنی ساعتیں صحیح کر لیں۔ غرض کہ جہاں سے اور جس جگہ سے بھی گزرے نظم و نسق کردار اور کارکردگی کے اَن مٹ نشان چھوڑتے گئے۔

ان کے ساتھ مجھے تھوڑے عرصے کے لیے کراچی کے اُردو بورڈ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اردو بورڈ کے اہلِ کار ان کے پلے کچھ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ قسام ازل نے روز اول سے ہی ان کی قسمت میں کچھ نہیں لکھا لیکن میں نے بہت کچھ پایا بہت کچھ سیکھا۔ مجھ پر انسانی اقدار اور فرض شناسی کے نئے نئے نکتے اور گوناگوں اسرار و رموز کھلے۔ میں نے اپنے میں بہت سی اصلاح طلب خامیوں اور کوتاہیوں کا شدید احساس پایا۔

اب وہ ہم میں نہیں ہیں، اب ہم قیامت تک ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کا کاروبار نہ رکا ہے نہ رکے گا کوئی آئے تو کیا؟ کوئی جائے تو کیا لیکن ایک بات بالکل واضح اور اٹل ہے کہ اردو کے عہدِ زریں کا آخری عظیم رجال اُٹھ گیا۔ اب اردو کی دنیا حقیقی ادیب اور ادب سے محروم ہو گئی۔ اب اردو کے نوشتے اپنی شگفتگی اور چنچل پن سے محروم ہو گئے۔ مدتوں کے لیے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرنوں تک کے لیے محروم ہو گئے۔ اب وہ مائیں کہاں ہیں جو نیاز جیسے رجالوں کو جنم دیا کرتی تھیں۔

اب کون پیدا ہوگا اور کون دیکھے گا؟ اردو کے رخساروں کا یہ غازہ تھا جو اڑ گیا!

انا لِلّٰہ وَ اِنّا الیہِ راجِعُون

کیفی دتاتریہ

چوں گفتگو ز لالہ و سوسن، بر آورم
دست چمن گرفتہ، بمسکن در آورم

یاد نہیں بٹوارہ ہوا تو مولانا عبدالحق کہاں تھے۔ اتنا البتہ ذہن میں ہے کہ جب دلّی لٹنے لگی اور وہاں کشت و خون کا بازار گرم ہوا، اُس وقت مولانا حیدر آباد میں تھے اور جب وہاں سے واپس دلّی آنے لگے تو بھوپال اسٹیشن پر مرحوم شعیب قریشی نے ان کو زبردستی اُتار لیا۔ چند دن ٹھہرے لیکن اب کے جی نہ لگا اور سیدھے کراچی چلے آئے، آئے کیا بالکل نڈھال اور سخت فکر مند۔

دلّی بدستور اُجڑ رہی تھی، قیامت کا منظر تھا، کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ مولانا کے پاس نہایت ہی وحشت ناک خبریں پہنچ رہی تھیں، جتنے منہ اتنی باتیں! انجمن برباد ہو گئی، دفتر غارت ہو گیا، کتب خانہ جلا دیا گیا، ایک دفتری شہید ہوا، سیّد ہاشمی جنّت کو سدھارے اور بیچارے بوڑھے کیفی بھی قاتلوں کے ہاتھوں سے بچ نہ سکے۔

مولانا سمجھ بیٹھے کہ چاہے اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، کم از کم ان کا اپنا قافلہ تو سارے کا سارا ہی لُٹ گیا، عمر بھر کی کمائی غارت ہو گئی، کیا کرایا خاک میں مل گیا اور پھر دو جگری دوست، جن کے ساتھ پوری عمر کٹی تھی، قیامت تک کے لیے ساتھ چھوڑ گئے:

دیدار تو یا قیامت افتاد
نیک است! ولے دراں سخنہاست

تلواریں اور کرپانیں جب نیام میں چلی گئیں، انسان نے درندگی کی قبا جب اُتار لی اور خون کے جو فوارے چھوٹ رہے تھے، ان کے سوتے بند کر دیے گئے، تو پھر کہیں جا کر معلوم ہوا کہ انجمن کا دفتر تو واقعی اس طرح کا درہم برہم ہوا ہے کہ پھر کبھی اس کی شیرازہ بندی نہیں ہو سکتی، ایک کارندہ بھی واقعی مع اہل و عیال جام شہادت نوش کر چکا ہے لیکن ہاشمی صاحب بچ گئے ہیں اور پنڈت جی بھی شہادت کی سعادت سے محروم ہو کر دلی پہنچ گئے ہیں۔ البتہ لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں جوان کی کوٹھی تھی وہ یار لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور کتب خانہ بھی جلا دیا گیا۔ چلو عمر کا صدقہ، جان تو بچ گئی۔

مولانا نے اطمینان کا سانس تو لیا لیکن ایک ٹھنڈی اور لمبی آہ کے بعد۔

نومیدی از وصال تو، بس جانگداز بود

صد جا گرہ زدیدم، امید بریدہ را

☆☆☆

مولانا کا قیام اِن دنوں پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیم سندھ کے ہاں گاندھی گارڈن کے پیچھے، ہرے رنگ والی کوٹھی میں تھا۔ جسمانی طور پر تو وہ یہاں یقیناً مقیم تھے لیکن ان کی رُوح دریا گنج نمبر ایک کے آس پاس آوارہ پھر رہی تھی، کبھی فرید آباد بھٹکنے لگتی، کبھی رامپور، کبھی حیدر آباد اور کبھی کیفی صاحب کا کھوج لگانے دلّی کے گلی کوچوں میں منڈلاتی پھرتی۔

میں اپنے طور پر ان کو بہلانے کی ہزار کوششیں کرتا رہتا تھا۔ ملیر، لانڈھی، منگھو پیر، جھونا مارکیٹ، کیماڑی، صدر، یہ سب اس زمانے میں ہمارے پاؤں تلے تھے۔ ہوا بندر تو تقریباً ہر شام ایک پھیرا ضرور ہی ہوتا۔ لیکن باوجود ان تمام ترکیبوں کے، دھیان ہر وقت وہیں لگا رہتا۔ جب بات کرتے تو وہیں کی کرتے۔ ہندوستانی احباب، انجمن اور اس کا مستقبل، ہاشمی، کیفی، صلاح الدین، بدر عالم، بشیر باورچی، کتب خانہ، نادر اور نایاب مخطوطے، مطبوعات کی ہزاروں جلدیں، انجمن کی عمارت کا پلاٹ، بینک میں پڑے ہوئے روپے، غرض کہ ایک سر اور ہزار سودا۔ وقت اسی طرح گزرتا تو چلا گیا لیکن بہت ہی تلخ۔

آخر ایک روز جب سنا کہ انجمن کا بچا کھچا کتب خانہ اور اس کے نادر مخطوطے مولانا کے اپنے ہی "پالتو" بیچ بیچ کر کھا رہے ہیں تو یکبارگی تلملا اُٹھے اور آخر دلّی پہنچ کر ہی دم لیا۔

ہزار گونہ بہ لنگم، بہر رحم کہ برند
رے کہ آں سوئے تست، ترکتاز کنم

☆☆☆

خود ہی کہا کرتے تھے کہ کیفی نے وصیت کی ہے کہ اگر مولانا کا انتقال پہلے ہو جائے تو کیفی کو ان کے ساتھ دفن کیا جائے! اور اگر پہلے کیفی صاحب جنت کو سدھاریں تو ان کی خاک رکھی رہے۔ جب مولانا رحلت فرمائیں تو محبت اور مروّت کے اس ننھے منے پیکر کی یہ "مشت خاک" اسی قبر میں ٹھکانے لگادی جائے۔

☆☆☆

میرا اپنا تعارف تو کیفی صاحب سے اس وقت ہوا، جب مولانا ہم دونوں بھائیوں کو دلی کے کارونیشن ہوٹل سے زبردستی اُٹھا کے اپنے ہاں لے گئے اور ایک کمرے میں یہ کہہ کر ٹھہرادیا کہ :
"دیکھو! ان حضرت سے شاہنامہ کی بات بھولے سے بھی نہ کرنا! ورنہ مشکل پڑ جائے گی!!"

ایک ریش تراشیدہ، کھچڑی مونچھوں والا بوڑھا آدمی، میلے پاجامے اور معمولی بنیان میں، ڈھیروں کتابیں اِرد گرد رکھے، چارپائی کے بیچوں بیچ، آلتی پالتی مارے، پروف پڑھنے میں اس قدر محو اور مشغول کہ مولانا کا یہ فقرہ جب فضا میں گونجا تو یکلخت گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا، ہمیں دیکھ کر وہ صاحب مسکرائے تو ضرور لیکن ان کی مسکراہٹ بہت ہی مضمحل تھی۔ گرمجوشی سے عاری اور شگفتگی سے بالکل خالی یا تو اس کمرے میں ہم اجنبیوں کا قیام انہیں ناگوار گزرا تھا یا پھر دمے اور بڑھاپے کی درماندگی سے وہ تھے ہی مرجھائے ہوئے۔

یہی تھے ہندوستان کے مشہور محقق، حافظ محمود خان صاحب شیرانی! وہی فردوسی پر چار مقالے والے، تنقید شعر العجم والے، پرتھوی راج راسو والے، پنجاب میں اردو والے اور پھر یہ وہی باپ تھے جنھوں نے جنم دیا تھا "حضرت ابوالمعانی الاختر شیرانی الافغانی" کو، جس کی سلمیٰ نے اس وقت کے نوجوان طبقے میں ایک سرور کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی یعنی ان کے تصورات میں ایک دھنک کا ساسماں پیدا کیے ہوئے تھی اور جس کی رومانی شاعری سے ہر وہ انسان، جو شباب کے عالم میں گھرا ہوا تھا مست اور مدہوش تھا۔

شاہنامہ کی بات تو نہ نکلی لیکن دس پندرہ دن کے قیام میں دوسری ہزاروں باتیں درمیان

میں آئیں۔ یکجائی نے باہمی اُنس پیدا کر دیا، اس حد تک کہ ہمارے پٹھان محافظ، بڑی مونچھوں والے لالہ عبّاس خان کے ساتھ بھی ان کو محبت ہو گئی۔ ہم دیکھتے تھے کہ گرم راتوں میں یہ دونوں پٹھان کئی رات تک آپس میں کھسر پھسر کیا کرتے تھے۔ شکار کی باتیں، تیر و تفنگ کی حکایتیں اور ہندوستان میں پٹھانوں کی حکومت کی داستانیں۔ لالہ عبّاس خان نے ایک رات ہم کو بتلایا کہ :

"پیر! شرانی خو ٹیک کیتا ہے، خو چار مرتبا پٹان کو ہندوستان کا حکومت ملا۔ اس خانا خراب نے خود چوڑ دیا۔ وئی! وئی! الو کدا!!"

لالہ عبّاس خان کی مونچھوں کا ایک ایک بال پھڑک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی فوجیں مستعد کھڑی ابھی ابھی دلّی پر دھاوا بولنے والی ہیں۔ لالہ عبّاس خان کی بڑی بڑی گول گول سرخ آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، جیسے کہ شعلے نکل رہے ہوں اور وہ "مجموعہ نغز" کے ایڈیٹر کو شیر گل خان آفریدی سے بھی جس نے دشمن قبیلے کے ایک سو دس آدمیوں کا تھری ناٹ تھری سے صفایا کر دیا تھا۔ اس وقت زیادہ جری بہادر اور غیرتمند سمجھ رہا تھا۔

اس مختصر قیام کے دوران میں نے شیرانی صاحبؒ سے بہت کچھ سیکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے ہی مجھے راستے پر لگایا۔ ہم روز شام کو جامع مسجد کے نواح میں جایا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سی مفید اور قیمتی کتابیں چار چار آنے میں خرید کر دیں۔ ایک دن 'گلشن بیخار' پر بڑا جھگڑا ہوا کتب فروش چار آنے میں دینا چاہتا تھا اور شیرانی صاحب چھ پیسے سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھے۔ خدا خدا کر کے دو آنے پر جا کے معاملہ طے ہوا۔ وہ دو آنے والا 'گلشن بیخار' ابھی تک میرے پاس موجود ہے۔ اب بھی جب میں اسے اُٹھاتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے وہی تصور بندھ جاتا ہے۔ جامع مسجد کے عقب میں ایک تنگ و تاریک کمرہ، چاروں طرف سے ہوا کا گزر بند، پسینے میں سر تاپا نہائے ہوئے، چھ پیسے اور چار آنے کا جھگڑا ہے کہ برابر جاری ہے، بڑے اطمینان کے ساتھ بولی پہ بولی لگ رہی ہے۔

☆☆☆

اس زمانے میں وہیں دریا گنج نمبر ایک میں صبح کو ٹہلتے ہوئے دوپہر کو کھانے کی میز پر اور شام کو چائے پر، ایک چھوٹے سے قد والے آدمی کو میں نے کوٹ پتلون میں دیکھا۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا کوٹ کے کالر کو ڈھانکے ہوئے۔ اس پر شاذ و نادر ہی ٹائی باندھی جاتی تھی۔ قمیص عموماً وہ

پہنی جاتی تھی جس کا کالر ٹینس کٹ کا ہوتا تھا۔ اسرائیل کے سابق وزیر اعظم بن گوریان کی تصویر دیکھیے، بس یہی اس دور کا فیشن تھا۔

یہ ننھے مُنّے صاحب بہت ہی کم آمیز اور کم گو تھے۔ بات کرتے تو فقط مولوی صاحب سے یا پھر شیرانی صاحب سے۔ سیّد ہاشمی ہوتے تو ان سے بھی دو چار باتیں ہو جاتیں لیکن مطلب کے چند جملوں سے آگے بالکل نہ بڑھتے۔ جب مولوی صاحب کھانے کی میز پر اپنے لطیفوں سے ہوا باندھنے لگتے اور کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھتا تو اس وقت بھی یہ مٹھی بھر جسامت کا انوکھا انسان محض مسکراہٹ ہی کو کافی سمجھتا تھا۔ آواز باریک تھی لیکن اس میں بلا کا رس تھا ایک لے بھی اور کشش بھی۔

اس وقت ایسے خشک آدمی کے ساتھ ہمارا اپنا معاملہ فقط صاحب سلامت تک ہی رہا۔ ہمارے متعلق ان کو فقط اتنا علم تھا کہ یہ سندھ کے بہت بڑے رئیس اور جاگیر دار ہیں جن کو مولوی صاحب حسبِ عادت اس امید پر پال رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ لوگ انجمن کے مقتل میں کام دے ہی جائیں گے۔

خیر ہمیں تو ان کے متعلق معلوم ہو ہی گیا تھا کہ یہ حضرت اردو کے بہت بڑے عاشق اور ادیب، محقق اور عالم، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب ہیں، جہاں انسان تو کیا پرندے تک کو پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ انجمن کی کائنات میں اس کتب خانے کا وہی مرتبہ تھا جو نہ جانے کون سے آسمان پر طوبیٰ کا ہے۔ وہیں کتب خانے کے ساتھ ایک کمرے میں ان کا قیام تھا۔ جب تک ہم رہے کتب خانہ اور کیفی صاحب دونوں ہمارے لیے سربستہ راز ہی بنے رہے۔

☆☆☆

تاریخ اب یاد نہیں رہی، بس یہ سماں نہیں بھولتا کہ جب مولانا دلّی سے واپس آئے تو کیفی صاحب بھی ان کے ساتھ ہوائی جہاز سے اُترے۔ بہت ضعیف و نحیف، بیٹھنے کے لیے ہوا سے بھرا ہوا ایک ٹیوب ہاتھ میں لیے ہوئے چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ بالکل چیونٹی کی چال، کراچی کی سرزمین پر کیفی صاحب نے قدم رکھا۔ حالات نے ان کو کتنا نڈھال کر دیا تھا، عجیب و غریب انسان کو انسان ہی کی حرکتوں نے کس قدر بے جان کر دیا تھا؟ کچھ نہیں، بس ایک زندگی کی رمق تھی، جو جہاز سے اُتری تھی۔

مولانا کی آنکھیں روشن تھیں، ان میں مشتری کی دمک تھی۔ کیفی صاحب کو ہم سے اس

طرح ملا رہے تھے جیسے وہ اپنا بہت ہی بڑا کرشمہ یا کارنامہ دکھا کر داد طلب کر رہے ہوں۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جب دلی کا سہاگ لٹا تو مولانا بھی اس لوٹ میں برابر کے شریک تھے بلکہ شریکِ غالب تھے اور یہ حضرت اس ابھاگن کی ناک کی وہ نتھ لے اُڑے تھے جس کی قیمت ان کی نگاہ میں گویا پوری کائنات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ مولانا واقعی اس وقت ایک فاتح کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر جلال بھی تھا اور جمال بھی۔

دراصل یہ بات تھی بھی ٹھیک۔ وہ اگرچہ سب کچھ لٹا چکے تھے اور زندگی کے پورے کئے کرائے پر پانی پھر گیا تھا لیکن اپنے ایک ایسے ہمدم اور ہم نفس کو بازیافت کر لائے تھے جس کے سامنے، حقیقتاً ان کے لیے دو جہان بھی ہیچ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ کیفی صاحب کی آنکھوں میں بھی ایک کیف سا تھا، جی مطمئن دکھائی دے رہا تھا اور ایک سکونِ خاطر بھی ہم نے محسوس کیا۔ یہ سب کچھ شاید اس لیے تھا کہ اب گویا یہ دونوں یارِ غار ایک ساتھ رہیں گے، ایک ساتھ مریں گے اور پھر ایک ساتھ دفن ہونے کے سلسلے میں جو ایک دُشواری آگئی تھی، اب وہ بھی جاتی رہی تھی۔

مولانا جب خوشی میں مست ہو جاتے تھے تو ان کی سرخ رومی ٹوپی کا پُھندنا خود بخود پھدکنے لگتا تھا۔ چنانچہ ایئرپورٹ پر بھی ہرچند کہ کیچ مکران سے آنے والی تند ہوائیں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں لیکن مولوی صاحب کا پُھندنا، اسی روایتی انداز میں، اپنے آپ ہی کود پھاند رہا تھا، اس طرح جیسے کہ ایک کٹھ پُتلی قسم کی گڑیا ناچا کرتی ہے۔

☆☆☆

مولوی صاحب جب بھوپال سے یہاں تشریف لائے تو اُن کی جیب میں کل تین سو روپے تھے۔ یہاں انجمن کی بنیاد از سرِ نو کس طرح استوار کی جاسکتی تھی؟ "کل پاکستان انجمن ترقی اردو" کیا، اس پونجی سے تو چھوٹی سی محفل بھی آراستہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ تین سو روپے تو درحقیقت اچھے وقتوں میں مولانا کی ایک وقت کی دعوت کا صرفہ بھی نہیں تھا۔

ہاشمی صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی صاحب بڑے ہی خوش قسمت اور خوش بخت واقع ہوئے ہیں بلکہ ان کو تو یہ بھی یقین کی حد تک گمان تھا کہ مولوی صاحب قطب اور ابدال اگر نہیں تو ولی ضرور ہیں۔ خدا جانے ولی ہونے کا یہ قول کہاں تک صحیح تھا، البتہ ان کی خوش بختی اور خوش قسمتی کے نظارے تو اچنبھے کی حد تک میں نے بھی کئی بار دیکھے۔ ہمیشہ اچھا کھایا، اچھا پہنا، اچھا مکان رہنے کو ملا اور جو کچھ دیکھا، وہ سب کچھ اچھا ہی اچھا تھا۔

یہاں بھی چنانچہ وہی خوش بختی اور خوش قسمتی ان کی کمک کو پہنچی۔ اچانک "ہذا من فضلِ ربّی" کی پروا چلنے لگی۔ شاردا مندر بھرا بھرایا مل گیا۔ یہ گجراتی ہندوؤں کی وہ باوقار تعلیم گاہ تھی جو اپنی اعلیٰ ترین تعلیمی روایات کی بناء پر مندر کا رُوپ دھار چکی تھی۔ تلک جی جب آتے تو یہیں قیام کرتے، مہاتما گاندھی جب بھی کراچی تشریف لاتے یہیں ٹھہرتے، پٹیل صاحب بھی کانگریسیوں کے جھگڑے چکانے جب آتے تو اسی میں رہتے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پیچھے ہم نے ایک مرتبہ نماز اسی شاردا مندر کی اُوپر والی منزل کے ایک کمرے میں ادا کی تھی۔ حد یہ ہے کہ شاردا مندر میں جو درخت لگے ہوئے تھے، جن میں سے اب ایک تہائی بھی موجود نہیں اور جن کی گھنی چھاؤں میں ستانے کے لیے لوہے کی بنچیں پڑی رہتی تھیں، ہندوستان کے کسی نہ کسی لیڈر کے لگائے ہوئے تھے۔ مہاراج گنگادھر تلک، سی۔ آر۔ داس، گاندھی جی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، لالہ لاجپت رائے، ولبھ بھائی پٹیل، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، بادشاہ خاں اور غالباً سب سے آخری درخت سوبھاش چندر بوس کا لگایا ہوا تھا۔ کن کن کے نام گناؤں، الغرض کوئی رہنما ایسا نہیں تھا جس نے شاردا مندر میں پودا نہ لگایا ہو۔

☆☆☆

میں نے اس کے قریب ایک اور بڑا سا گجراتی اسکول انجمن کے لیے ذہن میں رکھا تھا لیکن جب حکیم محمد احسن سے، جو اس وقت کراچی کارپوریشن کے میئر تھے، بات ہوئی تو وہ مولوی صاحب کو اور مجھے اپنے مطب سے سیدھے شاردا مندر لے آئے۔ عمارت اور اس کی شان دیکھ کر مولانا ہکے بکے رہ گئے۔ ہر اچھی چیز کو وہ پسند کرتے تھے اور دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے، ملکیت کسی کی بھی ہو، اس سے مولانا کو بحث نہیں تھی۔ چنانچہ شاردا مندر کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔

مولانا کی عادت تھی کہ جب کوئی کام کرانا مقصود ہوتا تو پہلے وہ کام کے سرانجام نہ ہونے کے اسباب بڑی شدومد سے بیان کرنے لگتے، لیکن ایسی ترکیب سے بیان کرتے کہ جس کے سپرد کام کرنا ہوتا تھا، وہ سُن کر کام پورا کرنے کے لیے شرط لگانے کی قسم کھا بیٹھتا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا جو مولانا بڑی چابک دستی سے، لیکن بظاہر بڑے معصومانہ انداز میں، ہر اہم موقع پر استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تو اس کے استعمال کا سچ مچ ایک نادر موقع

نکل آیا تھا۔ اتنا شاندار مکان اور وہ بھی انجمن کے لیے! بہت ہی اہم اور بہت ہی نازک موقع اور محل تھا!

مولانا اپنی جگہ مطمئن، پیر الٰہی بخش کی کوٹھی میں وقت گزار رہے تھے یا پھر سیر و تفریح میں۔ صبح اکثر و بیشتر گاندھی گارڈن میں، شام کلفٹن پر گزاری جاتی تھی۔ ادھر حکیم احسن تھے کہ ان کی "خودی" اور آن امتحان کے میزان میں آویزاں تھی۔ مطب بند، بیمار دربدر اور یہ خود الاٹمنٹ کے چکر میں سرگرداں۔ آخر ایک دن جب حکیم صاحب الاٹمنٹ ہاتھ میں لیے ہوئے پہنچے تو مولوی صاحب نے فقط اتنا کہا کہ :

بھئی واہ! واہ!!

حکیم صاحب یہ آپ ہی کا کام تھا!

بھئی ہم تو کہتے تھے کہ ان کے بغیر یہ کام ہونے کا نہیں!

جی کچھ بھی ہو ہاشم رضا بھی کیا کر سکتے تھے؟

واہ واہ بھئی واہ واہ!

یہ آپ ہی کی کارستانی ہے!

واہ بھئی واہ!

اور آخر میں فرما دیتے تھے کہ "بھئی خدا آپ کو خوش رکھے۔" یہ فقرہ دعا کے طور پر، سچی بات یہ ہے کہ ان کے دل سے نکلتا تھا۔ یہ ان کی بڑی مہربانی تھی۔ اگر یہ نہ بھی کہتے تو کیا تھا؟ بھلا ہم ٹھہرے بیچارے "سندھی مانہوں" سو بابائے اردو کی اتنی ہی شاباشی ہم سب کو باغ و بہار کرنے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

انجمن کی زیریں منزل میں جنوبی طرف کا جو بڑا کمرہ ہے، کیفی صاحب کا قیام اس میں تھا اور ہاشمی صاحب، کیفی صاحب کے ساتھ والے بڑے کمرے میں رہتے تھے، جہاں اس وقت "کتب خانہ عام" کی دریدہ بریدہ کتابوں کو رکھے ہوئے، دو بزرگ کچھ اس طرح اپنی صورت بنائے تشریف فرما رہتے ہیں کہ جیسے سچ مچ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" یا پھر جس طرح کسی خستہ حال خانقاہ کے زاویہ نشین، مریدان باصفا اور عقیدت مندان اخلاص کیش کے انتظار میں، دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے بظاہر اوراد و وظائف میں مشغول لیکن دراصل یوں

ہی سارا وقت اُکڑوں بیٹھے رہتے ہیں۔

مولانا شروع ہی سے اُوپر کی درمیانی منزل میں رہتے تھے اور کھانا اس چھوٹے کمرے میں کھایا جاتا تھا، جہاں بعد میں مرحوم قاضی احمد میاں اختر نے دفتر جمایا اور اب جس میں جلیل احمد صاحب قدوائی کو آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔

کھانے کے اس چھوٹے سے کمرے کی بیضوی شکل کی میز پر بہت سے مشاہیر علم و دانش کھانا کھا چکے ہیں۔ عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم، شعیب قریشی، مولوی محمد امین زبیری مرحوم، غرض کس کس کے نام گناؤں؟ مرحومین کے ایک پورے قافلے نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پیشتر، اپنے اپنے حصّے کا رزق اسی میز پر سے لیا ہے۔

☆☆☆

اسی کمرے میں مولانا نے ان سیٹھ لوگوں کو طرح طرح کے 'روغن جوش' اور 'مرغ مسلم' پکوا پکوا کر نوش جان کرائے ہیں، جن سے انجمن کے لیے روپیہ لینا مقصود ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس طرح کا کھانا ہمیشہ ضائع ہی گیا۔ نہ راہِ رسول نہ راہِ خدا۔ کھانا دونوں ہاتھوں سے کھایا اور خوب کھایا، ڈکاریں تک جی بھر کے لیں، لیکن جب روپیہ دینے کی نوبت آئی تو ایک ہاتھ بھی جیب کی طرف نہیں سرکا۔ بعد میں غصہ بلکہ یوں کہیے کہ زیادہ تر انفعالی کیفیت میں مولانا کے منہ سے ہمیشہ ان لوگوں کے حق میں "اردوئے معلّٰی" کے پھول جھڑتے دیکھا کیے۔

☆☆☆

ایک دفعہ ایک بہت ہی بڑے گجراتی سیٹھ کو قاضی صاحب مرحوم اپنے تعلقات کی بنا پر گھیر گھار کر انجمن میں لے آئے۔ چند دن پہلے سے ان کی دعوت کے لیے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

ان روپیوں کے بُوتے پر، جن کے حاصل کرنے کے لیے یہ دستر خوان بچھایا جا رہا تھا، بڑی بڑی اسکیمیں سوچی جانے لگیں۔ قاضی صاحب مرحوم ہر آن اس سیٹھ سے اپنے گہرے اور پرانے روابط اور ان کی دولت کی فراوانی اور دل کی فراخی کی داستانیں سنا سنا کر، مولانا کے یقین کو محکم اور ساتھ ہی مالی اشتہا کو تیز تر کر رہے تھے۔ البتہ یہ مسئلہ آخر تک مولانا اور قاضی صاحب کے درمیان متنازعہ فیہ ہی رہا کہ اندازاً کتنا روپیہ لینا چاہیے۔ بات یہ تھی کہ اُدھر دولت کی فراوانی تھی اور اِدھر ضروریات کی بہتات، ایسے حالات میں کوئی کیونکر فیصلہ کرے!

بہر حال وہ گھڑی آن پہنچی۔ ہم دو گھنٹے پہلے بلائے گئے اور 'سمٹ' شروع ہو گئی کہ دستر خوان پر کس طریقے اور کس پسیج دینے والی نہج سے "انجمن کے المیہ" کو چھیڑنا چاہیے؟ حسن طلب کے کیا کیا پینترے اختیار کیے جائیں؟ سلسلۂ کلام کے کس حصے کو کون بیان کرے؟ غرض یہ کہ "علم کلام" کے تمام گُر از سر نو اَز بر کیے گئے۔ آخر میں ہم سب نے اتفاق رائے سے یہ طے کیا کہ گفتگو جو بھی ہو اور جس طرح کی ہو اس کے ڈانڈے خدا اور رسول تک بہر صورت پہنچائے جائیں۔ مہمانِ خصوصی میمن قوم کا فرد فرید اور رُکن رکین تھا۔ رہی انجمن کی حالتِ زار، سو اس کے لیے سورہ 'الم نشرح' سے لے کر 'تفسیرِ حقانی' تک تمام مذہبی کتابوں کے چھپوانے کا ذکر کر کے، حسن طلب کے تیر مختلف سمتوں سے چلانے چاہئیں۔

ایک طرف ہم یہ 'ری ہر سل' کر رہے تھے، دوسری طرف بشیر باورچی مختلف قسم کے کھانوں کی نوک پلک دُرست کر رہا تھا۔ اس دوراہے میں سید بدرِ عالم جب سامنے سے گزرتا تو انتظام اور سلیقے کے سلسلے میں مولوی صاحب کی گالیوں کی ہلکی ہلکی پُھوار اپنے اُوپر "برسواتا" کھانے کے کمرے میں پہنچ کر دم لیتا۔ یہ اور بات تھی کہ حسبِ معمول وہ زیرِ لب کچھ مخفی فقرے ضرور گنگنا لیتا تھا، جن کے تیور تو ہم سب پرکھ رہے تھے لیکن روانی کے زور میں 'حسنِ بیان' سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا محال تھا۔

مولانا نے وہی روسی ٹوپی، ذرا سا کج دے کر سر پر رکھی، شیروانی ڈالی اور لکڑی ہاتھ میں لی اور یکبارگی اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارا پورا قافلہ ان کے پیچھے چلا۔ ایک بڑی موٹر دروازے پر آن کر رُکی۔ ایک طویل القامت جوان ہاتھ میں 'فائیو فائیو' کا ڈبّہ لیے ہوئے بڑی شان سے اُترا۔ قاضی صاحب نہایت ہی بے تکلفی اور ایک فاتحانہ انداز سے اُس کے بعد کار سے باہر نکلے۔

مولانا نے سر تا قدم جائزہ لیا۔ کچھ صورت حال جچی نہیں۔ حسبِ عادت زیرِ لب جو کچھ کہا وہ میں نے تو سنا نہیں لیکن ہاشمی صاحب نے وہی اپنا مخصوص ہلکا سا قہقہہ لگایا جس سے ان کے خوبصورت دانت پورے دکھائی دینے لگتے تھے، ان کی آنکھوں کے ستارے چمکنے لگتے اور پورے چہرے پر خوبصورت سلوٹیں سی پڑ جاتی تھیں۔ مولانا نے بظاہر بڑے اخلاص اور اخلاق سے آگے بڑھ کر تپاک سے استقبال کیا۔ ہم سب نے بھی باری باری ہاتھ ملاتے وقت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھائی۔ وہ آگے، ان کے پیچھے مولانا اور ہم سب مولانا کے پیچھے،

خراماں خراماں سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔

☆☆☆

کئی دن انتظار میں گزر گئے لیکن صدائے برنخواست۔ ہوتے ہوتے آخر ایک عرصہ کے بعد، فقط قاضی صاحب کے چھیڑنے تک بات محدود رہ گئی۔ مولانا طرح طرح سے اور مزے لے لے کر قاضی صاحب کو چھیڑتے، ہم سب لطف اُٹھاتے اور قاضی صاحب بھی پہلے تو کچھ انفعال سا محسوس کرتے تھے لیکن بعد میں مولانا کی فقرے بازی سے خود بھی حظ اُٹھانے لگے۔

جب تک آس بندھی رہی اس وقت تک مولانا جب بھی کلفٹن جاتے ہوئے اس رئیس کی شاندار کوٹھی کے سامنے سے گزرتے تو ان کی آل اور اقبال کی دائمی بقا اور قیام کے لیے سو سو دعائیں دیتے گزرتے اور پھر جب امید کے سارے تنکے ٹوٹ چکے تو بعد میں جب بھی ہم گزرے تو۔ ایک خاص انداز سے منہ دوسری طرف پھیر کر، خدا کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ خاص محاوروں اور تشبیہات کے استعمال میں مرحوم عبدالرحمان صدیقی کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔

اس دل لگی کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ ایک بار پھر اسی قسم کی ایک دعوت کا پروگرام بنا اور مولانا کے لطیفے ازسرنو اس طرح رواں دواں ہوئے جیسے برسات کے وقت جھرنوں سے پانی بہنے لگے۔

☆☆☆

میری صبحیں اور میری شامیں اکثر انجمن میں بسر ہوتی تھیں بلکہ رات کا کھانا بھی اکثر و بیشتر وہیں کھا کر پھر گھر آجاتا تھا۔ اس وقت پلازا کوارٹرس میں میرا قیام تھا۔ کھیم چند بلڈنگ کے اُوپر والے دو فلیٹ میرے پاس تھے، جن میں سے ایک میں اب ماہر القادری صاحب مقیم ہیں۔

شام کی چائے کے بعد ہم سب درمیانی منزل کے چوبارے (پورٹیکو) پر آجاتے تھے، جہاں رات کے کھانے تک محفل جما کرتی تھی۔ مولانا، کیفی صاحب، ہاشمی صاحب، مولوی زبیری صاحب، پھر شعیب قریشی، بعد میں عبدالرحمان صدیقی اور پھر پاکستان نیا نیا بنا تھا، لوگ نئے نئے آتے تھے، ابھی پرانی وضعداری کو خیرباد نہیں کہا تھا، ابھی نباہ اور دوستی، راہ و رسم کی وہ پرانی قدریں ہاتھ سے چھوٹی نہیں تھیں، لہٰذا جو لکھا پڑھا ترکِ وطن کر کے یہاں پہنچتا، اس چوبارے کی محفلوں میں ضرور شریک ہوتا تھا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب کے ساتھ تو

مولانا کا ویسے ہی یارانہ تھا، جب وہ بھی لکھنؤ سے اچانک چل کر راتوں رات کراچی پہنچ گئے تو مہینے میں ایک آدھ پھیرا ضرور کرتے تھے۔ اس طرح اردو کے سبھی مصنفین، سبھی شعرائے کرام اور تمام تر سامعین عظام کو، جن کے ہم 'سندھی مانہوں' نے فقط نام سُن رکھے تھے۔ اس چوبارے کے مونڈھوں پر گھنٹوں لطفِ صحبت حاصل کرتے دیکھا۔

☆☆☆

بس انہیں دو تین افراد پر مشتمل ایک مختصر سی بستی تھی اور انہیں سے اس وقت کی 'کل پاکستان انجمن ترقی اردو' عبارت تھی۔ ہر چند کہ یہ اصحاب آپس میں تین چار ہی فرد تھے لیکن در حقیقت یہ ایک پورے عالم پر بھاری تھے، یہ اپنے طور کی ایک پوری دنیا قائم کیے ہوئے تھے۔ ان کی دنیا الگ، ان کا عالم الگ، ان کا جہان الگ، سب سے جُدا سب سے نرالا اور سب سے دلچسپ اور دلکش بھی۔ کیا عرض کیا جائے! سچ تو یہ ہے کہ ان آنکھوں نے اس دور میں جو پر اخلاص علمی محفلیں دیکھیں، ان محفلوں میں جو قصے اور داستانیں سُنیں پھر وہ کبھی سننے میں نہیں آئیں، آنکھوں نے پھر کبھی وہ سماں نہیں دیکھا اور اب تو کاہے کو کوئی سنے گا۔ وہ تو ہند و پاک کی تہذیب، پرانی محفل علم اور پرانے تمدن کا ایک سنبھالا تھا، وہ تو بجھنے والی شمع کا دھواں تھا اور اب تو وہ بستی بھی مدتیں ہوئیں کہ اُجڑ چکی۔

باور نمی شود کہ، گہے آن دلِ خراب
معمورہ بودہ است، کہ ویرانہ کردہ اند

☆☆☆

کیفی صاحب سے میری بے تکلفی اسی زمانے میں بڑھی۔ میں نے قریب سے انہیں اسی چوبارے اور کمرے میں دیکھا۔ دلّی میں تو وہ مجھے قطعی پسند نہیں آئے تھے لیکن یہاں پسند کیا آئے بلکہ بہت ہی پیارے معلوم ہوئے اور بہت ہی بھلے محسوس ہوئے، جی کو بہت ہی بھائے۔ بحیثیت انسان کے، میں نے ان کو بہت بلند مقام پر پایا۔ اگرچہ ہاشمی صاحب میرے ساتھ اس مسئلے میں پورے طور پر اتفاق رائے نہیں رکھتے تھے لیکن کیا کیا جائے، یہ تو اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ عشق اور حسن پر کسی کا بس کبھی چلا ہے کہ اب چلتا؟

کیفی صاحب پر بھی یہیں آ کر حقیقت کھلی کہ ہر چند مولوی صاحب نے ابتدائے حال میں ہمیں سندھ کا رئیس اور جاگیر دار سمجھ کر خاص مصلحتوں کی بنا پر مہمان رکھا تھا لیکن ہم نہ تو

جاگیردار تھے اور نہ سرمایہ دار البتہ اخلاص اور وفاکیشی کی دولت ہمارے ہاں فراواں تھی اور اس حد تک فراواں کہ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ مولوی صاحب سے بھی ہمارا اس معاملے میں پلّا بھاری تھا۔

☆☆☆

ہاں تو انجمن بن گئی تھی۔ 'آل پاکستان انجمن ترقی اردو' کیونکہ مکان موجود تھا، بہت بڑا مکان، بلکہ تین مکان کئی منزلوں والے، اَن گنت کمروں والے، گھنے درختوں کے سائے میں۔ باہر بیٹھنے کو سینکڑوں بنچیں اور اندر کمروں میں استعمال کے لیے بافراط فرنیچر۔ کرسیاں، چوکیاں، میزیں، مونڈھے، الماریاں، تجوریاں، چارپائیاں۔ حتیٰ کہ استنجے کے لیے ناریل کے گڈو تک موجود۔ اس تمام اثاث البیت کو ہم اس طرح اطمینان، اہتمام اور دلجمعی کے ساتھ استعمال کرسکتے تھے بلکہ کر ہی رہے تھے، جیسے کہ اس پورے سازوسامان کو ہم نے اپنی ہی حلال کی آمدنی سے یا یوں کہ، بالکل ہی گاڑھے پسینے کی کمائی سے، نہ فقط قیمتاً بلکہ پورے شرعی حقوق کے ساتھ خریدا تھا۔

اور پھر باہر صحن میں نگاہ کریں تو چاروں طرف پھول ہی پھول، کیاریوں میں، بڑے چھوٹے گملوں میں طرح طرح کے موسمی بھی ابدی بھی، دیسی بھی بدیسی بھی اور ایسے رنگ برنگ کہ پوری عمارت گویا 'رنگ محل' معلوم ہوتی تھی۔

یہ سب کچھ تھا، علاوہ ازیں یہ کہ گجراتی اساتذہ، میزوں پر قلم دوات اور تصنیف و تالیف کے لیے کاغذ تک چھوڑ گئے تھے۔ بس کمی اگر تھی تو فقط پیسے کی۔

☆☆☆

مولانا مختلف اسکیمیں سوچتے اور روپیہ پیسہ حاصل کرنے کے داؤ پیچ میں، اپنے آپ کو مصروف رکھا کرتے تھے۔ ہاشمی صاحب بھی ادھر ادھر کھینچ تان کر اپنا وقت پورا کر ہی لیتے تھے زیادہ تر وقت دوستوں میں کٹ جاتا تھا۔ دلّی، نواح دلّی اور حیدرآباد سے آئی ہوئی صورتوں کا ایک سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔

دلّی کے ایک مرزا صاحب بھی ہوتے تھے۔ بہت ہنس مکھ لیکن بہت ہی باتونی۔ بیگماتی زبان بولتے تھے۔ "نوج" سے شروع ہو کر ہر بات "لوئی" پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ تقریباً پہروں تک کا ایک پھیرا روزانہ ہو جاتا تھا۔ بظاہر تو کام تھا کچھ نہیں اور ابھی متروکہ جائداد کے سلسلے میں 'فضل ربّی' کی ہوا بھی عام نہیں ہو چلی تھی، اس لیے اکثر و بیشتر سبھی کے لیے فی الحال فراغت

ہی فراغت تھی۔

☆☆☆

ہاں تو بات نکلی تھی وقت کاٹنے کی، یہاں کیفی صاحب کے لیے وقت کاٹنا البتہ ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ سوائے مولوی صاحب کے کسی اور کے ساتھ ان کی دوستی نہیں تھی۔ عام ملاقاتیوں سے وہ سخت گھبراتے تھے۔ ان کا مسلک تھا کہ :

باعاشقاں نشیں و ہمہ عاشقی گزیں
با ہر کہ نیست عاشق، کم گوئی کم نشیں

گپ شپ لڑانا کبھی ان کو نہیں آیا اور پھر وقت ضائع کرنا تو ان کے کیش میں کفر سے بھی ہزار درجہ زیادہ کفر تھا۔

وہ دراصل تھے۔ "کرم کتابی"۔ چنانچہ مولوی صاحب کے علاوہ فقط کتابوں ہی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔

حرام دارم با دیگراں سخن گفتن
کجا حدیث تو آید، سخن دراز کنم

بس کتاب ان کے ہاتھ میں آئی کہ وہ گرد و پیش سے الگ تھلگ ہو گئے۔ سو کتاب بھلا یہاں کہاں؟ اگر تھوڑی بہت تھیں تو وہ میرے ہی پاس، لیکن میں بھی مولوی صاحب کے ہاتھ سے مار کھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دیوان قلی قطب شاہ مستعار لیا تو بھول گئے، رسالہ 'اردو' کے چند فائل منگائے تو وہ نسیان کی نذر ہو گئے۔ جب ذکر چھڑتا بالکل بھولے سے بن جاتے جیسے کہ بیچاروں نے لینا تو کجا، ان کتابوں کا کبھی نام تک نہیں سنا۔ ایسے میں بھلا کیفی صاحب کو انجمن کے احاطہ میں کون کتابیں لا کر دیتا۔

طرفین نے بہت کچھ ضبط سے کام لیا لیکن بیچارگی اور اس سلسلے میں بے بسی کا عالم دیکھ کر، آخر مجھی کو ہار ماننی پڑی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو کیفی صاحب کو کتابیں دینی چاہئیں۔

☆☆☆

یہ لوگ بھی سچ مچ عجیب لوگ تھے! پورا ساز و برگ لٹا چکے تھے، مکان گئے، مکین گئے، وطن چھوٹا وطن والے چھوٹے، صدیوں کا جما جمایا گھر گھروندا الٹ لٹا گیا، سب کچھ چھٹا، سب کچھ لٹا، لیکن غم کسی چیز کا نہیں۔ اگر کچھ غم تھا اور کچھ صدمہ تھا تو وہ محض اپنی اپنی کتابوں کا اور

اپنے اپنے کتب خانے کا تھا، کبھی دل گرفتہ اگر ہوئے تو اس وقت جب کبھی کتابوں کا ذکر چھڑا۔ کبھی آنکھوں میں، باوجود ضبط کے، نمی آئی تو اس سے جب قدیم نسخوں اور نایاب مخطوطوں اور مسودوں کی یاد آتی۔ سبحان اللہ!

نازم باہلِ عشق کہ بر قیس غیرت است
رشکِ بملک و جاہ فریدون، نکردہ کس

☆☆☆

کیفی صاحب جو کتاب چاہتے، میں ان کو پہنچا دیتا مگر ایک شرط ان سے کر رکھی تھی اور وہ یہ کہ جب کتابیں واپس کریں تو ان پر اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دیا کریں۔ گویا یہ ایک تبرک تھا میرے لیے۔

کتابیں مہینوں ان کے پاس رہتیں، اندر کمرے میں بیٹھ کر ہر وقت وہ کچھ لکھا کرتے تھے، کم از کم مجھے علم نہ ہو سکا کہ اس کی نوعیت کیا تھی، کیونکہ کبھی ان ایام میں ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی سامنے نہیں آئی۔

بٹوارے سے پیشتر کراچی میں خانم محمودہ رضویہ اپنی اردو دوستی اور اردو تالیفات کی بنا پر ادبی حلقوں میں مشہور تھیں۔ مولوی صاحب کے پاس بھی آیا کرتی تھیں اور جب کیفی صاحب تشریف لے آئے تو انجمن میں ان کا آنا جانا اور زیادہ ہو گیا۔ جب آتیں تو کیفی صاحب کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ساتھ لیتی آتیں، کبھی اچار، کبھی چٹنی، کبھی پائے اور کبھی کبھی کوئی خاص چٹ پٹی چیز۔ یہ اشیائے خوردنی کیفی صاحب اکثر تخلیہ میں تناول فرمایا کرتے تھے اور جب رات کے کھانے پر اکٹھے ہوتے تو اس خلوتی بدپرہیزیوں پر مولوی صاحب اور ان کے درمیان اکثر لے دے تو ہو جایا کرتی تھی لیکن کیفی صاحب ان چٹخاروں سے، جب تک یہاں رہے، باز نہیں آئے۔ کھاتے بھی رہے اور اندر ہی اندر بھگتے بھی رہے۔

مولوی صاحب کے چٹکلے، محمودہ رضویہ کی چٹ پٹی چیزیں اور میری کتابیں، جب تک کراچی میں قیام رہا کیفی صاحب کے یہ تینوں دل بہلاوے برابر قائم رہے۔

اس بات پر جگ بیت گئے۔ اٹھارہ سال کا عرصہ معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ یہ باتیں اور یادیں ذہن سے نکل چکی ہیں۔ ابھی جو میں اپنا کتب خانہ صاف کر رہا ہوں تو مجھے ان کتابوں میں سے، جن پر کیفی صاحب کے نوٹ لکھے ہوئے ہیں، چند کتابیں نظر آئیں۔ دیکھ کر دل بہت پسیج

گیا۔ بھولی بسری یادوں نے یکبارگی ذہن میں جنم لیا اور میں بے چین سا ہو گیا۔
اب وہ تمام باتیں رفت و گزشت ہو گئیں۔ جو پہلے حقیقتیں تھیں اب وہ افسانے ہو کر رہ گئے۔ نہ مولانا رہے نہ کیفی صاحب، عبدالرحمٰن صدیقی اللہ کو پیارے ہوئے، شعیب قریشی مرحوم چل بسے، مولوی زبیری گئے، خان بہادر رضا حسین بھی جدا ہو گئے اور قاضی احمد میاں اختر بھی جنّت کو سدھارے اور نہ جانے کتنی اور صورتیں بھی ان آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ اب ایک ہاشمی صاحب باقی رہ گئے ہیں سو وہ بھی اتنے دور کہ ملنا ملانا مقدر کا کھیل بن کے رہ گیا۔ اس محفل کو اب خواب و خیال سمجھنا چاہئے(۱)۔

خزاں رسید، گلستان بہ آں جمال نماند
سماعِ بلبلِ شوریدہ رفت و حال نماند

نشانِ لالہ، این باغ، از کہ میپرسی؟
برو کہ آنچہ تو دیدی، بجز خیال نماند

جی چاہتا ہے کہ کیفی صاحب نے میری کتابوں پر جو نوٹ لکھے ہیں، وہ یہاں نقل کر دوں، بطور تبرک کے اور بطور ایک علمی یادگار کے، کیونکہ انہوں نے یہ عبارتیں محض لکھنے کو نہیں لکھیں بلکہ ان میں بہت سی کام کی باتیں اور کار آمد چیزیں بیان کر گئے ہیں، مثلاً:

(۱) کلیات میر طبع نول کشور (۱۹۴۱ء) بمقدمۂ عبدالباری آسی مرحوم پر لکھتے ہیں:

"آسی صاحب کی کوشش کے باوجود بھی غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کا ذکر میں 'ہماری زبان' میں کر چکا ہوں۔ میر ان شاعروں میں سے ہیں جن کا کلیات بھی منتخب کلام کے ساتھ ساتھ زندہ رہنا چاہئے کلیات کو غور سے دیکھئے تو پایا جائے گا کہ مرزا غالب کی اکثر اور اچھی غزلیں وہ ہیں جو میر کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ غالب ضرور میر کو سامنے رکھ کر غزل کہا کرتے ہوں گے۔ میر کے بہترین نشتر وہ ہیں، جن میں عربی فارسی کے لفظ بالکل نہیں آتے یا آتے ہیں تو برائے نام اور عام فہم۔ سنئے یہ بھی ایک نشتر:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ، کچھ ہنسی نہیں ہے

کیا اچھا ہوتا کہ مرتب صاحب ہر دیوان کے شروع میں غزلوں کے مطلعوں کے اوّل مصرعے بطور اشاریہ کے دے دیتے x کیفی"

6.6.48

میں نے وہی اِملا ضبط کیا ہے جو مرحوم نے اختیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ ڈیش اور فل اسٹاپ کی بجائے چلیپا (x) کو قائم رکھا ہے۔ یہ عبارت 13 سطروں میں ہے۔

یہی کتاب پورے دس برس کے بعد میرے عزیز جناب جی۔ ایم۔ سیّد صاحب کے پاس 10 اکتوبر 1958ء سے لے کر 31 دسمبر 1959ء تک کراچی کے سینٹرل جیل میں رہی جب کہ وہ مارشل لا کے تحت زندانی تھے اور میں عارضۂ قلب کی زد میں وطن سے ہزاروں کوس دُور زیرِ علاج تھا۔

کیفی صاحب کا نوٹ پڑھ کر میں نے کلیات کو یوں ہی کھولا، اتفاق کی بات ہے جو غزل نکلی وہ یہ تھی:

جو تجھ بن نہ جینے کو، کہتے تھے ہم
سو، اس عہد کو اب، وفا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ! جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو، یاں سے لہو میں، نہا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے!
نظر میں سبھوں کی، خدا کر چلے

نہ دیکھا غمِ دوستاں، شکر ہے
یہی داغ اپنا، دکھا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

مولوی صاحب نے جب ہندوستان سے ترکِ وطن کیا تو ان کو کئی دنوں تک بہت ملال تھا۔ جب بھی نجی صحبتوں میں اورنگ آباد، دلّی اور حیدر آباد کا نام زبان پر آتا، وہاں کے موسم برشگال کا ذکر نکلتا، محفلوں اور مجلسوں کی بات چھڑتی، دوست اور احباب یاد آجاتے تو ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

لمحوں تک پھر مولانا اپنے اندر ڈُوب جاتے تھے۔

مجھے ان کے اس شعر پر ایک دن فارسی کا یہ شعر یاد آ گیا، جب سنایا تو لمبے عرصے تک کھوئے کھوئے سے رہے :

چو اسبابِ سفر، از بہر غربت، بار میکر دم
غریبانہ نگہ، بر آں درٌ و دیوار میکر دم

مولوی صاحب ایسے ہی مواقع پر میر کی اسؔ غزل کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

بہت آرزو تھی، گلی کی تری
سو، یاں سے لہو میں نہا کر چلے

یہ حقیقت تھی، مولانا ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے لیکن حالات نے انہیں رہنے نہیں دیا۔

☆☆☆

(۲) انتخاب کلام میر۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (1932ء)۔ مرتبہ مولانا عبدالحق صاحب بی۔اے (علیگ) چوتھا ایڈیشن۔ کیفی صاحب لکھتے ہیں :

"بہت اچھا ہوا کہ یہ انتخاب شائع کر دیا گیا صفحہ 86 پر یہ شعر درج ہے :

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

خواجہ حالی نے اس شعر کی بہت تعریف کی ہے(۲) اور اس سلسلے میں
ایک واقعے کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کچھ بھی ہو شعر ترمیم طلب نظر آتا
ہے۔ وہ شروع ہی کے دو تین لفظ ہیں جن میں ترمیم کی ضرورت ہے
موجودہ صورت میں ایسا معلوم ہوتا ہے عاشق کا جنون مستقل نہیں ہے
فصلی بخار کی طرح کبھی ہوا کبھی برسوں نہ ہوا۔ جنونِ عشق میں کمی
بیشی...... کہہ سکتے ہیں ہوتی رہتی ہے، لیکن وہ کسی وقت بھی بالکل رفع
نہیں ہو جاتا۔ جیسے بہار کے موسم میں جنون جوش مارتا ہے خیر پہلا
مصرع یوں ہو تو بہتر:

اس فصل گل میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے۔

کیفی۔ 6.6.48"

یہ نوٹ انیس سطروں پر مشتمل ہے۔

☆☆☆

(۳) دیوان اثر۔ مرتبہ عبدالحق آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو (۱۹۳۰ء) مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۳۴۹ھ۔

"اگرچہ میر اثر کا ادبی شاہکار ان کی مثنوی خواب و خیال ہے مگر ان
کی غزل میں بھی جو لوچ اور بیان میں جو شگفتہ سادگی ہے اس کی تعریف
نہیں ہو سکتی۔ کیسی پیاری پیاری بھولی باتیں کرتے ہیں۔
کیفی 6.6.48"

یہ نوشتہ سات سطروں میں ہے۔
کیفی صاحب نے صحیح فرمایا ہے۔ واقعی سادہ زبان میں غضب کا شعر کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً
ان کا یہ شعر:

یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس
دل کبھی اپنے ہاں رہا ہی نہیں

☆☆☆

(۴) دیوان درد (سلسلہ آصفیہ نمبر ۳) مطبع نظامی، بار دوم ۱۹۳۲ء اس پر یہ چھ سطری

رائے مرقوم فرمائی ہے:

"خواجہ میر درد ان چند شاعروں میں سے ہیں جو میرے ممدوح ہیں۔ میں میر درد کو ان کے تمام معاصرین پر ترجیح دیتا ہوں۔ کیا زبان اور اسلوب کے لحاظ سے اور کیا نقطۂ نظر کی آفاقیت کے لحاظ سے 6.6.48
کیفی"

یہ غضب کے دو شعر دیکھئے کتنے اچھے ہیں:

تو ہی نہ اگر، ملا کرے گا
عاشق پھر جی کے، کیا کرے گا
اپنی آنکھوں، اسے، میں دیکھوں
ایسا بھی کبھو خدا کرے گا

☆☆☆

(۵) انتخاب سودا۔ از ثاقب کانپوری، مکتبہ جامعہ دہلی، بار دوم ۱۹۴۱ء۔ اس پر کیفی نے لکھا ہے:

"میں سوداؔ کو میرؔ پر ترجیح دیتا ہوں۔ میرؔ کے ہاں صرف اپنا رونا جھیکنا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ سودا کے ہاں اور کچھ بھی ہے اس کی خارجیت میر کی طبیعت سے دُور تھی۔

6.6.48 کیفی"

کیفی صاحب نے پانچ سطروں میں یہ رائے رقم فرمائی ہے۔ اس انتخاب میں سے دو تین شعر سنتے چلیے سوداؔ فرماتے ہیں:

دیکھئے آج کہ کس طرح سے گزرے ہم پر
دن سے محشر کے تو، کل دست و گریبان تھی رات
سوداؔ سے شخص کے تئیں، آزردہ کیجئے
اے خود پرست، حیف! نہیں تُو وفا پرست

سوداؔ سے کا حال تُو نے نہ دیکھا کہ کیا ہوا؟
آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تُو ہنوز!

جو گزری مجھ پہ، مت اس سے کہو، ہوا سو ہوا
بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

(۶) دیوان حالیؔ۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد پر لکھا ہے :

"اچھا کیا جو ناشر نے مقدمہ شعر و شاعری سے الگ دیوان حالی شائع کیا (۳)۔

خواجہ صاحب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ :

'ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے، صحیح ثابت نہ ہوا۔ تیس برس سے زیادہ خواجہ صاحب کے انتقال کو ہوئے اس سے پہلے ہی کے یہ الفاظ ہیں جو علامتیں ان کو نظر آئی ہوں گی وہ اب تو کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ شاعری کو حالیؔ نے جہاں چھوڑا تھا وہ اس سے بہت آگے نکل گئی ہے اور یقیناً اور بھی ترقی کرے گی۔

6.6.48 کیفی"

حالیؔ کے دیوان کا ذکر نکلا ہے اور کیفی صاحب کی رائے بھی سامنے ہے۔ اب وہ اشعار بھی سنتے چلیے جو مولانا کو پسند تھے اور میں نے بار بار ان کی زبان سے سنے :

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بُتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کُھلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بُتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں (۴)
اب ٹھیرتی ہے، دیکھیے جاکر نظر کہاں
یا رب اس التفات کا انجام ہو بخیر

تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دُعا، ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اَثر کہاں
حالی نشاط نغمۂ و مے ڈھونڈتے ہو اب؟
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

کچھ ہنسی کھیل، سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں
چاک (۵) دل میں ہے مرے، جو کہ گریباں میں نہیں

ٹھیرتے ٹھیرتے دل، یوں ہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے، وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے، صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصت سیرِ چمن کہاں
جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انہیں، مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں، مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا، دیوانہ پن کہاں

پوچھی گئی نہ بات کہیں، پاسِ وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے، جتنے گراں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے، ہم جہاں رہے
دارا و جم کو، تیرے گداؤں پہ رشک ہے
نرخِ متاعِ عشق، الٰہی گراں رہے
کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے، اور ہمزباں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

یہ دو مشہور شعر بھی اسی غزل کے ہیں:

یاران تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
دریا کو اپنی موج طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر
ہم بھی بیٹھے تھے، جب وہ جانے لگے
چارہ گر! کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر، وقت دعا یاد رہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی
مگر یاد عزیزاں راہزن ہے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

اسی غزل میں حالی اپنے رفیقان گزشتہ کے مرنے کا ذکر کرتے ہوئے مطلع میں کہتا ہے:

زندہ پھرنے کی ہے ہوس، حالی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

(۷) دیوان نظیر اکبر آبادی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۴۲ء:

"انجمن نے بہت اچھا کیا کہ نظیر کے اس دیوان کو شایع کیا x فرحت نے مقدمہ لکھا تو مگر میں اس کے لئے انہیں داد نہیں دیتا۔ شیفتگی ان کے دماغ میں تھی جب انہوں نے یہ مقدمہ لکھا۔

کیفی 6.6.48"

(۸) دیوان تاباں۔ مرتبہ مولوی عبدالحق۔ شایع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۳۵ء۔

"تاباں کے تلمذ کا مسئلہ قطعی طور پر طے نہ ہو سکا x اور یہ ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ وہ حسن پرستی کا زمانہ تھا اور تاباں کی حیثیت حسن و جمال کے لحاظ سے۔ یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے۔ کی مصداق تھی x جس بزرگ سے کبھی اس نے کوئی بات پوچھ لی وہ اسے اپنا شاگرد بتانے لگا x

کیفی 6-6-48"

(۹) کلیات مومن۔ محمد ہاشم مہتمم۔ مطبع ہاشمی۔ ۱۲۸۲ھ میرٹھ۔ حسب فرمایش یکتائے سوداگران دہلوی، شیخ محمد حسین صاحب بتاریخ ۲۵ رجب المرجب ۱۲۸۲ھ۔ بکتابت شیخ عبدالحق کیرانوی۔

"مومن کے کیا کہنے ہیں۔ کسی سے کم نہیں۔ ان کے کلام کا بھی انتخاب شایع ہونا چاہئے۔

کیفی 6-6-48"

☆☆☆
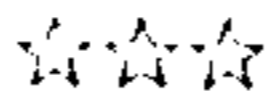
ایک عرصے تک کیفی صاحب یہاں رہے۔ پھر طے یہ ہوا کہ وہ دلّی جا کر انجمن ترقی اردو (ہند) کے کام کو سنبھالیں۔ ایسے ہی دو دوستوں کی جدائی پر کسی شاعر نے کہا ہے:

پتا ٹوٹا ڈار سے، چلی پون اُڑائے
اب کے بچھڑے نا ہی ملیں گے، دور پڑے ہیں جائے

کیفی صاحب یہاں سے جب گئے تو پھر اس طرح ہی گئے کہ دوبارہ آنے کی نوبت نہیں آئی اور یہ دونوں یار خوش گفتار ایسے جُدا ہوئے کہ ایک دوسرے کا دیکھنا پھر کبھی نصیب نہیں ہوا۔

جو پانی اج پتنوں لگدا فیر نہ آوندا پلٹے
بیڑی دا پور، ترنجن دیاں کڑیاں کدی نا بیٹھن رلکے

☆☆☆

رخصت کے واقعات کا بس اتنا ہوش ہے
دیکھا کیے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی

رخصت کی نہ تو تاریخ یاد ہے، اور نہ اب وداع کے واقعات ہی ذہن میں محفوظ رہے۔ چند دن کا ساتھ اگر چھُٹنے لگتا ہے تو دل میں ایک کسک سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہاں تو نصف صدی سے بھی زیادہ کا ساتھ تھا، دوستی تھی اور یارانہ تھا۔ یارانہ بھی ایسا کہ مثالی۔ اتنا تو بہر حال ظاہر ہے کہ جب دونوں جدا ہوئے تو دل پہ کیا کچھ نہ بیتی ہو گی۔

☆☆☆

جب 'لیاقت نہرو سمجھوتہ' ہوا اور پاکستان کے اخبار نویسوں کا وفد میرے برادر بزرگوار پیر علی محمد راشدی کی رہنمائی میں دہلی جانے لگا تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

دہلی کے دورانِ قیام میں ایک رات 'تیج' اخبار کے مالک آنجہانی لالہ دیش بندھو گپتا کی قیام گاہ پر ایک مشاعرہ ہوا (۶)۔ مشاعرہ اپنی نوعیت اور فضا کے لحاظ سے ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ اسی مشاعرے میں اَمن دہلوی صاحب نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع تھا:

یگانگی کا جو پیغام لے کے آئے ہیں
خدا گواہ بڑا کام لے کے آئے ہیں

اور لالہ دیش بندھو گپتا کے صاحبزادے جناب دھرم پال گپتا وفائی غزل میں یہ شعر تھے:

دکھ درد لیا ہے، غم ایام لیا ہے

دل دے کے محبت میں یہ انعام لیا ہے
فرقت میں تصور سے عجب کام لیا ہے
جیسے ترے دامن کو ابھی تھام لیا ہے
ساقی ترا سو مرتبہ جب نام لیا ہے
تب جا کے کہیں ہاتھ میں اک جام لیا ہے
ہنگامہ ہستی کو کیا فتح اجل نے
اب آئی ہے نیند اور کچھ آرام کیا ہے
جب یاد کیا ہے تو تجھے یاد کیا ہے
جب نام لیا ہے تو ترا نام لیا ہے

بٹوارے کے بعد دونوں ملکوں کے شاعر اور ادیب جو کبھی ایک ساتھ رہ چکے تھے، پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے گلے لگے تھے۔ سب کے دل جذبات سے معمور تھے، آنکھیں تھیں کہ ہر آن اشک بداماں، کسی نے اگلی صحبتوں کا ذکر چھیڑا اور امنڈ آئیں۔

ٹھنڈی چاندنی کے نورانی فرش پر سے خنک ہوائیں، جب پنڈت ہری چند اختر مرحوم کے اشعار کو، فضا میں لے اُڑیں تو یقین جانیے کہ یکبارگی چاروں طرف مشاعرے میں سسکیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ تو یوں ہوا کہ ہر ایک نے پولیٹیکل مصلحت کی بنا پر بہت ہی ضبط سے کام لیا، ورنہ سچ ہے کہ کہرام مچ جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی مصلحت کوشیوں کے باوجود طرفین نے چپکے چپکے اور چھپا چھپا کر اپنی آنکھیں بار بار پونچھیں تھیں۔ اس مرحوم کے دلدوز اشعار یہ تھے :

یاس و حرمان کی، غم و آلام کی باتیں کریں
آ دل ایذا طلب، کچھ کام کی باتیں کریں
ہم نے مانا عہد الفت، اک خیال خام تھا
آؤ لیکن، اس خیال خام کی باتیں کریں
دوست سے کہہ دیں دل بے مدعا کی داستان
آج ساقی سے شکست جام کی باتیں کریں
جس کی دنیا آپ سے تھی، جس کی دنیا آپ تھے

آج اس بدبخت کے انجام کی باتیں کریں

"شکست جام" پر اور اس آخری شعر پر تو سبھی دل تھام کر رہ گئے۔ کتنوں کو تو ضبط کا یارا نہ رہا۔

مشاعرے کی بات یوں درمیان میں آئی کہ پنڈت کیفی میر مشاعرہ تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر میں آگے بڑھ کر ان سے جا کے ملا۔ بہت پیار کیا، کوٹھی کا پتہ دیا اور دوسری صبح ملنے کی تاکید کی لیکن وائے ناکامی! یہاں کسے وقت تھا کہ مقررہ پروگرام (Conducted tour) کو توڑ کر کوئی جا سکے۔

☆☆☆

ایک عرصہ بیت گیا۔ ایک دفعہ مولوی صاحب کی زبانی میں نے سنا کہ لال قلعہ کے دیوانِ عام میں جشن آزادی کے سلسلے میں ایک دھوم دھام کا مشاعرہ کیا گیا۔ دیوان عام یا تو شاہ جہان کے دور میں سجتا تھا یا پھر اس رات کو اس میں چار چاند لگے تھے۔ صاحب صدر کی نشست کا انتظام تخت طاؤس کی کرسی پر تھا یعنی بالفاظ دیگر شاہجہان کے شہ نشین پر۔

نتیجہ کیا نکلا؟ مولانا نے یہاں تک پہنچ کر بھرائی ہوئی آواز میں اپنے سر کو ایک جھٹکا دے کر بڑے جوش سے کہا: "سنا آپ نے، کیفی صاحب جب آئے اور اپنی نشست کا یہ انتظام دیکھا تو غصے میں کانپنے لگے، کڑک کر کہا: "تم لوگوں کی یہ جرات! یہ گستاخی! شاہجہان کی مسند اور اس پر ہم بیٹھیں؟"

یہ کہہ کر واپس لوٹے۔ بڑے جتن کیے گئے تب جا کر رُکے لیکن صدارت انہوں نے نیچے، اس شہ نشین کے قدموں میں، فرش پر بیٹھ کے کی۔ مولانا نے کہا کہ دیکھنے والوں کا قول ہے کہ کیفی صاحب بیٹھ تو گئے مگر آخر تک ان کا غصہ فرو نہیں ہوا اور مزاج جو مکدر ہو چکا تھا وہ مکدر ہی رہا۔

اس کے بعد پھر فقط ان کی وفات کی خبر ہم تک پہنچی اور اس طرح یہ افسانہ ختم ہو گیا، پنجابی شاعر ہدایت اللہ نے کیا خوب کہا ہے۔

الف ایک ترنجن توں کت اگے
ساڈے نال دیاں چرخے چک گیاں
رہی شکل نہ اونھاں دی یاد سانوں
جیڑھیاں صورتاں مٹی دے وچ لک گیاں

ساڈے ہان دے رہے نہ رکھ لوگو!
جھڑے پھل پتر شاخاں سک گیاں

پُٹی چال شطرنج ہدایت اللہ
باری برد ہوئی گوٹاں مک گیاں

اب اس طرح کی صورتیں کبھی کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔

کراچی: ۱۰جون سنہ ۶۳ء

نظر ثانی: ۱۰ اپریل سنہ ۶۶ء

حواشی:

(۱) ہاشمی صاحب کا بھی ۱۹جولائی سنہ ۱۹۶۴ء کو انتقال ہو گیا۔

(۲) "چاک گریبان" کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں ایک شاعر کے دیوان سے ۲۳ نمونے لکھ کر آخر میں میر کا مذکورہ شعر دیا ہے اور فرمایا ہے:

"مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے میر سے بہتر "چاک گریباں" کا مضمون باندھا ہو" (دیوان و مقدمہ صفحہ ۱۳۶ طبع لاہور)۔

(۳) دیوان حالی مقدمہ کے ساتھ سب سے پہلے مرتبہ مطبع انصار واقع دہلی میں ۱۸۹۳ء میں دو قسم کے کاغذ پر چھپا تھا۔

(۴) یہ غزل حالی نے دلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی۔ داغ بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ ان کی غزل تھی:

اس مبتدا کی دیکھئے نکلی خبر کہاں

حضرت مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے کہ خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے ان سے کہا کہ حالی کی غزل اس طرح مشاعرے پر چھا گئی کہ جب شمع داغ کے سامنے آئی تو داغ نے کہا: اب میری غزل خود میری نگاہ میں گر گئی (یادگار حالی ص ۱۳)

(۵) چاک دل کا مضمون دیکھ کر مصحفی کا یہ شعر یاد آیا:

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
پر ترے دل میں بہت کام رفو کا نکلا

(۶) یہ مشاعرہ سنیچر کے روز ۶ مئی ۱۹۵۰ء کو رات کے ساڑھے نو بجے منعقد ہوا تھا اور دوسرے دن اس کی روداد تیج اخبار میں چھپی تھی۔

سندھ اور ایران کے تعلقات

(سیاسی اور ثقافتی)

سندھ جو اس وقت مملکتِ پاکستان کا ایک اہم ترین جزو ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ــــ اس کی قدامت اور اس کے شاندار تمدنی اور علمی ماضی کی وجہ سے ــــ کوئی پڑھا لکھا غیر واقف نہیں ہے۔ موہن جودڑو کی اس قدیم سرزمین اور ایران کے درمیان ظہور تاریخ سے ہی گہرے روابط کے آثار پائے جاتے ہیں (۱)۔ تاریخی کھنڈرات سے کشف شدہ چیزیں، سماجی اور تجارتی تعلقات کا پتہ دیتی ہیں۔ قدیم دار السلطنت بہمن آباد (۲)، ساسانی ساخت کا رنی کوٹ ،جو دیوارِ چین کا چھوٹا سا نمونہ ہے (۳)، یا خود میرے تاریخی قصبے بہمن کے نام سے اس بات کی شہادت آج بھی موجود ہے کہ ہمارے سیاسی روابط کے نقوشِ زمانہ قدیم سے ہی کس قدر گہرے ہیں علاوہ ازیں بہرام گور اور شنگل کا واقعہ (۴)، سندھ پر بہرام گور کے اثرات اور سندھ سے ہزاروں "لولیاں شوخ شیرین" (۵)، کا ایران جانا، کس کو معلوم نہیں ہے۔ فردوسی کے یہ اشعار کس نے نہیں پڑھے ہوں گے۔

بنزدیک شنگل فرستاد کس!
چنیں گفت اے شاہِ فریاد رس
ازاں لولیاں برگزیں، دہ ہزار!
نر و مادہ برزخم بربط سوار

کہ استادہ برزخم دستان بود!

در آواز او، رامش جاں بود!

(۲)

اسلام کے بعد ایران اور سندھ کے باہمی روابط اتنے گہرے اور اس طرح مرتب رہے ہیں کہ چودہ سو برس میں کبھی یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا۔ سیاسی ہو یا ثقافتی، فرہنگی ہو یا فنی بہر حال کسی نہ کسی روپ اور ڈھنگ میں یہ روابط ہر دور اور ہر سمے میں قائم اور مستحکم رہے ہیں۔

ان روابط کی تاریخ کو، تعلقات کے گوناگوں صورتِ حال اور کثرت مواد اور وسیع واقعات کی بنا پر میں کہاں سے شروع کروں، کن کن عنوانوں کے تحت بیان کروں اور پھر کہاں تک بیان کروں، میرے لیے واقعی حیران کن بات ہے:

سر ایں رشتہ ندانم، از کجا بکشائم

داستان طویل اور وقت قلیل ہے، لہٰذا یہاں پر میں اس حکایتِ شیریں کا فقط ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

آپ سب جانتے ہیں کہ سندھ میں اسلام ایران کے ذریعہ پہنچا۔ اگرچہ تاریخی راستوں اور راہوں کے ذریعے ہمارے درمیان تجارتی آمد و رفت قدیم سے موجود تھی (۶)۔ لیکن شیراز سے محمد بن قاسم کے ساتھ ایرانی لشکری جب سندھ میں وارد ہوئے تو ان عمومی روابط نے مذہبی رشتہ کی صورت اختیار کی اور عربوں کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی بستیاں اور نو آبادیاں از سر نو سندھ میں آباد ہو گئیں۔ سیستان کے طاہر ذوالیمین (۲۰۵۔۲۰۷ھ) یا یعقوب بن لیث صفار (۲۵۳۔۲۶۵ھ) کے زمانے میں سندھ میں ایرانی عمالوں اور سپاہیوں کے آنے جانے کے واضح آثار تاریخ میں مل جاتے ہیں (۷)۔

عربی دورِ تسلط میں یہاں عربی زبان کو سیاسی بنا پر سندھ میں قدم جمانے کے مواقع ملے، وہاں یہ فطری امر ہے کہ تجارتی تعلقات اور آنے جانے والے قافلوں (۸)، یا ان ایرانیوں کی وجہ سے جو عربوں کے ساتھ بس گئے، ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ایرانی زبان کو بھی یہاں متعارف ہونے کے مواقع ملے ہوں گے (۹)۔ اگرچہ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس بات کو اپنے خیال میں غیر اہم سمجھ کر، بیان کرنے سے گریز کیا ہے لیکن اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایران اور ایرانی زبان اس وقت محکوم تھی اس کے اثرات کا وضاحت سے ذکر نہ کرنا، کوئی غیر معمولی بات

نہیں تھی۔

سندھ کی فارسی زبان سے آشنائی اور اس سے لگاؤ اگر پہلے سے پیدا شدہ نہیں تھا تو عربی زبان کے تسلط ختم ہو جانے کے بعد، فارسی زبان کا بعد کے ادوار میں اس کی جگہ لے لینا کس طرح ممکن تھا۔

(۳)

عربوں سے زمام حکومت، تھوڑے سے عرصہ کی طوائف الملوکی کے بعد، سندھ کے ایک مقامی قبیلے نے لے لی جو "سومرہ" خانوادہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے، ان کے زمانے میں قرامطہ کا اقتدار (۱۰)، اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس دور کا ایرانی فکر اور اثرات سندھ پر زیادہ قوی ہو گئے تھے۔ محمود نے جب ملتان (۴۰۱ھ) اور منصورہ (۴۱۶ھ)، محکوم کیا تو ظاہری طور پر قرامطہ (۱۱)، ہی کے وجود کو شرعی جواز کے لیے استعمال کیا تھا۔

محمود کے متواتر حملوں اور اس کے سندھ اور پنجاب پر حکومت قائم کرنے کی وجہ سے سندھ میں ایرانی اثرات اور اس کے فرہنگ میں ایک تازگی پیدا ہو گئی۔ اس دور کے بہت سے فارسی شعراء نے سندھ کو اپنے اشعار میں مختلف صورتوں سے یاد کیا ہے جو سندھ اور اس میں رہنے والوں سے ان کی گہری واقفیت اور دلچسپی کا پتہ دیتا ہے۔ دقیقی (وفات قبل ۳۸۴ھ)، فرخی (وفات ۴۲۹ھ)، عنصری (وفات ۴۳۱ھ)، قطران تبریزی (وفات ۴۶۶ھ)، ناصر خسرو (وفات ۴۸۱ھ)، مسعود سلمان (وفات ۵۱۵ھ)، عسجدی مروزی (وفات ۵۱۴ھ)، امیر معزی (وفات ۲۱۔۵۱۸ھ)، اور مختار غزنوی (وفات ۵۳۵ھ) کے اشعار اس سلسلے میں مطالع کرنے کے قابل ہیں (۱۲)۔

غزنوی اثرات کے دور میں فارسی شعراء اور مصنفین کی آمدورفت نے سندھ کے اندر جو کچھ پیدا کیا، ہمیں افسوس ہے کہ زمانے کے دست دبرد نے سارے وہ آثار کچھ اس طرح مٹا دیے کہ آج ہم ان علمی یادگاروں میں سے کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے۔ بہر حال یہ تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملتان اور منصورہ پر تسلط کی وجہ سے علمی تخلیقات لازماً ہوئی ہوں گی۔

(۴)

غزنویوں کے دور (۴۰۱۔۴۴۱ھ) کے علمی اثاثے غائب ہو جانے کا ہم کیوں افسوس کریں۔ جبکہ ہمارے یہاں اس دور کے بعد ناصر الدین قباچہ کے عہد (۶۰۷۔۶۲۵ھ) کا علمی

ذخیرہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

ناصر الدین اور اس کے علم پرور وزیر عین الملک الشعری کی معارف نوازیوں نے تاتاریوں کی غارت گری اور خونریزی سے ترکِ وطن کر کے یہاں آئے ہوئے کئی اصحاب علم و فضل اور نامی شعراء کو اپنے دربار میں لا کر جمع کر دیا تھا(۱۳)۔

مولانا قطب الدین کاشانی(۱۴)، قاضی شرف الدین اصفہانی(۱۵)، سید الندما تاج الفضلا فخر القدما شمس الدین محمد بلخی، فخر الشعرا ضیاء الدین سجزی، منہاج سراج قاضی (۶۲۴ھ)، سدید الدین عونی (۶۱۷ھ)، "بفروش" شاعر اور فضلی ملتانی(۱۶)، کے وہ چند نام ہیں جو ہم تک اتفاق سے محفوظ رہ کر پہنچے ہیں جن کا نام اور کام مٹ گیا۔ وہ نہ جانے کتنے ہوں گے جو اس دربار اور دور سے متعلق تھے۔

"جامع الحکایات"، "الفرج بعد شدۃ" کا ترجمہ، طبقات ناصری کی تالیف کا آغاز، اور چچ نامہ (۶۱۳ھ)، اسی عہدِ زریں کی وہ علمی یادگاریں ہیں جو خوش بختی کی وجہ سے دست و بردِ زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچے ہیں۔

چچ نامہ، کا فارسی مترجم سندھ کے ایک عالم' مولانا کمال الدین اسمٰعیل کے لیے جن سے ان کو 'فتح نامہ' کا عربی متن ملا لکھا ہے کہ :وہ فارسی کے علوم و فنون میں بے نظیر تھے(۱۷)۔ یہ بزرگ الور کا تھا جو شہر سندھ کے سابق بادشاہوں کا دار السلطنت تھا۔

محمد بن علی کے اس قول سے سندھ میں فارسی علوم کی ترویج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فارسی مترجم خود بھی شاعر تھا۔ "چچ نامہ" میں بھی اس کے اشعار موجود ہیں(۱۸)۔

یہ عجیب اتفاق نیز افتخار کی بات ہے کہ فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ، جس کو دیوان کہا گیا ہے(۱۹)، سرزمین سندھ میں ترتیب پایا اور پھر دوسرے قدیم ترین تذکرہ 'لباب الالباب' کی تکمیل کا شرف بھی سندھ ہی کو حاصل رہا۔

اس دور کے فارسی شاعری کے نمونے ہمیں 'لباب الالباب' میں ملتے ہیں۔ خود عوفی کا وہ قصیدہ جو قلعہ بکھر کی فتح پر اس نے لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک ایک قیمتی ادبی نشان ہے(۲۰)۔

بہر حال یہ سب علمی آثار اور نوادر غزنوی عہد کے بعد کی بچی کھچی چیزیں ہیں۔ جو کچھ ضائع ہوا اس کا نقصان نہ فقط سندھ کے لیے بلکہ فارسی ادب کی تاریخ کے لیے ایک ابدی خسارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی (وفات ۶۶۶ھ)(۲۱)، اس دور کے جید صوفی اور صاحب حال وقال بزرگ تھے۔ ان کے پاس سماع کا رواج تھا جس میں زیادہ تر فارسی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس شعر نے شیخ کو عرصہ تک وجد کی کیفیت میں بے حال رکھا۔

مستان کہ شراب ناب خوردند
از پہلوئے خود کباب خوردند(۲۲)۔

اس شیخ بہاء الدین ذکریا کے پاس فخر الدین عراقی (۶۸۸ھ) وارد ہوا اور ان کی غزل جس کا مطلع ہے:

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

اور اس مطلع والی غزل:

در کوئے خرابات کسے راکہ نیاز، است
ہوشیاری د مستیش، ہمہ عین نماز است

یہاں کی یادگار ہیں (۲۳)۔

مرند سے شیخ عثمان قلندر لعل شہباز جس کی خانقاہ سندھ کے تاریخی شہر سیوستان میں آج تک مرجع خلائق ہے، بلبن کے دور میں جبکہ اس کا بیٹا خان شہید (۶۸۳۔۶۱۸ھ) ملتان کا عامل تھا۔ مرند سے سندھ پہنچا۔ بہت سی فارسی غزلیں اسی شیخ عثمان مرندی (متوفی ۶۵۰ھ) سے منسوب ہیں (۲۴)۔

یہ یاد رہنا چاہیے کہ جلال الدین خوارزم شاہ (۶۱۸۔۱۹ھ) کی آمد اور سندھ میں سال بھر تک رہنا اور نواحِ دیبل میں جامع مسجد بنا جانا زیر بحث دور کے آغاز کا اہم سیاسی واقع ہے۔

(۵)

تغلقوں کے سندھ پر حملے (۷۵۲ھ/۱۳۵۱ع)، سے شروع ہوتے ہیں جبکہ یہاں سومرو خاندان کی جگہ پر سمہ خانوادہ حکمران ہو چکا تھا۔

اس دور میں سندھ میں فارسی شعر گوئی کے مقامی طور پر رواج پانے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس اس فارسی شعر کا ایک مصرعہ ثبوت کے لیے موجود ہے جو سندھی نژاد والیٔ سندھ نے فیروز تغلق کے سامنے پڑھا تھا۔

شاہ بخشندہ توئی بندہ شرمندہ منم (۲۵)۔

اس دور سے متعلق ملتان کے حاکم عین الملک ماہرو کے مکاتیب کا مجموعہ 'منشات ماہرو' کے نام سے موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور میں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی اور سندھ کے سلسلے میں نوشت دخواند کے لیے بھی فارسی ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مجموعہ میں سندھ کے حکمران کے نام جو خطوط ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں (۲۶)۔

سندھ کے اندر یہ بھی رواج اسی زمانے میں پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے بزرگوں کے مقابر پر فارسی کے کتبے اور اشعار کندہ کر کے لگاتے تھے۔ چنانچہ حاجی ترابی کا کتبہ (۷۸۲ھ)(۲۷)، اور محمد تغلق کی عارضی قبر پر سیوہن کے کتبے (۲۸)، اس کی گواہی دیتے ہیں۔

برصغیر ھندوپاک میں کلام مجید کے دو فارسی ترجمے بھی پہلے سندھ میں ہی ہوئے ہیں، جن میں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت (متوفی ۷۸۵ھ) کا ترجمہ (۲۹)، اس زیر بحث دور کی یادگار ہے اور دوسرا ترجمہ (اگر شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر 'بحر مواج' کو، تفسیر کی حیثیت تک رکھا جائے) دسویں صدی ہجری میں مخدوم نوح ہالائی کا کیا ہوا ہے۔ یہ فارسی ترجمہ ہے جو ہندوپاک کے تمام فارسی تراجم سے مقدم تر ہے (۳۰)۔

اگرچہ موضوع سے متعلق نہیں لیکن ایک عجیب اتفاق کا یہاں ذکر کر دینا دلچسپ ہونے کی وجہ سے میرے خیال میں گراں نہ گزرنا چاہیے۔ وہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ کلام مجید کا پہلا ترجمہ جو کسی بھی غیر زبان میں ہوا وہ بھی سندھ ہی میں اور یہاں کی زبان میں ہوا ہے (۳۱)۔

(۶)

آٹھویں صدی ہجری میں یا اس کے بعد ہمیں بہت سے شرفا اور علمی خانوادے ایسے ملتے ہیں جنہوں نے ایران کو چھوڑ کر سندھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی جن کی بود و باش، مجالس اور صحبتوں کی وجہ سے سندھ میں فارسی زبان کی ترویج اور اشاعت کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

اس سلسلہ میں شیراز کے انجوی سادات کی ایک شاخ کے مورث سید محمد کا نام لیا جا سکتا ہے جو ۷۸۶ھ میں شیراز سے منتقل ہو کر سندھ میں آ کر بسا۔ خاندان کی تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی اسی سید محمد کا بے حد معتقد تھا اور اس نے بھی ساتھ ہی ترکِ وطن کیا تھا، لیکن قندھار میں پہنچنے کے بعد سید صاحب نے اسے باصرار واپس کر دیا۔ تاریخ میں ہے کہ: حافظ گریہ میکرد و میرفت (۳۲)۔

اس دور میں دار السلطنت ٹھٹھہ کے اندر خواہ سندھ کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں کثرت سے مدارس موجود تھے (۳۳)، جن میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کتابیں بھی پڑھائی جاتی رہی ہوں گی۔

(۷)

خراسان کا آخری تیموری سلطان شاہ حسین بایقرا (۸۶۳۔۹۱۲ھ) اور سندھ کے والی جام نظام الدین (۸۶۶۔۹۱۴ھ) نہ فقط معاصر تھے بلکہ ہم ذوق بھی تھے۔ معارف نوازی اور ہنر پروری میں دوش بدوش تھے جس کی وجہ سے ہرات اور ٹھٹھہ ایک ہی وقت میں شعراا ور علماء کے مرجع بنے ہوئے تھے (۳۴)، اور مابین مشابہت کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تیموریوں کی اس آخری سلطنت کی بساط اجڑی تو عین اسی وقت سندھ کی سمہ سلطنت کا چراغ بھی گل ہو گیا۔

آزاد سندھی حکومت کا یہ آخری تاجدار جام نظام الدین نہ فقط علم دوست اور ہنر پرور تھا بلکہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے:

اے آں کہ، ترا نظام الدین می خوانند
تو مفخری، مراچنیں می خوانند
گرددرہِ دین، از تو خطائے افتند
شک نیست کہ ترا، کافر لعین می خوانند (۳۵)۔

مولانا عبدالعزیز ابہری اپنے خاندان کو ساتھ لے کر اسی دور میں سندھ آ کر مستقل طور پر مقیم ہو گیا (۳۶)، اور علوم کی نشر واشاعت کے لیے ایک بڑے مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ علامہ جلال الدین دوانی (۹۰۸ھ) نے بھی اسی سلطان کی معارف پروریوں کا شہرہ سن کر یہاں آنا چاہا تھا۔ لیکن ان کے دو شاگرد میر شمس اور میر معین، سلطان نظام الدین سے زادِ راہ لے کر جب تک وہاں پہنچے، اس سے پہلے علامہ دوانی دوسری دنیا کا سفر اختیار کر چکا تھا (۳۷)۔

۹۰۱ھ میں مشہد مقدس سے سید یعقوب اور سید اسحاق تشریف لائے جن کا خاندان ساداتِ مشہدی کے نام سے ٹھٹھہ میں اس وقت تک چلا آرہا ہے (۳۸)۔ مشہدیوں کا دوسرا خانوادہ جو دو بھائیوں سید احمد و سید محمد فرزندان سید محمد عابد مشہدی پر مشتمل تھا ۹۰۶ھ میں منتقل ہو کر آیا (۳۹)۔

مکلی کے قبرستان میں خواجہ شرف الدین شیرازی کی قبر بھی اس دور کی یادگار ہے جس پر یہ کتبہ موجود ہے:

وفات مرحوم الواصل الی رحمتہ اللہ
خواجہ شرف الدین شیرازی
فی تاریخ شہر جمادی الاول ۹۱۱ھ (۴۰)۔

یہ بزرگ بھی انہی آنے والوں میں سے ایک ہیں جن کو سلطان نظام الدین کی معارف پروریاں ایران سے سندھ کھینچ لائی تھیں۔

ٹھٹھہ میں مغلپورہ اسی سلطان کی یادگار ہے۔ یہ محلہ اس لیے سرکاری خرچ سے بنایا گیا تھا کہ ایران سے آنے والے شرفاء اور علماء آسانی اور آرام کے ساتھ آتے ہی اس میں بس جائیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور میں ایرانیوں کے لیے مغل اور 'ولایت زاد' کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ مغل لفظ غالباً اس لیے ایرانیوں کے لیے مشہور ہو گیا تھا کہ اس دور میں ایران کے مختلف حصے تیموری مغلوں کے قبضے میں تھے۔

دسویں صدی ہجری کی ابتدا جس طرح ایران کے لیے ہلاکت اور انتشار کا باعث تھی، اسی طرح سندھ کے لیے بھی اس صدی کی ابتدا مستقبل کے مستقل سیاسی نحوست کا باعث بن گئی۔ ایران میں تیموریوں کا چراغ بجھنے لگا تھا۔ شیبانی، صفوی اور بابر کی قوتیں جدا جدا حصوں میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ یہاں سندھ میں سلطان نظام الدین کے انتقال نے خاندانی نزاع کا وہ سلسلہ پیدا کیا جس نے سندھ کی آزاد سلطنت کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیں۔

ایران شاہ اسماعیل صفوی (۹۰۶۔۹۳۰ھ) کے ذریعے جلد ہی ایک مستقل خاندان کے تحت آ کر نہ فقط انتشار اور طوائف الملوکی کی ہلاکت سے بچ گیا، بلکہ از سر نو آزادی حاصل کر کے اپنے تمام منتشر اجزاء کو پھر سے جمع کر کے مستقل سلطنت کی بنیادیں استوار کر کے، صحیح راستہ پر گامزن ہو گیا۔ لیکن سندھ کی حالت درست نہ ہو سکی کیونکہ تین چار افراد پر مشتمل ارغون خاندان جو سلطنت ہرات کی طرف سے قندھار، کابل، بست اور زمین دلور پر نیابت کر رہا تھا، وہ بابر کے قندھار اور کابل پر قبضہ کرنے کے بعد سندھ کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً سندھ پر قابض ہو گیا۔

ابھی خانہ جنگی چل ہی رہی تھی کہ ہرات کے تیموری سلطنت کا آوارہ گرد شہزادہ بدیع

الزمان(۴۱)، سندھ میں آکر جام نظام الدین کے جانشین جام فیروز کے پاس پناہ گزین ہوا (۱۸۔۹۱۹ھ)۔ لیکن پھر جلد ہی یہاں سے ترکی کی طرف نکل گیا۔

(۸)

کہا جاتا ہے کہ تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ارغونی تسلط کی تصویر کا سیاسی رُخ، جس کی تاریخ (۹۲۷ھ) "خرابی سند" سے نکلتی ہے (۴۲)، بلاشبہ تاریک نہیں بلکہ تاریک تر رہا۔ لیکن دوسرا رُخ جو خالص علمی اور فرہنگی تھا وہ روشن بلکہ منور تھا۔

سندھ اگرچہ فارسی زبان کو گزشتہ ادوار میں ہی درباری اور فرہنگی زبان بنا چکا تھا، لیکن اس خالص فارسی گو خاندان کے تسلط کے بعد، زبان اور ایران سے ہمارے روابط نہ فقط اور گہرے بلکہ زیادہ استوار ہو گئے۔ شیراز، مشہد، سبزوار اور دیگر ایرانی شہروں سے سینکڑوں روحانی اور علمی خانوادے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہو گئے، جن کی وجہ سے فارسی اور فارسی تمدن کی گویا ایک پوری دنیا سندھ کے اندر پیدا ہو گئی۔

یہی دور ہے جس میں غیاث الدین منصور دشتکی شیرازی کے خانوادے سے سید شکر اللہ شیرازی (۴۳)، سندھ میں چلے آئے جس کے خاندان نے سندھ میں کئی ایک جید علماء، فارسی شعراء، اصحاب طریقت اور اصحاب تصنیف کو جنم دیا۔

شیرازی سادات کا دوسرا خاندان سید کمال اور سید جمال نامی دو بھائیوں پر مشتمل اسی سید شکر اللہ کی معیت میں ٹھٹھہ پہنچا تھا جن کی اولاد سے بھی کئی ایک مشاہیر وجود میں آئے (۴۴)۔

مولانا جامیؒ کے دوست اور رفیقِ روحانی شیخ جلال الدین بایزید پورانی سے ہر وہ پڑھا لکھا بخوبی واقف ہے، جس نے 'نفحات الانس' پڑھا ہے۔ اسی شیخ جلال الدین پورانی کے نواسے میرک شیخ محمود وغیرہ سندھ میں اسی زیرِ بحث دور میں تشریف لائے (۴۵)۔ اور دو سو برس تک ان کا خاندان سندھ میں علماء، شعر اور مصنفین کو پیدا کرتا رہا۔ سندھ میں یہ خاندان میرکان سبزواری عرب شاہی کے نام سے بھی مشہور ہے اور پورانی سادات بھی کہلاتا ہے۔

میر غیاث الدین محمد معروف، سلطان رضائی عریضی سبزواری صاحب 'حبیب السیر' یعنی خواند میر کا نواسہ تھا (۴۶)۔ یہ بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر اسی دور میں منتقل ہو کر آ گیا تھا، اس کے سندھی اخلاف نے بھی سندھ کے اندر فارسی کے بہت سے پائدار علمی نقوش چھوڑے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ صاحب 'حبیب السیر' کے تعلقات ارغون خاندان

سے بہت گہرے اور دوستانہ تھے۔ خواند میر خود بھی یہاں آیا تھا لیکن پھر ہندوستان جاکر رہا جہاں ان کی وفات ہوئی (۴۷)۔

مولانا مصلح الدین لاری (۴۸)، مولانا عبدالخالق گیلانی (۴۹)، مولانا یار محمد یاری ہروی (۵۰)، اور مولانا یونس سمرقندی (۵۱)، بھی اسی دور کے آنے اور بسنے والوں میں سے ہیں اور حیدر کلوچ بھی اسی دور میں سندھ میں آکر بسا اور یہیں انتقال کیا (۵۲)۔

شاہ جہانگیر ہاشمی کرمانی کی مثنوی مظہر الآثار (۹۴۰ھ) (۵۳)، فخری ہروی کا تذکرہ روضۃ السلاطین (۹۴۰ھ) (۵۴)، اور فنِ شاعری میں صنائع الحسن (۵۵)، اور خواتین شعرا کا تذکرہ جواہر العجائب (۵۶)، یا فتاوائے پورانی (۵۷)، اور آداب المریدین (۵۸)، اسی دور کی، ہمارے ہاں کی اور اوپر ذکر کیے ہوئے خانوادوں کی چند علمی یادگاریں ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ 'روضۃ السلاطین' فارسی شعراء کے تذکروں کے سلسلے میں دوسرا قدیم ترین تذکرہ ہے جو سندھ میں لکھا گیا۔ اسی طرح فخری ہروی کا 'جواہر العجائب' غالباً پہلا تذکرہ ہے جو خاص خواتین شاعرات کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔

ہند کے مغل بادشاہ ہمایوں کا ایران میں جاکر پناہ گزین ہونا اس دور کا اہم ترین سیاسی واقع ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ شاہ حسن ارغون ہی تھا جس نے سندھ میں (۴۷۔۹۵۰ھ) ہمایوں کے پاؤں ٹکنے نہیں دیے اور وہ اپنی تمام تر کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد دوسرا چارہ نہ پاکر ایران کی طرف 'صراطِ مستقیم' (۹۵۰ھ) سے روانہ ہوا تھا (۵۹)۔ شاہ طہماسپ صفوی کو ہمایوں نے جو خط لکھا ہے اس میں ان مصائب کی طرف جو شاہ حسن ارغون کی سیاست کاری کی بنا پر ان کو پہنچے تھے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "از فضائے سوادِ اعظم ہند، بتنگنائے ظلم سندھ، رسیدہ شد"

بگذشت از سرما آنچہ گذشت
چہ بدریا وچہ کھسار وچہ دشت (۶۰)۔

(۹)

ارغونوں کے بعد (۹۶۲ھ) سندھ کو اس کے دو امراء تقسیم کرکے قابض ہوگئے۔ زیریں سندھ (ٹھٹھہ) میرزا عیسیٰ ترخان نے اور بالائے سندھ (بکھر) محمود بکھری کے حصے میں آئے۔

یہ وہی عیسیٰ ترخان ہے جس کے نام پر فخری نے 'جواہر العجائب' معنون کیا تھا لیکن جب اکبر ہندوستان میں تخت نشین ہوا (۹۶۲ھ) تو اس وقت ایک معمولی امیر کے مقابلے میں دوسرے قوی تر بادشاہ کی دایہ ماہم انگہ کے نام فخری نے اپنے پہلے انتساب کو تبدیل کر دیا۔

میرزا عیسیٰ اور اس کے جانشینوں (۹۶۲۔۱۰۰۰ھ) کے تعلقات ایران سے اس طرح مستحکم رہے جس طرح ارغونوں کے دور میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اس عہد میں بھی کئی ایک ایرانی خانوادے اپنے زاد بوم سے منتقل ہو کر سندھ میں وارد ہوئے۔ سید بدرالدین ماژندرانی (۶۱)، اس دور کے آنے والوں میں سے ہیں۔ تاریخ نگارستان کے مؤلف قاضی احمد غفاری قزوینی اسی زمانے میں سندھ پہنچے اور یہیں انتقال کیا (۹۷۵ھ) (۶۲)۔ کاشان سے میر غروری کا خاندان بھی اسی ترخانی عہد کے اقامت گزینوں میں سے ہے جو آگے چل کر کاشانی سادات کی نسبت سے سندھ میں مشہور ہوا (۶۳)۔

آستانہ قدس سے میرزا عیسیٰ ترخان کی بڑی گہری وابستگی تھی، چنانچہ اظہارِ عقیدت کے طور پر اس نے مشہور سندھی مشعلیں خاص اہتمام کے ساتھ بنوا کر بھیجی تھیں۔ میرزا عیسیٰ اس وقت سیاسی طور پر بھی ایران سے وابستگی کے لیے مجبور تھا۔ وہ سندھ میں ایک طرف اپنے رقیب سلطان محمود والیٔ بکھر سے بہت خائف تھا اور دوسری طرف اکبر سے بھی ان کو خطرہ تھا جو کہ نیا نیا، فتوحات کے تازہ جذبوں اور ولولوں کے ساتھ تخت نشین ہوا تھا۔ لہٰذا میرزا کے لیے ازبس لازم تھا کہ وہ اپنی ہمسایہ سلطنت بلکہ قوی تر مملکت یعنی ایران سے روابط پیدا کرے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ کٹّر سنی تھا لیکن مشہد کی طرف اس کا میلان یقیناً بربنائے سیاست تھا۔

محمود بکھری جس کا نام ہم نے ابھی ابھی لیا ہے، وہ اس وقت کا نہ فقط بے مثل بہادر اور جنگجو امیر تھا بلکہ سیاست اور تدبر میں بھی اپنی مثال آپ ہی تھا۔ ایران کی طرف میرزا عیسیٰ کا یہ میلان دیکھ کر اس نے بھی اپنے سفراء بھیج کر شاہ طہماسپ صفوی سے اپنے تعلقات استوار کر لیے تھے۔

میر ابوالمکارم بن میر غیاث الدین سبزواری جن کے خاندان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ محمود بکھری کی طرف سے آتا جاتا رہا اور تردی بیگ یا حق بردی بیگ ایرانی دربار سے سندھ میں آتا رہا (۹۶۷ھ) (۶۴)۔ شاہ طہماسپ نے نہ فقط اپنی طرف سے محمود بکھری کو 'خان' اور 'سلطان' کا خطاب دیا بلکہ محمود کی درخواست پر اکبر کو بھی لکھا کہ محمود کو ان کے دربار سے بھی

خان لور خانی (خانخانان) کا خطاب دیا جائے۔ ہندوستانی دربار میں چونکہ ایک وقت میں ایک ہی 'خانخانان' ہوتا تھا اور اس وقت منعم خان اس منصب پر فائز تھا، اس لیے اکبر نے شاہ طہماسپ کو معذرت کا خط لکھا (۶۵)۔

(۱۰)

ارغون و ترخان خاندان یوں صدی تک سندھ پر حکومت کرتا رہا لور سال ۱۰۰۰ھ میں سندھ، ہندی مغلوں کی سلطنت کا جز بن گیا جنہوں نے اگلے ڈیڑھ سو برس تک اس پر اپنا تسلط قائم رکھا۔

اس گیارھویں صدی کے اوائل ہی میں جو سفیر ایرانی دربار میں پہنچا، ایک سندھی تھا یعنی اکبر کا مشہور امیر، مورخ اور شاعر میر معصوم بکھری متخلص بہ نامی جوان کی طرف سے (۱۱۔ ۱۰۱۳ھ)، شاہ عباس کبیر صفوی (۹۸۵۔ ۱۰۳۸ھ) کی دربار میں گیا اور اس نے جا کر نہ فقط کامیابی سے سفارت کے فرائض انجام دیے بلکہ ذاتی طور پر بھی ایران کے اندر اپنے مستقل تاریخی اور ادبی نقوش چھوڑے۔ چنانچہ حکیم شفائی اصفہانی (وفات ۱۰۲۷ھ) (۶۶)، محمد رضا فکری اور تقی اوحدی جیسے شعراء کے ساتھ ان کی صحبتوں لور مشاعروں کا ذکر ایران لور سندھ کے ادبی روابط کا ایک مستقل عنوان ہے (۶۷)، لور اصفہان کی مسجد علی کا کتبہ (۶۸)، لور کاشان و مورچہ کے مابین کاروانسرائی شاہ عباس کا کتبہ (۶۹)، یا احمد جام زندہ پیل کے مزار کا کتبہ (۷۰)، منجملہ ان دیگر کتبات کے جو میر معصوم نے جگہ جگہ ایران میں نصب کیے آج بھی موجود ہیں۔ میر معصوم (متوفی ۱۰۱۴ھ) فارسی کا بہترین شاعر، تاریخ سندھ (۱۰۰۹ھ) کا مؤلف، صاحب دیوان لور ایک خمسہ کا مصنف ہے۔ طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین (۱۰۰۲ھ) نے ان ہی کی تحریک اور کمک (۱۰۰۳ھ) سے لکھی تھی (۷۱)۔

سندھ لور ایران کے درمیان سیاسی روابط قائم رکھنے والا اسی دور میں دوسرا سندھی امیر، ترخانی خانوادہ کا آخری جانشین مرزا غازی وقاری تھا جس کی شخصیت نہ فقط دلچسپ ہے بلکہ گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بے انتہا دلکش بھی ہے۔ جب ۱۰۱۷ھ تا ۱۰۲۱ھ، وہ قندہار میں مغلوں کی نیابت کر رہا تھا۔ اس وقت اس کا اپنا ذاتی دربار ان کی غیر معمولی علم پروری لور شخصی جاذبیت کی وجہ سے ایرانی شعرا سے بھرا ہوا تھا۔ طالب آملی پہلے ان ہی کے دربار کا شاعر تھا جس نے ان کی مدح میں اس طرح کے گرم قصیدے لکھے ہیں، ملک الشعراء بنانے کے باوجود جہانگیر کو بھی کم

نصیب ہوئے۔ شمسائے زریں قلم، مرزا فصیحی ہراتی، ملاشانی تکلو، میر الٰہی اسد آبادی، سنجر کاشی، محوی اردبیلی، بزمی کوز، میر نعمت اللہ وصلی شیرزای، ملااسد قصہ خوان، شیدا اصفہانی، ملا مرشد بروجروی، عتابی تکلو، مولانا صوفی ماژندرانی صاحب بتخانہ، سروری یزدی، میر عبدالباقی قصہ خوان، حکیم مغفور گیلانی (۷۲)، مرزا کے مدح خوان اور اس کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔

مرزا غازی کے تعلقات شاہ عباس کبیر سے بہت گہرے تھے۔ دونوں کے مابین ایلچی نامہ و پیام لایا کرتے تھے۔ مرزا غازی کی طرف سے سید عبداللہ سلطان عریضی سبزواری اس خدمت کو انجام دیتا رہا (۷۳)۔

ابتدا میں تو سیاسی روابط رہے لیکن پھر جلد ہی شاہ اور میرزا کے درمیان تعلقات شخصی پیدا ہو گئے اور وہ اس درجہ بڑھ گئے کہ جہانگیر کی طرح شاہ عباس بھی اپنے خطوط میں مرزا کو "فرزند" سے مخاطب کرنے لگا۔ مرزا غازی نے شاہ عباس کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ کا ایک ہی شعر ہم تک پہنچا ہے :

ز زہر مار زماں، در اماں بود، آنکس
کہ، شاہ مہرۂ مدح تو، در دہن گیرد! (۷۴)۔

مرزا رستم صفوی (ف ۱۰۵۱ھ) شاہ اسمٰعیل کبیر کا پرپوتا تھا۔ ایران سے ترک وطن کر کے جب سندھ میں پہنچا اس وقت (۱۰۰۰ھ) اکبر کا سپہ سالار عبدالرحیم خانخانان اور سندھ کے والی مرزا جانی بیگ ترخان کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس سلسلے کی متعلقہ تاریخوں میں میری نظر سے نہیں گزرا لیکن 'عالم آرائے عباسی' میں ہے کہ ان دونوں کے مابین مرزا رستم صفوی ہی صلح کا باعث بنا (۷۵)۔

مرزا غازی کے عین جوانی میں وفات (۱۰۲۱ھ) پا جانے کے بعد جب مغلوں نے براہ راست سندھ پر صوبیدار بھیجنے شروع کیے تو سب سے پہلا صوبیدار یہی مرزا رستم صفوی تھا جو ۱۰۲۲ھ میں ٹھٹھہ پہنچا۔ دراصل مرزا رستم کو بھیجنے سے پہلے مرزا غازی ہی کے ایک عزیز مرزا عیسیٰ ترخان ثانی کو صوبے دار بنانے کی تجویز زیرِ غور آئی۔ لیکن اس کے بھیجنے سے اس لیے پرہیز کیا گیا کہ مبادا وہ قدیم روابط کی بنا پر شاہ عباس کی مدد سے سندھ میں اپنے اجداد کی مسند دوبارہ واپس لے لے اور ہندی مغلوں کے ہاتھ سے سندھ نکال لے جائے (۷۶)۔ چند سال پیشتر شاہ عباس کی طرف سے قندہار پر حملہ ہوا تھا اُس کی وجہ سے شاہ اور جہانگیر کے درمیان تعلقات کچھ

خوشگوار نہیں تھے گو کہ طرفین نے نظر بہ ظاہر نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا تھا (۷۷)۔ جہانگیر نے سندھ کے مسئلے میں عافیت اور عاقبت اسی میں سمجھی کہ سندھ سے ایران کے تعلقات کی کاٹ مرزا رستم صفوی کو بھیج کر کرے جو کہ شاہ عباس کا مخالف تھا اور اسی مخالفت کی بناء پر ترک وطن کر کے یہاں پہنچا ہوا تھا۔

اس گیارھویں صدی ہجری میں جو مغلوں کے عہد کی صدی ہے، کئی کئی ایرانی شعراء ہند میں پہنچنے سے پیشتر سندھ میں مقیم رہے۔ مثلاً مرزا صائب تبریزی اور اس کا شاگرد ملک تغظیمائی (۷۸)، ہندوستان بعد میں پہنچے تھے، پہلے سندھ میں قیام پذیر رہے۔ اس طرح کئی ایک مثالیں سندھ کی ادبی تاریخ میں موجود ہیں۔ محمد سعید سرمد کاشی شہید (۱۰۷۰ھ)، اسی دور میں ایران سے ٹھٹھہ پہنچا تھا اور کافی عرصہ تک یہاں قیام کیا (۷۹)۔ ٹھٹھہ ہی کے ایک پسرِ رعنا نے اسے خرد آگاہی کے حدود سے نکال کر خدا آگاہی کی دنیا میں پہنچایا تھا۔ یہ کوئی ترک بچہ نہیں تھا بلکہ "ہندو پسر" ابی چند تھا جس کے لیے سرمد نے کہا ہے کہ:

خدائے کیست ای سرمد! دریں دیر!
نمی دانم ابی چند است، یا غیر

ایران اور فارسی زبان اور فرہنگ کے اثرات صدیوں کے تواتر کی وجہ سے سندھ میں اس حد تک سرایت کر چکے تھے اور سندھی فطرت کا جزو بن چکے تھے کہ اسی گیارھویں صدی میں جب رضای ٹھٹوی نے اپنی، مثنوی زیبا نگار (۱۰۵۳ھ)، لکھی تو عشق کا پورا مواد اگرچہ سندھ سے لیا لیکن عاشق و معشوق کے مقامی نام اس لیے بدل دیے کہ فارسی کی لطیف فطرت ان ناموں کی اجنبیت کی گرانی کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی، باوجود اس کے کہ وہ اپنی مادری زبان سندھی کو بہترین اور شیریں قرار دیتا ہے:

زبان سندھ شیریں است شیریں!
بجائے خویش رنگین است رنگین!

نمی سازم بیاں را سندھی آمیز!
نیام از زبانِ سندھ پرہیز!

ز ملک پارس آدم پرنیاں را!
بیو شانم، عروسِ داستاں را
چو حرف از عاشق و معشوق دانم!
بلفظ فرس ھر یک را بخوانم
بگویم نام ھر یک تابدانی
بہ ھنگام کہ ایں دفتر بخوانی
چودر معشوق حسن و زیب دیدم
پے او نامِ "زیبا" برگزیدم

ہماں شہرے کہ می باشد مقامش
زادم و شہر حسن آباد، نامش
"نگار" از بہر عاشق ساختم نام
کہ نقش اوست زیب لوحِ ایام (۸۰)۔

(۱۱)

بارھویں صدی ہجری میں سندھ سے مغل تسلط کا خاتمہ ہوا اور سندھی نژاد خاندان جو کلہوڑا کے نام سے مشہور ہے سریر آرائے حکومت ہوا۔ اگرچہ یہ خالص سندھی تھے، اور ان کا عہد سندھی زبان اور ادب کا عہدِ زریں کہلاتا ہے اور باوجود اس کے کہ فارسی گو مغلوں سے ابھی ابھی نجات پائی تھی لیکن فارسی زبان اور فرہنگ کو انہوں نے برابر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ چنانچہ ان کے دور میں سندھ کے اندر نہ صرف فارسی زبان میں تمام علوم پر قابل قدر کتابیں لکھی گئیں۔ بلکہ ایک صاحب دیوان فارسی شاعر ایسے پیدا ہوا جن کا درجہ اس دور کے ہند میں رہنے والے شعرا سے کس طرح کم نہیں تھا۔ تحفتہ الکرام، اور مقالات الشعرا، وغیرہ اسی دور کی اہم ترین علمی نشانیاں ہیں۔

اس دور کا سب سے اہم سیاسی واقعہ جس کا ایران سے تعلق ہے۔ نادر شاہ کی دہلی سے واپسی پر سندھ میں آمد ہے (۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳ھ)۔ اس وقت کے حکمران میاں نور محمد (۳۲۔۱۱۶۷ھ) نے سالانہ خراج دے کر اپنے سیاسی تعلقات ایران سے استوار کر لیے اور نادری شمشیر کی خوں

آشامیوں سے اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کو بچالیا جو محمد شاہ کی بے دانشی کی وجہ سے دلی اور دلی کے عوام کو بھگتنی پڑی تھی۔

سندھ میں نادر شاہ کی آمد نے مستقل علمی اور ادبی نشانات چھوڑے ہیں۔ علمی نشانات والیٔ سندھ نور محمد کی تصنیف 'منشور الوصیت' (۸۱)، اور تاریخ پر کئی ایک کتابیں ہیں، اور ادب میں وہ موافق اور مخالف تاریخی قطعات اور قصائد ہیں جو نادر شاہ کی آمد پر سندھی شعرا نے کہے ہیں۔ سندھی شعرا نے تلمیح کے طور پر بھی نادر شاہ کو اپنے اشعار میں یاد کیا ہے، مثلاً

کرد غارت، دہلیٔ دل، آں شہ مہ پیکراں
شوخِ من، اندر ستم کم ترز نادر شاہ نیست (۸۲)۔

اسی نادری دور میں سرکاری خواہ غیر سرکاری طور پر ایران کے کئی امیر، عالم اور شاعر سندھ میں وارد ہوئے جن میں سے عاشق صفاہانی (۸۳)، میرزا جعفر شیرازی (۸۴) اور دیگر کئی شعراء اور سلطنتی کارندے آئے جن کا ذکر مقالات الشعراء اور تحفۃ الکرام، میں موجود ہے۔ عاشق صفاہانی یہیں سندھ میں فوت ہوا اور گورستان مکلی میں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔ شیخ علی حزین (۸۵)، اور ایران کا مشہور مرثیہ گو شاعر ملا مقبل (متوفی در گجرات، ۱۱۵۷ھ) اسی دور میں سندھ پہنچے تھے (۸۶)۔

نادر شاہ نے ۱۱ محرم ۱۱۵۳ھ کو سندھ سے ایران کی طرف مراجعت کی تو چلنے سے پیشتر نور محمد کو "شاہ قلی خان" کا خطاب دیتا گیا، جس کی تاریخ سندھی دربار کے شاعر نے یوں کہی ہے:

اے. آنکہ توئی بملک دولت قائم
از خوانِ تو افطار کند ہر صائم
تا مملکت "سند" شہنشاہت داد
تاریخ تو شد "شاہ قلی خاں دائم" (۱۱۵۲ھ) (۸۷)۔

نادر شاہ جب تک زندہ رہا، ہمارے سیاسی تعلقات ایران سے برابر قائم رہے۔ سندھ کے ایلچی اور خود والیٔ سندھ کے دو بیٹے مستقل طور سے نادر شاہ کے قتل (۱۱۶۰ھ) تک ایران میں رہے۔ چنانچہ محمد مراد جب ۱۱۶۴ھ میں واپس سندھ پہنچا تو شعرا نے ان کی آمد پر قصائد اور تاریخیں کہیں، مثلاً

بامژدہ رسید خان عالی بہ وطن (۱۱۶۷ھ)
بافضل خدا خان جواں بخت رسید
ازراہِ خراساں بہ وطن باز رسید (۸۸)۔

شیخ غلام محمد بھی اس سلسلہ میں بطور ایلچی نادری دربار میں آخر وقت تک رہا (۸۹)۔ میر ابراہیم شاہ حیدر آبادی دوسرا ایلچی تھا جو سندھ سے ایرانی دربار میں بارہا جاتا رہا (۹۰)۔

والیٔ سندھ میاں نور محمد کلہوڑا کی ایران پرستی کی مستحکم اور مقدس نشانی ایک اور بھی ہے جو آج بھی ہمیں ان ایام کی یاد دلا رہی ہے۔ اور یہ کتب خانہ مشہد کے میوزیم کا وہ عدیم المثال کلام مجید ہے جو اس نے نادر شاہ کی آمد سے پہلے (۱۱۴۸ھ)، آستانہ قدس میں بھیجا تھا، جس کی زیبائش اور آرائش کی مثال شاید ہی دنیا کے کتب خانوں میں ملے (۹۱)۔

(۱۲)

تیرھویں صدی ہجری میں سندھ پر دوسرا مقامی خانوادہ حکمران (۱۱۹۸۔۱۲۵۸ھ) تھا جو "تالپور" کہلاتا ہے۔ خود تال۔ پور کی لفظی ترکیب ایرانی اور سندھی تعلقات کی ایک نشانی ہے۔ ایران سے اس خانوادے کا تعلق اس حد تک قوی ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایران دوستی میں نہ فقط اسے اختیار کیا بلکہ ان کے طور وطریق، حکمرانی کے قواعد وضوابط، رھن سہن، پوشش اور خوردونوش، خواہ عمارت سازی پر ایرانی اثرات غالب تھے۔

قاچاری سلاطین سے گہرے روابط ہو گئے تھے۔ وکلاء کی آمدرفت اور تحفہ تحائف کا لین دین آخر تک قائم رہا۔ مرزا محمد علی کو ایلچی کے طور پر ۱۲۱۴ھ میں ایران بھیجا گیا جو واپسی کے وقت فتح علی شاہ قاچار کے سفیر مرزا اسمٰعیل کو ہمراہ لیتا آیا۔ ان سفراء کی آمدورفت کی تاریخیں مقامی شعرا کے دواوین میں موجود ہیں (۹۲)۔

سندھ کا مشہور مرثیہ گو شاعر سید ثابت علی شاہ ۱۲۱۹ھ میں ایران کی سفارت سے واپس پہنچا تھا جس کی تاریخ میر مائل نے کہی ہے۔ میر غلام محمد ٹھٹوی سفارت سے ۱۲۲۵ھ میں واپس آیا۔ اس کی آمد کی تاریخ بھی کہی گئی (۹۳)۔

تالپوری حکمران خود فارسی کے مصنف اور صاحبِ دیوان شاعر تھے چنانچہ نظم اور نثر میں ان حکمرانوں نے کثیر تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان کا دربار فارسی شعرا اور خاص طور پر ایرانی شعرا سے بھرا رہتا تھا۔ کتب خانے بنانے کا انہیں خاص شوق تھا۔ ہر سلطان اور اہل حرم میں ہر خاتون کا

کتب خانہ علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا جن میں فارسی کی اہم ترین کتابیں موجود تھیں۔ یہ سب کتابیں، خاص طور پر شاہی کتب خانوں کے لیے لکھوائی جاتی تھیں اور اکثر کاتب ایرانی تھے(۹۴)۔

یہ کتب خانے انگریزوں نے تسلط کرتے وقت (۱۸۴۳ء) لوٹ لیے۔ روس سے پیرس اور لندن سے جرمنی تک مختلف کتب خانوں میں ان کے اجزا موجود ہیں۔ اس وقت بھی جو کچھ کتابیں ہمارے یہاں بچ گئی ہیں، وہ اپنی جگہ پر بیحد قیمتی ہیں۔ زیادہ تر کتابیں ایسے ایرانی کاتبوں کی کتابت شدہ ہیں جو اکثر و بیشتر ایران میں غیر معروف ہیں اور اپنے دور کی تاریخ خطاطان میں یہ کتابت قیمتی اضافہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ وصال شیرازی کے لکھے ہوئے کئی کلام مجید موجود ہیں۔ مولانا جامی کا مکمل خمسہ انہی کے اپنے خط سے لکھا ہوا موجود ہے۔ ماضی کے دیگر ہندی سلاطین کے علاوہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر کے دستخط مبارک بھی موجود ہیں، جو سندھ کے آخری دارالسلطنت حیدر آباد میں درودِ مرکب ہمایونی کے موقعہ پر بطور یادگار ثبت فرمائے تھے۔

اس تالپوری دور کی ایک اور بھی یادگار ہمارے پاس ہے اور وہ ہے معاصر شعراء کا تذکرہ جو سید میر حسین الحسینی شیرازی نے زبدۃ المعاصرین (۹۵)، کے نام سے تالپوری سلاطن کے لیے (۱۲۴۰ھ) تالیف کیا۔ اس تذکرہ میں زیادہ تر ایسے ایرانی شعراء کا ذکر ملتا ہے جن سے خود ایران کے علمائے ادب بھی واقف نہ ہوں گے۔

اس کتب خانے میں دیگر قیمتی اسناد جو ایران اور سندھ کے روابط سے تعلق رکھتی ہیں اور ایرانی پادشاہوں کے بھیجے ہوئے تحائف بھی محفوظ ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ رہن سہن اور عمارت سازی پر ایرانی اثرات غالب تھے۔ اس مماثلت کی ایک آخری نشانی حیدر آباد کے قلعہ میں وہ چھوٹی سی عمارت اب بھی زبوں حالت میں موجود ہے جو اصفہان کی علی قاپو کی معمولی سی نقل معلوم ہوتی ہے۔

(۱۳)

تیرھویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں پہلے اور بعد میں سندھ میں انگریز کے اور اس کے تسلط کے آثار گہرے ہوتے گئے۔ مسلمان کو اس کا شدید احساس تھا لیکن مسلمان حکمران اس حد تک کمزور ہو چکے تھے اور مغل سلطنت کی وحدت اس قدر ٹوٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی کہ کسی باہر کی تازہ دم قوت کا مقابلہ کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس دور

کے جرائد، مجلات، کتابیں اور شعراء کے دواوین اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہند کا ہو خواہ سندھ کا مسلمان، ایران کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا۔ یقین تھا کہ ایران کی کمک انہیں ضرور اس آڑے وقت میں بچالے جائے گی۔

اس دور کا ایک ہندی شاعر ظہور اللہ نوا جس کے اجداد ساتویں صدی ہجری میں ایران سے ہند میں وارد ہوئے تھے (۹۶)، ہند اور سندھ کی اس حالت سے متاثر ہو کر ایران کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے تاریخ جہانکشائے نادری، کے مؤلف مرزا مہدی کے نواسے میرزا ذکیؔ کے سامنے یہ شعر پڑھا:

تنگ دل، بیمار، جان بر لب، بہ ایران آمدم
اندریں دارالشفاء، محتاج درمان آمدم!

یہ دور فتح علی شاہ قاجار (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۳۴ء) کا تھا۔ میرزا ذکی نے شاہی دربار کے شاعر فتح علی خان صبا تک اس کو پہنچادیا اور صبا کی وساطت سے نوا، جب شاہ کے سامنے پیش ہوا تو ہند اور سندھ کی حالتِ زار پر اس نے ایک دردناک قصیدہ پڑھا جس کی ابتدا ہی اس فریاد سے ہوتی ہے:

درہند ازبد گوہران، آفت پدیدار آمدہ!
سبز نخلِ فتنھا، ظلم و بلا بار آمدہ!

اور آگے چل کر کہتا ہے کہ:

احوال ہندوستان زمن، کن گوش اے شاہ زمن
درہندو سندوہم دکن، رایت نگونسار آمدہ!

نوا نے قصیدے میں کہا ہے کہ: اے دوستو! جس دن ہمیں پیغامبر یہ خوش خبری لاکر دے گا کہ شاہ ایران، ہندوستان کے ارادے سے قندہار تک آپہنچا ہے، اس وقت ہم اس کا منہ شکر سے بھر دیں گے۔

سازد ز قندش پر دھن گوید چو منھی ناگہاں!
یاران! پئے ہندوستان، شاہم بقندہار آمدہ

قندہار، ایران اور سنٹرل ایشیا کی طرف جانے کی راہ صاف کرنے کی خاطر بہر حال

انگریزوں نے یہ ضروری سمجھا کہ پہلے سندھ پر قبضہ کرلیں، چنانچہ دہلی پر تسلط (۱۸۵۷ء) کرنے سے ۱۴ برس پیشتر (۱۸۴۳ء میں) انہوں نے سندھ کو محکوم کرلیا

سندھ کی آزاد حکومت اور مملکت ایران کے تعلقات کی آخری نشانی، ہمارے پاس بطورِ یادگار کے وہ لاجواب کلامِ مجید ہے جو تالپوروں کے آخری آزاد سلطان امیر محمد نصیر خان نے ۱۲۵۸ھ میں آستانہ قدس کے لیے سندھ سے بھیجا تھا جو اب تک وہاں کے میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے۔ یہ کلام مجید (۹۷)، اس قرآن کریم سے جو ایک سو سال پیشتر سندھ سے بھیجا گیا تھا۔ زینت اور زیبائش میں کسی صورت سے کم نہیں ہے۔

آخری دور کے نویسندۂ بزرگ شادرواں فرصت شیرازی (۱۲۷۱۔۱۳۳۹ھ) کا وہ تاریخی قطعہ بھی ہمارے لیے ایک عزیز یادگار ہے جس کو انہوں نے سندھ کے تالپور امیر مدد علی خان کے کہنے پر تصنیف کیا ہے، جبکہ دونوں مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے ہم سفر تھے۔

بزرگ خطۂ ہند و امیر کشور سند
کہ نامِ نامیٔ او، خود علی مدد خاں شد
بزرگواری، کز عقل و دانش و تدبیر
بدہر غیرت اعشیٰ و رشک حساں شد

پس آنکہ از پیٔ تاریخ ایں زیارت میر
خرد، بعرصہ فکر و خیال، پویاں شد
زہوش، فرصت آوردسر، پس آنکہ گفت
علی مدد، مددش از علی، عمراں شد (۹۸)۔

بہر حال اگرچہ انگریز کے تسلط کے بعد، سندھ اور ایران کے تعلقات بظاہر ختم ہو گئے، لیکن روحانی اور فرہنگی روابط برابر اسی طرح قائم مستحکم اور محکم رہے، جس طرح کہ سینکڑوں سال پہلے سے چلے آرہے تھے۔

اس وقت سندھ پاکستان کا جزو ہے۔ پاکستان اور ایران کے مراسم نے جو صورت اختیار کی ہے۔ نظر بد دور۔ وہ کسی شرح کے محتاج نہیں ہیں۔

حواشی :

(۱) J.B: P.P. ۳۸،۴۷،۱۴۸،۱۰۲

(۲) رشید۔ص ۲۳۔۴۹

(۳) Smith: P.P. ۱۰۷ قصص :ص ۱۱۸

(۴)عزر :ص ۵۶۳۔ مسعودی :ج (۲)،ص ۱۹۱۔۲۰۰

(۵) E.I. P. ۳۰

(۶)خان :۱۱۔۱۲،خرد :ص ۶۲۔ مسعودی :ج ۱،ص ۳۴۹

(۷)تاریخ :ص ۱۳۴۔۱۳۶۔۲۱۶۔۲۲۳۔ خل :ج ۳،ص ۳۴۳،سید۔ص ۲۴۱

(۸)ایران کے لوگوں اور قافلوں کی آمدورفت کاذکر عربوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثلاً مسعودی (۳۴۶ھ)۔ "وبلاد السند متصلہ ببلاد خراسان والسند ممالک المنصورۃ والمولتان والقوافل المتصلہ من السند الی خراسان" (ج ۱،ص ۱۵۷)اور ادریسی (۵۶۰۔ ۴۹۳ھ) نے لکھا ہے کہ اھل خراسان (ایران) بلخ کی بختی نسل نیز سمرقندی نسل اونٹنیوں کے لیے نسل بڑھانے کی غرض سے سندھ کے اونٹ لے جایا کرتے تھے۔ "اھل یرغب فیھا اھل خراسان وغیرھم من اھل فارس واشباھہا النتاج البخت البلخیت والنوق السمر قندیہ (ص ۲۶)۔ اسی طرح ابن بطوطہ : (۷۳۴ھ) نے بادام کے بارے میں لکھاہے کہ :از خراسان بادام واردمی کردند، زیرا در اینجا (در سند) درخت بادام وجود نداشت۔ شرفاء علما اور شعرا کی آمدورفت کاحال بھی عربی کتابوں میں ملتاہے چنانچہ مقدسی (تالیف ۳۷۵ھ) نے شیراز میں ایک عالم سے ملاقات کی تھی جو مدت سے سندھ میں مقیم تھے، اورانہوں نے یہاں کے طور طریقے اور حالات مقدسی سے بیان کیے تھے۔ نیز ایک اور فاضل دانشور سے بھی مقدسی کی ملاقات ہوئی تھی، جو ابوالھشیم، نیشاپوری کے احباب میں سے تھے اور انہوں نے سرزمین سندھ کے بہت سے مقامات کو دیکھا تھا۔ "وساءلت رجلا من اہل العلم الحکمۃ وکان بمجلس بشیر ازوالا ہوازدیقص علیم ویعرف بالزہد وقد اقام بتلک البلدان مدۃ مدیدۃ (ص ۴۷۷)......وکذالک سالت فقیہا آخر من اصحاب ابوالہیثم النیسابوری وقد وطی تلک النواحی وعرف اسبابہا فصح عندی من قولہا (ص ۴۷۷)۔

مقدسی ان سفیروں سے بھی ملا تھا جو حکومت منصورہ کی جانب سے عضدالدولہ (۲۸۳۔۳۳۸) کے دربار میں متعین ہوئے تھے (ص ۲۸۵) ورایت رسولھم قدوانی الی ابنہ وبحن بشیراز (ص ۲۸۵)

جس وقت ابن بطوطہ (۷۳۴ھ) میں بکھر آئے تھے، تو وہاں انہوں نے شمس الدین بن محمد شیرازی سے ملاقات کی تھی "ولقیت بہا الشیخ العابد الزاہد شمس الدین محمد الشیرازی وہو من العمرین" (ج ۲،ص ۸)

مذکورہ حالات اور تعلقات پر نظر کر کے یقین کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی حکومت کے عہد میں ایران کے اثرات سندھ میں نمایاں تھے۔

(۹)اگرچہ عرب کے جغرافیہ دانوں نے منصورہ میں زبان فارسی کے رواج کاذکر صریح طور پر نہیں کیا۔ تاہم انہوں

نے مکران اور ملتان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ فارسی بولتے اور بخوبی سمجھتے تھے، مکران اور سندھ نہ صرف یہ کہ باہم متصل تھے بلکہ بڑی حد تک مکران، سرزمین سندھ کا ایک حصہ تھا اور ملتان اگرچہ اس وقت منصورہ سے الگ ہو چکا تھا، لیکن جغرافیے اور تاریخ کی رو سے سندھ کا ایک حصہ خیال کیا جاتا تھا۔ اصطخری: (وارد ہند ۳۴۴ھ) ـــــ "ولسان اہلِ مکران فارسی ومکرانی" (ص ۴۰)۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا لباس تک ایرانی تھا۔ نیز دیکھیے: اصطخری (ص ۱۷۷)۔ اسی طرح مقدسی (تالیف ۳۷۵ھ) نے ملتان کے بارے میں لکھا ہے: "وفارسیۃ مفھومۃ (ص ۴۸۰)

اگر ملتان اور مکران میں فارسی رائج تھی اور لوگ اس زبان میں بات چیت کرتے تھے تو پھر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سندھ فارسی زبان سے محروم تھا، جبکہ منصورہ اور دیبل وغیرہ بڑے تجارتی مرکز تھے۔

(۱۰) E.R.E:P.۲۲۳

(۱۱) زین: ص ۷۰۔ نیز سندھ اور ملتان کے اسماعیلیوں کے بارے میں دیکھیے:

سید: ص ۳۱۵ تا ۳۲۶ و ۳۴۱ تا ۳۵۵۔ فرشتہ: ج ۱: ص ۱۷، ۲۷۔

کامل: ص ۱۳۲۔ عنصری نے اس سلسلے میں کہا ہے:

(۱۲)
نہ قلعہ ماند کہ نکشاد ونہ سپہ کہ نزد — دیوان: ص ۱۱۱
نہ قرمطی کہ نکشت و نہ گبر نہ کافر

فرخی: (جبکہ وہ محمود کا ہم سفر تھا)
شہ بر برستان و شاہانِ ہند
گزینش بدارند و شاہان سند — دیوان: ص ۸۰

شنیدہ ام کہ فرامرز رستم اند سند
بکشت ماروبداں فخر کرد پیش تبار — دیوان: ص ۵۳
بسند و ہند کسی نیست ماندہ کاں ارزد
کز آن تو شود آنجا، بجنگ یک چاکر — دیوان: ص ۷۳
ژندہ پیلاں کز در دریائی سند آوردہ ای
سال دیگر بجزرانی ازلب دریائی نیل — دیوان: ص ۲۲۱
رایت تو سایہ افگندہ است بر دریائی سند
کی بود شاہا کہ سایہ افگند بر کوہ شام
سند و ہند ازبت پرستان کرد پاک
رفتہ زیں سو تا بدریائی رواں — دیوان: ص ۲۶۳

عنصری:
سند و ہند زعکس رنگ بزستیاں
مزا رغوان رانتواں شناختن ز زرید — دیوان: ص ۷۳
سند و ناحیت ہند شہر یار آں کرد

کجا بمردم خیبر نکرده بد حیدر — ص ۱۱۱

هم اندر این مہ کایں حرب کرد و رفت بسند

بحرب کورہ و تارا چو گبر کان کبر — ص ۱۱۲

قطران: اگرچہ زاد تو این جاو گرچہ جای تو ایدر

بتو ترسانند اندر سند و چین اطفال را مادر — دیوان: ص ۱۷۴

ناصر خسرو: ازپارسی و تازی و ازہندی و از ترک

وزسندی و رومی وز عبری ہمہ یکسر

پیغمبر عرب یکسر مشرف گشت و فراد

زترک و رومی و ہندی و سندی گیلی و دیلم — ص ۲۶۹

بعلم ہندسہ سر کشیدی

بسند و ہند و اطراف خراساں — ص ۲۱۳

بسد انداخت گاہم گہہ بمغرب

چنیں ہرگز ندید ستم فلاخن

من ہمی نازش بہ آل حیدر و زہرا کنم

تو ہمی نازش بسند و ہند بدگوہر کنی

•• •• •• •• ••

بندہ ای راسند بخشی پیشکاری را طراز!

کھتری رابر زمین خاوران مہتر کنی — ص ۴۲۳

بخواہد خورد مر پروردگانِ خویش را گیتی

نخواہد رستن از چنگال از سندی و نہ ہندی — ص ۴۹۳

چو فضل دین احمد رازِ فضل خویش بفگندی

چہ باشد فضل سوی اوترا ہندی و سندی — ص ۴۹۴

مسعود سعد سلمان: رایان ہند را و ہز بران سند را

در بیشہا بیاب و بیکجا نثار کن

عسجدی: (جبکہ سومنات اور سندھ میں محمود کے ساتھ)

تاشاہ خسرواں سفر سومنات کرد

کردار خویش را علم معجزات کرد — دیوان بتصیح طاہری شہاب

امیر معزی: برزمین ہند و سند از ہیبت شمشیر او

امیر معزی: شیر غرّندگر و دیکوبان عائب ز عائب — دیوان: ص ۲۶

ازناحیہ سند کوش تا بدر ہند

بس کس کہ ازیں رنج بدرست و بیار — ص، ۲۰۲

خصم ملک از گریزی صد لشکر آوردہ بہم

از حد کالنجر و قنوج و سند و مولتان — ص ۵۲۰۱

مختار غزنوی: (جو سرہنگ خطیبی اور مسعود سعد سلمان کی ملاقات کے لیے سندھ میں آیا تھا مقدمہ: ص ۹۵)

ترا بحاکی سند تہنیت چہ کنم

کہ گشت از ہنرت ہنرور زمانہ سمر

ہمہ ممالک مشرق سپردہ گیر بتو

چو ہند برتو نوشتند سند راچہ نظر

(۱۳) ناصری میں لکھا ہے کہ: چوں ممالک سند بروی (ناصر الدین) قرار گرفت، در حوادث کفار چین اکابر خراساں و غور و غزنین بسیار بخدمت او پیوستند واو در حق انعام واکرام فرمود (ج ۱، ص ۴۱۹)

(۱۴) مملوکیہ: ص ۶۰ (بحوالہ فرشتہ)

(۱۵) بزم: ص ۹۳

(۱۶) لباب: ص، ۶۳-۷۔ مملوکیہ: ص، ۳۹-۳۔ میگزین: ص، ۹۳ (شمارہ نومبر ۱۹۳۸ء) یہ عبارت تذکرہ گل رعنا (شفق) سے نقل کی گئی ہے: "فضلی ملتانی ملقب بتاج الفضلا از علماء ملتان بود در خدمت ناصر الدین قباچہ بسر می برد"

(۱۷) چچ نامہ: ص، ۱۱

(۱۸) ناصر الدین قباچہ کی مدح میں کہا ہے، مطلع یہ ہے ؎

خسروا ملک بر تو خرم باد

کل گیتی ترا مسلم باد!

بقیہ دیکھیے چچ نامہ، ص ۷

(۱۹) عوفی: ج: ۳، ص ۴۱۸۔ میگزین: ص ۹۱ (شمارہ نومبر ۱۹۳۸ء)۔ قانع: ص ۲۷ (مقدمہ)

(۲۰) عوفی: ص ۲۴

(۲۱) بزم: ص ۱۰۴ (بحوالہ فرشتہ)

(۲۲) بزم: ص ۱۰۲ (بحوالہ فوائد الفواد: ص ۱۳۷)

(۲۳) بزم: ص ۱۵۷

(۲۴) P.P.S:P.P. 9-1۔ مظہر: حاشیہ عثمان۔ لب: ص ۸-۶ "در دربار خان شہید (۶۸۳-۶۶۸ھ) شعر و ادبیات فارسی رونق خاصی داشت اشعار فردوسی، سنائی، خاقانی و نظامی قرأت می شد، و مورد بحث قرار می گرفت۔" برنی نے لکھا ہے: "وندیمان او شاہ نامہ و دیوان سنائی و دیوان خاقانی و خمسہ شیخ نظامی خواندی و در اشعار بزرگان

مذکور دانایان در پیش او بحث کردندی" (ص ۶۷)۔ جس زمانے میں شیخ عثمان مرندی اس سرزمین میں مقیم تھے، خان شہید نے دو دفعہ شیخ سعدی (متوفی ۶۹۱ھ) کو ملتان میں بلانا چاہا لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے ضعف پیری کی بنا پر عذر کر دیا۔ برنی میں لکھا ہے: شیخ عثمان مرندی کہ بزرگوار بود در ملتان رسید خان شہید۔۔ اورا بافراط تواضع کرد۔۔ دخان شہید۔۔۔ دو کرت از ملتان در طلب شیخ سعدی قاصد او عائد اکسان وخرج در شیراز (فرستاد و شیخ را در ملتان طلب کرد، دخواست کہ بجہت او در ملتان خانقاہ سازد و دراں خانقاہ دہا وقف کند۔ خواجہ سعدی از ضعفِ پیری نتوانست آمد و ہر دو کرت بکان سفینہ غزل بخط خود، نزد خان فرستاد عذر نیامدن خود در قلم آورد۔۔۔ (ص ۶۸)

(۲۵) عفیف: ص ۲۴۶

نوٹ: راشدی صاحب نے بعد میں لکھا کہ یہ شعر امیر حسن سجزی (وفات: ۷۳۸ھ) کا ہے (مہران، ۴/۱۹۶۸ء) مرتب۔

(۲۶) عفیف: ص ۴۰۶۔ ماہرو: مکاتیب، شمارہ ۱ (ص ۲)، ۸ (ص ۱۹)، ۴۶ (ص ۱۰۰)، ۹۹ (ص ۱۸۶) ۱۳۴ (ص ۲۲۹) مکلی (راقم الحروف کے حواشی) ص ۷۱۳ تا ۷۱۶

(۲۷) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۸۷۔ ۱۰۷۔ میگزین: (شمارہ فروری ۱۹۳۵ء) ص ۱۴۰

(۲۸) میگزین: (شمارہ فروری ۱۹۳۵ء) ص ۱۴۲ تا ۱۵۶

(۲۹) ایوب: ص ۶۲ و ۲۶۳۔ قلمی نسخہ جو اس وقت ڈاکٹر معین الحق کے ذاتی کتب خانے (کراچی) میں محفوظ ہے

(۳۰) نسخہ قلمی جو خانقاہ مخدوم نوح کے کتب خانے (ہالا) میں محفوظ ہے

نوٹ: اب یہ ترجمہ سندھی ادبی بورڈ نے چھاپ دیا ہے (مرتب)۔

(۳۱) بزرگ: ص ۳

(۳۲) مکلی: راقم الحروف کے حواشی، ص ۱۴۱ تا ۲۷۔ معارف، ص ۱۱۵۔ تک: ص ۱۸۶

(۳۳) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۳

(۳۴) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۳۔ معصومی: ص ۷۴۔ ۷۵

(۳۵) قانع، ص ۸۱۶

(۳۶) معصومی: ص ۷۶، ۱۹۹۔ حبیب: ج ۴، ص ۳۴۹۔ ہاشمی: راقم الحروف کا مقدمہ۔ رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۵۔ تک: ج ۳، ص ۱۴۱

(۳۷) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۴۔ معصومی: ص ۷۵۔ علامہ دوانی کو محمود گاواں وزیر نے بھی دعوت دی تھی کہ بیدر میں تشریف لائیے، دیکھیے گاواں: مکتوب نمبر ۴۱، ص ۱۷۲

(۳۸) تک: ج ۳، ص ۱۹۱

(۳۹) تک: ص ۱۹۲

(۴۰) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۵۵۰

(۴۱) حبیب: ج ۴، ص ۳۹۰ تا ۳۹۴۔ ترخان: شجرہ۔ ایل، مکلی: راقم الحروف کا مقدمہ۔

(۴۲) فرشتہ: ج ۲، ص ۶۲۰۔ طاہری: ۶۱

(۴۳) تک: ج ۳، ص ۱۹۳۔ قانع: راقم الحروف کا مقدمہ، نیز ص ۵۳۱۔ قصائد: راقم الحروف کا مقدمہ۔ سندی: میر قانع کے حالات از راقم الحروف

(۴۴) تک: ج ۳، ص ۱۹۸

(۴۵) معصومی: ص ۹۱۔ ۲۔ ۱۸۱۔ تک: ج ۳، ص ۳۰۰۔ پورانی:

(۴۶) معصومی: ص ۴۴۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۵۲۔ ۲۱۵۔ ۲۲۵۔ ۲۳۹۔ تک: ج ۳، ص ۲۰۲

(۴۷) شیخ نظام الدین دہلوی کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ قبر موجود ہے۔

(۴۸) معصومی: ص ۲۰۴۔

(۴۹) معصومی: ص ۴۴، ۲۰۴، ۲۱۷، ۲۳۹

(۵۰) معصومی: ص ۲۰۴

(۵۱) تک: ج ۳، ص ۱۳۱

(۵۲) معصومی: ص ۲۰۶

(۵۳) مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، بتصحیح راقم الحروف

(۵۴) زیر چاپ، بتصحیح و مقدمہ راقم الحروف

نوٹ: یہ تذکرہ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر دیا ہے (مرتب)۔

(۵۵) نسخہ قلمی کتب خانہ بانکے پور، اور اس کا عکس راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

(۵۶) مطبوعہ: نولکشور لکھنو ۱۸۸۰ء طبع دوم، نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۳ء، طبع سوم: ماہنامہ اردو: اورنگ آباد (شمارہ جولائی ۱۹۲۸ء) اور نسخہ قلمی مملوکہ راقم الحروف

(۵۷) نایاب

(۵۸) نسخہ قلمی مملوکہ راقم الحروف

(۵۹) قانع: ص ۸۶۲۔ معصومی (ص ۱۸۰) میں لکھا ہے "پل بر نہر مقابل قصبہ جون بسعد و تاریخ مصالحہ و پل بسعی را بادشاہ (ہمایوں) "صراط مستقیم" "یافتہ اند۔" نیز دیکھئے: بیگم: ص ۶۳

(۶۰) RAY:P.P.۶۵۔ عباسی: ص ۹۷

(۶۱) تک: ج ۳، ص ۱۹۹

(۶۲) قانع: ص ۱۷

(۶۳) قانع: ص ۶۵۔ تک: ج ۳، ص ۲۰۳

(۶۴) معصومی: ص ۲۲۵ اور ۲۳۹

(۶۵) عباسی: ص ۱۱۶۔ اکبر: ج ۲، ص ۲۳۷۔ رولو: ص ۳۲۲۔ اور وہ خط جو شاہ طہماسپ نے لکھا تھا، وہ عالم آرائی عباسی، (برٹش میوزیم، ورق ADD 7654 178B) کے قلمی نسخے کے حاشیے پر ایک غیر معلوم شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ میں اپنے دوست جناب ڈاکٹر ریاض الاسلام کا ممنون ہوں جنہوں نے یہ اطلاع فراہم کی۔

(۶۶) قتی :ورق ۳۸۲ تا ۳۸۶۔روز : ص ۶۷۹۔نشتر :ورق ۳۲۷۔مخزن : ص ۱۴۰۱ تا ۱۴۰۶

(۶۷)معانی : ص ۵۲۳۔۵۲۴

(۶۸)زخمی :ورق ۲۵۳۔ہنر : ص ۳۷۷۔آثار : ص ۴۳

(۶۹)ہنر : ص ۳۷۹

(۷۰)سیر، ص ۱۶۹۔معانی : ص ۱۱۶، بحوالہ عرفات

مرشد نامی شیخ گرامی احمد جامی عم برہ

سال وفاتش گر تو بجوی احمد جامی قدس سرہ ۵۳۶ھ

حررہ محمد معصوم بکھری نامی ۱۰۱۲ھ

۱۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو راقم یہ کتبہ دیکھنے اور اس کا عکس لینے خود گیا تھا۔کتبہ مزار احمد جام کے سنگی کٹھرے کے اوپر والے کنارے پر کندہ ہے۔

(۷۱)عباسی : ص ۶۴۷۔۶۶۳۔اکبر : ج ۳ : ص ۸۲۵۔۔بکھری : خط میر معصوم، شاہ عباس کے نام لے گئے تھے۔وہ جامع الرسلات قلمی اور فیاض القوانین (برٹش میوزیم نمبر OR_۹۶۱۷) میں موجود ہے۔نیز اکبر : ج ۳، ص ۸۳۶

(۷۲)ترخان : ص ۸۵۔معانی : ص ۲۹۳۔۲۹۴۔۳۲۵۔۳۳۷۔۳۵۳۔۳۷۷۔۵۵۵۔۵۷۶۔۵۹۸۔۶۰۳۔۶۰۵۔۶۷۱

(۷۳)تنک :ج ۳، ص ۸۵۔۱۳۸۔ترخان : ص ۹۱۔ماآثر :ج ۳، ص ۳۴۶۔

(۷۴)ذخیرہ : ص ۱۶۲

(۷۵)عباسی : ص ۴۵۰

(۷۶)ذخیرہ : ص ۲۸۶۔ماآثر :ج ۳، ص ۴۸۵۔مکلی : (راقم الحروف کے حواشی) ص ۲۷۶ تا ۲۷۷۔تزک : ۱۲۹۔۱۳۰۔ ذخیرہ : ص ۸۔

(۷۷)مکلی :(رقم الحروف کے حواشی) ص ۲۷۷ تا ۲۸۰۔تزک : ص ۳۵۰۔۳۵۶۔۳۵۹۔

(۷۸) قانع : ص ۱۳۰۔۷۵۹

(۷۹) قانع : ص ۳۰۰

(۸۰) قلمی نسخہ مملوک راقم الحروف : ص ۵۱

(۸۱)وصیت :راقم الحروف کا مقدمہ

(۸۲)مہران : ص ۱۴۵

(۸۳) قانع : ص ۳۹۰۔مکلی :راقم الحروف کے حواشی۔

(۸۴) قانع : ص ۱۵۰

(۸۵)حزیں : ص ۲۳۷۔ قانع : ص ۱۶۸۔سفینہ : ص ۱ تا ۵۴۔آزاد : ص ۱۹۳

(۸۶) قانع : ص ۶۶۷۔ روئداد : ص ۳۸۴

(۸۷) محسن : ص ۴۸۷

(۸۸) وصیّت : ص ۱۲

(۸۹) وصیّت : ص ۲۳

(۹۰) مہران : ص ۱۸۰

(۹۱) نمبر ۲۵۵، موزہ آستانہ قدس، اوراق ۱۰۶=۲۴x۳۶ / ۴

(۹۲) مہران : ص ۱۷۹۔ ڈاکٹر برنس نے لکھا ہے کہ تالپوروں نے ایران کے اثرات کے تحت مذہب اختیار کیا تھا۔

The Talpurs were originally soonnees like Balochees and Sindhians in general but the Connection with Persia has infected the court with the Heresies of that Kingdom: and with the exception of Murad Ali and Sobdar, who are still attached to the orthodox docriness, they have become sheah's or followers of Ali" (P.81)

جب محمد علی وکیل، سلطان فتح علی خاں قاچار کے وکیل کی معیت میں ایران سے سندھ میں آئے تو میر مائل نے مبارکباد میں ایک قطعہ کہا :

محمد علی میرزا آمدہ ! بنازم کز ایران دگر در وطن
باقبال شاہان ما آمدہ ز سلطان ایران گرفتہ وکیل
زبشیدن این صدا آمدہ خوش آمد کہ خوشنودی طبع من
بشارت دہ مرحبا آمدہ دل من بشکرانہ ایں نوید
سلامت بحفظ خدا آمدہ بحمداللہ کایں مسلم پاک دین
نوید حصول رجا آمدہ فبلغ دعائی الی من لہ
پیامم بہ پیک صبا آمدہ فبلغ تسالیم شوقی الیہ
ز "مائل" بحق ایں دعا آمدہ ببزم شہان باروی برخرو

مہران : ص ۱۷۹

میر مائل نے ایک اور قطعہ میرزا محمد اسماعیل، وکیل سلطان ایران کے سندھ میں تشریف لانے کی مبارک باد اور تاریخ پر مشتمل کہا، جو حسب ذیل ہے۔

مژدہ ای دل کایں زمان از حضرت خاقان و شاہ
مژدہ تشریف مرزای بما خوش آمدہ
میرزایم سید اسماعیل ذوالمجد و شرف
بارک اللہ خیر مقدم مرحبا خوش آمدہ
خوش ز سمت شاہِ ایران جانب شاہان سند

از صداقت آن وکیل باصفا خوش آمده
در قدوم پر نشاط آں نشاط افزائی دل
گفت از شادی ولم صبح و مسا خوش آمده
از صداقت شادِ دل آمد ز ایران چوں بسند
شادی دوراں بکارم اصدقا خوش آمده
سال تشریف شریفش زان مکان در ملک سند
چوں زِ دل جستم بگفتا "میرزا خوش آمده"

۱۲۱۴ھ

باد دائم فضل حق برمدعایش کام بخش
ار دل مائل، بحق عرض دعا خوش آمده

مہران: ص ۱۷۹

(۹۳) مہران: ص ۱۵۶

(۹۴) موج: مقالہ شادرواں احسن کربلائی

(۹۵) یہ تذکرہ حال میں جناب ڈاکٹر محمد باقر نے لاہور میں طبع کرایا ہے

(۹۶) بدایوں: ص ۱۸ تا ۳۵

(۹۷) موزۂ آستانہ قدس، شمارہ ۳

(۹۸) دیوان فرصت: ص ۴۲۷، مطبوعہ تہران، ۱۳۳۷ش

فہرست منابع

ادریسی: نزہت المشتاق، شریف ادریسی، تصحیح مقبول احمد — علی گڑھ، ۱۹۵۴م

اصطخری: مسالک والممالک، الاصطخری — لیدن، ۱۹۳۷م

اکبر: اکبرنامہ جلد ۳، ابوالفضل — کلکتہ، ۱۸۷۷م

ایوب: شرح حال مخدوم جہانیاں جہان گشت، محمد ایوب قادری، — کراچی، ۱۹۶۳م

آثار: مجلہ آثار ایران — تہران، ۱۹۳۷م

آزاد: خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد — نولکشور لکھنو، ۱۹۰۰م

بدایوں: بدایوں ۱۸۵۷م میں (اردو) سلیمان بدایونی — کراچی، ۱۹۶۰م

برنی: تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی — کلکتہ، ۱۸۹۳م

بزرگ عجائب الہند، بزرگ بن شہریار — اسدی، تہران

بزم :	بزم صوفیا(اردو)، سید صباح الدین	اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء
بطوطہ :	رحلہ جلد ۳، ابن بطوطہ	مصر ۱۹۳۸ء
بکھری :	میر معصوم بکھری، تالیف سید حسام الدین راشدی، زیر چاپ نوٹ: یہ کتاب سندھی میں ہے اور ۱۹۷۹ء میں سندھی ادبی بورڈ نے شائع کی ہے (مرتب)۔	
بیگم :	ہمایوں نامہ، گلبدن بیگم، بیورج،	لندن ۱۹۰۲ء
پورانی :	سادات پورانی در سند (سندی، تالیف سید حسام الدین راشدی) زیر چاپ	
تاریخ :	تاریخ سیستان بتصحیح بہار،	تہران ۱۳۱۴ش
ترخان :	ترخان نامہ، سید محمد ستوی، بتصحیح سید حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ	۱۹۶۵ء
تزک :	تزک جہانگیری، جہانگیر بادشاہ	نولکشور، لکھنو
تقی :	خلاصۃ الاشعار، تقی کاشی	خطی، نسخہ مانچسٹر نمبر ۳۱۲
تک :	تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع	مطبع ناصری، دہلی
تیموریہ :	بزم تیموریہ (اردو) سید صباح الدین	اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء
جامع :	جامع القوانین	خطی موزہ برطانیا
چچ نامہ :	فتح نامہ (چچ نامہ) علی کوفی، بتصحیح دکتور داؤد پوتہ،	بمبئی، ۱۹۳۹ء
حبیب :	حبیب السیر، خواند میر،	تہران ۱۳۳۳ش
حزین :	سوانح شیخ علی حزین، BELFOAR	لندن ۱۸۳۱ء
خرد :	المسالک والممالک، ابن خرواذبہ	لیدن ۱۸۸۹ء
خل :	تاریخ ابن خلدون جلد ۳،	مصر
ذخیرہ :	ذخیرۃ الخوانین، فریدی بکری	خطی، کتابخانہ سید حسام الدین راشدی
رحیمی :	ماثر رحیمی جلد ۱، عبدالباقی نہاوندی	کلکتہ، ۱۹۲۵ء
رشید :	مقالہ بر قلعہ رنی کوت، کرنل خواجہ عبدالرشید، مجلہ اقبال ریو، شمارہ اپریل	کراچی، ۱۹۶۵ء
روز :	روز روشن، مظفر حسین صبا،	بھوپال ۱۲۹۷ھ
روملو :	احسن التواریخ، حسن روملو، بتصحیح C.N.Saddon	برودا، ۱۹۳۱ء
روئداد :	ادارہ معارف اسلامیہ اجلاس دوم ۱۹۳۶ء	لاہور ۱۹۳۸ء
زخمی :	انیس العاشقین، رتن سنگھ زخمی	خطی، نسخہ دانش گاہ پنجاب
زین	زین الاخبار، گردیزی	برلن، ۱۹۲۸ء
سفینہ	سفینہ علی حزین، مقدمہ از مہاراج کشن پرشاد	حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۰ء
سندھی	تحفۃ الکرام (ترجمہ سندی)	سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۷ء
سید	عرب و ہند کے تعلقات (اردو) سید سلیمان ندوی	الہ آباد، ۱۹۳۰ء

سیر :	سیر ایران (اردو) محمد حسین آزاد	لاہور
طاہری :	تاریخ طاہری، طاہر محمد نسیانی	سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴ء
عباسی :	عالم آرائی عباسی	تہران
عزر :	تاریخ غزرو السیر، الثعالبی،	
عظیم :	دیوان عظیم ٹھٹوی، ڈکتور غلام مصطفیٰ خاں	سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۲ء
عفیف :	تاریخ فیروز شاہی، سراج عفیف، تصحیح ولایت حسین،	کلکتہ، ۱۸۹۰ء
عوفی :	جامع الحکایات، عوفی بتصحیح دکتور محمد معین	تہران، ۱۳۳۵ش
غازی :	مرزا غازی اور اس کی بزم ادب (اردو) تالیف سید حسام الدین راشدی زیر چاپ نوٹ : یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے شایع کی ہے (مرتب)	
فخری :	تذکرہ روضۃ السلاطین، فخری ہروی، بتصحیح نوٹ : روضۃ السلاطین، فخری کے ایک اور تذکرے "جواہر العجائب" کے ساتھ سید حسام الدین راشدی نے ۱۹۶۸ء میں شایع کر دیا ہے۔ ناشر سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد (مرتب)۔	اسدی، ۱۹۶۳ء
فرشتہ :	تاریخ فرشتہ جلد (۲) ہندو شاہ، فرشتہ	بمبئی، ۱۸۳۲ء
فیاض :	فیاض القوانین، شمارہ ۱۹۶۱۷	خطی، موزہ برطانیا
قانع :	مقالات الشعراء، میر علی شیر قانع ٹھٹوی، بتصحیح سید حسام الدین راشدی،	سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۷ء
قصائد :	مثنویات و قصائد قانع، مرتبہ سید حسام الدین راشدی	سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۱ء
نقص :	مجمل التواریخ والقصص، تصحیح بہار	تہران، ۱۳۰۸ش، ۱۹۶۱ء
کامل :	کامل جلد ۹، ابن اثیر	لیدن
گاوان :	ریاض الانشا، محمود گاوان، مرتبہ شیخ چاند	حیدر آباد دکن، ۱۹۴۸ء
لب :	لب تاریخ سند، خداداد خان،	امرت سر، ۱۹۰۰ء
لباب :	لباب الالباب، عوفی، بتصحیح نفیسی	تہران، ۱۳۳۳ش
ماہرو :	منشیات ماہرو، بتصحیح شیخ عبدالرشید	لاہور، ۱۹۶۵ء
مائل :	دیوان مائل ٹھٹوی، غلام علی مائل ٹھٹوی	سندی ادبی بورڈ،
ماثر :	ماثر الامرا جلد ۳، شاہنواز خاں، بتصحیح مرزا اشرف علی	کلکتہ ۱۳۰۹ھ
محسن :	دیوان محسن ٹھٹوی، محمد محسن ٹھٹوی	سندی ادبی بورڈ، ۱۹۶۳ء
مخزن :	مخزن الغرائب، سندیلوی	خطی، ذخیرہ آزر، دانش گاہ پنجاب
مسعودی :	مروج الذہب، مسعودی	سعادۃ مصر ۱۹۴۸
مظہر :	مظہر شاہجہانی، میرک یوسف، بتصحیح سید حسام الدین راشدی	کراچی ۱۹۶۲ھ
معارف :	معارف الانوار، ملا زکریا ٹھٹوی	خطی، کتاب خانہ سید حسام الدین راشدی
معانی	تذکرہ میخانہ، عبدالنبی فخر الزماں، بتصحیح گلچین معانی	تہران، ۱۳۴۰ش
معصومی :	تاریخ سند، میر معصوم نامی، بتصحیح دکتور داؤد پوتہ	بمبئی

مق : احسن التقاسیم، المقدسی، لیدن ۱۹۰۶ء

مکلی: مکلی نامہ، میر علی شیر قانع ٹھٹوی، بحواشی سید حسام الدین راشدی ادبی بورڈ ۱۹۶۶ء

مملوکیہ : بزم مملوکیہ (اردو) سید صباح الدین اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

موج : مہران جوں موجون (سندی)، تالیف سید حسام الدین راشدی کراچی محکمہ اطلاعات

مہر : تاریخ کلہوڑا جلد (۱) (اردو) غلام رسول مہر سندی ادبی بورڈ، ۱۹۵۸ء

مہران : شرح حال میر مائل ٹھٹوی (سندی) مقالہ سید حسام الدین راشدی، مجلہ مہران۔ شمارہ بھار، سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۵ء

میگزین : اورینٹل کالج میگزین، شمارہ فروری، لاہور ۱۹۳۵ء

" " " " شمارہ نومبر، " ۱۹۳۸ء

" " " " شمارہ فروری، " ۱۹۳۹ء

ناصری : طبقات ناصری، بتصحیح استاد حبیبی کابل ۱۳۴۲ھ

ندوی : ہندوستان عربوں کی نظر میں، دو جلد (اردو)، معین الدین ندوی دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۶۲۔۱۹۶۱ء

نشتر : نشتر عشق خطی ذخیرہ آذر، دانشگاہ پنجاب

وصیت : منشور الوصیت، میاں نور محمد کلہورا، بتصحیح سید حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴ء

ہاشمی : مثنوی مظہر الاثار، شاہ جہانگیر ہاشمی " "

ہنر : گنجینہ آثار اصفہان، دکتور ھنرفر ۱۳۴۴ش

E.I : Encyclopaedia of Islam, vol: III.

E.R.E: Encyclopaedia of religion and ethics, vol:III, 1933.

J.B: Foreign influence on ancient India- R.A. Jairaz Bhoy N.Y.1963.

KHAN: Indus Valley and eary Iran- Dr. F.A. Khan Karachi- 1964.

RAY: Humayun in Persia - Sukumar RAY- R.A.S. of Bengal - Cal. 1948.

SMITH: The early history of India- V.A.Smith Oxford- 1962.

قاہرہ میوزیم میں چند گھنٹے

میں چندروز پیشتر بھی قاہرہ کے اس عظیم الشان عجائب گھر کو دیکھ چکا تھالیکن اس موقع پر میرے ساتھ پاکستان کا صحافتی وفد بھی ساتھ تھا۔ یہ قوم تو جانی پہچانی ہے۔ لکھتے لکھاتے تو یہ لوگ رات دن ہیں لیکن کتاب جس چیز کا نام ہو تا ہے وہ نہ کبھی پڑھتے ہیں اور شاید نہ وہ اس لذت سے آشنا ہیں۔ چنانچہ جب ہم پندرہ بیس آدمی سب ایک ساتھ ان کمروں میں پہنچے تو ایک ہلڑ مچ گیا۔ اچھی طرح دیکھنا اور ان میں دلچسپی لینا تو خیر دُور کی بات تھی ان کے منہ میں فقط کتابوں کی میناکاری اور ان پر سونے چاندی کا کیا ہوا کام دیکھ کر پانی بھر آیا۔ یہ دیکھا، وہ دیکھا۔ اِدھر بھاگے، اُدھر بھاگے، الغرض ایک ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی ضائع کر کے چلے آئے۔ بعض حضرات نے غیر معمولی دلچسپی دکھانے اور اپنا شغف ظاہر کرنے کے لیے ساتھ میں کاغذ اور پنسل بھی لیا تھا کہ کچھ نوٹ کریں اور ان کی تاریخی اہمیت لکھیں۔ لیکن جب کتابوں کے نام اور ان کے ہجے دیکھے تو غالباً نوٹ کرنے کا خیال ترک کر دیا اور پھر کسی نے کچھ نہ لکھا۔

میں چند دن کے بعد تنہا گیا تاکہ ایک دفعہ اچھی طرح اس بیش بہا ذخیرہ کو دیکھ لوں۔ چنانچہ دروازہ پر رکھی ہوئی کتاب میں اپنا نام اور پتہ درج کیا۔ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پہلے تو جاکر دار الکتب کی شائع کردہ کتابیں خریدیں، اس کے بعد اطمینان کے ساتھ میوزیم میں پہنچ کر ایک ایک کتاب دیکھنی شروع کی۔ شیشے کی بہت سی الماریاں قرینہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خطاطی کے نمونے اور وصلیاں آویزاں تھیں۔ تصاویر بھی دیواروں پر لٹکی ہوئی تھیں۔

میرے سامنے سینکڑوں نوادر کھلے ہوئے رکھے تھے۔ بعض کتابوں کے نوٹ لیے اور پہلے تو بہ نگاہ نمائر دیکھنا شروع کیا لیکن جب دیکھا کہ شاید وقت گزر جائے اور میں ایک بھی کمرہ ختم نہ کر سکوں گا۔ تو پھر میں نے سر سری جائزہ لینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ خاص خاص کتابوں کی فہرست بھی مرتب کرتا گیا۔ اس سر سری مطالعہ میں بھی میرے پانچ گھنٹے صرف ہوئے اور جب میں نیچے اترا تو اس وقت شام ہو چکی تھی۔ کتب خانہ بند ہو رہا تھا اور کلرک، کارندے اور افسر اپنا اپنا کام سمیٹ کر تھکے ہارے نیچے اتر رہے تھے۔

اس وقت جو میں نے فہرست مرتب کی تھی اس کو یہاں پیش کر رہا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو بھی اس میوزیم کے نوادرات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے۔

مصحف :

(۱) بخط ابی سعید الحسن البصری کتابت ۷۷ھ

(۲) فوٹو گراف کاپی مصحف سیدنا عثمانؓ

(یہ بہت چھوٹی تقطیع کی حمائل کے دو صفحہ تھے)

(۳) بخط احمد بن الاسکاف الوراق کتابت رمضان ۳۶۰ھ

(۴) بخط امام جعفر صادق المتوفی ۱۴۸ھ

(۵) بخط علاء الدین محمد الحسینی کتابت ۱۱۴۰ھ

(۶) بخط قاری۔ نسخہ فارسی کتابت سن ۱۲۶۷ھ

(۷) بخط محمد بن محمد بن جعفر۔ نسخہ فارسی۔ سلطان فتح علی شاہ

(قاچار کی فرمائش پر لکھا) ۱۲۶۲ھ

بعض کلام مجید مطلاء اور مذہب کلاں اور خورد تقطیع کے نہایت ہی خوش خط بڑے کمرے میں رکھے ہوئے ہیں جن کی کتابت کے سال یہ ہیں، ۷۰۴۔ ۸۴۱۔ ۸۸۵۔ ایک کلام پاک ارغون شاہ کی ملکیت کا بے انتہا دیدہ زیب رکھا ہوا تھا۔ ارغون شاہ کا انتقال ۷۵۰ھ میں ہوا ہے بعض کی کتابت حسب ذیل سنین میں ہوئی تھی

۷۱۳۔ ۸۷۳۔ ۵۶۰۔ ۹۱۲۔ ۹۴۴۔ ۹۵۷۔ ۹۶۹۔ ۸۴۵۔ ۹۶۴۔ ۸۷۶ھ،

لاہور کے ایک مشہور خطاط حافظ روح اللہ کے لکھے ہوئے دو تین کلام مجید بھی موجود تھے بعض کی تقطیع بڑے سائز اور ایک کی جیبی تقطیع تھی۔ حافظ کا پورا نام یوں لکھا ہوا تھا۔ حافظ

روح اللہ بن حافظ محمد حسین لاہوری۔

بعض کا خط موٹا اور بعض کا باریک لیکن اتنا دل کش اور دیدہ زیب تھا کہ دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی تھیں۔ کتابت کے سال یہ تھے۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۰۸ھ

ایک کلام مجید بخط قطب الدین ۱۱۹۷ھ بھی اسی شوکیس میں رکھا ہوا ہے جس میں حافظ روح اللہ کے کتابت شدہ کلام مجید رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تمام کلام مجید مختلف سائز اور مختلف قسم کے کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے۔ خط کا حُسن اور طلاکاری اور نقش سازی کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ بس یہ دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

ترکی سلاطین کے کتب خانوں کے یا خاص ان کے مطالعہ کے کلام مجید بھی بڑی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں جن میں بعض کے نام یہ ہیں:

(۱)	مصحف بخط یاقوت		سن ۶۹۰ھ
(۲)	۔ ۔ ۔		سن ۶۸۹ھ
(۳)	۔ ۔ ۔		سن لکھا ہوا نہیں
(۴)	۔ ۔	الیاس محمد بن الیاس	سن ۷۲۰ھ
(۵)	۔ ۔	عبدالرحمٰن بن ابی الفتح فرغ سلطان سلیم کے لیے لکھا گیا تھا	سن ۶۹۰ھ
(۶)	۔ نسخہ فارسی بقلم	محمد بن احمد التبریزی	سن ۹۸۸ھ
(۷)	سورہ الفتح ۔ ۔ ۔	شاہ محمد نیشاپوری	سن ۹۶۵ھ
(۸)	مصحف	بہاء الدین محمد بن ابی الفضل لاھجانی کتابت	سن ۱۰۹۷ھ

عربی کی کتابیں:

اسی بڑے کمرہ میں جس میں کلام مجید رکھے ہوئے ہیں بعض شوکیس ایسے بھی ہیں جن کے اندر عربی زبان کی ایسی کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو یا تو مصنف کے اپنے خط میں ہیں یا پھر کسی باکمال کاتب یا مصنف کے ہم عصر کی کتابت شدہ ہیں۔ ہر صدی کے لیے جُدا جُدا الماری مخصوص کی گئی ہے اس ترتیب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خط اور کتابت کے فن نے کس طرح ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ چند کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکتا

ہے۔

۱۔ المجالسۃ وجواہر العلم۔ شیخ ابی بکر احمد بن مروان الدنیوری۔ بخط علی بن محمد المعروف بسخاوی بتاریخ ۶۳۶

۲۔ تاریخ بغداد للخطیب۔ بخط عبد القادر بن ابی صالح الجیلی بتاریخ ۵۳۱

۳۔ مقامات حریری، ابی محمد القاسم الحریری البصری بخط مصنف بتاریخ ۵۰۴

۴۔ مختارات اشعار العرب، لابن الشجری المتوفی ۵۴۲۔ بخط مصنف

۵۔ مختصر المسند الجامع الصحیح الامام مسلم۔ کتابت ۶۴۷ھ

۶۔ التحریر فی شرح الجامع الکبیر الجزء السابع، جمال الدین محمود بن احمد بن عبد السید الحصیری البخاری المتوفی ۶۳۶۔ بخط مصنف بتاریخ ۶۱۶

۷۔ الجامع البہی لدعوات النبی صلعم۔ شیخ ابی الکریم عبد السلام بن حمد الاندرسانی بخط مصنف بسال ۵۶۴

۸۔ المختصر المحتاج الیہ من تاریخ بغداد۔ للذہبی المتوفی ۷۴۸ھ بخط مصنف ۷۰۴

۹۔ مصباح المجتہد وکفایتہ المنفرد۔ محمد بن الحسین المتوفی بخط مصنف سال ۵۶۹

۱۰۔ شرح الکافیہ ابن الحاجب۔ تالیف رضی الدین محمد بن الحسن الاستر آبادی، المتوفی ۶۸۶ بخط عماد الدین یحییٰ ابن القاسم الصنعائی شارح الکشاف سال ۷۳۲

۱۱۔ نسیم الریاض فی شرح شفا، القاضی عیاض، شہاب الدین احمد بن محمد الخفاجی المصری المتوفی ۱۰۶۹ھ بخط مصنف سال ۱۰۵۸ھ

۱۲۔ طبقات الکبریٰ لابن السبکی بخط مصنف

۱۳۔ المواہب اللدینہ بالمنح المحمدیہ۔ شہاب الدین ابی العباس احمد بن محمد القسطلانی المتوفی ۹۲۳ بخط مصنف سال ۹۰۴ھ

۱۴۔ المنن والاطلاق فی بیان وجوب التحدث بنعمتہ اللہ علی الاطلاق، شیخ عبد الوہاب بن احمد بن علی المعروف بالشعرانی، المتوفی ۹۷۳ بخط مصنف سال ۹۶۰ھ

۱۵۔ الالقاب، لابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۰۲ھ بخط مصنف

۱۶۔ طالع الانوار من مطالع الانظار للبیضاوی المتوفی ۶۸۵۔ بخط ابی عبد اللہ محمد المعروف بابن جماعت سال ۸۰۹

۱۷۔ مغفر اللبیب عن کتب الاعاریب، جمال الدین عبداللہ بن ہشام الانصاری التوفی ۷۶۱ بخط حافظ ابن ہشام، شہاب الدین احمد بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ۔ سال ۸۳۵ھ

۱۸۔ مشکل القرآن، ابی محمد عبداللہ بن مسلم المعروف با ابن قتیبہ الدینوری التوفی ۲۷۶، بخط محمد بن احمد بن یحیٰی کتابت ۲۷۶

۱۹۔ درالحکم الاثعالبی النیشابوری التوفی ۴۲۹، بخط یاقوت مستعصمی کتابت ۶۸۱

۲۰۔ کتاب الاغانی الجزء الرابع۔ ابوالفراح الاصفہانی التوفی ۳۵۶ بخط محمد ابی طالب البدری کتبہ ۶۱۴

۲۱۔ المدونۃ الکبریٰ۔ مالک بن انسؒ التوفی ۱۷۹۔ دو صفحات کے فوٹوگراف رکھے ہوئے ہیں یہ اس نسخہ سے لیے گئے ہیں جو سلطان مراکش کی ملک تھا اور جس کی کتابت ۴۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ یہ سب سے قدیم ترین نسخہ اس کتاب کا ہے۔

۲۲۔ الجامع الصحیح الامام بخاری التوفی ۲۵۶ بخط بن احمد بن عبداللہ القزوینی کتابت ۳۱۷

۲۳۔ اس نسخہ پر سال ۴۲۴ کے نوٹ حاشیوں پر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت اس سے بھی قبل ہوئی ہے۔

فارسی ادب :

فارسی ادب اور زبان کی بھی بہت سے نادر مخطوط الماریوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ نقش و نگار اور طلاکاری اور خط کی گلکاری دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں ایک خاص کمرہ ان چیزوں کے لیے مخصوص ہے جس میں ۱۰۔ ۱۲ شوکیس مخطوطوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر مختلف خطاطوں کی وصلیاں اور مصوری کے نمونے آویزاں ہیں شاہنامہ۔ خمسہ نظامی جامی۔ حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بیشمار مخطوطے اور مطلا نسخہ کھلے ہوئے رکھے ہیں۔ بعض نسخوں کی فہرست یہ ہے۔ یہ تمام نسخے ہر لحاظ سے نادر روزگار تھے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں :

(۱) دیوان حافظ مصور مذہب، منقش۔ ۹۷۳ھ و ۱۰۹۱ھ

(۲) خمسہ نظامی کے مصور نسخے گیارھویں صدی اور اس سے پیشتر کی صدیوں کے

(۳) دیوان قاسم الانوار

(۴) دیوان جامی

(۵) جواہر التفسیر التحفۃ الامیر ملا کاشفی

(٦) بوستان سعدی۔ بخط میر علی الحسین الکاتب السلطانی۔

(۷) دیوان محمد اصفہانی ۱۲۴۱ھ

(۸) انتخاب شعراء افارسی: دیوار پر لگے ہوئے شوکیس میں رکھا ہوا تھا بیحد حسین اور منقش۔ یہ ہندوستان میں لکھا گیا ہے ایک صفحہ پر ایک تصویر ہے جس میں چند مشہور شعرا بیٹھے ہوئے شعر و سخن ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں اس مرقع میں یہ شعراء ہیں: جامی۔ متین۔ سید۔ نوید نظمی حیا۔ ملا عطاء اللہ ہما۔ موئد۔ جامی سفید ریش خوبصورت اور وجیہ ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کی صورت کو حسین اور جمیل بنایا گیا ہے۔ جامی کے سوا باقی شعرا جوان ہیں۔ سب کے چہرے پر ڈاڑھیاں ہیں اور سر پر پگڑیاں۔ یہ نسخہ ۹۲۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ دوسرے صفحہ پر سید اور شائق کی غزلیں ہیں ہم وزن اور ہم قافیہ غالباً تمام کتاب میں انتخاب کا طریقہ یہی ہوگا۔

سید کی غزل کا مطلع یہ ہے

ھر آنکس خانۂ از بھر بودن مختصر گیرد
چوز نبورِ عسل او شھد احت کام بر گیرد

مقطع:

مہارا جہ چو خورشید جہاں تابست اے سید
چہ کم گردد از و گر ذرہ را از خاک بر گیرد

شائق کی غزل کا مطلع یہ ہے:

عطا کن نالۂ یا رب کہ رنگ از اثر گیرد
دگر دست دعائے دہ کہ داماں سحر گیرد

(۹) بوستان سعدی المتوفی ٦۹۱ھ بخط سلطان علی الکاتب سال ۸۹۳۔ اس نسخہ کی تصاویر بہزاد کی موقلم رہین منت ہیں۔

(۱۰) سلسلۃ الذھب جامی المتوفی ۸۹۸۔ کتابت ۹۵۸ھ

(۱۱) دیوان عرفی المتوفی ۹۹۸۔ کتابت ۱۰۷۳ھ

(۱۲) دیوان خسرو دہلوی المتوفی ۷۲۰ھ بخط منعم الدین الاوحدی الحسینی سنہ ۹۲۱ھ

(۱۳) کلیات سعدی المتوفی ٦۹۱ھ یہ جمع کی ہوئی ہیں علی بن احمد بن ابی بکر المتوفی ۷۲٦

کتابت ۹۴۹ھ

(۱۴) تحفۃ الاحرار۔ جامی۔ بخط علی سنہ ۹۱۱ھ

(۱۵) المواہب العلیۃ حسین واعظ کاشفی التوفی ۹۰۶ بخط علی بن محمود الکرمانی ۹۰۴ھ

(۱۶) تحفۃ الاحرار جامی۔ کتابت ۹۸۹

(۱۷) ھفت اورنگ جامی۔ کتابت تورک باقر سنہ ۹۷۸

(۱۸) خمسہ نظامی التوفی ۵۹۶۔ کتابت ۹۸۳

(۱۹) خمسہ خسرو دہلوی کتابت ۱۰۲ھ

(۲۰) دیوان حافظ التوفی ۷۹۲ھ بخط علاء الدین لذہ۔ کتابت ۹۷۶ مصور

(۲۱) دیوان گلشنی۔ شیخ ابراہیم بن محمد بن ابراہیم المعروف بگلشنی التوفی ۹۴۰ھ

(۲۲) کلیلہ و دمنہ۔ مصور

(۲۳) مثنوی مہر و مشتری۔ احمد عصار۔ کتابت ۸۹۸

(۲۴) شاہنامہ فردوسی التوفی ۴۱۶ھ بخط صفی قلی بن الفرہاد کتابت ۱۰۶۶ھ

(۲۵) " " " نامعلوم ۹۰۵

(۲۶) " " " السمرقندی معینی ۸۴۴

(۲۷) شاہنامہ فردوسی التوفی ۴۱۶ھ بخط صفی لطف بن عیسیٰ شیرازی کتابت ۷۹۶

شاہنامہ کے یہ چاروں نسخے مصور مطلا اور دلفریب خط میں ہیں۔

(۲۸) مانی اور بہزاد کی تصاویر کے البم بھی دیواروں کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں اور کئی خوبصورت اور خوش خط وصلیاں دیوار پر آویزاں ہیں جن میں کاتبوں نے مختلف خط کے نمونے دکھائے ہیں بعض وصلیاں آیات کی ہیں اور بعض پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

(۲۹) انتخاب شعراء فارس : یہ انتخاب سلطان علی کے خط میں ہے اور سنہ کتابت ۹۰۱ھ ہے اور یہ سلطان ابوالمصر بایزید کے لیے لکھا گیا تھا۔ انتخاب ان شعراء کا ہے۔ حافظ۔ امیر خسرو۔ خواجہ خسرو۔ شیخ کمال۔ خواجہ سلمان۔ جامی۔ ثنائی۔ عصمت بخاری۔ ناصر بخاری

(۳۰) منتخب کلام شاہی : پہلے صفحہ کی لوح پر فتح علی شاہ قاچار کی سنہری مہر لگی ہے۔ کاتب معزالدین محمد الحسین ہے اور سن کتابت ۹۸۷ھ

صفحہ اول پر یہ اشعار ہیں :

اے نقش بستہ نام خطت باسرشت ما
ایں حرف شد ز روز ازل سرنوشت ما
کارم بسینہ تخم دنیائے تو کشتن است
خود عقل خندہ می زند ازکار وشت ما
ما شرمسار ماندہ ز تقصیر ہائے خویش
لطف تو خود نمی نگرو خوب وزشت ما

صفحہ دوم:

اے شیخ شہر اگر بہ خرابات بگذری
رشک آیدت بکلبہ ہمچوں بہشت ما
بگذر بسوئے تربت شاہی کہ بشنوی
بوئے و ناز طینت عنبر سرشت ما
بتقصیر وفا عیبم مکن کذ آب چشم من
ہنوز اندر وہم تخم وفا میر دیداز گل ہا
گر از گردون ملاے باشدت بر عشق املاکن
کہ عشق آمد دریں مشکل مدور حل مشکل ھا

اسی کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس کے دروازہ کا عنوان یہ ہے: کمرہ الاوراق البردیۃ اس میں PAPYRUS پر لکھے ہوئے قدیم ترین خط لور مکاتیب شیشوں کے شوکیسوں میں رکھے ہوئے ہیں۔ بعض خط ثابت ہیں بعض بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ روشنائی پھیکی پڑ چکی ہے۔ ان خطوط کے سنین یہ ہیں: ۱۴۲ھ۔ ۱۷۸ھ۔ ۱۸۶ھ۔ ۲۳۶ھ۔ ۲۴۱ھ۔ ۲۶۴ھ۔ ۲۸۵ھ۔ ۲۷۲ھ۔ ۲۹۹ھ۔ ۳۴۷ھ۔ ۴۵۰ھ۔ ۴۵۹ھ۔

ایک کتاب یہاں لور بھی نظر آئی

الجامع الحدیث تالیف ابی محمد عبداللہ بن وہب الغرمی القریشی اس مصنف کی پیدائش سال ۱۲۴۔ ۱۲۵ھ میں ہوئی ہے یہ تیسری صدی کی ابتدا میں کتابت کیا گیا ہے۔ ایک خط ولید بن عبدالملک (۸۶۔ ۹۶ھ) کے زمانہ کا اسی کاغذ پر یونانی لور عربی زبان میں لکھا ہوا رکھا تھا۔ ایک لور خط بھی ولید کا اس کے بھائی عبداللہ بن عبدالمالک کے نام ھے جو اس وقت مصر کا گورنر تھا۔ ان

خطوط کے متعلق دار الکتب المصریہ نے انگریزی زبان میں تین جلدوں کی ایک کتاب شائع کی ہے اور عربی زبان میں ایک جلد کی کتابت۔

بڑے کمرے میں جہاں کلام مجید کے قدیم نمونہ اور مصنفوں کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں وہاں چند شوکیس ایسے بھی ہیں جو ترک سلاطین کے کلام مجید دکھاتے ہیں اور ان میں ترکی زبان کے مخطوطے ہیں۔ میر علی شیر نوائی کے ترکی دیوان کے چند بہترین نسخے بھی شوکیسوں میں کھلے ہوئے اپنے حسن اور زینت کی بہار دکھا رہے ہیں۔

اسی کمرہ کے ایک حصے میں چند شوکیس رکھے ہوئے ہیں جن میں علامہ المرحوم تیمور باشا کی ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔ مثلاً قلم دان۔ فاؤنٹین پن۔ پیپر ویٹ۔ خورد بین۔ دوات۔ ہاتھ کی لکڑیاں۔ چائے کے پیالے۔ کھانے کی پلیٹیں وغیرہ وغیرہ۔ غالباً یہی قلم اور دوات ہوں گے جن کے ذریعے اس عالم بے مثل نے عربی ادب اور تاریخ پر بیش بہا مضامین سپردِ قرطاس کیے۔

علامہ تیمور باشا کا کتب خانہ بھی دار الکتب کے سپرد کیا گیا ہے جس کی فہرست چھاپی جا رہی ہے اور خزانہ تیموریہ کے نام سے چار جلدیں اب تک چھپ بھی چکی ہیں۔

مولانا محمد شفیع

رفتہ اند، ازین بزم، تا سخن باقیست
ز دیدہ رفتہ حریفان، ہنوز در گوشند

جب شعور نے آنکھیں کھولیں، اُس وقت دیکھا، علمی دنیا میں مولانا محمد شفیع کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کی تحقیق، ان کی دقت نظر اور ان کا علمی مقام اور منزلت اس دور کی ایک مانی ہوئی بات تھی۔

یہی دن تھے جب اورینٹل کالج نہ فقط اہم بلکہ معزز اور محترم ادارہ بنا ہوا تھا، کیونکہ مولانا اس میں موجود تھے، کالج کا رسالہ اور اس کا فارسی ضمیمہ اس لیے موقر اور مقبول عالمی شہرت رکھتا تھا کہ مولانا کی تحقیقات ان میں چھپتی تھیں۔ دانش گاہ پنجاب ان دنوں دنیائے دانش و علم میں اس لیے مشہور و معروف بلکہ آبرومند تھی کہ اس نے کئی ایک ایسے اہم علمی نوادر شائع ہو چکے تھے، ایک مدت سے اہلِ علم کو جن کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مکاتیب رشید الدین تو بعد میں سامنے آئی، لیکن اس سے پہلے فہرست عقد الفرید، مطلع السعدین، تتمۂ صوان الحکمہ، درۃ الاخبار، تذکرۂ میخانہ، خواجہ غیاث الدین کا سفر نامۂ چین اور اقتباسات آداب الحرب والشجاعت جیسی نادر کتابیں اہلِ علم تک پہنچ چکی تھیں۔ عنصری کی وامق و عذرا کی دریافت اور اس پر تحقیقات خود ایک ایسا غیر معمولی انکشاف تھا کہ اہلِ علم و قلم میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ دنیائے علم کو علم تھا کہ لاہور ایک آبرومند شہر ہے، اور اس کی دانش گاہ صحیح معنوں میں دانش اور علم کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو کسی صورت میں دنیا کے کسی بڑے علمی سرچشمے سے کم نہیں ہے۔

☆☆☆

مولانا کا وجود خیر و برکت کا باعث تھا، ان کی مردم شناسی، قدر دانی اور ان کی اپنی ذاتی صفات اور شخصی کشش نے، جہاں تہاں سے کئی ایک محقق اور مانے ہوئے اہلِ علم اپنے اِرد گرد جمع کر لیے تھے اور بجا طور پر دانش گاہ پنجاب کو ان کی وجہ سے نہ فقط فضیلت یا افضلیت حاصل تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ دور اس کی سروری کا دور تھا اور یہ زمانہ ان کی لجکلاہی کا زمانہ تھا۔ اور اس سمے میں مولانا عبدالعزیز المیمنی وہاں تھے، حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کا یہی زمانہ تھا، شیخ محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اسی دور کے اساتذہ تھے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے بزرگوار سیدّ عبداللہ کا دور بھی وہی دور تھا۔

یہ سب حضرات اسی حلقے کے ارکان، اسی سلسلے کے موتی اور اسی محفل کے شبِ چراغ تھے۔ ان سب برگزیدہ شخصیتوں نے مل کر پورے ملک کے اندر تحقیق اور تجسّس کی، علم اور عمل کی، قلم کی اور کتاب کی، ایک ایسی ہوا باندھ رکھی تھی اور علمی ماحول کو اس بلند مرتبے اور درجے تک پہنچا دیا تھا کہ دورنگی دنیا نے جب اس طلسم کو توڑا اور یہ بساط اُلٹی تو پھر یہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے ترستی ہی رہیں۔

مولانا نے شاہ حسین بایقرا کے حالات پڑھتے اور ہرات کی علمی نشاۃ ثانیہ پر لکھتے لکھتے اپنے شہر کو اور اپنے ملک کو بھی قریب قریب اسی منزل اور مقام تک پہنچا دیا تھا، علمی ذوق و شوق پورے شباب پر تھا، لکھنا پڑھنا اور مطالعہ ایک دین بن چکا تھا، خالص علمی اور ٹھوس تحقیقی کتابوں کی مانگ بڑھ چکی تھی۔ لاہور کے بازار ہر وقت ہرے بھرے رہتے تھے۔ سودا تبھی تو بازار میں ہوتا ہے جب اس کے گاہک ہوتے ہیں۔ کتابوں کی خرید اور ملک بھر میں خطی نسخوں کی تلاش اور اپنے آباواجداد کی ارث کی حفاظت اور فراہمی اس زمانے میں ایک مقدس فریضہ سمجھا جانے لگا تھا۔ لاہور کے ہر اہلِ علم کو یہ فریضہ انجام دینا پڑتا تھا۔ شیرانی کے نوادر، پروفیسر آذر کا کلیکشن، خود مولانا کا اپنا کتب خانہ سب اسی عہد زریں کی یادگار ہیں۔

مولوی صاحب ہی سب سے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ملک کے علاوہ ملک سے باہر مشرق ہو خواہ مغرب، یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون سے علمی نوادر کہاں کہاں اور کس کس کتب خانے کی زینت ہیں۔ مختلف کتابوں کے فوٹو اور فلمیں، جو اس وقت دانش گاہ کے کتب خانے کی زینت اور آبرو ہیں، سب اسی یادگار زمانے کی یادگار ہیں۔

اپنے ذاتی ذوق اور شخصی تلاش اور تحقیق کے طفیل اس بزرگوار نے، دانش گاہ میں اس طرح کے پائدار اور نہ مٹنے والے نقش اور نشان چھوڑے کہ اسی پرانی ساکھ اور ان پرانے نقش و نگار کی بنا پر، دور دیس سے آج بھی جو پڑھا لکھا وارد ہوتا ہے، وہ ایک مرتبہ ضرور دانش گاہ کے دروازے پر جا کر دستک دیتا ہے۔

☆☆☆

مولانا سے شخصی طور پر حضوری تو غالباً پاکستان بننے کے بعد، اس وقت حاصل ہوئی جب سیّد ہاشمی فرید آبادی مرحوم نے راقم حروف کے لیے لاہور میں اپنے گھر پر دعوت کا اہتمام فرمایا اور حضرت مولانا کو بھی تشریف فرما ہونے کی زحمت دی۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، روحانی شرفیابی برسوں سے حاصل تھی۔ ان کے نوشتوں میں، ان کے مقالوں میں، ان کی کتابوں میں ان کو میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

اس رات کو جب وہ تشریف لائے، تعارف ہوا اور باتیں ہوئیں تو ہر چند پہلی ملاقات تھی، لیکن شخصاً بھی میں نے ان کو دیکھ لیا بلکہ جی بھر کے دیکھ لیا۔ قد درمیانہ، مضبوط کاٹھی، بدن چوڑا چکلا، کھلا ہوا گندمی رنگ، چہرہ مہرہ مردانہ، نہایت شاندار اور پُر وقار، پیشانی کشادہ اور تابندہ، آنکھیں چھوٹی لیکن چمکدار اور اتنی تیز کہ تاب لانا بڑا ہی مشکل کام تھا، بلکہ ناممکن تھا کہ ان کو گھور کے دیکھا جا سکے۔ مونچھیں مناسب حد تک لمبی اس دور کی یادگار جس دور میں مرد، مرد دکھائی دیتے تھے۔ ان کا منہ بہت دلکش اور ٹھوڑی بہت خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔ سر کے بال جھڑ چکے تھے، کنپٹیوں پر بال جتنے تھے، وہ سفید ہو چکے تھے، آواز باریک نہایت ملائم اور حریر و پرنیاں کی طرح نرم اور نازک۔ ایسی آواز تند اور تلخ کبھی کاہے کو ہوتی ہو گی، یہ تو سراسر مشفقانہ اور دلوں کو اپنی طرف کھینچنے والی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ آج اس شخصیت کا سامنا ہے، جس کو دیکھنے کی مدّت سے تمنا اور آرزو تھی۔

نازم بچشم خود، کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائی خود، کہ بکویت رسیدہ است

☆☆☆

مولانا پہلے شخص تھے جنہوں نے سندھ کا علمی سفر کیا تھا، سکھر، روہڑی، حیدر آباد، ٹھٹھہ اور سیوھن پہنچے، وہاں کے تاریخی آثار دیکھے اور جہاں کہیں کتبات نظر آئے نقل کئے اور بعض

اہم کتبوں کے چربے بھی اُتارے۔ مُرانے خانوادوں میں گئے، خطی کتابیں، قلمی بیاضیں اور تاریخی نوشتے دیکھے، جو خرید سکے وہ خرید لیے باقیوں کی یادداشتیں تیار کیں۔

اس تاریخی سفر کے حالات اورینٹل کالج میگزین کی متعدد اشاعتوں میں جب شایع کئے، کتبے دیے اور چربے چھاپے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے، سندھ کے علم دوست حضرات چونک اُٹھے تھے۔ کئی اہم تاریخی حقائق، علمی تحقیق اور تنظیم کے ساتھ، پہلی مرتبہ ان کے سامنے آئے تھے اور پہلا موقع تھا کہ ان کو یہ علم ہوا کہ مقابر اور خانقاہیں پوجاپاٹھ کے علاوہ بھی کچھ اہمیت اور افادیت رکھتی ہیں۔

مولانا نے انہیں مضامین کے ذریعے علمی دنیا کے سامنے یہ اہم تاریخی انکشاف کیا تھا کہ سلطان محمد تغلق جب ٹھٹھہ کے قریب مرا تو اس کی نعش پہلے سیوھن میں دفن کی گئی اور دہلی بعد میں منتقل کی گئی تھی۔ اس عارضی مدفن پر جو کتبے چسپاں ہوئے تھے، وہ مولانا نے سیوھن میں دریافت کر لئے تھے اور ان کے چربے اسی سلسلۂ مضامین چھاپ کر لکھنے والوں کے لیے اہم تحقیقی موضوع پیدا کر دیا تھا۔

☆☆☆

بہت زمانے کی بات ہے، میرے برادر بزرگ پیر علی محمد راشدی ٹھٹھہ جاکر، تحفۃ الکرام کا وہ نسخہ جو مصنف کے اپنے خط میں تھا، ان کے خاندان سے چند دن کے لئے لے آئے تھے۔ مطبوعہ نسخے کے مقابلے میں جو اضافے اور اختلافات نکلے، ان کو مرتب کر کے انہوں نے اپنے روزنامہ "ستارۂ سندھ" کی کئی اشاعتوں میں شایع کیا۔ یہ ایک بات تھی جو آئی گئی ہو چکی تھی، نہ ستارۂ سندھ رہا نہ وہ پرچے محفوظ رہے اور نہ پھر یہ معلوم رہا کہ وہ نسخہ کیا ہوا اور کہاں گیا۔

اس صحبت میں، ٹھٹھہ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے مولانا نے انکشاف فرمایا کہ تحفۃ الکرام کا وہی نسخہ انہوں نے خرید اتھا اور اب وہ ان کے پاس محفوظ ہے، گو کہ رشک سے میں یکلخت چونک اُٹھا اور منہ میں پانی بھر آیا، لیکن ساتھ ہی مطمئن ہو گیا کہ کتاب اہم تھی، نادر تھی اور منحصر بہ فرد تھی، ٹھیک ہی ہوا مولانا کے پاس پہنچ کر ضائع ہونے سے بچ تو گئی۔

☆☆☆

میں نے لوگوں سے سُن رکھا تھا کہ مولانا بڑے ہی خشک اور مزاج کے بہت ہی سخت ہیں، میرے دل پر وحشت بیٹھی ہوئی تھی لیکن جب دیکھا اور باتیں کیں تو سراسر مختلف پایا،

بہت دلچسپ بڑے شفیق اور مزاج کے نہایت مہربان اور نرم۔

اس رات کی صحبت اور صحبت کی تلطف آمیز باتیں اور دل بڑھانے والی شفقت تھی، جس نے مجھے یکسر گرویدہ بنالیا۔ پہلے فقط ان کے علمی جاہ و جلال سے مرعوب تھا لیکن گفتگو کے بعد اور مربیانہ سلوک کی وجہ سے اب ان کی ذات اور شخصیت بھی میرے لیے جاذب اور دلکش بن گئی تھی۔ جیسے جیسے میری حضوری بڑھی ویسے ویسے ان کے طور طریقے اور ان کی مزاجی کیفیت مجھ پر واضح ہوتی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو لوگ ان سے گھبراتے تھے، دراصل وہ ان کے مزاج کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کو اپنی بے مائگی اور افلاس ذہنی، مولانا سے دُور دُور رہنے پر مجبور کرتا تھا، مولانا اس طرح کے لوگوں کے ساتھ اگر خشک رویہ رکھتے اور سرد سلوک برتتے ہوں گے تو وہ اس میں برحق تھے۔ آخر اتنے فاضل اوقات کہاں سے لاتے، وقت کا صرفہ وہ اس طرح کرنے لگتے تو یہ سب کچھ جو انہوں نے کیا وہ کس طرح کر سکتے تھے۔

☆☆☆

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اگر سخت اور خشک تھے تو محض علمی معاملات اور تحقیقی مسائل میں، ایسی چیزوں میں وہ سخت ہی نہیں بلکہ بہت ہی سخت گیر تھے۔ چلتی ہوئی چیز اور سطحی لکھت کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لکھنے والے اکثر سرسری لکھنے کے عادی تھے، مولانا اس عمل کو علم کے لیے رُسواکن اور اپنے ملک کے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور بالکل بجا خیال تھا کہ اس طرح کے لکھنے والوں کی اگر تحسین کی گئی یا درگزر اور سکوت سے کام لیا گیا تو ملک سے حقیقی علم مفقود ہو جائے گا۔ بحیثیت استاد کے بھی اور بحیثیت ایک عالم کے بھی، مولانا اپنی اس عادت اور پالیسی پر سختی سے قائم رہے۔ ان کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ ملک میں تحقیق کا معیار پست نہ ہونا چاہیے اور قلم سے جو بات نکلے وہ جچی تُلی ہو، سرسری اور سپاٹ نہ ہو۔ مولانا کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی یا یہ آرزو کس حد تک تکمیل کو پہنچی؟ اس کے بیان کا نہ یہ موقع ہے اور نہ یہ محل ہے۔

مولانا کی یہ گرفت فقط عامیوں کے لیے نہیں تھی بلکہ مانے ہوئے اصحاب علم و قلم کے لیے بھی ان کا یہی دستور العمل تھا۔ ایسے حضرات کے نوشتوں سے بھی، جب تک ایک ایک لفظ کر کے خود پڑھ نہ لیتے اور پرکھ نہ لیتے تھے، اس وقت تک ممکن نہیں تھا کہ وہ مطمئن ہوں۔

ایک دن کی بات ہے، صبح صبح ہمارے مشترکہ دوست جناب عبدالحئی حبیبی صاحب

تشریف لائے۔ بہت متردد اور پریشان تھے، معلوم ہوا کہ مولانا کی فرمائش پر انہوں نے ایک مقالہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا، مولانا نے اس میں سے ایک حوالے کی تصدیق چاہی تھی۔ بظاہر بات بہت معمولی تھی لیکن گھبراہٹ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ بات بجائے کسی کتاب کے حبیبی صاحب نے اپنی یادداشت پر بھروسا کر کے لکھ دی تھی۔ اتفاق کی بات کہئے یا مولانا کی نکتہ رسی کی رسائی، نگاہ کرتے ہی نظر وہیں جا کر رُکی اور طبیعت وہیں جا کر ٹھٹکی جہاں از روئے اصول تحقیق کچھ کمزوری رہ گئی تھی۔

بڑی دیر کے بعد، کئی کتابوں کی اُلٹ پھیر کرتے ہوئے، جب مطلوب حوالہ مل گیا تو میں نے محسوس کیا کہ جیسے حبیبی صاحب کے سر پر سے ایک پہاڑ تھا جو بحمد للہ اتر گیا۔ اطمینان کی سانس لی، پیشانی سے پسینہ پونچھا اور سگریٹ سلگانے کے بعد جب اپنے میں آئے تو ایک اعترافی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ : صاحب! واقعی یہ شخص صاحبِ نظر ہے، آپ لوگوں پر قدرت کا بہت بڑا احسان ہے۔ میں نے کہا: حبیبی صاحب! آخر اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات تھی؟ فرمایا: آپ کہتے ہیں پریشانی؟ صاحب! میری تو علمی آبرو چوراہے پر کھڑی تھی۔ یہ کہہ کر حوالے کا کاغذ لیا اور اطمینانِ قلب اور سکون ذہنی کے ساتھ نیو ٹاؤن پوسٹ آفس کی طرف جلد جلد قدم اُٹھاتے ہوئے چلے گئے۔

دیر تک میں دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، واقعی یہ ہماری خوش بختی تھی کہ ایک ایسا شخص ہم میں موجود تھا۔ اس وقت مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بعض حضرات کا تلملا اُٹھنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ مولانا کی تحقیق طلبی ان کی دسترس سے بہت بلند تھی اور ان کے ظرف سے بھی باہر۔

☆☆☆

مولانا کی علمی تحقیق کی دنیا محدود نہیں تھی، بہت ہی وسیع بلکہ لامحدود تھی، دُور دراز فاصلوں کو ان کا اشہب قلم طے کئے ہوئے تھا۔ ان کی ذہنی گیرائی اور فکری رسائی بہت سے ملکوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ یہاں کے لوگ اپنے گرد و پیش کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے آگے جانے کے عادی نہیں تھے۔ مولانا ہی تھے جنہوں نے ایک خاص نہج پر ٹھوس اور باوقار علمی تحقیق کی بنیاد ڈالی اور ایسے موضوعات اور گوناگوں علمی مسائل کے چھپے ہوئے گوشوں سے نقاب اُٹھائے کہ پہلی مرتبہ بیرونی دنیا ہمارے ملک کی تحقیقات سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ خطاطی،

مصوری، ادب، شعر، تاریخ، سوانح، کتبات، مقابر، غرض کہ علم اور قلم کا کون سا ایسا شعبہ یا شاخ تھی جس پر مولانا کی تحقیقات اور مرتب کیئے ہوئے نتائج نے علمی دنیا میں ایک مقام حاصل نہ کیا ہو۔

وسط ایشیا کی تاریخ، ادب یا فنون لطیفہ پر ہمارے یہاں سب سے اوّل مولانا ہی کی نگاہ پڑی اور انہوں نے ہی اپنی تحقیق اور تلاش کا موضوع اس کو بنایا۔ تیموریوں کی تاریخ ہو یا ان کی معارف پروری، مولانا ہی کے قلم نے پہلے پہل اس کو اُجاگر کیا۔ اس کی تاریخی اہمیت سے نہ فقط ہمیں متعارف کر لیا بلکہ دنیا کے مختلف گوشوں میں جو علما ان موضوعات پر تحقیق کر رہے تھے، ان کی عقدہ کشائیاں کیں۔ یہی سبب تھا کہ بیرونی دنیا کے اہلِ علم ہمارے ہاں سے فقط مولانا ہی کی ذات کو جانتے تھے اور ان کی مجالس علمی میں مولانا ہی کو مساویانہ بلکہ بعض چیزوں میں بلند مقام اور بالاتر درجہ حاصل تھا۔ جب "ارمغان علمی" کا اعلان ہوا تو بیرونی دنیا کے کئی ایک علما نے اس میں حصہ لینا، اس وجہ سے اپنے لیے علمی فرض سمجھا کہ مولانا کی شخصیت ان کے سامنے بہت محترم تھی۔ استاد محترم جناب بدیع الزماں فروزانفر نے، اسی موقع پر فرمایا تھا کہ :

دھر و دوراں کم آورد فرزند
چون محمد شفیع دانشمند

اور سچ کہا تھا کہ :

خاک لاہور ازو فزودہ شرف
پدر فضل را بہینہ خلف

☆☆☆

مولانا کی شخصیت، اپنے کردار و عمل اور علم کے لحاظ سے ہمارے لیے نہ فقط مثالی بلکہ مشعلِ راہ ہے۔ ان کو اپنے موضوعات سے لگاؤ ہی نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک عشق تھا، انہماک کی یہ حالت تھی کہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے انہیں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ عمل کی صورتِ حال یہ تھی کہ گھر پر ہوں یا باہر، سفر ہو یا حضر، ہمیشہ اور ہر آن کسی نہ کسی مسئلے کی تحقیق اور تلاش میں سرگرم رہتے تھے۔ یہ سب کچھ کسی جاہ کے لیے نہیں تھا بلکہ محض حصولِ علم کے لئے۔ ذاتی غرض کوئی نہیں تھی نہ اس سے جلب منفعت مقصود تھا۔ ان کی ملازمت کا نہ اس پر انحصار تھا اور نہ ان کی روزی کا یہ سہارا تھا۔ مولانا نے علم کو بیچا نہیں اور نہ علم کو کبھی بازار میں لا کر بٹھایا۔

ان کی زندگی نہایت ضابطے کی زندگی تھی۔ ہر لمحہ قیمتی اور باکار اور ہر قدم بچاتُلا منزل کی جانب۔ ایک ایک آن قیمتی سمجھتے تھے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے، وقت ضائع کرنا ان کی نگاہ میں کفر سے بدتر تھا۔ وہ وقت ان کی زندگی کا حاصل ہوتا تھا جس میں وہ کوئی نئی معلومات یا کچھ نئی تحقیق کر لیتے تھے۔ گھر میں تو یہ طبعی امر ہے۔ اہل و عیال کے ساتھ کبھی کبھار اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتے ہوں گے، لیکن باہر کی زندگی میں جہاں تک مجھے علم ہے ان کے منہ سے کبھی ایسی بات نہیں سنی گئی جو بے مقصد ہو، غیر ضروری یا غیر علمی ہو۔ پوری زندگی از اوّل تا آخر ایک نپے تلے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی زندگی قیمتی بھی ہوئی اور یہی وجہ ہوئی کہ وہ اتنے کام کر بھی گئے اور ایسے اہم آثار چھوڑ بھی گئے کہ آج اگر ان پر کسی کا ہاتھ اُٹھنا بھی چاہے تو شل ہوتا ہوا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی اور ایک زندگی کا متواتر عمل رہتی دنیا تک کے لئے، فقط دانش گاہ ہی کو نہیں، ایک شہر ہی کو نہیں بلکہ پورے ملک کو آبرو مند بنا گیا۔

☆☆☆

مولانا انسائیکلوپیڈیا کے سلسلے میں یورپ جاتے ہوئے ایک مرتبہ چند گھنٹوں کے لیے اپنے داماد کے ہاں کراچی میں ٹھہرے۔ آقائی عبدالحیٔ حبیبی اور اس خاکسار کو جیسے ہی اطلاع ہوئی، ہم دونوں ان کی خدمت میں پہنچے، بڑے خوش ہوئے اور ایسے جذبے کے ساتھ پذیرائی فرمائی کہ ہم سمجھے گویا ان کو منہ مانگی مراد مل گئی یا وہ ہمارے ہی منتظر تھے۔ اس زمانے میں مولانا بازیدی فرقے پر تحقیق کر رہے تھے، بیٹھتے ہی اس موضوع پر گفتگو اور مسائل کا آغاز کر دیا۔ حبیبی صاحب مخاطب تھے، مولانا کے سوال اور حبیبی صاحب کے جواب، غرض کہ دو ڈھائی گھنٹے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر، یورپ کے لیے فراہمیٔ اسباب سے بے پروا، سفر کی تیاری اور ضروری کاغذات وغیرہ کی درستی سے بے نیاز نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ "بازیدیوں" کے متعلق تحقیق و تفتیش فرماتے رہے۔

میں سوچتا رہا کہ یہ کیا آدمی ہے، یورپ جا رہا ہے، نہ ڈالروں کی فکر نہ پونڈوں کی لگن، نہ داماد سے پوچھتے ہیں کہ کیا لائیں، نہ صاحبزادی سے فرمائشات کی فہرست لکھواتے ہیں۔ نہ اس پوچھ گچھ میں ہیں کہ لندن سے کون سی چیز لائی جائے جو یہاں بیچ کر کرایہ مع نفع نکال لیں۔ ریفریجریٹر کون سا بہتر ہوتا ہے، ٹیپ ریکارڈر کس میکر کا لایا جائے، موٹر کونسی موزوں رہے گی۔ نہ کسٹم والوں کی ٹوہ نہ یہ تعین کہ واپسی کے وقت ایسا بندوبست ہو کہ بغیر سامان کھلوائے گھر پہنچ جائیں۔

ہم دونوں جب چلے تو سوچتے ہوئے چلے اور یہی باتیں کرتے ہوئے گھر تک آئے۔
سبحان اللہ! علمی عشق اور اس کے عالم کا کیا عالم تھا۔

☆☆☆

مولانا کالج سے سبکدوش ہوئے تو انسائیکلوپیڈیا کے اردو ترجمے کی نگرانی میں مشغول ہوگئے لیکن اس طرح جیسے کہ ان کے مزاج کی افتاد تھی، دن اور رات صبح اور شام ایک کردیا۔
سردیوں میں ان کا چھوٹا سا چھتری نما خیمہ باہر کتب خانے کے لان میں لگا رہتا اور گرمیوں میں اندر کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ مولانا کا یہ چھتری نما خیمہ کتب خانے کے صحن کا ایک نمایاں کردار بن چکا تھا۔ چھوٹی کرسی اور سامنے مختصر سی میز آس پاس اس دن کام آنے والی کتابوں کے ڈھیر اور ساتھ ہی فائلوں میں ترجمہ شدہ مقالوں کے انبار۔
میں اس خیمے میں کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے ہر بار موقع اس لیے مل جاتا کہ کراچی سے چل کر آیا ہوتا تھا، ورنہ کام کے وقت مولانا سے ملاقات ہونا ناممکن بات تھی۔ ملاقات برائے ملاقات کو مولانا گناہ بلکہ قومی بداخلاقی سمجھتے تھے۔

☆☆☆

طریقۂ کار یہاں بھی ان کا وہی مخصوص تھا۔ مضمون سامنے رکھتے ایک ایک لفظ کو خود دیکھتے ایک ایک سند ایک ایک نام ایک ایک سن و سال کی جب تک خود تحقیق نہ کرلیتے، مضمون چھپنے کے لیے نہیں بھجواتے۔ تصحیح اور مطابقت کے سلسلے میں ان کو ہمیشہ تکلیف اور زحمت اُٹھانی پڑتی تھی۔ اکثر مترجم حضرات علمی ترجمے کے عادی نہیں تھے اور نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ جغرافیائی نام کا تعین یا ماہ و سال کی درستی کیا اہمیت رکھتی ہے۔ عبارت اور جملوں تک کی صحت مولانا کو خود کرنی پڑتی تھی۔
میں نے بارہا اخباروں میں پڑھا کہ اولیائے دانش گاہ شاکی ہیں کہ کام تیزی سے نہیں ہورہا، خاصے لمبے اور صبر آزما وقفوں کے بعد چھپتے ہیں۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ترجمے کے بعد سے لے کر پریس میں بھجوانے تک ایک ایک مقالے کو کن کن منزلوں اور مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور مولانا کو اس سلسلے میں کتنے ہفت خوان طے کرنے پڑتے ہیں۔

☆☆☆

آخری دور میں مولانا کی صحت دُرست نہیں رہی تھی، دل پھول چکا تھا، جگر کا فعل پورا

نہیں تھا، دُور سے ہی آدمی محسوس کر لیتا تھا کہ مولانا بیمار ہیں۔ لیکن جیتے جی کام میں ناغہ کبھی انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ ہر روز آتے ہر چیز پر خود نگاہ کرتے اور وقت ختم ہو جانے سے پہلے تو کیا کچھ دیر ہی سے گھر لوٹنا نصیب ہوتا تھا۔

جسم پر سفید شلوار، میل خور رنگ کی شیروانی اور کھڑی دیوار کی سرخ تُرکی ٹوپی۔ موٹر سے اُترتے لکڑی کا سہارا لئے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے خیمے میں داخل ہوتے اندر پہنچ کر جب ایک دفعہ بیٹھ گئے اور قلم ہاتھ میں لے لیا تو پھر کہاں کی بیماری اور کہاں کی صحت، نہ کمزوری پاس پھٹکتی اور نہ ضعف کا احساس باقی رہتا۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز لفظوں اور عبارتوں میں گُم ہو کے رہ جاتے تھے۔ کئی لیل و نہار اور کئی ماہ و سال مولانا نے اسی طرح گزار دیے۔

☆☆☆

یہ اتوار تھا اور سال ۱۹۶۳ء کے مہینے مارچ کی دسویں تاریخ دوست نے پوچھا: "کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا: "مولانا کے پاس، چلیے گا؟" دوسرے دوست نے دخل دیا: "کہاں جائیں گے بھائی صاحب! یہ لوگ تو بیٹھ کر کریں گے قبروں کی باتیں، مردوں کی داستانیں اور پھٹی پرانی کتابوں کے قصے وسے، آپ بیٹھ جایئے گپ شپ کرتے ہیں، اتوار ہے چھٹی کا دن ہے آج!"

میرے دونوں دوست عرف عام میں پڑھے لکھے تھے، ایک پی ایچ ڈی تھا اور دوسرا ڈبل گریجویٹ۔ لندن میں غالباً دونوں تربیت پا چکے تھے۔

☆☆☆

سردی ختم ہو چکی تھی، بہار کا موسم تھا، لارنس گارڈن کے پھول بہت کچھ کھِل چکے تھے اور کچھ کھلنے باقی تھے۔ اس صبح کی خنکی ابھی دم توڑ رہی تھی کہ میں ۲۴ میسن روڈ پہنچا۔ مولانا برآمدے میں ایک کھڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف چند کرسیوں اور ایک آدھ ٹیبل پر کتابیں ایک دوسرے پر اٹی رکھی تھیں۔ بروکلمان، انسائیکلوپیڈیا، سارٹن، قاموس الاعلام اور کشف الظنون، اپنی ضخامت کی وجہ سے بہت نمایاں تھیں۔ کئی ایک مسودے بھی سامنے رکھے تھے، ایک مسودے پر گردن جھکائے کتر بیونت میں مشغول تھے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ بھی ایک اتوار ہے اور ایک یہ بھی چھٹی کا دن ہے۔

مجھے دیکھ کر مسکرا دیے خوش دلی اور خندہ روئی سے بڑے ہی تپاک اور گرم جوشی کے

ساتھ گلے لگایا۔ ویسے تو مولانا ہمیشہ ہی لطف فرمایا کرتے تھے لیکن آج کا سلوک کچھ غیر معمولی سا سلوک تھا۔ خوشی سے میرا خون بڑھ گیا، ذرہ جیسے آفتاب ہو گیا ہو۔

☆☆☆

بیٹھتے ہی مجھ سے میرے عارضۂ قلب کی کیفیت پوچھنا شروع کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ خود ان کی حالت دگرگوں اور مخدوش ہو چکی ہے۔ چہرہ بالکل سفید ہو رہا ہے، گال سُوجے ہوئے، آنکھوں کے حلقے سیاہ اور ان کی چمک ماند پڑ چکی ہے۔ پاؤں پر اتنا ورم تھا کہ ایک ایک پاؤں من من بھر کا معلوم ہو رہا تھا۔ پنڈلیوں سے اوپر تک سوجن کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ میں نے حیرت سے کہا "مولانا یہ کیا ہے؟" ہاں ہوں کر کے ٹالتے ہوئے پھر میری صحت کی پوچھ پاچھ اور حفظانِ صحت کی ہدایات شروع کر دیں۔

میں نے موقع پاتے ہی پھر کہا کہ مولانا اتوار کے دن بھی آپ آرام نہیں فرماتے؟ انہوں نے کہا: "بھائی! اگر کام نہ کروں تو دن کیسے کٹے؟ اور کام بھی تو بہت ہے، لوگ لکھنا تو در کنار ترجمہ تک کرنا بھی تو نہیں جانتے، ہر چیز مجھی کو دیکھنا پڑتی ہے۔

صحت کے اس عالم میں فرض شناسی کا یہ عالم اور رنگ دیکھ کر میں دنگ تو رہ گیا لیکن ساتھ ہی ان کی حالت پر بہت رحم بھی آیا۔

☆☆☆

تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک میں ان کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ بہت باتیں ہوئیں بلکہ یوں کہیے کہ اس دن واقعتاً جی کھول کر باتیں ہوئیں۔

مولانا نے طاہر آشنا کے دیوان کی بات کی۔ پیرس سے فلم منگائی تھی لیکن کاغذ کی کم یابی کی وجہ سے فوٹو اسٹاٹ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کہا: مجھے دیجئے مولانا! پرسوں جا رہا ہوں کراچی سے بنوا لاؤں گا۔ فرمایا: کل آفس پہنچ کر فلم بھیج دوں گا۔

محمد حسین آزاد مرحوم کے سلسلے میں مولانا نے بعض حیرت انگیز چیزیں بتائیں اور ان پر لکھا ہوا اپنا ایک تازہ مضمون بھی عنایت کیا۔ مفتی صدر الدین آزردہ پر انہی دنوں ایک مقالہ لکھا تھا، وہ بھی اندر سے لا کر دیا۔ میری عادت ہے کہ چیزوں پر آٹوگراف لے لیتا ہوں لیکن مولانا کی شخصیت کا رعب اتنا زیادہ تھا کہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا، بعد میں کیا بلکہ آج تک پچھتا رہا ہوں، اگر دستخط فرما دیتے تو غالباً یہ ان کے آخری دستخط ہوتے۔

☆☆☆

میرے دونوں دوستوں کی گھبراہٹ بجا تھی۔ ہم نے دیمک چاٹی ہوئی اور پھٹی پرانی کئی ایک کتابوں کا ذکر کیا، مولانا نے شکایت بھی کی کہ ان کے کتب خانے میں کئی ایک خطی نسخے دیمک چاٹ چکی ہے۔ اب یاد نہیں رہا، ایک دو نہایت ہی قیمتی کتابوں کا نام لیا جن کو دیمک لگ چکی تھی۔ اس طرح کی ایک کتاب کتب خانے سے لینے بھی گئے لیکن اس وقت ملی نہیں۔
مولانا نے باتوں باتوں میں فرمایا: نظیری نیشاپوری کے علاوہ بھی ایک نظیری شاعر ہندوستان میں رہ چکا ہے جس کا دیوان، جس پر میر مومن استر آبادی کی مہر ہے، ان کے پاس موجود ہے۔
مولانا ایک دفعہ پھر کتاب خانے کی طرف اُٹھ کے چلے، میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا، ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ بار بار اُٹھیں اور اندر جائیں۔ میں نے محسوس کیا کہ کرسی سے اُٹھتے ہی ان کی سانس پھولنے لگتی ہے۔

☆☆☆

اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر نے کراچی میں مجھ سے کہا تھا کہ میں مولانا سے کتب خانے کے سلسلے میں معلوم کروں، اگر فروختگی کے لئے آمادہ ہوں تو قیمت طے کر لوں۔
مجھے براہ راست پوچھنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی، پہلو سوچ ہی رہا تھا۔ جب دیمک اور کتابوں کے ضائع ہونے کا ذکر آیا تو میں نے دبے الفاظ اور کچھ بہی خواہی کے انداز میں مسئلے کو چھیڑا۔
فرمایا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ابھی تو پانچ برس تک کام کرنے کا خیال ہے، کئی ایک کام ادھورے پڑے ہیں۔ بغیر کتابوں کے کس طرح گزارا ہو سکتا ہے؟
مولانا کا یہ پانچ سالہ منصوبہ سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ چہرے کی طرف دیکھا، صحت کا جائزہ لیا اور پاؤں کے ورم پر نگاہ کی۔ اللہ اکبر! کس ارادے اور عزم کا یہ انسان تھا۔
کسی کو کیا معلوم تھا کہ اب زندگی اور موت کے درمیان فقط دو دن کا وقفہ باقی رہ گیا ہے۔

☆☆☆

آج ۴ امارچ تھی اور جمعرات کا دن۔ صبح نکھر آئی تھی، ابھی میں آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ مرحوم رازی کی آواز تھی، گھبرائی ہوئی اور بھرائی ہوئی۔ میں نے پوچھا: خیریت؟، کہا: مولانا کا انتقال ہو گیا!، کب؟، رات بارہ بجے! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں سن ہو گیا۔ ابھی تین دن پیشتر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، ٹیبل ڈائری میں ۱۰ تاریخ اتوار کا

ورق ابھی تک کھلا رکھا تھا، مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام میرے جناتی خط میں اس پر درج تھا۔

میرے ذہن میں اس آخری ملاقات کے واقعات ایک ایک کر کے اُبھرنے لگے، باتیں جو ہوئی تھیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں اور بار بار اُن کے فرمائے ہوئے فقرے کانوں میں گونجنے لگے، ابھی تو پانچ برس تک مجھے کام کرنا ہے! بہت سے کام ادھورے پڑے ہوئے ہیں! کتابوں کے بغیر کیسے گزارا ہوگا؟

☆☆☆

اتوار کا دن خیریت سے گھر پر گزارا تھا۔ پیر کو حسبِ معمول آفس گئے، کام کیا اور گھر لوٹ آئے۔ منگل کو مولانا جب آفس پہنچے تو ہلکا سا بخار محسوس ہونے لگا، واپس گھر آگئے۔ رات کو طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوئی تو ہسپتال آگئے۔ بدھ کی پہلی دوپہر خیریت سے گزر گئی۔ دن جیسے ہی ڈھلا مزاجی کیفیت دگرگوں ہونے لگی، شام کو سورج غروب ہونے کے ساتھ مولانا کی نبضیں ڈوبنے لگیں۔ نصف شب کو ادھر ہسپتال کے گھنٹے نے بارہ بجا کر اس دن کی تاریخ کا ورق اُلٹا اور ادھر فرشتۂ اجل نے مولانا محمد شفیع مرحوم و مغفور کی زندگی کا صفحہ اُلٹ کے رکھ دیا۔

یہ ایک شخص کی زندگی کا ورق نہیں تھا جو اُلٹا گیا، یہ پوری قوم کی علمی آبرو کا ورق تھا جو آج کے دن اور آج کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُلٹ دیا گیا۔ یہ خسارہ تھا، ایک ایسا خسارہ جس کی اذیت عارضی نہیں بلکہ دائمی اذیت تھی اور یہ اذیت ایک خاندان کے لئے نہیں ایک قبیلے کے لئے نہیں ایک شہر کے لئے نہیں بلکہ پورے ملک کے لئے تھی اور پوری ملت کے لئے تھی۔

تو آگہی کہ مرا از غروب، ایں خورشید
چہ گنجہائی سعادت، زیان جان آمد

☆☆☆

کتب خانے کی پشت پر ایک چھوٹا سا لان ہے، دنیائے علم کے اس زعیم کی نعش آخری سفر کے لئے وہیں تیار کر کے رکھی گئی تھی۔ عزیز و اقارب کے ساتھ شہر کے معززین اور صاحبِ علم حضرات بھی موجود تھے۔ جسٹس رحمان صاحب تھے، حمید احمد خان صاحب تھے، حامد علی خان صاحب اور مولانا صلاح الدین مرحوم تھے، ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

تھے، شیخ محمد اکرام صاحب اور سیّد محسن شاہ صاحب تھے، یونیورسٹی کے کئی ایک اساتذہ بھی آئے ہوئے تھے، جتنے بھی تھے سبھی سوگوار کھڑے تھے، سبھی کے چہروں پر اُداسی تھی، ایک اوس پڑی ہوئی تھی۔ سب کو اس زیاں کا احساس اور اس نقصان کا اندازہ تھا۔

آخری دیدار کے بعد چار بج کر پانچ منٹ پر کفن کی ڈوریاں باندھ دی گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ ایک مومن کا چہرہ تھا پُر سکون اور مطمئن۔ مولانا بڑے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ دنیا سے جا رہے تھے۔

بندہ ام پاک روی را کہ، دریں دیر کہن
تا زید پاک زید، چون برود پاک رود

خاکی جسم کو پورے ساڑھے پانچ بجے خاک کے سپرد اور خالق کے حوالے کر کے عزیزوں اور عقیدت مندوں کا یہ مختصر گروہ، لٹے ہوئے قافلے کی طرح، اچھرے کے قبرستان سے باہر نکلا اور تھوڑی دیر میں اپنے اپنے گھروں کی سمت منتشر ہو گیا۔ مولانا کو ہم رُخصت کر آئے تھے لیکن:

گیرم کہ شدی زدیدہ، مستور
از سینۂ من، کجا شوی دور

کراچی ۳۰ جون ۷۹ھ

پنبہ کجا کجا نہم

گریاں چو بسر، منزلِ احباب گذشتیم
صد مرتبہ در ہر قدم، از آب گذشتیم

یہ اس وقت کی بات ہے جب میری تنخواہ کل پچاس روپے تھی، یہ عدد رجسٹر میں لکھا ہوا تو تھا لیکن یاد نہیں کہ یہ رقم مجھے کبھی بھی بیک وقت دیکھنا نصیب ہوئی ہو۔ کبھی ایک روپیہ اور کبھی آٹھ آنے ملا کرتے تھے۔ اور جب ایک دفعہ پورے پانچ روپے اکٹھے ملے تو اس کو بھی دگنے کرانے کی ہوس میں رمو مکرانی کی پتے بازی میں گنوا بیٹھا۔ ویسے کہنے کو تو میں سندھ کے ایک اہم اخبار کا مدیر سردبیر تھا۔

یہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ ہے یعنی آج سے تقریباً ۳۹ سال پہلے کا۔ شباب اردو غالباً بند ہو چکا تھا، خان احمد حسین خان فوت نہیں ہوئے تھے۔ لیکن رسالے کے بند ہو جانے کی وجہ سے ادبی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، عالمگیر اور نیرنگ خیال نے اپنے ضخیم عید نمبروں اور خاص نمبروں کی وجہ سے پوری ادبی فضا پر قبضہ کر لیا تھا۔ میاں بشیر احمد کا ہمایوں اپنی روایتی رفتار پالیسی اور کردار کے لحاظ سے ایک ہی چال پر چل رہا تھا۔ ہندوستان کے ادبی رسائل میں نگار کا درجہ بہت بلند تھا اور علمی لحاظ سے معارف کا ثانی کوئی نہیں تھا۔

شوق اور ذوق کا کیا کہنا؟ لیکن تنخواہ کی کمی اور اس کی بھی بالاقساط ادائیگی نے ان رسائل کا حاصل کرنا، میرے لیے مشکل بلکہ ایک طرح سے ناممکن بنا دیا تھا۔ مجبوری کے اس عالم میں

میں نے حل یوں نکالا کہ سکھر ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال کے مالک سے یارانہ گانٹھ لیا۔ شخصی اہمیت اخبار کی وجہ سے حاصل تھی ہی، لہٰذا اس دوستی کے پیدا کرنے میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

سکھر ان دنوں اگرچہ بے انتہا صاف ستھرا شہر تھا لیکن اتنا بڑا نہیں تھا کہ آدمی ادھر ادھر تفریحاً گھوم پھر کر اپنا وقت کاٹ سکے۔ کھاتے پیتے لوگ شام کو ریلوے اسٹیشن پر آجاتے تھے، ریل کا تماشہ دیکھتے اور ریلوے ڈائننگ روم میں، سفید مونچھوں والے بوڑھے بیرے جان صاحب کی بنائی ہوئی لپٹن ٹی جس سے خوشبو کی لپٹیں پھیل جاتی تھیں، پی پلا کر، بک اسٹال سے کھڑے کھڑے اپنی پسند کے دو ایک اخبارات کا جائزہ لے کر اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے تھے۔

میں بھی دوسروں کی طرح شام کو اسٹیشن پر پہنچ جاتا، جان صاحب کی چائے پینا تو اپنی مقدرت سے دور تھا، کون روزانہ چار آنے اس پر صرف کرے لیکن یارانے کی وجہ سے بک اسٹال کا مالک اسٹول رکھ دیتا تھا اور میں اس پر بیٹھ کر اطمینان سے رسائل اور اخبارات پڑھ لیا کرتا تھا۔ اگر کبھی جیب میں پیسے ہوئے اور کسی رسالے کا خاص نمبر آگیا تو خرید بھی لیا کرتا تھا۔

یہ دور اور یہ اپنی صورت حال تھی، جب دلی سے ساقی کے نام سے ایک رسالہ بک اسٹال پر آیا تو سرورق دیدہ زیب چھپائی اتنی صاف ستھری کہ لاہور کے رسالوں کا مقابلہ کر سکے، مضامین اتنے دلچسپ کہ آدمی کا دل موہ لیں۔ شاہد احمد دہلوی نامی ایک صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔

یہ حضرت کون تھے؟ ادبی دنیا میں ان کا پس منظر کیا تھا؟ کس ادبی اثاث اور بُرتے پر اس میدان میں آئے تھے؟ یہ کچھ بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ اچانک وارد ہوئے تھے اور بغیر کسی اشتہار اور عام اطلاع کے ایک دم سے یہ رسالہ نکالا تھا۔ بڑی دیر اور بعید عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولوی بشیر احمد دہلوی کے صاحبزادے ہیں جن کی لکھی ہوئی تین تین جلدوں میں ضخیم کتابیں "واقعات دار الحکومت دہلی" اور "واقعات حکومت بیجاپور" میری کرسی کی پشت والی الماری میں آج بھی خاص الخاص حیثیت سے رکھی ہوئی ہیں اور 'توبتہ النصوح" والے ڈپٹی نذیر احمد ان کے دادا جان تھے۔ گویا یہ شاہد احمد دہلوی ادبی میدان میں یوں ہی ٹپک نہیں پڑے بلکہ خاندانی لحاظ سے ایک طویل اور موقر علمی روایات کا پورا انبار اپنی جھولی میں بھر کر لائے تھے اور خود بھی بھرپور ہو کر آئے تھے۔ اگر میں نے کوئی رسالہ اس دور افلاس میں مستقل طور پر خریدنا

شروع کیا تھا تو وہ یہ ہی ایک رسالہ تھا۔

مہینے کے آخر میں سگریٹ کے بجائے ۱۵ نمبر کی بیڑی پی کر آٹھ آنے بچا لیتا اور پہلی تاریخ کو یہ رسالہ جا کر خرید لیتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ساقی خرید لیتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے ڈھیروں دولت میرے قبضہ میں آگئی ہو۔

یہ روئداد ہے ساقی اور میرے تعلقات کی اور یہ داستان ہے ساقی کے ذریعے شاہد احمد سے میری واقفیت کی، زمانہ بڑا ہی اچھا تھا، ذمہ داری کوئی خاص اپنے اوپر تھی نہیں، اگر میں یہ کہوں کہ عشق کی کسک اور اس کی حرارت سے دل خالی تھا، تو کوئی اعتماد نہیں کرے گا۔ اور یہ چیز ویسے بھی اعتماد کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے انکار نہیں کرتا، دل میں ایک کسک لیے ہوئے تھا لیکن بڑے اعتدال اور احتیاط کے ساتھ بلکہ یہ حرارت، یہ گرمی اور یہ سوز و ساز ساقی کے پڑھنے میں اور اس کے مضامین سے لذت حاصل کرنے میں، سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے ممد و معاون ثابت ہوئے۔ اگر کبھی میں نے افسانے انہماک اور لذت سے پڑھے ہیں تو وہ فقط ساقی میں اور وہ بھی محض اسی دور میں۔

ساقی نے بہت سے نئے لکھنے والوں کو جنم دیا تھا۔ عظیم بیگ چغتائی اسی زمانہ کی عظیم پیداوار تھے، ان کی بہن عصمت چغتائی آج تک اسی دور کو یاد دلا رہی ہیں۔ پریم پجاری کی سچی کہانیوں نے نہ فقط عشاق کے گروہوں میں تہلکہ مچا دیا تھا بلکہ آہ و فغاں کی گونج اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہتی ہوئی، میں نے خود بھی دیکھیں، یہ تو کئی برس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حضرت عندلیب شادانی کی ذات والا صفات تھی جنھوں نے پریم پجاری کا روپ دھار رکھا تھا اور یہ سچی کہانیاں حقیقت میں ان کی اپنی سچی کہانیاں تھیں۔ بہر حال اس وقت تو "پریم پجاری" ایک پُراسرار شخصیت تھی اور عشاق کے امام سمجھے جاتے تھے۔ مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان کہانیوں نے کئی ایک عاشق خود سکھر میں بھی پیدا کر لیے تھے۔

وہیں سکھر میں آرت مل پنجابی ہمارے ہم پیشہ دوست تھے، خوب صورت، جوان، صحت مند جسم اور کھلا گندمی رنگ اگرچہ کٹر آریہ سماج تھے، لیکن ان کا یارانہ ہمیشہ ہم جیسے مسلمانوں سے رہا کرتا تھا۔ ہندو لیگ گزٹ نکالتے تھے اور اس میں مسلمانوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے تھے۔ اردو کے بہت بڑے رسیا تھے۔ سرشار اور شرر کے ناول، حجاب امتیاز علی اور ایم۔ اسلم کے افسانے انہیں خاص طور پر پسند تھے۔ پریم پجاری سے جب آشنا ہوئے تو یک لخت اُن کے دل میں عملی طور

سے عشق کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یا اگر دبی ہوئی کوئی چنگاری پہلے سے تھی تو وہ ایک الاؤ بن کے ظاہر ہو گئی۔ انہیں دنوں ایک ہندو خاتون ڈاکٹری کا امتحان دے کر سکھر میں آئی تھیں۔ پریم پجاری کی کہانیوں نے ہمارے اس دوست کو عاشقی پر اس حد تک اکسایا کہ اس خاتون پر والہ و شیدا ہو گئے۔ عشق چونکہ یک طرفہ تھا اس لیے ہمارے دوست آرت مل ہمیشہ سوزش اور سرگردانی میں مبتلا رہنے لگے۔ ایک تو بال بچے دار تھے اور پھر عشق، اور عشق بھی ہندو خاتون سے اس لیے کسی ہندو کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان سے اپنا یہ راز کہہ سکتے۔ ہمارے چونکہ لنگوٹیا یار تھے اس لیے ہمیں ہی راز داں بنایا۔ اُن کے عشق میں روزانہ جو مدوجزر ہو رہا تھا وہ راتوں میں آکر ہم دونوں بھائیوں کو بتایا کرتے تھے۔ شرؔر کے ناول پڑھ پڑھ کر اپنے تئیں مسلمانوں کو عشق کے پیشے میں استاد اور فرہاد سمجھے ہوئے تھے اس لیے فریق ثانی کو راہ راست پر لے آنے کے لیے مجھ سے کم، البتہ میرے بھائی سے زیادہ مشورے لیا کرتے تھے۔ مہینہ بھر اس ریاضت میں کٹ جاتا تھا اور جب پہلی تاریخ کو ساقی آجاتا اور اس میں پریم پجاری کی کہانی پڑھتے تو ان کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے بے پناہ دھارے بہہ نکلتے تھے۔

آرت مل ہم دونوں بھائیوں کے جانی دوست اور لنگوٹیا یار تھے۔ مدتیں اکٹھی گزری تھیں۔ کوئی راز ایک دوسرے سے مخفی نہیں تھا۔ سیاست ہو چاہے خانگی زندگی، ہم نے محسوس کیا کہ عشق کا الاؤ آخر تک اس کے دل میں شعلہ زن رہا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ جب پاکستان بنا اور وہ ہم سے رخصت ہوئے ہیں تو دونوں بھائیوں سے گلے مل کر بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روئے اور رخصت ہوئے۔ ہندوستان میں اب وہ کہاں ہیں؟ زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ لیکن اُن کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ اُن کی یاد کے ساتھ ساقی، پریم پجاری اور وہ خاتون سب مل جل کر مجسم صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ مدتیں بیت گئیں لیکن سچ عرض کرتا ہوں جب کبھی وہ یاد آجاتے ہیں تو آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور بڑی دیر تک پرانے واقعات میں گم سم ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ زندہ ہوں تو خدا انہیں دیر تک جیتا رکھے۔

ہمارا اپنا پریس جس سے ہم "ستارۂ سندھ" نکالتے تھے۔ وہ بجلی گھر کے قریب، شردھانند پارک کے عین مقابل تھا۔ پریس بھی وہیں۔ اخبار بھی وہیں سے نکلتا تھا اور ہم دونوں بھائی بھی وہیں رہتے تھے۔

سید محمود شاہ اخبار کے نیوز ایڈیٹر تھے اور ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ بیس اکیس سال کا

گبرو جوان، خوبصورت چہرہ آنکھیں وہ جسے شعراء کی زبان میں آہو چشم یا نرگس شہلا کہا جاتا ہے۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ شعراء یہ دونوں تشبیہیں عورتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں یا مردوں کے لیے۔ لیکن بہرحال اس میں کلام نہیں کہ جب وہ آنکھ اٹھاتا تھا تو بہت سے دل اندر ہی اندر مسل جاتے تھے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے بھی تھے اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ جیسے شراب پی رکھی ہو اور سرور کی سرخی آنکھوں میں آگئی ہو۔

یہ حضرت بھی ساقی کے پڑھنے والوں میں سے تھے اور معلوم ہوا کہ یہ حضرت بھی پریم پجاری کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے تھے۔ جس کمرے میں یہ سوتے تھے اس کی ایک کھڑکی ہندو ہمسائے کی کھڑکی کے عین مقابل کھلتی تھی۔ محمود شاہ صاحب اپنا اکثر کام اسی کھڑکی کے سامنے میز لگا کر کیا کرتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ساقی پڑھنے کے بعد آرت مل کی طرح یہ بھی بہت متاثر ہو جاتے تھے۔ آرت مل کی وجہ تو معلوم تھی لیکن اس نوجوان کے تاثر کا سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے انہیں ساقی پڑھتے پڑھتے آنکھیں پونچھتے ہوئے بھی دیکھا تھا!

اس دور میں مُیاری اور امروٹ شریف دو ایسے مُقام تھے جہاں غیر مسلمان مشرف بہ اسلام ہوا کرتے۔ مرد کم عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن اس مشرف بہ اسلام ہونے میں دین محمدی کا حصہ کم، عشق کی کار فرمائی زیادہ ہوتی تھی۔ ہندو مرد کسی مسلمان لڑکی پر عاشق ہو کر حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا۔ یہ بہت ہی شاذ تھا۔ ہندو لڑکیاں مردِ مومن میں ایمان کی روشنی پا کر اسلام سے فوراً مشرف ہو جایا کرتی تھیں۔

ایک ہندو امروٹ شریف سے مشرف بہ اسلام ہو کر ہمارے ہاں آکر ملازم ہوا۔ عشق میں تو بیچارہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن مسلمانوں کی صحبت میں آنے کے بعد گوشت پکانے میں اس نے کمال حاصل کر لیا تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد کسی مسلمان کی سرپرستی اسے حاصل نہ ہو سکی اس لیے پھرتے پھرتے ایک دن ہمارے ہاں آن پہنچے ہمیں باورچی کی ضرورت تھی۔ انہیں تنخواہ پر تو نہیں البتہ روٹی اور رہائش کی شرط پر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ آدمی زندہ دل ہم ان کو "شیخ صاحب" کہہ کر پکارتے تھے۔ کھانا پکانے کے بعد اکثر ہمارے پاس آکر اِدھر اُدھر کی دلچسپ داستانیں سنایا کرتے تھے۔ ہمسایوں کے حالات اور شہر میں جو کچھ ہوتا رہتا تھا۔ اس کی اطلاعات بھی انہیں سے حاصل ہو جاتی تھیں۔

ایک دن شیخ صاحب نے غلطی سے ایک خط لا کر مجھے دے دیا۔ خط میں نے پڑھا تو ششدر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ خط دراصل محمود شاہ کے نام ہے اور اس ہمسائی ہندو لڑکی کا لکھا ہوا ہے جس کی جھلک کبھی کبھار اس کھڑکی سے میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ الھڑ لڑکی جوانی کی آمد آمد جب گلی سے گزر کر گھر میں جاتی یا گھر سے نکل کر کہیں باہر جاتی تو کودتی پھاندتی اور اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ اس خط میں عشق کی روئداد ہجر و فراق کے افسانے اور میل ملاپ کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ ہمارے شیخ صاحب خود بھی عشق کا تیر کھائے ہوئے تھے اور عاشقوں پر جو بپتا پڑتی ہے اس کو خوب جانتے تھے۔ لہٰذا محمود شاہ اور اس لڑکی نے اسی کو اپنے نامہ و پیام کے لیے کبوتر بنا رکھا تھا۔ شیخ صاحب کبھی کبھی اپنی عاشقانہ ناکامی کو یاد کر کے خود بھی از خود رفتہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی شاید ان پر وہی عالم تھا اور خود فراموشی ہی کے اس عالم میں اس نے یہ خصوصی خط مجھے لا کر دے دیا۔

ہم لوگوں کی شخصیت سکھر شہر بلکہ پورے ضلع کے مسلمانوں میں بہت اہم تھی۔ بہت سے ہندو اگرچہ دوست بھی تھے لیکن ساتھ ہی دشمنی کا وقت آجاتا تو دریغ بھی نہیں کرتے تھے۔ مہا سبھائی تو ہمیشہ ہمیں نیچا دکھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے اور پھر شہر کے سیاسی معاملات کی پارٹی بازیاں اور دوستیاں دشمنیاں اس کے علاوہ تھیں۔ سندھ کے عاشقانہ معاشرے کا اب بھی اور تب بھی یہ اٹل قانون تھا کہ اگر وصل میں ناکامی نظر آنے لگتی تو عاشق و معشوق کا فرض ہو جاتا تھا کہ گھر سے بھاگ کھڑے ہوں چنانچہ اغوا کے کیس سندھ میں اب تو معلوم نہیں، لیکن اس زمانے میں روزمرہ کی بات تھی۔ ہمارے لیے بہت نازک اور خطرے کا وقت تھا۔ اگر محمود شاہ کا معاشقہ کامیاب ہو جاتا اور وہ لڑکی اس سے بھاگ نکلتی تو ہم شہر بھر میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ میں نے بھائی سے مشورہ کیا۔ بڑی ترکیبوں سے محمود شاہ کو فہمائش کی اور معاملے کو طرح طرح کے حیلوں سے رفع دفع کر دیا۔

اس رفع دفع کے دوران میں معلوم یہ ہوا کہ اس عشق کی ابتداء اور نشوونما میں رسالہ ساقی کا بہت بڑا دخل رہا۔ پریم پجاری نے تو خیر آگ پر تیل کا کام کیا ہی تھا، لیکن ساقی کے دوسرے افسانوں نے بھی اس الاؤ میں شدت کے شرارے پیدا کر دیے تھے۔

ساقی پہلے میں پڑھتا تھا اور آرت مل کے بعد محمود شاہ پڑھتے تھے۔ پھر شیخ صاحب کی وساطت سے چوری چھپے یہ رسالہ اس لڑکی تک پہنچ جاتا تھا۔ ویسے تو میری توجہ کبھی نہیں گئی

لیکن اب معلوم ہوا کہ بعض افسانوں کی سطروں پر جو دو مختلف رنگوں کے نشانات لگے ہوتے ہیں وہ دراصل طرفین نے اپنے حسب حال عبارتوں پر لگائے ہوتے ہیں اور یہی عبارتیں بے زبانی کی زبان سے نامہ و پیغام کا فرض بجالاتی تھیں، آج جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں مجھے وہ منظر یاد آرہا ہے کہ محمود شاہ کی خوب صورت آنکھیں ساقی پڑھتے پڑھتے کس طرح نمناک ہو جایا کرتی تھیں اور ساقی کے آنے کے بعد چند دن تک وہ کیسے مغموم رہتا تھا۔ یہ دو واقعے تو میرے سامنے کے ہیں لیکن ساقی نے ہندوستان بھر میں نہ جانے کتنے دلوں کو گرمایا ہو گا اور کتنی آنکھوں کو نمناک کیا ہو گا۔

خیر، یہ تو ساقی کی جاذبیت کا ایک معمولی سا پہلو میرے ذہن میں ہے۔ لیکن درحقیقت اردو ادب اور زبان کو جلا دینے میں شاہد احمد نے ساقی کے ذریعے لازوال خدمت انجام دی۔ اب تو لکھنے والوں کے نام بھی یاد نہیں رہے لیکن ان میں سے کئی ایک جو اس وقت نو مشق اور نوخیز تھے، خدا کرے کہ ان میں سے بہت سے زندہ ہوں۔ اب ادب کے صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہوں گے۔

مولوی عنایت اللہ کے تراجم سب سے پہلے ساقی میں چھپے جن کے ذریعہ اردو کے ادیب مغربی ادب کے شہ پاروں سے آشنائے ہوئے۔ دلّی کی زبان اور قلعہ معلّیٰ میں بولے جانے والے روزمرہ اور محاورے سب سے پہلے اس رسالے کے ذریعہ سندھ جیسے دور دراز گوشوں تک پہنچے۔ ناصر نذیر فراق، سید وزیر حسن، انصار ناصری، اشرف صبوحی، ظفر قریشی، ایم اسلم۔ یہ سب ادیب اور زبان و بیان کے یہ سارے اساتذہ ساقی ہی کی وجہ سے ظہور میں آئے۔

ساقی کی سب سے بڑی خدمت، کارنامہ یا کرشمہ کہئے یہ تھا کہ اس نے عظیم بیگ چغتائی جیسا عظیم فن کار پیدا کیا، یہ اور بات ہے کہ یہ شمع دیر تک روشن نہ رہ سکی۔ شاہد احمد کا پیدا کردہ ادیب دولت مستعجل ثابت ہوا، ورنہ آج عظیم بیگ زندہ ہوتے تو اردو ادب میں نہ جانے کیا کارنامے اور کتنے ادبی شاہکار پیدا کیے ہوتے۔

شاہد احمد سے میری نہ خط و کتابت تھی اور نہ میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی۔ فقط اس رسالے میں ان کی شہد و شکر سے بھی زیادہ شیریں طرز نگارش پر غائبانہ عاشق رہا۔ ۱۹۳۹ء میں میں دلّی گیا، خیال تھا کہ اس دفعہ شاہد احمد سے ضرور ملوں گا۔ ان دنوں کچھ سیاسی شغل بھی کرتا تھا۔ بھائی صاحب ساتھ تھے، وہاں جا کر کچھ ایسے چکر میں پڑا کہ شاہد احمد سے مل تو نہ سکا، لیکن

ان کی چھاپی ہوئی تمام کتابیں اردو بازار سے خرید لیں۔

وقت گزرتا گیا، لاہور کے سارے رسالے ایک ایک کر کے دم توڑنے لگے، عالمگیر بند ہوا۔ نیرنگ خیال گیا۔ شباب اردو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اختر شیرانی نے کبھی رومان کے نام سے رسالہ نکالا اور بند کیا۔ کبھی کسی دوسرے نام سے شروع کیا اور ایک دو قدم کے بعد ٹھٹھر کر رہ گیا۔ لاہور سے قوس قزح نامی رسالہ بھی اسی دور کی یادگار تھا۔ لیکن اس کے بھی چند ہی پرچے نکل سکے۔ بہت اچھا رسالہ تھا۔ مخزن ایک دفعہ اور نکلا لیکن چند ہی پرچے نکلے تھے کہ پھر بند ہو گیا۔ لاہور سے ہمایوں، لکھنؤ سے نگار اور دلی سے ساقی۔ یہ تین رسالے ایسے تھے کہ جس روش اور رفتار سے شروع ہوئے تھے اپنے اسی طرز اور اسی انداز و ادا پر چلتے رہے تھے تا آنکہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آ گیا اور جغرافیائی حدود کے ساتھ ساتھ انسان بھی بٹ گئے۔ دلوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا، ادیب اور ادبی رسائل بھی ایک دوسرے کے لیے دو حصوں میں تقسیم ہو کر اجنبی اور غیر ملکی بن کر رہ گئے۔

پاکستان بنے ابھی ایک آدھ سال ہی گذرا ہو گا کہ کئی ایک نامی شاعر، مشاہیر اہلِ قلم اور نام آور ادیب ہندوستان تیاگ کر یہاں پہنچ گئے۔ مولانا عبدالحق اپنے رفقا، کیفی صاحب اور سید ہاشمی کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی تشریف لے آئے اور اُن کا بھی تعلق انجمن سے ہو گیا تھا، صبح و شام کی اکثر و بیشتر مجلسیں مولوی صاحب کے ہاں ہوا کرتی تھیں لیکن رات کی محفل گئی رات تک قاضی صاحب مرحوم کے ہاں لازمی ہو گئی تھی۔ بلاناغہ روزانہ آنے والوں میں چار ایسے دوست تھے جنہیں اس زمانے میں اخوان الصفا کہا جاتا تھا۔ ایک یہ نیاز مند، قاضی صاحب، حفیظ ہوشیارپوری اور ممتاز حسن صاحب۔ اس اخوان الصفا کے چار رکن تھے۔

نووارد ادیب، عالم اور شاعر مولوی صاحب کے ہوتے ہوئے یہاں کا پھیرا بھی ضرور کیا کرتے تھے۔ ابھی ہر ایک بڑی اُمیدوں اور ایک بے پناہ جذبے میں تھا۔ اسلامی ملک کا نام دیا گیا تھا اور شیر و شکر بننے اور بنانے کی آس بندھی ہوئی تھی۔

ہادی مچھلی شہری کا نام غزل گو شعراء میں بہت مشہور تھا۔ نیرنگ خیال، عالمگیر اور پھر ساقی نے چھاپ چھاپ کر ان کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ ایام جوانی میں جب رسائل میں بڑے انہماک اور شوق سے پڑھتا تھا اُس وقت سے ان کے نام سے نہ فقط آشنا تھا بلکہ ایک قسم سے مرعوب بھی تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ صاحب یہاں بھی کبھی پہنچ جائیں گے۔

بوڑھے ہو چکے تھے، بہت نازک اندام اور ایسے منحنی کہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاتے تھے۔ شیروانی کوٹ، کھڑا پاجامہ، داڑھی منڈی ہوئی اور چہرے پر جھریاں، ایک شاگرد ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ یہاں جب پہنچے تو سنا کہ ریلوے میں کہیں ملازمت ہے۔

ایک روز شام گئے یہ حضرت بھی ایک شاگرد کے سہارے سیڑھیاں طے کر کے قاضی صاحب کے ہاں تشریف لے آئے بہت دیر بعد صحبت ختم ہوئی اور ہم سب جب سیڑھیوں سے اترنے لگے تو ہادی صاحب اپنے شاگرد کے کاندھے پر ہاتھ رکھے اس کے سہارے ہم سے پہلے سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ میں پیچھے تھا اور وہ آگے آگے۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ آج تک میں نہیں بھولا۔

شاگرد نے ان سے کہا کہ "حضرت! سبحان اللہ قاضی صاحب بھی کیا آدمی ہیں!

اس پر ہادی صاحب نے فرمایا "میاں کیا پوچھتے ہو؟ پورا ہندوستان ویران ہوا ہے تب جا کر یہ کراچی آباد ہوا ہے۔ ایسے نامی اہلِ علم اور ایسے چیدہ لوگوں کا اجتماع یوں کہیں ہوا کرتا ہے؟ وہ کہنے کو ایک بات چلتے راہ فرما گئے لیکن ان کا فرمانا آج تک برابر میرے کانوں میں گونج رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے جن اہلِ علم اور ادیبوں کا ہم نام سنا کرتے تھے اور جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں وہ تقریباً سب کے سب کوئی پہلے کوئی بعد میں آکر یہاں جمع ہو گئے تھے۔ اس لحاظ سے واقعی ہندوستان اُجڑا اور یقیناً کراچی آباد ہو گیا۔ کون تھا جو یہاں آکر آباد نہیں ہوا؟ یا کون تھا ایسا ادیب جو اگر آکر آباد نہیں ہوا تو بھی دس بیس مرتبہ یہاں کا پھیرا نہ کر چکا ہو۔

پاکستان بنتے ہی ساقی نے دم توڑ دیا۔ سترہ برس سے جو محفل سجی ہوئی تھی وہ ایک دم سے تتر بتر ہو گئی جس رفتار اور چال سے وہ چلا تھا اور چل رہا تھا اسے منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی آبلہ پائی نے بٹھا دیا۔ آخر ایک دن کسی نے کہا کہ شاہد احمد دہلوی بھی کراچی پہنچ گئے ہیں۔

صحیح طور پر تو یاد نہیں کہ ان سے کب کیسے اور کہاں ملاقات ہوئی لیکن پہلے پہل جو میں نے انہیں دیکھا وہ بس میں گزرتے ہوئے دیکھا۔ میرے کتب خانے کے کمرے کا دروازہ جمشید روڈ کے ایک نمبر بس اسٹاپ کی طرف کھلتا ہے۔ ایک دن دروازہ کھولا تو کسی دوست نے کہا کہ "وہ دیکھئے شاہد احمد دہلوی بس میں جا رہے ہیں!

پورے طور پر دیکھ بھی نہیں سکا کہ بس گزر گئی لیکن جلدی میں جو کچھ دیکھا وہ یہ کہ میلے رنگ کی جناح کیپ۔ بگڑی رنگ کی شیروانی اور چہرے کا رنگ سانولا سا معلوم ہوا۔ بس اور اس

میں ایسی بھیڑ کہ الاماں الحفیظ، شاہد صاحب دبکے ہوئے بیٹھے تھے۔

ایک دن اپنے کتب خانے میں بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ لمبا قد، مضبوط کاٹھی، چہرہ کشادہ، بڑی بڑی راجپوتی آنکھیں، داڑھی منڈی ہوئی، مونچھیں بہت گھنی اور گل مچھے جسے ہم سندھی "دشمن داغ شہپر" کہتے ہیں۔ چکن کا کرتہ، مہری دار پاجامہ، منہ میں پان، ایک ہاتھ میں چاندی کی ڈبیہ اور دوسرے ہاتھ میں مخملی بٹوہ، اس طرح اچانک پہنچ کر یک لخت آکر تڑاکے سے یوں آداب عرض کیا کہ میں بغیر سوچے سمجھے مبہوت ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور سہم کر مصافحہ کیا۔

انہوں نے فرمایا میرا نام راحت سعید چھتاری ہے! میں چاہتا ہوں کہ اپنی نظموں اور افسانوں کا مجموعہ تیار کروں، سنا ہے کہ ساقی کے مکمل فائیل آپ کے پاس ہیں، میرا سارا ادبی اثاثہ اسی میں ہے اگر آپ عنایت کریں تو میرا کام بن جائے گا۔ یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں وہ کہہ گئے۔

راحت سعید کا تو نہیں لیکن نواب احمد سعید چھتاری کا نام بچپن میں سُن رکھا تھا اور جب گورنری کے لباس میں اُن کا فوٹو ریاست اخبار میں دیکھا تھا تو ان کے مردانہ حسن کو دیکھ کر میں دنگ سا رہ گیا تھا۔ وجیہ اور شاندار صورت و شکل، سینے پر سرکار بہادر کے دیے ہوئے تمغے، قطار اندر قطار، آنکھیں بہت بڑی بڑی لیکن خوب صورت اور شبنمی، پیشانی کشادہ اور دل کو بھاتی ہوئی مونچھیں مردانہ وہی "دشمن داغ شہپر" لیکن جو تاب و توانائی ان مونچھوں میں دیکھی تھی وہ کچھ اور تھی۔ راحت سعید کی مونچھیں تھیں تو اپنے والد ماجد کی نقل، لیکن بالوں کی ملی جلی سیاہی اور سفیدی نے مونچھوں کے رعب کو مرجھاہٹ کی طرف مائل کر دیا تھا۔

میں نے نظر بھر کے اُن کو دیکھا حیرت میں تھا کہ ایسا لمبا تڑنگا صاحب بھی گویا افسانہ نویس ہو سکتا ہے؟ اس طرح کا تناور آدمی اور وہ بھی راجپوت قسم کا، کیا غزل جیسی نازک لطیف بلکہ حریر و پرنیاں سے بھی لطیف تر چیز راجپوتی فکر و ذہن نکال سکتا ہے؟ میں نے بہت سوچا۔ راجہ جے سنگھ کا نام یاد آیا، راجہ سورج سنگھ ذہن میں اُبھرا، راجہ مالدیو بہادر کی یاد بھی آئی۔ افسانہ نویس یا شاعران میں سے کوئی بھی نہیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ان حضرت کو جو اپنے آپ کو راحت سعید چھتاری کہتا ہے، عشق کا گھاؤ لگا بھی ہوگا؟ کسی کی نگاہ غلط انداز کا تیر ان کی موٹی کھال کو چھید کر کبھی ان کے دل و جگر کے پار ہوا بھی ہوگا؟ افسانہ نویس اور پھر شاعر؟ یہ کیسے ہو سکتا

ہے؟

شاعر اور افسانہ نگار تو وہ حضرات ہوا کرتے ہیں جن کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی، بال بکھرے ہوئے صفائی اور میل سے بیگانہ، کنگھی اور مانگ سے بے نیاز، ارادہ کسی طرف کا اور جلدیں کسی سمت، لباس کی کوئی پرواہ نہیں، اگر کرتا صاف تو پاجامہ میلا، بٹن سب کے سب نہیں تو کچھ کھلے ہوئے اور باقی ٹوٹے ہوئے۔ ایسی شکل و صورت اور چال ڈھال ایسی عادتیں اور اس طرح کی خصوصیتیں کہ جو عام انسانوں میں پائی نہ جاتی ہوں۔ سگریٹ اپنا تو یقیناً ماچس کسی دوسرے کا یا پھر دونوں اپنے نہیں۔ ساقی خانے سے اگر نہ بھی آرہے ہوں تو پھر بھی دکھائی اس طرح دیں گے کہ خم کے خم لنڈھائے ہوئے ابھی مستانہ وار چلے آرہے ہیں۔ یہ جو اپنے آپ کو راحت سعید چھتاری کہہ رہے ہیں یہ حضرت تو ماشاء اللہ صاف ستھرے انسانوں کی سی وضع قطع میں تھے نہ چال میں ترنگ نہ حال میں بے حالی!

ساقی کی جلدیں میرے گاؤں میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے وعدہ کیا اور خاص آدمی بھیج کر جلدیں منگالیں۔

وعدے کے دن یہ حضرت تشریف لائے۔ فروتنی کی یہ کیفیت کہ وہ بوجھل بستہ جو بوری میں بندھ کر آیا تھا، اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے چلے، میں نے ہزار کہا کہ ملازم کو بلاؤں لیکن آنکھ جھپکنے کی دیر تھی کہ یہ جا اور وہ جا، اور جب واپس آئے تب بھی اپنے ہی کاندھے پر لاد کر لے آئے۔

راحت سعید بعد میں تو میرے بے تکلف دوست اور لنگوٹیا یار بن گئے لیکن میرا یہ تاثر پہلی دو ملاقاتوں کا ہے۔ بعد میں انہیں واقعی اہلِ دل بھی پایا اور اہلِ ذوق بھی۔

شاہد احمد سے میری ملاقات پہلی مرتبہ جب ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی اچھے آدمی اور نفیس طبیعت کے انسان ہیں، آواز مدھم اور ملائم، اس میں قدرتی طور پر ایک رنگ رس تھا۔ بس میں نے جو سانولا سا چہرہ دیکھا تھا واقعی وہی سانولا پن تھا۔ رنگ اگرچہ کھلا ہوا نہیں لیکن چہرے کے نقش و نگار پر یہ سانولا پن غضب ڈھا رہا تھا۔ آنکھیں خوبصورت تھیں، ناک نقشہ البتہ اچھا کہ دیکھ کر دل مطمئن ہو جاتا تھا۔ قد درمیانہ اور بہت سجا ہوا لیکن باقی صورت حال مجھے کچھ اطمینان بخش معلوم نہیں ہوئی یعنی یہ نہیں تھا کہ دیکھنے والے پر اثر ہو کہ وہ یہاں آکر خوش حال اور کشمکش روزگار سے فارغ البال ہیں۔

بہر حال اب تو جب ملاقات ہو گئی تو پھر ملاقات ہوتی رہیں، کبھی دعوتوں میں کبھی گلڈ کے جلسوں میں اور کبھی کبھی وہ میرے گھر پر بھی تشریف لاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ متین اور سنجیدہ زیادہ ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ شروع ہی سے اس طرح تھے یا یہاں آکر غم روزگار نے ان کو ساکت اور ساکن بنا دیا تھا لیکن ویسے متانت اور سنجیدگی نے ان کی طبعی شگفتگی اور مزاجی نکھار کو ماند ہونے نہیں دیا تھا۔ مزید ار بات ہوتی تو وہ کھلکھلا کر قہقہہ بھی لگا لیتے تھے اور وہ قہقہہ عام قہقہے سے کچھ مختلف سا ہوتا تھا، اس میں ایک خوشگوار پن اور ایک نغمگی ہوتی تھی۔

وہ وضع داری کے بے حد پابند تھے۔ مصائب اور خستہ حالی کے باوجود انہوں نے ساقی یہاں سے بھی نکالنا شروع کیا لیکن اب کے ساقی وہ ساقی نہیں تھا۔ دلّی کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ لکھنے والے خدا جانے اب کہاں منتشر ہو چکے تھے؟ یہاں جو لکھنے والے آئے تھے اُن میں سے بعض کی خوش حالی ختم ہو چکی تھی اور بعض مالدار بننے کی کوشش میں مصروف ہو کر قلم کے پیشے سے دست بردار ہو چکے تھے۔ ساقی ویسے نکلتا تو رہا لیکن یہ فقط وضع کا نباہ محض روایت کی پابندی تھی، باقی کچھ بھی نہیں!

یہاں کے ساقی کو میں متواتر نہیں لیتا تھا لیکن سنا یہ کہ انہوں نے یہاں آکر خود جو کچھ لکھا اس میں زبان اور بیان کا رس تو تھا ہی لیکن اکثر اور بیشتر مضامین خونچکاں تھے، یعنی شاہد صاحب کو دلّی چھوڑنے پر جو زخم پہنچے تھے اور اندر ہی اندر جو گھاؤ تھے اس کے خون کی سرخی ان کے ایک ایک حرف کی سیاہی میں ملی تھی۔

بڑی مدت کے بعد یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ شاہد صاحب گانا بھی جانتے ہیں۔ دلّی کے مالدار گھرانے اور شرفاء کے خاندان سے تعلق تھا۔ کہیں شوقیہ گایا بجایا ہو گا لیکن حیرت کی حد یوں نہ رہی کہ پاکستان میں آکر روٹی جو کھائی وہ اسی گانے بجانے کی بدولت! لکھنے پڑھنے یا سینکڑوں لکھنے والوں کے پیدا کرنے میں جو مشقت اور محنت اٹھائی تھی وہ یہاں ان کے کسی کام نہ آئی۔

در حقیقت یہاں پہنچنے کے بعد جائداد، آبرو اور نئے معاشرے میں ایک مقام حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اور گر ھذا من فضلِ ربّی کی مدد سے ایجاد کیے گئے تھے۔ شاہد صاحب اُن سے قطعی نابلد تھے۔ اب یہ ان کی خاندانی شرافت کی کمزوری یا بزدلی سمجھ لیجئے۔ بہر حال علی گڑھ کے قفل ساز، آگرے کے موچی، میرٹھ کے قصائی، دلّی کے مٹھائی فروش تو

اکثر و بیشتر امیر بن گئے اور کئی ایک نے سید بن کر سجادے بھی آراستہ کر لیے اور بعض نے کسی نہ کسی بوسیدہ قبر پر بیٹھ کر ولایت اور کرامات سے روپیہ پیسہ بٹورنا شروع کر دیا۔ گویا تھوڑی بہت جدوجہد اور ذہن رسا سے کام لے کر ہر ایک طبقے نے اپنے اپنے لیے راستے بنا لیے اور مطمئن ہوتے گئے۔ لیکن شاہد صاحب نے ان میں سے کسی گُر پر عمل نہیں کیا۔ حالانکہ خاندانی لحاظ سے اگر یہ سید بن جاتے اور پیری مریدی شروع کر دیتے تو چنداں بعید بھی نہیں تھا کہ ایک قسم سے ان کو استحقاق بھی پہنچتا تھا۔ آخر علم اور سیادت میں کوئی زیادہ دُوری تو ہے نہیں لیکن شاہد صاحب نے پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک بہت ہی ویران اور اُداس سے گوشے میں ایک تخت پر بیٹھ کر زندگی کے کڑے دن طے کرنے شروع کیے اور تعجب یہ کہ بالکل ہنستے مسکراتے، کبھی تو کھلکھلا کر قہقہہ بھی لگا کے بتا دیے۔

یہ سب کچھ تھا اور شاہد صاحب نے کیا تو سہی لیکن در حقیقت یہ ایک بڑا طنز تھا۔ ایک زور کا تھپڑ جو انہوں نے ہم سب کے منہ پر مارا تھا۔ یہ ہنسی اور مسکراہٹ، خوشی اور طمانیت کب تھی۔ یہ تو در حقیقت ایک زہر خند تھا۔ ان کے گھر کی ویرانی اور اُداسی کا کیا پوچھنا!

بیا بکلبۂ ویرانِ من، کہ پنداری!
زشش جہت، بہم آوردہ ایم صحرا را

ہندوستان میں جن کے ہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ انہوں نے یہاں آکر سب کچھ بنا لیا، جس کی کٹیا تھی اس نے کوٹھی بنالی اور جس کی کوٹھی تھی اس نے محل کھڑے کر دیے۔ جنہیں وہاں شرفاء کے محلوں میں گھسنے کا استحقاق نہیں تھا۔ انہوں نے یہاں مکانوں اور دکانوں کی قطاریں بنا دیں۔ جن کے پاس ایک بیگھ زمین نہیں تھی انہوں نے سیکڑوں ایکڑ پا لیے۔ دولت کی اس فراوانی نے نو دولتیے پن کے اُبھار اور اٹھان کا زور دکھانے کے لیے دھنک کے سے رنگ کی قطار در قطار کوٹھیاں کھڑی کر دیں اور یہاں تک ہوا کہ بجا تو نہیں بلکہ بہت بیجا طریقہ سے ان کوٹھیوں پر سیکڑوں کی تعداد میں رنگا رنگی قمقمے بھی روشن کرا دیے تاکہ شام ہونے پر آنے جانے والوں کی آنکھیں ھذا من فضلِ ربّی کا حیرت ناک تماشا دیکھ کر خیرہ ہو جائیں۔

حاجی مولا بخش سومرو ریفیوجی منسٹر تھے۔ ان کی روایت ہے کہ دلّی کی ایک خاتون تقریباً چالیس کروڑ کی شہری جائداد کے پروانے لے کر اُن کے پاس پہنچی۔ حاجی صاحب نے اس خاتون سے عرض کیا کہ:

"محترمہ! آپ نے کچھ تو دلی کے دوسرے غریب مسلمانوں کے لیے بھی چھوڑا ہوتا، حکومت سندھ نے کراچی کی اپنی جائداد جو پاکستان کے سپرد کی ہے وہ تمام تر بھی اس سے کم داموں کی ہے!

سید مطلبی فرید آبادی خدا انہیں جیتا رکھے، مرحوم سید ہاشمی فرید آبادی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ علم و فضل اور خاندانی ثروت اور وجاہت کی وجہ سے اس خاندان کو کون نہیں جانتا۔ ان کی روایت ہے کہ کراچی آتے آتے جب ملتان کے اسٹیشن پر ان کی گاڑی رُکی تو سامنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے بے پناہ جھرمٹ میں ایک صاحب انہیں نظر آئے، صاف سفید کپڑے، قیمتی شال کاندھے پر اور صوفیانہ عمامہ سر پر بندھا۔ انہیں شک گزرا، اتر کر جو دیکھا تو فرید آباد کا ایک میراثی نکلا۔ شبراتی نام تھا لیکن فرید آباد کے لوگ اسے 'ابے او شبر ادھر تو آ!' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ادھر اُدھر پیغام پہنچانا اُس کے ذمے تھا۔

طنز تو سید ہاشمی مرحوم کی گفتگو میں بھی بلا کا تھا لیکن مطلبی صاحب کی مسکراہٹ میں نہ فقط طنز ہے بلکہ ایک بھرپور شرارت بھی ہے۔ پیر صاحب کی جب ان پر نظر پڑی تو مریدوں کے جمگھٹ سے فوراً نکل آئے، ادب سے مل کر علیحدہ لے گئے اور التجا کی کہ خدا کے واسطے میری لاج رکھیو سید صاحب تیرے نانا کے دامن میں پناہ لی ہے۔ سید بن کر مریدوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا ہے اب میری روزی پر لات نہ ماریو! باپ دادا کا واسطہ ہے۔

شاہد صاحب اگر اتنے ہی بزدل تھے کہ سید بننے کی توفیق نہ ہوئی تو انہوں نے اس میں بزدلی کیوں دکھائی کہ اپنے آباواجداد کی حویلیاں اور منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کا مطالبہ بھی نہیں کیا؟ اگر کیا بھی ہوگا تو وہ پینترے ان میں کہاں تھے اور وہ داؤ پیچ کہاں سے یاد تھے کہ حاصل کرنے تک کے لیے پورے ہفت خواں طے کرتے! سچ تو یہ ہے کہ وہ اس قسم کے ذہن رسا اور عقل خداداد کے آدمی تھے ہی نہیں۔

ریڈیو پاکستان سے شاہد صاحب کو جو کچھ آمدنی ہوتی تھی بس وہی سب کچھ تھا۔ ممکن ہے بعض کتابوں کے تراجم سے بھی اس میں اضافہ ہوتا ہو۔ بہر حال بظاہر آمدنی کی صورت جو کچھ تھی وہ یہ ہی تھی اس میں سے کچھ گھر کے دال دلیا میں صرف کرتے باقی جو کچھ بچتا وہ ساقی کی طباعت میں صرف ہو جاتا تھا۔ اس افلاس اور تنگیٔ روزگار میں ساقی پر فضول خرچی کرنے کا ردِّ عمل پورے گھر پر کیا ہوتا ہوگا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں بہر حال اگر کچھ ہوا بھی ہوگا تو انہوں نے

اسے اپنی روایتی ھنسی اور ایک قہقہے میں ٹال دیا ہوگا۔ وہ اپنے فیصلوں پر سختی سے پابندی کرتے تھے اور اپنی روایات کے قائم رکھنے پر ان کو بے حد اصرار تھا۔ پشتہاپشت کے خاندانی پن کی آخری یہی تو نشانیاں ہوتی ہیں! کوئی اور سرخاب کا پر تو نہیں ہوتا۔

شاہد احمد دلّی کے رہنے والے تھے، قلعہ معلّیٰ کی زبان پر قادر تھے۔ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی دہلی کی زبان بغیر کوئی لفظ ان کے منہ سے نہیں نکلا۔ زبان اور قلم سے عمر بھر اسی زبان کی خدمت کرتے رہے تھے، روزمرہ محاورے، الفاظ ان کے معانی اور معنی کے تمام پہلوؤں سے وہ نہ فقط واقف تھے بلکہ آخری دور میں اگر انہیں ہم یکتائے روزگار کہیں تو قطعی بے جا نہ ہوگا۔

پاکستان میں جب اس زبان کی لغت لکھنے کا وقت آیا اور ایک ادارہ قائم ہوا تو شاہد احمد نااہل قرار پایا۔ دلّی کا ہو بلکہ دلّی کے مستند خاندان کا آخری نشان ہو 'یعنی یہ کہ ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا' جنہوں نے قانونی کتابوں کے ترجمے کیے اور انگریزی کی قانونی اصطلاحیں اُردو میں اس خوبصورتی سے تراشیں کہ کسی سے اس کا جواب آج تک بن نہ پڑا۔ وہ آبائی جائداد سے تو یہاں آ کر محروم ہو گیا لیکن علم کی دولت کے متعلق جو یہ سنا جاتا ہے کہ وہ چھینی نہیں جاسکتی اس سے وہ کس طرح اور کیونکر محروم کیے گئے بلکہ نااہل قرار دیے گئے۔ یہ معمہ آج تک معمہ ہی بنا رہا۔ کم از کم میرے لیے تو قطعی یہ معمہ ہے!

اس ادارے کے سربراہوں میں سے کچھ تو ان کے ہم درس تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو ان کے وطن کے تھے، کچھ وہ تھے جنہیں ان کے دوست ہونے کا دعویٰ تھا۔ نام تو میں نہیں گناتا لیکن حق بات تو یہاں تک ہے کہ اور تو اور مجھ جیسا ناا‌ھل بھی اُس ادارے میں حکم کی حیثیت رکھتا تھا لیکن شاہد احمد دہلوی کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

دلّی کے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں، دراصل دارالسلطنت کے لوگ ہیں، شہزادوں کے اطوار کی کچھ کچھ جھلکیاں ان میں موجود ہیں۔ مٹتے مٹتے بھی ان کی طبیعتوں میں چلبلے پن کے آثار باقی رہ جاتے ہیں۔ جی میں آیا تو ان کے سامنے جاھل بھی عالم قرار پائے اور ان پڑھ بھی مسند علم پر بیٹھ گئے اور اگر مزاج نے قبول نہ کیا تو تحصیل علم کی ہزار پگڑیاں کیوں نہ باندھ رکھی ہوں لیکن جاہل مطلق شمار کیے گئے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے، آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

شاہد صاحب نے کوششیں تو کیں لیکن میں داد دوں گا اُس آدمی کے حمیت اور غیرت کی کہ اس نے ترقی اُردو بورڈ میں آنے کے لیے کوئی گھٹیا پن نہیں دکھایا، خودداری کو قائم رکھتے ہوئے اور اپنی وضع داری کو نبھاتے ہوئے کبھی کبھی یوں ہی اظہارِ مدعا کر دیتے تھے اور ناکامی کے بعد جب دوست پوچھتے تو محض قہقہہ لگاتے جو صحیح معنوں میں ایک بھرپور تھپڑ تھا اُردو کے رُخ پر!

گر دل از عرض تمنا، بمرادی نرسید
ایں قدر شد، کہ ترا بر سر نازم آوردم!

یقیناً وہ اردو زبان جانتے بھی تھے، ترکیبوں، محاوروں، روزمرہ اور محل استعمال، تشریح اور الفاظ کی رُوح اور نوک پلک اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا تبھی تو ان کے کلک سے شہد و شکر ٹپکتا تھا۔ اُن کی یہ ساری خوبیاں اور خصوصیات کسی کی نظر میں نہیں جچیں، وہ گاناگاتے گاتے سازو سرود بجاتے اور یہ فن سکھاتے ہوئے اس دنیا میں جتنے دن رہنے تھے رہ لیے اور آخر چل بسے۔ علم و قلم، زبان اور زبان دانی کے صفات دتی چھوڑنے کے بعد ان کے کسی کام نہ آسکے۔

ہم مردہ پرست ہیں، جب وہ اس دنیا میں نہیں رہے تو ساری ہمدردیاں نکھر آئیں۔ اب سنا ہے کہ اس خاندان کی کوئی خاتون ترقی اُردو بورڈ میں کسی کام پر لگادی گئی ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

چلیئے زندگی میں نہ سہی، مرنے کے بعد تو یہ راز کھلا کہ اُن کے خاندان میں عورتیں تک اس معیار کی اُردوئے معلٰی جانتی ہیں کہ اُردو بورڈ میں کھپ سکیں۔

آگہ نیم کہ، صید نگاہ کہ گشتہ ام
کز دست رفتہ بود دلم، تاخبر شدم

ممتاز حسن صاحب بہت کریم النفس اور اھلِ علم کی خدمت میں ہمیشہ چوکس رہنے والے انسان اور شاہد صاحب کے ہمدرد بھی تھے اور ان کو یہ بھی دعویٰ ہے کہ شاہد صاحب کے ساتھ دہلی سے ہی دلی لگاؤ رکھتے ہیں! لیکن اس نکتے پر پہنچ کر وہ بھی شاہد صاحب کو "کار آمد" ثابت نہ کر سکے! ؎

دہان یار، کہ درمان درد حافظ داشت

فغاں کہ وقتِ مروت چہ تنگ حوصلہ بود

دوست احباب ہمیشہ تعجب سے کریدتے رہتے تھے، کبھی کبھی یہ مسئلہ میرے بھی زیرِ بحث آیا، لیکن میرے پاس تو اس کا جواب سوائے خاموشی کے اور کوئی نہیں تھا۔ مجھ پر ایک ندامت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی لیکن وہ ایک دل نشین قہقہے میں میری ندامت اور میرے انفعال کو گم کر دیتے تھے۔

زمن مپرس! کہ در دست او، دلت چونست؟
ازو بپرس، کہ انگشتھاش در خونست!

میں نے دیکھا تھا کہ ابتداء میں تو انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق کسی روزگار کے لیے کوشش کی لیکن جب مایوس ہو گئے اور یہ حال دیکھا اس وقت بالکل ایں و آں سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔ نہ کسی میں امید رکھی اور نہ کسی سے کچھ اپنے بارے میں کہا۔

بے نیازانہ ز اربابِ کرم میگذرم
چوں سیہ چشم، کہ بر سرمہ فروشان گذرد

دراصل پاکستان بننے کے بعد یہ فقط ایک شاہد احمدؒ کی روئداد نہ تھی بلکہ بہت سے شاہد احمد اس بے قدری کے شکار ہوئے ہیں۔ اھلِ علم نہ جانے کیا سمجھ کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے کئی ایک بزرگ جن کے علم و فضل کے ڈنکے نصف صدی سے زیادہ ہندوستان میں بجتے رہے تھے۔ ان کی حالتِ زار یہاں وہ دیکھی ہے جو در حقیقت دیکھنے کے قابل نہیں تھی۔ اور نہ وہ اس قابل تھے کہ اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اگرچہ وہ دینوی دولت کی تھیلیاں اور جائداد کے قبالے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن وہ علم و ہنر کی ایسی لازوال دولت لائے تھے کہ پاکستان واقعی ان کی ذات کی وجہ سے علمی دنیا میں سر اُونچا کر کے چل سکتا تھا۔

طریق وادی غم را، کسے نبود رفیق
خود از صعوبت ایں راہ پُر خطر گویم!

سیمابؔ اکبر آبادی یہاں آ کر رہے تو بالکل کسمپرسی کی حالت میں اور پھر جب جہاں سے اُٹھے تو اس سے بھی زیادہ بیکسی کے عالم میں۔ اُن کی قبر کہاں ہے؟ یہ اُن کے صاحبزادے کو تو خبر ہو گی لیکن دوسرا کوئی شاید ہی جانتا ہو۔

آرزو لکھنوی یقیناً بہت سی آرزوئیں لے کر یہاں پہنچے تھے۔ اُن پر کیا بیتی؟ تفصیل تو مجھے

معلوم نہیں، مگر بہرحال جس کیفیت میں میں نے ان کو کراچی کی ذلیل گرمی میں عین دوپہر کی تپتی ہوئی دھوپ میں صدر میں پیادہ پا غیر معمولی تحیر کے عالم میں اِدھر اُدھر بھٹکتے اور گھومتے دیکھا۔ وہ سماں خدا شاہد ہے کہ کبھی بھی بھول نہیں سکتا! کس طرح زندگی گزاری، کب مرے، کہاں دفن ہوئے، کراچی کے کس حصے نے ان کے جسم کی عریانی کو قیامت تک کے لیے ڈھانپ لیا۔ وہ کچھ لوگ اب جانتے بھی ہوں گے لیکن اگلے برسوں میں کوئی بھی جاننے والا نہیں ہوگا!

ارشد تھانوی ایک صاحب تھے، جن کی ایک کتاب میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ "دنیا کی سیر اسّی دن میں" جس ذوق سے میں نے اس کو پڑھا تھا، وہ آج تک مجھے یاد ہے۔ بچپن سے اُن کا رعب دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی یہاں آئے۔ زندگی کے دن کاٹے، جب اجل کا پیام آیا تو نہ جانے کس حال میں اُن کی آخری سانس نکلی ؎

بسکہ مابیچارگاں، آفت نصیب افتادہ ایم
رنگ مابشکست اگر، دل باطپیدن جنگ داشت

ایک دن میں نے کراچی کی دیواروں پر قدِ آدم پوسٹر پڑھا کہ:

"سیرت رسول کا لکھنے والا کراچی کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرما رہے ہیں! کراچی والوں کو چاہیے کہ لاکھوں کی تعداد میں ان کے استقبال کو کراچی کینٹ پر پہنچیں۔"

شہر میں بڑی ہماہمی تھی کہ سید سلیمان ندوی ہندوستان کو خیر باد کہہ کر اس اسلامی مملکت میں رہنے اور بسنے کے لیے تشریف لا رہے ہیں!

لالہ بھیم سین سچر کی قیادت میں "پھر بساؤ کمیٹی" کے ممبران بھی دلّی سے آ رہے تھے۔ ہم لوگ ان کو لینے جب اسٹیشن پر پہنچے تو واقعی پورا پلیٹ فارم اسلامیانِ پاکستان سے اَٹا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ سید صاحب بھی لاہور سے اسی گاڑی سے تشریف لا رہے ہیں۔ جب گاڑی رُکی تو ہم "پھر بساؤ کمیٹی" کی طرف لپکے۔ لوگوں نے بھی اسی طرف آنا شروع کیا۔ اللہ اکبر کے نعرے فضا میں گونج اُٹھے اور پھولوں کے ہار بھیم سین سچر اور ان کے ساتھیوں کے گلے میں ڈالے گئے۔ کمیٹی والے خوش ہو گئے کہ یہ پوری پاکستانی مخلوق ان کے استقبال کے لیے سر کے بل چل کر اسٹیشن پر پہنچی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ انہیں آخر دم تک یہی غلط فہمی رہی۔ حقیقت یہ تھی کہ سید صاحب کسی وجہ سے نہ آ سکے۔ پھر بساؤ کمیٹی کے لیے استقبال کنندہ ہم پندرہ بیس

آدمی تھے۔ کمیٹی والے غلط فہمی میں رہے اور ہم اندرون خانہ ان استقبال کنندگان کی موجودگی اور ان کے ہاروں سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر بہت خوش ہوئے تھے۔ اسے اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق۔ بہر حال ہمیں تو وقت پر بڑا کام دے گیا۔

جب سید صاحب تشریف لائے تو میرے قریب ہی ایک کوٹھی میں قیام فرمایا۔ یہ وہ دور تھا جب کہ لوگوں کو اُمید تھی کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا دستور بننے والا ہے۔ اور اس کے کمیٹی کے سربراہ سید صاحبؒ ہوں گے۔ مسلمان کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر سربراہ سے فوراً عقیدت اور مروت پیدا کرلیتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کی شخصیت اور شخصی وجاہت کی بنا پر معتقد یا متاثر ہوتے ہوں۔ لوگ در حقیقت اپنی ذاتی اغراض نکالنے کے لیے گردوپیش کے چکر کاٹتے رہتے ہیں اور حقیقی عقیدتمند کم اور اعتدال کی حد تک آتے رہتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کا بھی لوگوں نے کیا۔ میں نے سُنا اور دیکھا بھی کہ سید صاحب کی کوٹھی پر ہر وقت ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ ان دنوں شاید ہی سید صاحب کو اپنے گھر میں آنے، آرام کرنے اور سوچنے کی فرصت ملتی ہوگی۔

غرض کہ ایک زمانہ اس امید پر لوگوں کا بیت گیا کہ سید صاحب سربراہ اب بنے اور کل بنے۔ جب ایک دفعہ اقتدار کے دروازے سید صاحب پر وا ہوئے تو پھر ان تمام فرضی عقیدت کیشوں کے کاج سدھ ہوتے رہیں گے۔ لمبے عرصے تک آنے جانے والوں کے ذہنوں اور عقائد میں یہی کش مکش رہی اور اسی آس پر انہوں نے اپنی آمدورفت جاری رکھی لیکن یہاں تو نہ اسلامی دستور کی طرف توجہ ہوئی اور نہ سید صاحب کسی ایسے محکمے کے سربراہ بنے۔ حکومتی حلقوں میں بھی سید صاحب کی آمدورفت نہیں تھی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ جھمگٹا اور جُھرمٹ کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا اور فقط وہی لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے جو واقعی ان کی علمی فضیلت اور منزلت کی وجہ سے ان کی ذات والا صفات سے حقیقی تعلق رکھتے تھے۔

نظامی دواخانے والے میرے محترم شفیق حکیم نصیر الدین احمد ندوی کا خدا بھلا کرے جنھوں نے روزِ اوّل سے سید صاحب کے دم توڑنے تک ان کی خدمت اس دل سوزی سے کی کہ وہ انسانیت کے بلند مراتب پر توبفضلہٖ تعالیٰ فائز ہیں ہی لیکن اس سے جبکہ سید صاحب پر آخری وقت آیا تو وہ واقعی ملائک معلوم ہوتے تھے۔ ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا، ان کی آنکھوں میں آنسو کی نمی تھی اور دل میں ایک کراہ، ذہن میں بے پناہ کش مکش، اضطراب اور اذیت تھی اور اسی عالم میں وہ

خدمت اور علاج برابر جاری رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن صبح سویرے مولانا عبدالرشید نعمانی گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

جلدی اُٹھو! سید صاحب کے جنازے کی نماز میں شرکت کریں۔

میرے منہ سے چیخ نکل گئی، کھل کر تو نہیں رویا لیکن اندر میں ایک طوفان برپا ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے پاکستان کی پوری فضا تاریک اور بھیانک دکھائی دینے لگی۔

نیو ٹاؤن جامع مسجد کی بنیادی عمارت تو مکمل ہونے کے قریب تھی، لیکن ایوان میں فرش فروش ابھی تک نہیں ہوا تھا، مولانا کا جنازہ رکھا ہوا تھا۔ کچھ عزیز، کچھ اہل علم اور ایک دو عرب سفراء موجود تھے۔ دو صفیں غالباً بڑی مشکل سے ہوئیں اور ہم نے سیرت رسولؐ کے لکھنے والے کی نماز جنازہ پڑھی۔

پاکستانی مسلمان کے مزاج کی دونوں کیفیتیں اس وقت میرے ذہن میں اُبھر آئیں۔ ایک آنے کے وقت ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پر جمع ہونا اور یہ کہ دائمی مفارقت کے وقت اس طرح آنکھیں چرا جانا ؂

زراہ میکدہ، یاراں! عناں بگردانید
چراکہ، حافظ ازیں راہ رفت و مفلس شد

پاکستان اسلامی حکومت کا روپ دھار کر وجود میں آیا تھا۔ لیکن دستور سے پہلے شیخ الاسلام کا منصب قائم کرنا ضروری تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم و مغفور اس وقت کی حکومت میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر بھی تھے، حکومت کی طرف سے تو غالباً نہیں لیکن مسلمانوں کی طرف سے وہی شیخ الاسلام قرار پائے اور پکارے جانے لگے۔ اتفاق سے وہ بھی میرے ہی محلے میں جب تک زندہ رہے، ایک صاحب کی کوٹھی میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے فروکش رہے، میزبان کی آنکھیں تو فرش راہ تھیں ہی لیکن اور عقیدت مند بھی کچھ کم نہیں تھے۔

مولانا کی خدمت میں افسوس ہے کہ میں فقط ایک ہی مرتبہ جا سکا اور وہ بھی مولانا غلام رسول مہر کے ہمراہ۔ ان دونوں کے مابین اسلامی دستور پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں سنتا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جب مولانا مہر باہر نکلے تو وہ بھی کچھ متردد اور مذبذب معلوم ہوتے

تھے۔ بہر حال اس کے بعد پھر کبھی مجھے توفیق نہ ہو سکی کہ ان کی خدمت میں حاضری دے سکوں۔

بہت سی باتیں اور حقائق ایسے ہوتے ہیں جو کہنے کے لیے نہیں ہوتے، وقت اور مصلحت کوشی کا خدا بھلا نہ کرے بلکہ بیڑا غرق کرے جس نے انسان کا یہ ازلی حق ابد ہی سے چھین رکھا ہے۔ بہر حال جہاں یہ "مہمانِ خصوصی" قیام پذیر تھے اس کے سامنے بہت بڑا میدان خالی پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی میدان ہے جہاں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا تھا اور مولانا ظفر علی خاں نماز کے وقت اجلاس ملتوی کرنے کی بات پر گاندھی جی سے ناراض ہو کر نہ فقط واک آؤٹ کر گئے بلکہ اسی رات کو لاہور چلے گئے تھے۔ جب یہ "مہمانِ خصوصی" اس جہان سے رخصت ہوئے تو اسی میدان کے دور افتادہ کونے میں سپردِ خاک کیے گئے۔ اس میدان میں شیخ الاسلام کی زندگی میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی گئی تھی۔ مولانا سپردِ خاک کیے گئے اور جب یہ سب کچھ ہو چکا تو بقیہ میدان میں اسلامیہ کالج کی اتنی بلند و بالا اور شاندار عمارت کھڑی کی گئی کہ مولانا کا مزار اور خدا کا گھر دونوں اس کے سائے تلے نہ فقط دب کے رہ گئے بلکہ ایک کھیل معلوم ہونے لگے۔

اس غیر اہم گوشے میں دو مزار ہیں ایک شیخ الاسلام کا اور اس کے پہلو میں حضرت سید صاحب کا۔ یہ گوشہ اس طرح ویران اور اُداس سا ہے کہ دن کی دوپہر کو بھی وہاں شام غریباں کا ساسماں نظر آتا ہے۔ دعائے مغفرت کے لیے ممکن ہے کوئی بھولا بھٹکا بندۂ خدا آتا ہو، لیکن جب بھی میں وہاں سے گزرا ہوں تو ان دونوں قبروں کو کچھ اس طرح اُجاڑ اور ویران پایا ہے کہ جیسے یہ قبریں ایسے دو نا معلوم مسافروں کی ہوں جن کا نہ وطن معلوم ہو اور نہ اس دنیا میں کوئی ان کا اور وارث ہو۔ نہ جانے یہ دو غریب الدیار کن امیدوں کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے قبرستان کو تج کر یہاں پہنچے تھے اور نہ جانے پھر کیا ہوا کہ آج ان کے مزاروں کی یہ صورت ہے۔ بہر حال آئندہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان دو مزاروں کے اندر اس صدی کے دو ایسے نادر روزگار نامی فردوس نشیں ہیں جن میں سے ایک رسولؐ کی سیرت کو اُجاگر کرنے والا ہے اور ایک خدا کے کلام کا بے بدل مفسر ہے۔

بے کسی کی زندگی بسر کرنے والے اور کئی ایک نامیوں کو اس دنیا سے بے نام و نشان رخصت ہوتے ہوئے میں نے دیکھا ہے اور جو کچھ ان آنکھوں کے سامنے گزرا ہے اگر ایک ایک کر کے گنانا شروع کر دوں تو ایک بھیانک اور سخت گھناؤنی صورت حال سامنے آجائے گی۔ جس

سے شاید آج کے آسودہ حال اور رنگ محلوں میں رہنے والے نو دولتیئے اور بے حس لوگ تلملا اٹھیں۔

نواب نثار یار جنگ حیدر آباد کے منصب دار اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر رہ چکے تھے۔ علم کے شائق، اہلِ قلم کے سرپرست اور کتابوں کے رسیا تھے، چاند بی بی ان ہی کی تحریک پر لکھی گئی اور ان ہی کے خرچ سے چھاپی گئی۔

یہاں پہنچ کر تنگیٔ روزگار نے جب آن دبوچا تو کتابیں۔۔۔۔ جو زندگی بھر جمع کی تھیں اور اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھیں وہ بیچ بیچ کر گزر اوقات کرنے لگے۔ مکان تھا نہیں لہٰذا میرے عزیز دوست جناب ماہر القادری کے دفتر میں یہ کتابیں برائے فروخت رکھ دیں۔ ماہر صاحب نے مجھے بتایا اور ایک دن مجھے اپنے دفتر میں ایسے وقت لے گئے جبکہ نواب نثار یار جنگ بھی وہاں تشریف رکھتے تھے۔ بال سفید، داڑھی منڈی ہوئی، ہلکی سی مونچھیں، جسم کے نازک اور قامت میں متوسط، جوانی میں رنگ سرخ و سپید ہو گا۔ لیکن اب زمانے کی دھوپ چھاؤں نے ان کے چہرہ کو ملگجا سا بنا دیا تھا۔ ناک نقشہ نمکین اور شرفاء کا سا تھا۔ شیروانی، چوڑی دار پاجامہ، اگلے دور کے شرفاء کی طرح میں پیٹنٹ پمپ شو پاکستان کے اندر آخری مرتبہ اسی دن انہیں کے پاؤں میں دیکھا اور پھر کبھی کسی کے پاؤں میں نظر نہ آیا۔

نثار جنگ نے جب وطن کو خیر باد کہا تھا تو عمر رسیدہ ہو چکے تھے لیکن بڑھاپے نے صحیح معنی میں انہیں یہاں آ کر گھیرا تھا۔ اگلے زمانے کے شرفا کیسے ہوتے تھے؟ اور چھوٹوں کے ساتھ کس طرح شفقت کا برتاؤ کرتے تھے؟ مجلس میں نشست و برخاست کے کیا طور طریقے اور آداب تھے؟ یہ اوصاف مجموعی طور پر اگر کبھی یک جا میں نے دیکھے تو وہ نثار یار جنگ میں دیکھے۔

کتابوں کا ذکر نکلا تو قیمت چکاتے وقت آنکھیں جھکا لیں اور چہرے پر پسینہ کی بوندیں نکل آئیں۔

نواب نثار یار جنگ اس وقت ایک اجنبی کے ہاتھ کتابیں بیچ رہے تھے؟

ایک مدت کے بعد میں نے سنا کہ نواب نثار یار جنگ کراچی کے جیل خانے میں ہیں۔ مکان نہیں مل سکا۔ خریدنے کی توفیق نہ تھی۔ ایک خالی پلاٹ دیکھ کر کرایہ کا خیمہ اس میں کھڑا کر لیا اور اپنی زندگی کے دن اس میں پورے کرنے کی ٹھان لی۔

ازبال و پر ، غبار تمنا نشانده ایم

برشاخ گل، گراں نبود، آشیانِ ما

لیکن جب زمانہ کروٹ لیتا ہے اور شرفاء کے لیے بُرے دن آتے ہیں تو یہ ظالم روزگار انہیں اس سبکساری کے ساتھ بھی جینے اور رہنے دینے کا روادار نہیں ہوتا۔

یہ خالی پلاٹ کسی خاتون کی ملک بن گیا۔ خیمے کی طنابیں کٹ گئیں اور نواب نثار جنگ بہادر اس جیل خانے کے اندر جا پہنچے جو میرے گھر سے تھوڑی ہی دور کلفٹن روڈ کے اختتام پر واقع ہے اور آج بھی خونخوار درندے کی طرح کسی کو چبا جانے کے لیے اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ خدا بھلا کرے سید ہاشم رضا کا جو اس وقت اتفاق سے کراچی کی کمشنری پر فائز تھے۔ الحمد، نو عمر اور نوخیز پاکستانی برانڈ افسر نہیں تھے، شریف تھے۔ شریف خاندان سے تعلق تھا۔ اس لیے اخلاقی اقدار اور شرفاء لوازمی ان کی سرشت میں تھی۔ نہ جانے کس طرح اور کتنے دنوں کے بعد انہیں جب یہ علم ہوا تو خود جا کر اس بوڑھے نواب کو، جو اپنا وطن اور اپنے وطن میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ فقط ایک جذبہ اور وہ بھی خالص اسلامی جذبے کا خزانہ لے کر دنیا کی اس پانچویں بڑی سلطنت اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت میں چلا آیا تھا چھڑا لائے۔

بہرحال پھر سنا کہ انہوں نے جیسے ہی بندی خانے سے رہائی پائی۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس سے بھی بڑے زندان خانے سے نجات پالی یعنی اس بے معنی اور بے مصرف زندگی کا طوق گردن سے اُتار پھینک دیا۔

رود آرام زعمرے کہ بہجران گذرد

کارواں، در رہ نا امن شتاباں گذرد

یہی حال یہاں آکر مرحومہ عطیہ بیگم فیضی اور ان کے پورے خاندان کا ہوا۔ بمبئی میں جو اس خاندان کی قدر و قیمت تھی اور وہاں جو انہیں منزلت اور مقدرت حاصل رہی اس کو وہی لوگ بہتر جانتے ہیں جنہوں نے ان کا وہ ٹھاٹ اور روزگار دیکھا ہوگا۔ بڑے بڑوں کے سر ان کی چوکھٹ پر حاضری کا سودا سر میں لیے پھرتے تھے۔ ہم نے تو یہاں اُن کی یہ حالت دیکھی کہ جھونپڑا اُلٹا پھر سامان ضبط ہوا اور اس کے بعد معمولی سے ہوٹل کے ایک تنگ کمرے میں سر چھپایا۔ ایک ایک نے پھر جو بے کسی اور کسمپرسی کے عالم میں اس جہان کو چھوڑا ہے تو آج سے چند سال بعد یہ بھی کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ اس نامی خاندان کے ارکانِ ثلاثہ کی قبریں کہاں ہیں؟

یہ اور بات ہے کہ جب سب کچھ بیت چکا تو ان کے بقیہ افراد کو کچھ وظیفہ ملنے لگا اور جب جہاں چھوڑا تو ان کے اثاثے کو ایک میوزیم کی صورت دے دی گئی لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؎

جو مسافر سر بھٹک کر جنگلوں میں مر گیا
اب اسے آواز دینے کارواں آیا تو کیا

جب یادیں آنی شروع ہوتی ہیں تو پھر بہت سی یادیں ایک ساتھ ذہن میں اُبھر آتی ہیں۔ فرید آباد کے میراثی کا حال اوپر میں نے بتایا ہے۔ ایک طرف تصویر کا وہ رُخ آپ نے دیکھا دوسری طرف راجہ صاحب محمود آباد کو دیکھئے۔ پاکستان کے لیے مردانہ وار لڑے۔ سات پشت سے ارکہ ترکہ جو کچھ تھا سب ہی داؤ پر لگا دیا باقی جو بچ رہا وہ ضبط ہو گیا۔ کھدر کے کرتے پاجامہ میں یہاں تشریف لائے۔ بہت دن رہے۔ آخر لندن جا کر پناہ لیتے بنی ؎

تیر عاشق کش ندانم؟ بر دل حافظ کہ زد
ایں قدر دانم کہ، از شعر ترش، خوں می چکد

کس سے پوچھا جائے کہ یہ سب کیوں ہوا اور کیونکر ہوا؟ جب راجہ صاحب کو دیکھتا ہوں تو کہنا پڑتا ہے ؎

باز گویم نہ دریں واقعہ، حافظ تنہاست
غرقہ گشتند دریں، بادیہ بسیار دگر

کراچی بظاہر تو بہت ہی روشن، درخشاں اور زندوں کا شہر نظر آتا ہے، لیکن در حقیقت پاکستان کا یہ سب سے بڑا قبرستان ہے، ایک ایسا قبرستان جس میں اس پوری صدی کے رجال، علمی مشاہیر قومی اور اشخاص نامی اس طرح خاک میں مل گئے ہیں کہ جب مسلمان کو ہوش آئے گا۔ یہ خمار اُترے گا اور اپنے زیاں اور نقصان کی تلافی کرنے اُٹھے گا۔ اس وقت افسوس کہ ایک نام و نشان بھی ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اس بے اعتنائی کا خمیازہ اور جرمانہ کب اور کس عدالت میں اس کو دینا پڑے گا؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تاریخ کی عدالت میں لازماً ایک دن اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، گلے میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں گی۔ اپنے محسنوں اور نامی شخصیتوں کے ساتھ اس کا یہ مسخرہ پن کوئی معمولی گناہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا اور ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی سزا یہاں بھی ایک دن ان کو مل جائے گی لیکن جب زمانہ جاگ اٹھے گا۔

شاہد احمد بھی ان ہی مشاہیر میں سے تھے جن کے ساتھ پاکستان میں انصاف نہیں ہوا۔

انہوں نے علم جو حاصل کیا تھا۔ پاکستان میں انہیں اس سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اگر انہیں یہاں جائے پناہ ملی تو مضراب کی جنبش اور طبلے کی تھاپ میں ملی! ویسے تو یہ امر بھی ایک عجوبہ ہی ہے کہ جہاں بڑے غلام علی خاں پنپ نہ سکے، وہاں شاہد احمد کو روزی دے کر ریڈیو پاکستان نے کس طرح اپنے دامن کے کچھ داغ دھو لئے۔

شاہد احمد کا میں نے کبھی گانا سنا نہیں تھا۔ ہمیشہ پروگرام بنتے رہے اور ٹوٹتے رہے، سنا ہے کہ بہت ہی بڑے استاد تھے۔ ایک مرتبہ وہ منیلا تشریف لائے اور ہمارے بھائی صاحب کے ہاں مقیم ہوئے اس وقت البتہ ویسے ہی ایک دن صبح کے ناشتے کے بعد انہوں نے ایک غزل گنگنانی شروع کی تھی۔ بس اس کی لذت اور طرب انگیزی اب تک یاد ہے اور جب وہ گھڑی اب بھی یاد آتی ہے تو کانوں میں ایک رس بھری آواز سنائی دیتی ہے لیکن ایسے جیسے بہت دور سے کوئی گا رہا ہو۔

آج میں اپنی ۱۹۶۷ء کی ڈائری کھول رہا ہوں۔ ۲۸ مئی کی تاریخ ہے اور اتوار کا دن۔ اس میں یہ عبارت لکھی ہے :

"آج صبح جنگ میں یہ خبر آئی کہ گذشتہ رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر شاہد احمد دہلوی پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اس دنیا کی کش مکش سے نجات پا کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے۔"

شاہد احمد کا جنازہ جب اُٹھا تو کچھ عزیز اور باقی بہت قریب کے ملنے والوں کا ایک مختصر سا قافلہ ان کی آخری منزل تک پہنچانے چلا۔ قبر منہ کھولے ہوئے منتظر تھی۔ ایک سیاہ پوش خاتون جلدی جلدی قرآن مجید کی آیتیں پڑھ رہی تھیں۔ لاش قبر میں اُتاری گئی اور پھر منوں مٹی اس پر ڈالی گئی۔

زندہ رہنے والے مرنے والے کو قبر میں اُتار کر جب تک پوری قبر اَٹ نہ جائے اس وقت تک مختلف ٹولیوں میں بٹ کر اپنی اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے، دنیا اسی کا نام ہے کوئی کسی کے پیچھے نہیں گیا۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی، دنیا کا کاروبار اور انسانوں کے مشاغل ویسے ہی جاری رہیں گے۔

شاہد احمد اپنے خالق کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب اسے کوئی ضرورت نہیں ہے دنیا جانے اور اس میں رہنے والے جانیں انہیں کوئی سروکار نہیں لیکن افسوس فقط یہ کہ جیتے جی ان کے دُکھ درد کی کسی نے کوئی خبر نہ لی۔

مانند سبزۂ کہ، بردید بزیر سنگ

آگہ نشد کسی، ز خزاں و بہار من

اب تو ہادی مچھلی شہری بھی خدا کو پیارے ہو گئے ہیں ورنہ میں پوچھتا کہ حضرت! پورا ہندوستان بگڑ کر کراچی بنا تو سہی! لیکن پھر کیا ہوا؟ پوچھوں گا لیکن عرصہ گاہ قیامت میں شاہد احمد کے سامنے۔ سید سلیمان کے منہ پر، نثار یار جنگ اور ایسے سیکڑوں مشاہیر کے رُوبرُو!

ہمارا تعلیمی نظام اور ماحول

سندھ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد دیبل، منصورہ، قصدار اور ملتان وہ مرکزی مقامات تھے جو مسلم تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا مرکز بن گئے تھے ان میں منصورہ کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ محمد بن قاسم کے ہمراہ قرآن اور حدیث کے بعض عالم بھی تھے۔ ان میں موسیٰ بن یعقوب ثقفی ایک ممتاز عالم اور محدث تھے وہ اروڑ کے قاضی مقرر ہوئے۔ منصورہ کا مدرسہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ منصورہ میں علماء کی کثرت تھی ان ہی علما کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سندھ کے باشندے بھی علوم و فنون میں ماہر و کامل ہوگئے ان میں ابو معشر سندھی، عبدالملک، حافظ ابو محمد اور ابو نصر بڑے بڑے محدث اور فقیہہ گزرے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے بغداد جیسے علمی مرکز میں درس و تدریس کی محفلیں جمائیں۔

اس زمانہ میں زیادہ درسی کتابیں نہیں تھیں اور نصاب تعلیم بھی کوئی خاص مقرر نہیں تھا۔ حدیث و قرآن پر خاص توجہ دی جاتی تھی اور یہی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ نصاب کی صورت مقرر ہوتی گئی اور مختلف اوقات میں مختلف کتابیں نصاب میں شامل رہیں ان میں سے بعض سندھ سے باہر کے علما کی بھی تصانیف تھیں اور ان میں سے اکثر کتابیں علمائے سندھ کی تھیں۔ یہاں دین کے بنیادی اصولوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ عام طور سے فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر اور طب وغیرہ علوم پڑھائے جاتے تھے۔ طب پڑھانے کی وجہ یہ تھی کہ پردے کی پابندی کی وجہ سے غیر محرم طبیب

گھر میں نہیں آسکتا تھا اس سے علمِ طب درس کا لازمی جز قرار پایا تاکہ مستورات کا علاج گھر میں خود کیا جاسکے اور اس طرح خدمت خلق بھی ہوتی تھی۔

تعلیم و تدریس کو ذریعہ معاش کے طور پر اختیار نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس سے علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت اور اپنے اسلاف کے علوم و فنون اور کارناموں کی حفاظت کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عام طور پر پڑھے لکھے خاندان کی بیٹھک میں مخصوص طلبہ مخصوص فن کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ عام مدارس کے لیے مساجد استعمال ہوتی تھیں۔ خاص طور سے قرآن اور ابتدائی درسیات کی تعلیم مساجد میں ہوتی تھی۔ سندھ میں حدیث کو ہر دور میں خاص اہمیت دی گئی اور علمائے سندھ کو یہ فخر و امتیاز حاصل رہا کہ ان میں سے اکثر علمائے محدثین مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حدیث کے اساتذہ رہے اور انہوں نے ان مقدس مقامات پر حدیث کا درس دیا۔ ان محدثین کرام میں ابوالحسن کبیر، ابوالحسن صغیر، محمد حیات، محمد قائم اور علامہ محمد عابد سندھی امتیازی طور سے مشہور و معروف ہیں۔ برصغیر کے ہر سلسلہ حدیث میں اوپر کے سلسلے میں سندھی محدثین کا واسطہ بالعموم ضرور ہوتا ہے۔

تاریخ میں سمہ دور مدارس اور تعلیم کے لیے خاصا مشہور ہے پھر بارہویں صدی کے آغاز سے انگریزوں کے قیام حکومت تک، تعلیم اور درسگاہوں کا نمایاں طور سے اجرا ہوا۔ ھملٹن فتح سندھ سے پہلے ٹھٹہ شہر آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس وقت ٹھٹہ میں چار سو درسگاہیں تھیں جن میں علماء درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ سر رچرڈ برٹن نے بھی سندھ کی تعلیمی کیفیت و حالت کا ذکر کیا ہے اور اس سے اس زمانے میں جو نصاب مروج تھا اس کی بعض کتابوں کی بھی نشان دہی کی ہے لیکن اس کی بعض باتیں سنی سنائی ہیں اور اس نے مکمل نصاب نہیں بتایا ہے اور اس نے بعض کتابیں غلط مصنفین کے نام بھی منسوب کردی ہیں۔ مثلاً اس نے ایک تصنیف قلندر لال شہباز کے نام سے بھی بتائی ہے اور کہا ہے کہ یہ کتاب داخل نصاب تھی۔ حقیقت میں یہ کتاب کسی دوسرے مصنف کی ہے اتفاق سے اس مصنف کا نام بھی عثمان تھا۔ لال شہباز قلندر نہ تو مصنف تھے اور نہ شاعر تھے وہ لاابالی طبیعت کے مالک تھے اور قلندرانہ مشرب رکھتے تھے ان کی زبان آذربیجانی تھی فارسی نہیں تھی۔ وہ عربی جانتے تھے مگر ان کی تصنیف و تالیف

میں کوئی درک نہیں تھا۔

اصول تعلیم پر سندھ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں مخدوم جعفر بوبکانی کی کتاب "حاصل النھج" بہت مشہور و معروف ہے اس کتاب میں اصول تعلیم طریق تعلیم اور علم کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ علامہ محمد ہاشم ٹھٹوی نے بھی اصول تعلیم پر فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ نہایت قابلِ قدر تصنیف ہے۔ مخدوم بوبکانی کی کتاب سے سندھ میں تعلیم کے نظام کا جو حلیہ تھا وہ ظاہر ہوتا ہے۔

سندھ میں امن وامان اور دینی درس کے رواج کا شہرہ سن کر علامہ جمال الدین دوّانی نے بھی یہاں آکر درسگاہ کھولنے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ زادراہ پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ ان کے دو شاگردوں نے ایران کے حالات سے بیزار ہوکر یہاں آکر درسگاہیں کھولیں۔ اسی طرح عبدالعزیز ابھری اور اظہرالدین ابھری بھی یہاں کی دینی آب و ہوا سے متاثر ہوکر ترک وطن پر مجبور ہوئے اور یہاں آکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔

درس نظامی یہاں اپنی مکمل صورت میں کبھی رائج نہیں رہا۔ البتہ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد بعض اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ یہاں رواج پذیر ہوا۔ سندھ میں دوردراز علاقوں کے طلبہ تحصیل علم کے لیے آتے تھے اور تعلیم پاتے تھے۔ چونکہ بخارا اور سمرقند سے براہِ راست سندھ کے تعلقات تھے اس لیے خصوصیت سے وہاں کے لوگ تحصیل علم کے لیے یہاں آتے تھے۔

یہاں عربی کے علاوہ فارسی زبان بھی بہت مقبول تھی۔ فارسی کی درسی کتابیں جو میرے زمانے تک داخل نصاب رہیں وہ یہ تھیں: سکندر نامہ، بہار دانش، یوسف زلیخا، انشائے ابوالفضل، گلستاں، بوستاں، اخلاق ناصری وغیرہ۔

یہاں کی درسگاہوں میں درس سے فارغ اوقات میں ضرب الامثال، بیت بازی اور ادبی لطائف و ظرائف یاد کرائے جاتے تھے تاکہ مجلسی آداب کی تربیت ہوسکے اور ان کے برتنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

حدیث کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ حدیث کے شروع میں علامہ ابوالحسن کبیر کے حواشی پڑھائے جاتے تھے بلکہ یہ حواشی نہ صرف

سندھ بلکہ جامعہ الازہر (مصر) میں بھی پڑھائے جاتے تھے چنانچہ ان حواشی کے ایڈیشن مصر میں شائع ہوئے ہیں۔ عمومی مطالعہ میں فارسی تفسیر اور مخدوم محمد ہاشم تتوی کی سندھی تفسیر بھی رہتی تھی اور فارسی ادب میں مولانا رومی، حافظ، فردوسی اور جامی مقبول ترین شاعر تھے بلکہ مثنوی مولانا روم کو سندھ میں بڑا درجہ حاصل تھا۔ اور اسی کی تعلیم کے لیے خاص علما ہوتے تھے چنانچہ ہمیں بہت سے علما کے نام ملتے ہیں، جو صرف مثنوی مولانا روم کا درس دیتے تھے اور اس کے رموز ونکات کو بیان کر کے مولانا رومی کے فلسفے کو واضح کرتے تھے۔ مثنوی رومی کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح صبح کو کلام مجید کی تلاوت کی جاتی تھی اسی طرح تلاوت کے بعد مثنوی شریف کو رحل پر رکھ کر پڑھا جاتا تھا۔

سندھ فکری لحاظ سے وسیع المشرب رہا ہے۔ تصوف کے سلسلے میں یہاں کے صوفیہ نے تمام مذاہب کے تصوف کو لے کر اپنا ایک خصوصی نظریہ اپنا لیا تھا جس میں منصور، عطار اور سرمد کو خاص طور سے اہمیت دی جاتی تھی اور اس میں ویدانیت اور ایرانی تصوف کی بھی آمیزش تھی اسی سلسلہ میں علما کے درمیان کشمکش بھی رہی چنانچہ آخری دور میں یہاں دو اسکول قائم ہوگئے۔ ایک اسکول کے بانی مخدوم محمد معین تھے جن کے دوست شاہ عبداللطیف بھٹائی تھے، کہتے ہیں کہ مخدوم معین نے شاہ ولی اللہ دہلوی سے بھی استفادہ کیا تھا۔

دوسرے اسکول کے بانی محمد ہاشم تتوی تھے اس اسکول کے لوگ ظاہری شرعی احکام پر زور دیتے تھے اپنے افکار میں متشدد بھی تھے اور وسیع النظر نہیں تھے۔ لہٰذا یہ اسکول زیادہ ترقی نہیں کرسکا۔ اوّل الذکر مکتبہ فکر کے لوگ پھلتے پھولتے رہے اور اس کے مراکز ابھی تک قائم ہیں۔ شاہ عنایت (جھوک)، شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، کنڈڑی والے بزرگ وغیرہ تمام صوفیہ اسی اسکول کے ماننے والے ہیں۔ امام غزالی اور شیخ ابن عربی دونوں اسکولوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔

ابوالحسن ڈاہری کی کتاب الینابیع الحیات تصوف میں بنیادی کتابوں کی حیثیت رکھتی ہے اور امہات الکتب میں شمار ہوتی ہے اگرچہ یہ کتاب سبقاً سبقاً نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ طلبہ بالعموم تعلیم کے دوران اسے عام مطالعہ میں رکھتے تھے۔ فصوص الحکم، احیاء

العلوم، کیمیائے سعادت، عوارف المعارف کے ساتھ ساتھ ابوالحسن ڈاہری کی کتاب بھی مطالعہ میں رہتی تھی۔

انگریزوں نے ابتدا میں عربی فارسی کی تعلیم اس طرح رائج رکھی لیکن آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر کتابوں میں ردوبدل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بات گلستاں بوستاں پر آکر ٹھہر گئی اور آخر میں صرف اقتباسات پڑھائے جانے لگے۔ انگریزی عہد میں دینی درسگاہوں میں تعلیم کو ذریعہ معاش بنایا گیا ورنہ اس سے قبل تاریخ میں ہمیں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سندھ کے بعض قصبے اور شہر علمی مراکز کے اعتبار سے خاصے مشہور تھے ان میں سے ٹھٹہ کو مورخین نے دمشق، بغداد اور سمرقند کا ہم پایہ قرار دیا ہے۔ ٹھٹہ کے علاوہ سیہون، ٹیاری، ہالہ، روہڑی، کوٹری کبیر، شکارپور، ہمایوں، سلطان کوٹ اور پاٹ مشہور مراکز علمی تھے۔ ان مقامات پر بہت سے مدارس تھے۔ علما ذاتی طور سے درس دیتے تھے گھر گھر کتب خانے تھے اور ایک شہر میں کئی کئی علما ایسے تھے جو دنیائے اسلام کے بڑے بڑے اساتذہ میں شمار ہونے کے قابل تھے لیکن افسوس کہ ان کے سوانح اور ان کی تعلیمی و تدریسی خدمات کی تفصیل ہم تک نہ پہنچ سکی۔ ہم ان کے نام جانتے ہیں ان کے کام کی تفصیل سے ناواقف ہیں۔

سندھ کے تعلیمی نظام میں فقہ کو خصوصی مرتبہ حاصل تھا کیونکہ شرعی مسائل اور حکومت کے جھگڑوں کے فیصلے اسلامی فقہ کے مطابق ہوا کرتے تھے اس وجہ سے فقہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا یہاں بڑے نامور فقیہ اور ائمہ فن پیدا ہوئے جن کے فتاویٰ مرتب و مدون موجود ہیں مثلاً فتاویٰ پورانی، بیاض ہاشمی، بیاض واحدی، بیاض ہمایونی وغیرہ آج تک فقہ کے دقیق مسائل کے حل میں مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔

اس میں فقہ کی وہ تمام کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو عالم اسلام کی درسگاہوں میں رائج تھیں۔ تاریخ اور عربی ادب پر کم توجہ تھی بنیادی طور پر یہاں کی درسگاہوں میں قرآنی علوم، حدیث، فقہ اور طب نصاب تعلیم کے خاص مضامین تھے۔ طب کے ساتھ جفر، رمل، نجوم وغیرہ علوم پر بھی بعض اطباء خاص توجہ دیتے تھے اس سلسلے میں علمائے شھدادکوٹ، مخدوم محمد جعفر بوبکانی اور میرے پردادا پیر علی محمد راشدی خاص طور سے

قابلِ ذکر ہیں۔

تعلیمِ نسواں پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی عورتوں کے مدرسے حویلیوں میں ہوتے تھے۔ لڑکیاں ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد، نور نامہ سندھی، مدح کی کتابیں اور شاہ کا "رسالہ" پڑھتی تھیں ان کو زیادہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی کیوں کہ پردے کی وجہ سے لڑکیوں کو خانگی امور کی تربیت دینی ضروری سمجھی جاتی تھی بعض خواتین گھریلو طب بھی پڑھتی تھیں جس میں بچوں کے علاج کا عنصر خاص طور سے شامل ہوتا تھا معجزات نبوی پر خاص نظموں کے مجموعے عورتوں کی تعلیم کے لیے مرتب کیے گئے تھے جو عورتوں کے نصاب میں شامل تھے جس میں ہرنی کا معجزہ، جم جماہ بادشاہ کا قصہ اور اسی طرح کے کئی قصے ہوتے تھے۔

مساجد کے حجرے، علماء کی قیام گاہ اور زمینداروں کے اوطاق باہر کے شاگردوں کے لیے اقامت گاہ کا کام دیتے تھے۔ مدارس اور کتابوں کے مصارف کے لیے زمیندار ہر فصل پر فصلانہ دیتے تھے۔ شہر کے کھاتے پیتے لوگ طلبہ کو کھانا بھیجا کرتے تھے۔ کپڑا بھی بالعموم زمیندار مہیا کرتے تھے۔ طلبہ کی کتابیں یا تو شخصی کتب خانوں سے مستعار لیتے تھے یا زمیندار خرید کر دیا کرتے تھے۔

آج کل کی طرح طلبہ کو گداگر مسکین یا فقیر نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاتا تھا کہ ان میں عزتِ نفس اور خودداری پیدا ہو اور یہ اوصاف حمیدہ قائم بھی رہیں اور طالب علم میں یہ احساس پیدا نہیں ہونے دیا جاتا تھا کہ وہ مفت کی روٹیاں کھا رہا ہے اور مفت کے کپڑے پہن رہا ہے۔ مساجد، مدارس اور طلبہ کی اقامت گاہوں کے چراغوں کے لیے تیل بالعموم ہندو دکاندار کارِ خیر سمجھ کر دیا کرتے تھے۔

برصغیر کی اسلامی تاریخ میں سندھ کو اس بنا پر امتیازی درجہ حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلے اسلامی حکومت قائم ہوئی اور یہی خطہ ہے جسے عربوں نے فتح کیا، عربوں کی یہ شان برتری کسی شرح کی محتاج نہیں کہ ان کے قدم جس خطہ میں پہنچے، اسے الٰہی رنگ میں رنگ دیا۔ ومن احسن من اللہ صبغہ جس جگہ گئے اسلامی علوم و فنون کے انوار ساتھ لے گئے۔ سندھ ہی سے یہ انوار اس وسیع براعظم کے دوسرے گوشوں میں پھیلے۔

آج اسلامی حکومت کے اس اوّلین مستقر کے علمی و تہذیبی کمالات کی داستان پر فراموشی کے گردوغبار کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے لیکن جن اصحاب علم و خبر کی نظریں تاریخی سفائن کے اوراق سے بہرہ مند ہیں وہ جانتے ہیں کہ سندھ صدیوں تک علوم دینی، فنون ادب اور فضائل سیر و سلوک میں اکابر کا سر چشمہ بنا رہا۔ اگر ان بزرگوں کے صرف ناموں کی فہرست مرتب کی جائے تو ایک دفتر عظیم تیار ہو جائے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول ادب، شعر، تاریخ، حکمت یا تصوف میں سے کون سا شعبہ ہے جس میں سیکڑوں بلند پایہ اصحاب ہر دور اور ہر عہد میں موجود نہ رہے اور انہوں نے اپنے کمالات کے گہرے نقوش یادگار نہ چھوڑے۔

سندھ کے تاریخی اور سیاسی مکتوبات

تاریخ کے سلسلے میں مکتوبات، مراسلات، عرائض اور فرامین کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ ہماری تاریخوں میں واقعات کو بڑی حد تک وقتی مصلحتوں کے تحت خاص بخیۂ نگاہ سے ضبط کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے حوادث و حالات کے اصل پہلو پڑھنے والے کے سامنے پوری طرح منکشف نہیں ہوتے اور واقعات کے حقیقی محرکات کا ٹھیک پتہ نہیں چلنے پاتا۔

تاریخ کے یہ سقم تبھی دور ہو سکتے ہیں جب ہم تاریخ کی ترتیب و تدوین کے دوران مکتوبات کے مجموعوں کو بھی اپنے سامنے رکھیں اور ان کو تاریخ کا ماآخذ سمجھ کر ان سے کماحقہ استفادہ کریں، ہم نے مکاتیب کو "انشا" قرار دے کر داخل درس تو رکھا لیکن ان سے تاریخی فوائد حاصل کرنے سے دریغ کیا ہے۔

اس برصغیر میں "انشا" یا مکتوبات کے جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں ان پر میری نظر سے دو مفصل مضمون گزرے ہیں۔

ا۔ "انڈو ایرانیکا" میں ڈاکٹر مومن ابراہیم خان کا مضمون جو متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ "ہنر و مردم" تہران میں "دبیری و نویسندگی" کے عنوان سے آقائے، دانش پژوہ کا چودہ قسطوں میں مقالہ، جس میں 'منشات' کے ۳۶۶ مجموعوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ مقالہ فہرست شدہ ان تمام فارسی مجموعوں پر محیط ہے جو ترکی سے لے کر ہندوستان تک مرتب ہوئے

ہیں۔

جو مجموعے فہرست شدہ نہیں ہیں اور ہنوز ذاتی ذخیروں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ آقائے دانش پژوہ کے مقالہ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سندھ میں مکاتیب کے جو مجموعے ملتے ہیں وہ ابھی تک اہلِ علم کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ حالانکہ یہ مجموعے تاریخی مواد کے لحاظ سے ایران، افغانستان، سندھ، ملتان، پنجاب اور دہلی تک کے تاریخی واقعات اور حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور بیشتر اہم واقعات و حوادث کے محرکات اور تفاصیل ان میں موجود ہیں۔

سندھی ادبی بورڈ نے خوش قسمتی سے تاریخ سندھ کے اہم ترین ماخذ تو چھاپ دیے ہیں لیکن مکاتیب کے ذخیرے کو ابھی چھوا تک نہیں ہے۔ خود تاریخ کی کتابیں ابھی مخطوطات کی شکل میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر روپیہ ہو اور کام کرنے والے دستیاب ہوں تو برسہا برس یہی کام ختم نہیں ہو سکتا لہٰذا ان حالات میں یہ بات بعید از امکان ہے کہ مکاتیب کے ان مجموعوں کو سندھی ادبی بورڈ چھاپ سکے گا۔ سندھی مکتوب نگاروں کے مرتب شدہ مجموعوں میں سے چند ایک کو دنیا جانتی ہے کیونکہ مختلف کتب خانوں کی فہرستوں میں ان کا ذکر آچکا ہے مثلاً:

۱۔ منشآت نمکین۔۔۔ از ابوالقاسم نمکین بکھری

۲۔ رقائم کرائم۔۔۔ از محمد اشرف پسر امیر عبدالکریم امیر خانی سندھی

۳۔ آداب عالمگیری۔۔۔ از شیخ ابوالفتح قابل خاں ٹھٹھوی

ان تین مجموعوں کے علاوہ سندھ میں مرتب شدہ مکاتیب کے جتنے مجموعے موجود ہیں وہ سب کے سب ابھی تک مورخین کی نظروں میں نہیں آئے۔ اس کانفرنس کا دائرہ کار چونکہ اٹھارویں صدی عیسوی تک محدود ہے اس لیے میں یہاں سندھ میں مرتب شدہ تاریخی مکاتیب کے صرف ان مجموعوں کا ذکر کروں گا جو اس دائرہ کی حدود میں آتے ہیں۔ سردست میں ان مکاتیب، مراسلات اور شاہی فرامین کو چھوڑے دے رہا ہوں جو "انشائے ماہرو" سے لے کر عالمگیر کے آخری عہد تک مرتب ہوئے ہیں۔ مکاتیب کے ان مجموعوں کا ذکر کرنے سے قبل یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ یہ مجموعے جس صدی سے متعلق ہیں، اس صدی میں ہماری اور ہمارے پڑوسی ملکوں کی سیاسی صورت حال کیا تھی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا زوال۔ چند سال کے اندر اندر متعدد شاہزادوں کا تخت پر بیٹھنا اور جلد ہی تختہ دار یا تلوار کی دھار تک پہنچنا۔ سندھ کا ۱۱۵۱ھ میں مغلوں کے تسلط سے آزاد ہونا۔ عالمگیر کی وفات

سے لے کر سندھ سے مغلوں کے بستر گول کرنے تک یعنی ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۵۱ھ تک کل ۳۳ برس کے مختصر سے عرصہ میں ۱۷ صوبیداروں کا سندھ میں آنا اور پھر یکے بعد دیگرے خوار و خجل ہو کر ناکام لوٹنا۔ سندھ کے مقامی خاندان کلہوڑا کا سندھ کو واگزار کر کے اپنے قبضہ میں لانا۔ ادھر ایران میں صفوی خاندان کا زوال۔ افغانستان میں میر ویس اور محمود خان کا ابھرنا۔ خراسان اور اصفہان کا ان کے ہاتھوں تہ و بالا ہونا۔ لوٹ مار کا مال اور قیمتی سامان، سندھ کے کلہوڑا سلاطین و امراء کے ہاں لا کر بیچنا۔ اس افراط و تفریط کے نتیجہ میں نادر شاہ افشار کا ظہور۔ ایران کی واگزاری۔ دہلی پر نادر شاہ کی لشکر کشی اور سندھ کو اپنا باج گزار بنالینا۔ سندھ سے زر و جواہر، مال و متاع اور شاہی کتب خانے اپنے ساتھ ایران لے جانا۔ سندھ کی حکومت کو ہمیشہ خانہ جنگی میں مبتلا رکھنے اور کمزور کرنے کے لیے بہاول خان کو سندھ کا ایک حصہ دے کر ایک الگ ریاست قائم کرنا۔ نادر کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی کا افغانستان میں ایک مستقل اور جداگانہ حکومت قائم کرنا۔ ہندوستان کے اور پنجاب پر اس کے تابڑ توڑ اور پے در پے حملے۔ سر زمین سندھ پر افغانیوں کا تسلط۔ باج گزاری کے نام پر رقم کے علاوہ زر و جواہر اور مال و اسباب کا بار بار آکر لوٹنا۔ شکار پور کو مستقل طور پر افغانستان کے تحت لانا۔ سندھ کی اصل آبادی کی عددی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لیے افغان قبائل کو بے تحاشا شکار پور اور اس کے گرد و نواح میں لا کر بسانا۔ مدد خان افغان کا سندھ میں پہنچ کر ہر شہر، ہر بستی اور ہر قریہ و قصبہ کو تہس نہس کرنا اور سب کچھ لوٹ کر لے جانا۔ بہاولپوریوں کی شہ پر کلہوڑہ خاندان کی باہمی خانہ جنگی۔ تالپور خاندان، جو دراصل کلہوڑوں کے وابستگان دامن اور امراء دربار کا خاندان تھا، اس کا کلہوڑوں سے اختلاف و نزاع۔ جس کا نتیجہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان کشت و خون کی شکل میں ظاہر ہوا۔ آخر میں تالپور خاندان کا کلہوڑوں کو ختم کر کے خود وارث تخت و تاج بننا۔ پھر اس تالپور خاندان کا تین حصوں میں بٹ جانا اور سندھ کے حصے بخرے کر کے تینوں دھڑوں کا اپنی علیحدہ علیحدہ حکومت قائم کرنا۔ کلہوڑہ خاندان کی حکومت کے آخری دور میں انگریزوں کا ٹھٹھہ میں تجارتی کوٹھی قائم کرنا۔ پھر تالپور عہد کی ابتدا میں افغانستان تک پہنچنے کے لیے دریائی اور زمینی راستہ حاصل کرنے کی غرض سے سندھ میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنا اور بالآخر پورے سندھ پر قبضہ جما لینا۔

سیاسی صورت حال کا یہ وہ اجمالی خاکہ ہے۔ جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں موجود تھی اور

سندھ کے اندر جو واقعات رونما ہوئے اس کی لپیٹ میں ایران، افغانستان، ہندوستان، ملتان اور مرکزی ایشیا کے تمام علاقے بھی آجاتے ہیں۔ اس صدی کی تاریخ اس وقت تک نامکمل اور تشنہ رہے گی۔ جب تک مکاتیب کے زیر نظر مجموعوں کو "انشا" سے نکال کر تاریخی مآخذ کے طور پر کھنگالا نہ جائے گا۔

مکاتیب کے جن مجموعوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان میں وہ تمام تحریری مواد موجود ہے جو اس صدی کے جملہ واقعات کے اصل محرکات اور اندرونی معاملات پر حیرت انگیز حد تک روشنی ڈالتا ہے۔

مجموعوں کی یہ فہرست 'ظاہر' ہے کہ نامکمل ہے، جن کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے وہ یا تو میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں یا میری دانست میں ہیں۔ سندھ کے بے شمار نجی کتب خانے جن تک ابھی سورج کی روشنی پہنچ نہیں پائی۔ ان میں جو کتابیں موجود ہیں ان کے متعلق خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیسے نوادر ہوں گے اور ان کی تعداد کیا ہو گی۔ میری فہرست یہ ہے:

ا۔ گلدستہ نورس بہار (شمارہ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲)

یہ شیخ عبدالرؤف سیوستانی (متوفی ۱۱۴۰ھ) کے لکھے ہوئے سرکاری خطوط ہیں اور عالمگیر کے عہد حکومت کے آخری برسوں سے لے کر ۱۱۴۰ھ تک کے سیاسی حالات اور واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شیخ عبدالرؤف، میاں یار محمد اور میاں نور محمد کا منشی تھا اور شیخ موصوف کے فوت ہو جانے کے بعد میاں نور محمد کی فرمائش پر ۱۱۴۰ھ کے فوراً بعد ان کے بیٹے شیخ محمد وفا سیوستانی نے ان مکاتیب کو "گلدستہ نورس بہار" کے نام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعۂ مکاتیب تین لطیفوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ لطیفۂ اول: در عرائض بوالا درگاہ و امرایان عظام و راجہائے عظیم الشان

۲۔ لطیفۂ دوم: متصدیان و جاگیرداران و سادات و علماء و شرفا و غیر ذلک

۳۔ لطیفہ سوم: بوکلائے دربار دولت مدار

پہلے لطیفہ میں ۵۹ خطوط ہیں جن میں عالمگیر کی وفات سے لے کر میاں یار محمد اور میاں نور محمد کے ابتدائی عہد تک جو کچھ سرکاری خط و کتابت ہوئی وہ شامل ہے۔ عالمگیر کی وفات پر سندھ میں جو ردعمل ظاہر ہوا اس کے تذکرہ کے علاوہ متعدد شہزادوں کی تخت نشینی کے حالات

ٹھٹھہ، بکھر اور سیوھن میں صوبیداروں کی تقرری اور معزولی کے واقعات میر ویس غلزئی کے افغانستان پر تسلط، قندھار، قلات، بلوچستان، ملتان اور ہندوستان میں پیدا شدہ حالات اور ان حالات سے متعلق شخصیات کے تعارف، نیز ملتان، سیوستان، بکھر، بلوچستان اور ٹھٹھہ کے صوبیداروں کے نام اور اس دور میں رونما ہونے والی جنگوں کے حالات مذکور ہیں۔

لطیفۂ دوم میں ۲۰۵ مکتوب ہیں۔ ان مکتوبات میں ہندوستان کے وزیر اعظم، سپہ سالاروں، صوبیداروں اور دیگر متعلقہ امراء کو واقعات و حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ان مکتوبات میں کئی معروف اور غیر معروف لیکن اہم شخصیتوں کے ناموں اور کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔

لطیفۂ سوم میں وکلائے دربار کے نام خطوط ہیں۔ ان خطوط میں اس وقت کے اہم ترین تاریخی واقعات کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں اہم ترین کرداروں اور شخصیتوں کا بھی علم ہوتا ہے جن کے ناموں اور کاموں سے تاریخ کے اوراق بالکل خالی ہیں یہ حصہ ۲۸ خطوط پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے دو نسخے میرے کتب خانہ میں موجود ہیں جن کو سامنے رکھ کر میں نے اس کتاب کا متن تیار کیا ہے اور انتظار ہے کہ تاریخی حواشی اور وضاحتوں کے ساتھ اس کو شائع کیا جائے۔

۲۔ خلاصۃ المکتوبات (شمارہ ۱۳)

یہ خطوط سندھ کے دو بڑے انشاپرداز اور سرکاری منشی میاں ہارون اور منشی عبدالرؤف کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ مجموعہ دراصل خطوط کا انتخاب ہے جسے انشانویسی کی غرض سے تیار کیا گیا ہے لیکن ہر ایک خط کسی نہ کسی تاریخی واقعہ کا حامل ہے۔

زیادہ تر خطوط جیوند ابڑو، مہتہ تخت مل، نواب بختیار خاں اور میر عبداللہ بروہی کے ہیں۔ اس مجموعہ سے سندھ کے بہت سے علماء، امراء اور اس دور کے مشاہیر کے نام معلوم ہو جاتے ہیں جن میں سے کئی ایک نام ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ محمود افغان، جس کو ان خطوط میں "نا محمود قندھار" لکھا گیا ہے اس کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلے میں بھی ایک خط مجموعہ میں شامل ہے، جو ہرات اصفہان اور افغانستان کے نزاعی معاملات پر روشنی ڈالتا ہے اس خط کا سن تحریر ۱۱۳۹ھ ہے۔

ایک خط اسی سلطان محمود خان افغان والی ہرات کا بنام ریاست پناہ میر عبداللہ خاں انگہ ہے۔

دوسرا ایک حکم نامہ ہے۔ جو سلطان محمود خان نے ۱۱۳۵ھ میں امیر عبداللہ خاں کے نام لکھا ہے۔

اس مجموعہ مکاتیب میں محمود خان کا ایک عہد نامہ بھی ہے، جو نہایت اہم ہے۔ یہ ۱۱۴۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس عہد نامہ میں محمود خان افغان نیز اصفہان، افغانستان، سندھ اور پنجاب کے بارے میں نہایت اہم معلومات درج ہیں۔ ان خطوط سے افغانوں کے محاصرہ اصفہان، ہرات، مشہد وغیرہ، نیز افغانستان اور موجودہ پاکستان کی سرحدات کے سلسلے میں بڑی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

افغانوں اور صفویوں کے درمیان جو نزع برپا ہوا اور جنگیں ہوئیں اور جس کے نتیجہ میں نادر شاہ افشار کا ظہور ہوا، اس موضوع پر جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اگر ان مکاتیب سے استفادہ کیا جاتا تو ان کی تاریخی اہمیت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

میرے پاس اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس پر مہر ثبت ہے جس کے یہ الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں۔ بندہ ؟ محمد ۱۱۶۳ھ۔

گویا یہ ایک قریب العہد نسخہ ہے۔

۳۔ انشائے نور الحق مشتاقی (شمارہ ۱۸۲)

سندھ کے نامور انشا پرداز، شاعر، عالم اور سرکاری منشی میاں نور الحق مشتاقی سیوستانی کے تحریر کردہ سرکاری مراسلات کا مجموعہ ہے جو بکھر، سیوھن اور ٹھٹھہ کے سیاسی، مالی اور دوسرے تاریخی واقعات کے سلسلہ میں نہایت قیمتی اور اہم ترین معلومات فراہم کرتا ہے مثلاً

۱۔ محمد عطا منصبدار سرکار سیوستانؒ

۲۔ مال گزاری، ٹھٹھہ کے متعلق ایک خط

۳۔ عبدالرحیم (؟) صوبہ دار ٹھٹھہ کے ۵ خطوط

۴۔ اہل سمجہ کی شورش فرو کرنے کے لیے ابو المعالی سے درخواست

۴۔ انشائے عطارد (شمارہ ۱۱۵)

منشی شیوک رام عطارد، میاں غلام شاہ اور میاں سرفراز کلہوڑہ شہید کا درباری شاعر اور منشی تھا۔ امیر الامراء میر بجار خان تالپور سے بھی متوصل تھا اس نے جو سرکاری خطوط لکھے تھے، اس کی وفات کے بعد ان کو ۱۲۱۲ھ میں امل رائے اوردہ نے جمع کیا ہے۔

میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ۱۲۸۲ھ کا مخطوطہ ہے۔

یہ مجموعہ "گلدستۂ نورس بہار" کے بعد اہم ترین مجموعہ ہے جس میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے واقعات پر بھرپور معلومات ملتی ہیں۔ جملہ ۸۵ خطوط ہیں۔ آخری خط امیر الامراء میر بجار خان شہید کا ہے جس کو کلہوڑہ حکمران میاں عبدالنبی نے شہید کرادیا تھا اور جس کی شہادت کلہوڑہ خاندان کے اختتام اور تالپوری حکومت کے آغاز کا باعث بنی۔ ایران، شیخ مسقط، قلات، جودھپور، سندھ اور ملتان کے تقریباً تمام امراء اور اعیان سلطنت کے نام، اس مجموعہ خطوط میں شامل ہیں اور ان سے کئی ایک تاریخی گوشے ہمارے سامنے روشن ہوتے ہیں۔

۵۔ مجموعہ مکاتیب دانش گاہ سندھ (شمارہ ۲۰۴۶۱)

یہ سندھ کے اعیان و حکام کے مکاتیب کا ضخیم مجموعہ ہے جو دانش گاہ سندھ کی ملک ہے۔

اس مجموعہ میں سندھ کے ملکی معاملات اور سیاسی حالات سے متعلق بیش بہا خطوط موجود ہیں۔

۶۔ مجموعہ رقعات دانش گاہ سندھ شمارہ (۲۰۴۸۰)(۳۰۰)

یہ تاریخی مکاتیب قاضی عبدالرسول اور منشی جان محمد سیوستانی (متوفی ۱۱۲۳ھ) کے انشا کردہ ہیں اور سندھ کے گوناگوں سیاسی، انتظامی سماجی اور علمی حالات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس صدی کی سیاسی اور سماجی تاریخ ان خطوط کے مطالعہ کے بغیر ادھوری اور نامکمل رہے گی۔ مغلوں کے آخری دور میں سندھ کے اندر جو بدنظمی اور بدانتظامی پھیل گئی تھی، ان خطوط سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ چند ایک خطوط کے مطالب ملاحظہ کیجئے۔

مطالب کی فہرست

نواب عبدالصمد خان۔ نواب خان دوران۔ مردم دل۔ قتل کردن مردم دل۔ نور محمد کلہوڑہ۔ ٹھٹھہ۔ رقعۂ شیخ مبارک۔ سید عبدالجلیل بلگرامی کا مکتوب۔ مخدوم عیسیٰ ولد مخدوم عباس

ہنگورجہ۔ میر یعقوب بلھری۔ رقعۂ عبدالواسع، راجع بہ براہم زدگی نظم و نسق در سندھ۔ آب ہوا و میوۂ ٹھٹھہ۔ پارچہ ہائے ٹھٹھہ۔ میاں عبدالرؤف و ابوالقاسم۔ ملا اللہ ڈینہ بوبکانی۔ مخدوم عبدالرحیم۔ کابل و ناظم ٹھٹھہ۔ قانون گوئے بکھر میاں عبدالواسع رسول پوری۔ شہزادہ محمد اعظم۔ قحط و بدحالی و قرض داری۔ سرکار بکھر۔ قضاۃ روہڑی و سکھر قلعہ۔ صدر الصدور خزانہ بکھر۔ پول سیاہ۔ انتظام پرگنہ جات دربیلہ، الورو کاکری۔ شیخ فیض اللہ۔ مدد معاش ملا نجم الدین بوبکانی۔ بیست ہزار دام۔ ارسلان خان۔ دربارۂ خالصہ قلعہ بکھر۔ لوہری۔ باغ۔ میوہ۔ اولاد مخدوم عثمان دربیلی۔ قاضی نصیرالدین صدر سرکار بکھر و سیوستان۔ خوش حال بخشی و وقائع نگار سرکار بکھر۔ قانون گویان سرکار سیوستان۔ و بدسلوکی ایشاں بمردم بومبی۔ شیخ عبدالرؤف۔ مکاتبات خدلیار خان بہ نواب عبدالصمد خان دربارۂ تحائف و مادہ فیل۔

۷۔ گلدستۂ باغبان (شمارہ ۲)

یہ نہایت اہم خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں قدوۃ السالکین مخدوم قاضی محمد رحیم، مخدوم محمد پناہ، قاضی محمد شاکر اور فضیلت شعار قاضی عبدالجلیل سکنہ شہر نصرپور کے لکھے ہوئے خطوط ہیں جن کو میاں قاضی محمد حافظ (برادر قاضی محمد اکبر) بن قاضی میاں خیسہ نصرپوری نے مرتب کیا ہے۔

ان خطوط کا موضوع، افغانستان کی سندھ میں لوٹ کھسوٹ۔ مدد خان کی سندھ میں آمد۔ اور انگریزوں کی آمد آمد پر سندھ کے باشندوں اور اہل الرائے بزرگوں کا اظہار تشویش۔ شکارپور پر افغانوں کا قبضہ۔ اپنے اہل کاروں کا تقرر۔ اور خراسان، ایران، افغانستان کے سیاسی مسائل و معاملات مندرج ہیں۔ اس مجموعہ کی ابتدا میں کوئی دیباچہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس کا آغاز ایک مکتوب سے ہوتا ہے جس میں محمد رحیم خان بارکزئی کے شکارپور سے شہر بدر ہونے اور عالی جاہ مدد خان ولد عالی جاہ غفور خان کو شکارپور کی حکومت ملنے کا حال درج ہے۔ یہ کتاب ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ میں ۱۴ سطریں ہیں۔

یہ مجموعہ، سندھ افغانستان اور برصغیر میں انگریزی اثر و نفوذ کے بارے میں تاریخ کا اہم ترین ماخذ ہے۔

۸۔ انشائے ابری (دفتر اوّل) (شمارہ ۱۸۳)

مکتوبات کا یہ مجموعہ دو دفتروں پر مشتمل ہے۔ مؤلف کا نام ابراہیم بن حافظ نصر اللہ بن عبدالکریم احمدانی سیوستانی انصاری متخلص بہ ابری ہے۔ اس نے پہلا دفتر ۱۲۰۴ھ میں مکمل کیا ہے جو پانچ فصول پر منقسم ہے۔

۱۔ در خطوط جانب عزیزان و خویشاں

۲۔ در مکاتیب یاران دوستی نشان

۳۔ در تحریر پروانہ جات و پرزہ جات۔ یہ دو نوع میں تقسیم ہے۔

۴۔ در استحصال دستکات کار و دستکات طلب سرکار

۵۔ در عرائض حضور و امراء عظام و خواتین عالی مقام و در عرائض دربار معلیٰ

۹۔ انشائے ابری (دفتر دوم) (شمارہ ۱۸۳)

یہ دفتر ۱۲۰۷ھ میں مرتب ہوا ہے اور قسم اول اور قسم دوم میں منقسم ہے۔

۱۔ در تحریر اخلاص نامجات شوق انگیز آتش ریز

۲۔ در نوشتن مکتوبات معاملات آمیز، ویک فرد فرمان درگاہ فلک بارگاہ کہ تیمناً و تبرکاً ثبت نمودہ شد

ان دونوں دفتروں میں کچھ خطوط ذاتی ہیں، بقیہ خطوط سیاسی ہیں جو مغل کلہوڑہ، افغان اور تالپور عہد کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ۱۲۶۸ھ کا مخطوطہ ہے۔

۱۰۔ منہاج الشعور (ابراہیم ابری سیوستانی) (شمارہ ۱۸۳)

اس نام سے ابری نے تیسرا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس مجموعہ کے پہلے حصہ میں اعزازی عبارتیں ہیں جو اس دور میں دوستوں امیروں، رشتہ داروں یا سرکاری ملازموں کے خطوط کے لیے سندھ میں مروج تھیں۔

دوسرے حصہ میں تاریخی دستک، اعرائض اور خطوط ہیں۔ یہ حصہ بے حد قیمتی ہے۔

کلہوڑوں اور تالپوروں کے ایک دوسرے کے نام خطوط، ایران اور افغانستان کے درمیان مراسلات، سندھ میں صوبیداروں کے تقررات کے ہونے اور بہاول پور کے حاکم اول بہاول خاں کے سلسلے کے خطوط دوسرے حصہ میں شامل ہیں۔ اس کتاب کے دو نسخے میرے پاس ہیں ان میں سے ایک ۱۲۱۶ھ کا مخطوطہ ہے۔

۱۱۔ تاریخی انشاء (شمارہ ۱۴۳)

یہ مجموعہ بیاض کی صورت میں ہے۔ جامع و مرتب کا نام معلوم نہیں۔ پہلا خط ابوالفضل کا احمد نگر کی یورش سے متعلق شہزادہ مراد کے نام ہے۔ دیگر خطوط سندھ، ملتان، دہلی، بلوچستان اور افغانستان کے اہم معاملات اور مسائل پر ہیں۔ مغلوں اور کلہوڑوں کے عہد سے متعلق اس میں بہت اہم واقعات آگئے ہیں جن کا تاریخ میں اب تک ذکر نہیں آیا جملہ ۳۵ خطوط ہیں۔

۱۲۔ انشائے خبرت (شمارہ ۱۴۳)

سلطانی مل جس کا تخلص خبرت ہے۔ یہ مجموعہ اس کا مرتب کردہ ہے اور ملتان میں تیار ہوا ہے مجموعہ کا تاریخی نام رقعات مانی نگار ۱۱۴۳ھ ہے۔ اس مجموعہ کے بعض خطوط تاریخی اور سماجی پس منظر کے حامل ہیں۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ ۱۲۶۵ھ کا مخطوطہ ہے۔

۱۳۔ انشای منشی محمد سعید (شمارہ ۱۸۲)

یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اور چند خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط آخری مغل دور کے سندھ سے متعلق نہایت اہم معلومات کے حامل ہیں۔

۱۴۔ رقعات امام الدین (شمارہ ۱۴۳)

مکتوبات کا یہ مجموعہ امام الدین ہالائی کا مرتب کردہ ہے۔ میرے پاس اس کا جو نسخہ ہے وہ مؤلف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا سن کتابت ۱۲۶۵ھ ہے۔

یہ خطوط تاریخی حیثیت سے اگرچہ غیر اہم ہیں لیکن سندھ میں فارسی عبارت آرائی کا ایک اچھا نمونہ ہیں۔

۱۵۔ انشاء (شمارہ ۱۸۲)

اس مجموعہ کے مؤلف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ میرے پاس اس کا جو نسخہ ہے وہ دولت رائے نے ۱۰ جمادی الاول ۱۱۲۶ھ کو مکمل کیا ہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں سندھ اور ہندوستان کے معاملات کا ذکر ملتا ہے۔

۱۶۔ مجموعۂ شاہی اسناد و فرامین (شمارہ ۱۵۵)

یہ ایک مجموعہ ہے جس میں ارغون، ترخان، مغل، کلہوڑہ اور تالپور حکمرانوں کی اسناد اور ان کے فرامین یک جا ہیں اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ٹھٹھہ کے مغل گورنروں کی تاریخوں کا تعین کرنے میں اس مجموعہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

علاوہ ازیں اس سے اعیان سلطنت، قضاۃ، سادات، علماء، شعراء، اور ان کے ورثا و اخلاف کے وظائف کے بارے میں بھی خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جن سے علماء اور قدیم خانوادوں کے حالات مناسب اور ان کے سلاسل کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ اسناد سب کی سب باشندگان ٹھٹھہ اور امرائے ٹھٹھہ کے نام کی ہیں۔ یہ نسخہ میں نے قاضی علی محمد ٹھٹھوی مرحوم کے نسخہ سے نقل کرلیا ہے۔

۱۷۔ مجموعہ اسناد و فرامین (۱۵۴۔۵۶۔۵۷۔۵۸)

یہ مجموعہ ترخان، مغل، کلہوڑہ اور تالپور حکمرانوں کے اوریجنل فرامین، حکم ناموں اور اسناد پر مشتمل ہے اور سندھی ادبی بورڈ کے ذخیرہ میں موجود ہے۔

فرامین، تین حصوں میں مجلد کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ پانچ فرمان۔ عیسیٰ ترخان اول، باقی بیگ ترخان، جانی بیگ ترخان اور غازی بیگ ترخان کے ہیں۔

۲۔ تین فرمان شاہ جہان اور عالمگیر کے ہیں۔

۳۔ عالمگیر کے آخری ایام سے لے کر میر نصیر خان تک کے تمام مغل صوبہ داروں اور سندھ کے کلہوڑہ اور تالپور حکمرانوں کے ۱۴۳ فرمان ہیں۔ یہ آخری حصہ اٹھارھویں صدی عیسوی کی تاریخ میں کام آسکتا ہے میرے پاس ان فرامین کی نقول موجود ہیں۔

بعض اوریجنل فرامین کے فوٹو میں تحفۃ الکرام میں بھی شائع کر چکا ہوں۔

۱۸۔ مکتوبات قانع

یہ مکتوبات، سندھ کے نامور مورخ میر علی شیر قانع کے تحریر کردہ ہیں۔ یہ مؤرخ کلہوڑوں کے آخری ایام میں سرکاری منشی تھا۔ مکاتیب کے اس مجموعہ میں چند ذاتی اور سرکاری مراسلے ہیں۔

یہ مجموعہ سندھی ادبی بورڈ کی تحویل میں ہے۔

۱۹۔ مکتوبات میر عظیم الدین

میر عظیم الدین ٹھٹھوی، تالپوری خاندان کے پہلے دربار کا ملک الشعراء تھا مثنوی فتح نامہ (کلہوڑوں کی شکست اور تالپوروں کی فتح پر) اور ایک دیوان اس کی یادگار ہیں۔

یہ مکتوبات کلہوڑہ خاندان کے آخری ایام اور تالپور خاندان کے ابتدائی عہد کے بہت سے اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۲۰۔ مکتوبات میر نصیر خان تالپور (شمارہ ۹۴۔۹۰)

میر محمد نصیر خان، سندھ کے آخری تالپور حکمران تھے جن سے انگریزوں نے ۱۸۴۲ء میں سندھ کا اقتدار چھینا اور دوسرے تالپوری صاحبزادگان کے ساتھ ان کو بھی کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں نظر بندر کھا گیا۔

میر صاحب نے غریب الوطنی کے عالم میں جو خطوط اپنی بیگمات، امراء اور دیگر لواحقین کو لکھے یہ ان کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۲۹۲ خطوط ہیں آخری خط ایک درخواست کی شکل میں ہے جو میر صاحب کی صاحبزادی نے ملکہ وکٹوریہ کے نام تحریر کیا ہے۔

جس زمانہ میں سندھ کا یہ حکمران کلکتہ میں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، انہی ایام میں واجد علی شاہ بھی مٹیا برج (کلکتہ) میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہا تھا۔ جلاوطنی کے ان ایام میں واجد علی شاہ نے اپنی بیگمات کے نام خطوط لکھے ہیں جن کے بہت سے مجموعے چھپ چکے ہیں۔

میر نصیر خان کے یہ خطوط جہاں بہت سے تاریخی فوائد کے حامل ہیں وہاں سماجی اور تہذیبی لحاظ سے بڑی اہمیت اور افادیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔

واجد علی شاہ کے خطوط کا اگر میر نصیر خان کے خطوں سے عبارت اور مفہوم کے اعتبار سے موازنہ کیا جائے تو واجد علی شاہ کے خطوط کی عبارتیں ان کے مطالب اور ان خطوں میں بیان کردہ عاشقانہ جذبات نہایت رکیک، عامیانہ اور پست نظر آتے ہیں جب کہ اس کے مقابلہ میں میر نصیر خان کے خطوط نہایت شائستہ، مہذب اور باوقار ہیں۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ میر نصیر خان کے خطوط کا لب و لہجہ ایک مہذب اور شائستہ مزاج بادشاہ کے جذبات کا آئینہ دار ہے جس میں حرم شاہی کی عزت و ناموس اور ان کی عظمت و تقدس کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے جذبات محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک فقرہ بھی غیر شائستہ اور عامیانہ نہیں ہے۔

اس سے جہاں لکھنو کے دربار کی سماجی گراوٹ کا پتہ چلتا ہے وہاں شاہان سندھ کی تہذیبی برتری کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

میں نے جیسا کہ ابتدا میں کہا، یہاں فقط تاریخی مکتوبات کے معلوم شدہ مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام مکتوبات کے مجموعوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو اہل تصوف اور علماء کے لکھے ہوئے ہیں، جن سے سندھ کے مذہبی معاملات مذہبی معرکہ آرائیوں اور دینی اور تصوف کے نکتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ سیاسی اور ملکی تاریخ میں اگرچہ یہ مجموعے کام نہیں دے سکتے۔ لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی میں سندھ کی سماجی صورت حال، مذہبی حالات اور صوفیانہ رجحانات کا پتہ ان سے ضرور چلتا ہے۔

ایران میں آج کل تاریخی مکاتیب چھاپنے کی طرف خاص طور پر توجہ دی جارہی ہے اور تقریباً ۱۵۔ ۲۰ مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے تاریخی اثاثہ اور تہذیبی ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھتی ہیں۔ کاش ہمارے ہاں بھی اس قومی سرمایہ کے تحفظ کا احساس بیدار ہو اور ہم بھی ہوش میں آئیں اور تاریخ کے پہلو بہ پہلو مکاتیب کے ایسے مجموعے بھی فراہم کرنا اور چھاپنا شروع کر دیں جن سے ہماری تاریخ کی گم شدہ کڑیاں مل جائیں اور دلچسپ اندرونی معاملات اور مسائل معلوم ہو جائیں جن کا اب تک ہمیں علم نہیں ہو سکا۔

اردو شعرا کے تذکرے۔ کچھ گذارشات

اردو نامہ شمارہ (۵۱) میں سید معین الدین شاہ صاحب قادری کا مضمون بعنوان "اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" شائع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں صاحبِ مضمون سے ذیل کی گزارشات کرنی ہیں۔

فخری ہندوی

فخری ہندوی شاہ طہماسپ کے دربار کا قصیدہ گو شاعر نہیں تھا۔ اس کا پورا نام سلطان محمد سنجری نہیں ہے بلکہ صحیح نام ہے سلطان محمد بن امیری ہندوی۔ ۱؎

لطائف نامہ کے نام سے فخری نے میر نوائی کے تذکرے "مجالس النفائس" ۲؎ کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا ہے اور ترجمے میں بہت سارے اضافے اپنی طرف سے کیے ہیں۔ یہ ترجمہ ایک دوسرے ترجمے کے ساتھ تہران سے (۱۳۲۱ش) آقائے علی اصغر حکمت کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

لطائف نامہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے بھی اورینٹل کالج میگزین میں (اگست ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۴ء) شائع کیا تھا۔ یہ کتاب فخری نے سال (۹۲۸ھ) میں مکمل کی۔ ۳؎

شاہ صاحب نے غالباً فقط اشپرنگر کو سامنے رکھ کر فخری کی تصنیفات کی نامکمل فہرست دی ہے۔ اس کی مکمل فہرست یہ ہے:

(۱) ہفت کشور (قبل ۹۲۷ھ)

(۲) لطائف نامہ (۹۲۸ھ)

(۳) تحفتہ الحبیب (۹۲۹ھ)

تحفتہ الحبیب غزلیات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ مختلف شعرا کی ہم زمین غزلیات کا مجموعہ ہے۔

(۴) روضتہ السلاطین (۹۵۶۔۹۵۸ھ)

یہ ان شعرا کا تذکرہ ہے جو بادشاہ، شاہزادے یا امیر تھے۔ یہ اس موضوع پر پہلا تذکرہ ہے۔ فخری جب ہرات کو ترک کر کے سندھ پہنچا اس وقت لکھ کر شاہ حسین ارغون والئ سندھ کے نام پر معنون کیا۔ اس تذکرے کو مفصل حواشی کے ساتھ (۱۹۶۸ء) میں شائع کر چکا ہوں۔ ۴ے

(۵) صنایع الحسن (بعد از ۹۵۸ھ)

یہ کتاب صنایع شعری پر فخری نے لکھی ہے اور شاہ حسین ارغون کے نام پر معنون کی ہے۔ اس میں سند اور نمونے کے طور پر اپنے اشعار دیے ہیں جن کو میں نے اپنے مقدمے میں لے لیا ہے۔

(۶) جواہر العجائب (شعبان ۹۶۲ھ)

یہ شاعرات کا تذکرہ ہے جس کو فخری نے پہلے شاہ حسین ارغون کی بیوہ اور اس کے جانشین میرزا عیسیٰ ترخان (۹۶۲۔۹۷۳ھ) کی بیوی حاجی ماہ بیگم کے نام پر معنون کیا اور پیش کرنے سے پہلے ارادہ بدل کر اکبر کی تخت نشینی پر ماہم انگہ کے نام کر دیا۔ میں نے یہ تذکرہ روضتہ السلاطین کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس کے تین اور بھی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ دو نولکشور نے چھاپے اور ایک مرحوم سید شمس اللہ قادری نے مجلہ اردو میں شائع کیا تھا۔ میرا ایڈیشن کامل تر ہے۔

روضتہ السلاطین اور جواہر العجائب موضوع کے لحاظ سے فارسی میں اولین تذکرے ہیں اور انصاف کی بات ہے کہ دونوں سندھ میں لکھے گئے۔ میرے علم میں "بوستان خیال" نام کی فخری نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ اس نام سے دو مصنفوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ ایک بگنش قلی نے اور دوسری سید محمد تقی حسین نے۔

مقالات الشعرا

یہ میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کا لکھا ہوا سندھ کے فارسی شعرا کا تذکرہ ہے۔ جس کو میں نے سال (۱۹۵۷ء) میں شائع کر دیا ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب شدہ نہیں تھا، میں نے اپنا ایڈیشن الف بائی کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔

مقالات الشعرا: حیرت

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ قیام الدین حیرت نے اس نام سے کوئی تذکرہ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ تذکرہ، حیرت نے (۱۱۷۴ھ) میں مرتب کیا ہے اور اس کا ایک نسخہ رامپور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ قیام الدین حیرت کا یہ تذکرہ مرتبہ نثار احمد صاحب فاروقی، علمی مجلس دہلی کی طرف سے (۱۹۶۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ ۵ ۔ صفحات ۱۰۲۔ صفحہ ۱ تا ۱۲ پر فاروقی صاحب نے مصنف اور تذکرہ کے متعلق دیباچہ لکھا ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو سے شروع ہوتا ہے۔ اس تذکرے کا حوالہ اشپرنگر میں موجود ہے۔ اورینٹل کالج میگزین (فروری ۱۹۳۰ء) میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔

شاہ صاحب کے مضمون میں بہت سے اور بھی اشتباہات موجود ہیں لیکن میں نے فارسی کی حد تک عرض کر دیا۔ شاہ صاحب نے غالباً اشپرنگر ہی کو اساس قرار دیا ہے حالانکہ معلومات اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ اشپرنگر اب حوالے کی کتاب نہیں رہی ہے۔

تذکروں کے سلسلے میں، علاوہ ان مقالوں کے جو اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہو چکے ہیں، دو کتابیں اس موضوع پر پچھلے سالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان۔ ڈکتر سید علی رضا نقوی (مطبوعہ تہران ۱۳۴۳ش)

(۲) تاریخ تذکرہائے فارسی دو جلد، احمد گلچین معانی (مطبوعہ تہران ۱۳۴۸ش)

ہر چند کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب اشتباہات سے خالی نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کی حد تک یہ پہلی کوشش اور بہترین کوشش ہے۔ حرف آخر کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے چنانچہ یہ کتاب بھی اس موضوع پر حرف آخر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کا دوسرا ایڈیشن اس سے کامل تر ہو اور غلطیوں سے بھی نسبتاً پاک ہو۔

حواشی:

۱۔ نام پر بحث دیکھئے روضۃ السلاطین کے مقدمہ میں صفحہ (۱۳)، سنجری غلط نسبت ہے، اصل لفظ سجزی ہے جو نقطے کے ہیر پھیر سے اس برصغیر میں سنجری لکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ حسن سنجری

۲۔ صحیح نام یہی ہے "مجلس النفائس" نہیں

۳۔ مقدمہ روضۃ السلاطین ص ۳۸ تا ۴۱

۴۔ اس کا ناقص ایڈیشن تبریز سے بھی ڈاکٹر خیام پور نے شائع کیا ہے۔

۵۔جناب عارف نوشاہی صاحب نے مجھے اس تذکرے کے متعلق اس طرح معلومات فراہم کی ہیں:
"کل صفحات ۱۰۲+۴ص۔ مقدمہ /دیباچہ اور متن کے صفحات مسلسل ہیں جو ۱۰۲پر ختم ہو جاتے ہیں۔ آخر میں ۴ صفحے کی فہرستِ شعرا ہے۔ نثار احمد فاروقی کا مقدمہ صفحہ ۷ تا ۱۲ ہے۔ صفحہ ۱۳ سے متن شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا شاعر آرزو ہے اور آخری محمد اشرف یکتا کشمیری۔ کل ۱۵۹ شعرا ہیں۔"(مرتب)

اصفہان کی ایک یادگار شام

جہان را اگر اصفہانی نبود
جہان آفرین را جہانی نبود

ایران کے آرٹ، آرکیٹیکچر اور دیگر فنون لطیفہ کو دو محسن ایسے ملے ہیں، جنہوں نے اس کے تحفظ اور اس پر تحقیق اور اس کو زندہ اور ابد بنانے میں اپنی تمام تر زندگی صرف کر دی ہے۔ ایک نے پورے ایران کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور دوسرے نے ایک ہی شہر یعنی "اصفہان نصف جہان" پر لکھنے کو اپنا شعار بنا کر اس کی ایک ایک عمارت اور ایک ایک گلی کوچے کو دیکھا، خرابوں اور آبادیوں کی تحقیق کی اور ان کی تاریخی نوعیت کو معلوم کر کے اس کی تاریخ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹنے سے محفوظ کر لیا۔

او بم پوپ :

پہلا او بم پوپ (Arthur Upham Pope) تھا جس نے ۹۰ برس عمر پائی اور سن شعور سے لے کر آخری سانس تک پورے زمانے اور طویل حیات میں ایران کی خاک چھانی اور تاریخی آثار اور عمارات، خط، نقش و نگار، کتبات اور دیگر تزئینی آرٹ پر بارہ ضخیم جلدوں میں ایک کتاب (Survey of Persian Art) یعنی "تاریخ ہنر ایران" لکھ کر جب جان جان آفرین کے سپرد کرنے کے لمحات نزدیک آئے تو، وصیت کی کہ : اسے اصفہان میں "زندہ رود" کے کنارے دفن کر دیا جائے تاکہ مرنے کے بعد بھی 'زندہ رود" کی موجیں اور لہریں مدفن کے دامن کو چھوتی

رہیں۔ آج اس کا خوبصورت مقبرہ جس جگہ چاہا تھا، اسی جگہ پر حکومت ایران نے بنوا کر، ایک طرف اس مرحوم کی روح کو تسکین پہنچائی ہے اور دوسری طرف اپنی بزرگواری اور علمی قدردانی کی زندہ مثال کھڑی کر دی ہے۔

اس بوڑھے بزرگ سے ان کے آخری ایام میں میری بھی شناسائی ہوئی اور ملاقاتیں رہیں۔ انتقال سے چند ماہ پیشتر، ان کی طرف سے شیراز میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کا دعوت نامہ آیا، لیکن کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا اور کانفرنس ملتوی ہو گئی۔

بہت شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

لطف اللہ ہنر فر:

دوسرا عالم ہے ڈاکٹر لطف اللہ ہنر فر جس نے "گنجینۂ آثار تاریخی اصفہان" کے نام سے ایک ہزار صفحات اور کئی سو تصاویر پر مشتمل کتاب لکھ کر، شہر اصفہان اور اس کے اطراف کے تاریخی آثار اور ثقافتی اثاثے کو ہمیشہ کے لیے روشن اور محفوظ کر دیا ہے۔ یہ حضرت بھی میرے عزیز دوست اور عنایت فرما ہیں۔ اصفہان کی یونیورسٹی میں تاریخ اور فنون لطیفہ کے پروفیسر اور اس شعبہ کے رئیس ہیں۔ ان کی صبح یونیورسٹی میں گزرتی ہے اور ان کی شام اصفہان کے آثار کو تلاش کرنے، دیکھنے اور ان کی تحقیق میں بسر ہوتی رہتی ہے۔ ان کی راتیں لکھنے پڑھنے میں بیت جاتی ہیں۔ ایام جوانی سے لے کر بالوں کے سفید ہونے تک، ان کے شب و روز کا یہی معمول اور مشغلہ رہا ہے۔ اس ضخیم کتاب کے بعد اور کئی ایک مضامین لکھنے کے باوجود، ان کا خیال ہے کہ اصفہان پر ابھی کچھ نہیں لکھا گیا اور بہت کچھ لکھنا ابھی باقی ہے۔

گمان مبر کہ، بپایان رسید کار مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ، در رگ تاک است

اب کے کیا دیکھنا تھا:

میں کئی مرتبہ اصفہان گیا ہوں۔ مشہور مقامات، مساجد، بازار اور مقابر بار بار دیکھے ہیں لیکن اصفہان در حقیقت پورا جہان نہیں تو "نصف جہان" واقعی ہے۔ واپس آ کر جب پڑھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آثار تھے، یہ مقابر تھے اور یہ تاریخی کتبے تھے جن کا دیکھنا رہ گیا اور ابھی بہت کچھ ایسا ہے جس کا دیکھنا ضروری ہے۔

اس مرتبہ مارچ (۱۹۷۴ء) میں دو نصف دن اس "نصف جہان" میں رہنا نصیب ہوا۔ سترہ تاریخ کی دوپہر کو پہنچا اور دوسرے دن یعنی اٹھارہ کو بعد از ظہر وہاں سے روانہ ہوا۔ اس دفعہ مصمم ارادہ تھا کہ دیکھے ہوئے مقامات نہیں دیکھوں گا بلکہ اس کے بجائے:

۱۔ نظام الملک طوسی کا مزار

۲۔ ملک شاہ سلجوقی اور اس کے خاندان کا مدفن

۳۔ اور مسجد لنبان

دیکھنا ہے۔ چنانچہ جہاز سے اُترتے ہی اپنے دوست ڈاکٹر ہنر فر کو میں نے جتادیا کہ اب کے مشہور مقامات سے ہٹ کر فقط ماضی کے تاریخی جھروکوں میں جھانکنا ہے!

زمانے کی رسم کو پورا کرنا ضروری تھا۔ یورپی ممالک کے آٹھ "ایران شناس" ساتھ تھے۔ پہلے ہم نے میدان شاہ، عالی قاپو، مسجد شاہ، مسجد لطف اللہ، چہل ستون اور دیگر قابلِ دید عمارات و مقامات کو دیکھا۔ یہ وہ مقامات ہیں جن کی وجہ سے اصفہان کو شہرت حاصل ہے اور ہر آنے والا ان کو دیکھنا اصفہان کے سفر کا مقصود اور حاصل سمجھتا ہے۔

مدرسہ ملک شاہ سلجوقی:

اصفہان کے ایک محلّہ کا نام "احمد آباد" ہے۔ اس میں ایک گلی ہے جس کو "دار البطیخ" کہتے ہیں اور عوام کی زبان پر اس کا نام بگڑ کر "والبیتی" یا "دالبتی" چڑھ گیا ہے۔ یہ گلی تاریخی ہے۔ سلجوقیوں کے دور میں یہ محلّہ، جس کا قدیم نام "محلّہ کران" تھا، بہت آباد اور مرکز علم و فن تھا۔ ملک شاہ سلجوقی کا بنایا ہوا بہت بڑا مدرسہ اسی محلّہ میں واقع تھا، جس میں دور دراز ممالک کے طالب علم آکر تحصیل علم کرتے تھے۔ ان کے اخراجات اور اساتذہ کا خرچ حکومت کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔

مدرسہ کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ نیز محلّہ بھی اپنی پرانی وضع قطع اور نقش نقشہ کھو چکا ہے۔ نئے مکانات، سیدھی گلیاں اور جدید طرز کے کوچے وجود میں آگئے ہیں۔ محلّہ کا پرانا نام لوگ بھول بھال گئے ہیں۔ اب "کران" کی جگہ اس کو "احمد آباد" کہتے ہیں۔ تاریخی آثار میں ملک شاہ سلجوقی کا گورستان اور اس کے مشہور عالم وزیر نظام الملک طوسی کا مزار ایک ہی احاطے اور ایک ہی چھت کے نیچے باقی رہ گیا ہے۔

سلجوقی سلاطین:

سلجوقی سلاطین کی پانچ شاخیں ممالک اسلامیہ کے پانچ مختلف حصوں پر حکمران تھیں۔ بنیادی شاخ وہ تھی جو ایران پر حکمران رہی۔ دوسری شاخ عراق پر حکومت کرتی تھی، تیسری شاخ کرمان پر حاکم تھی، اور چوتھی شاخ وہ تھی جو روم اور ارض اروم یعنی ترکی پر قابض تھی، پانچواں سلسلہ شام پر مسلط تھا۔

ایران کی بنیادی شاخ کو تاریخ میں "سلاجقہ بزرگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ہی سلاجقہ کے نامور بادشاہ ہو گزرے ہیں۔

سلاطین کے مدفن :

یہ بادشاہ ایک شہر یا ایک جگہ مدفون نہیں ہیں۔ مختلف شہروں میں دفن ہوئے اور زمانے کے نشیب و فراز نے بعض کی قبریں اُجاڑ دیں اور بعض کے مقابر کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اس بنیادی "سلاجقہ بزرگ" کے سلاطین اس طرح دفن ہوئے ہیں :

۱۔ طغرل بیگ بن میکائیل (۴۲۹۔۴۵۵)	ری (طہران)
۲۔ الپ ارسلان بن چغری بیگ (۴۵۵۔۴۶۵)	مرو
۳۔ ملک شاہ بن الپ ارسلان (۴۶۵۔۴۸۵)	اصفہان
۴۔ برکیارق بن ملک شاہ (۴۸۷۔۴۹۸)	اصفہان
۵۔ محمد بن ملک شاہ (۴۹۸۔۵۱۱)	اصفہان
۶۔ محمود بن محمد بن ملک شاہ (۵۱۱۔۵۲۵)	اصفہان
۷۔ سنجر بن ملک شاہ (۵۱۱۔۵۵۲)	مرو

عراق چونکہ ایران کا حصہ تھا اس لیے وہاں کے سلجوقی سلاطین زیادہ تر ہمدان اور رے میں مدفون ہوئے جن کی فہرست یہ ہے :

۱۔ طغرل بن محمد بن ملک شاہ (۵۲۶۔۵۲۷)	مدرسہ طغرل ہمدان
۲۔ مسعود بن محمد بن ملک شاہ (۵۲۷۔۵۴۷)	مدرسہ طغرل ہمدان
۳۔ محمد بن محمود بن محمد بن ملک شاہ (۵۴۸۔۵۵۴)	ہمدان
۴۔ سلیمان بن محمد بن ملک شاہ (۵۵۴۔۵۵۶)	ہمدان
۵۔ ارسلان بن طغرل بن محمد بن ملک شاہ (۵۵۶۔۵۷۳)	ہمدان
۶۔ طغرل بن ارسلان بن طغرل بن محمد (۵۷۳۔۵۹۰)	مقبرہ طغرل بیگ ری

مسجد لنبان :

مجھے اس دفعہ ایک تو ملک شاہ اور نظام الملک کی قبریں دیکھنی تھیں اور دوسری ""مسجد لنبان"۔ ڈاکٹر لطف اللہ ہنر فر نے پہلے "مسجد لنبان" کی طرف رُخ کیا۔ میدان شاہ سے نکل کر "چہار باغ" کی طویل شاہراہ کو عبور کرتے ہوئے خیابان شیخ بھائی کے ذریعے ہمارا موٹر مسجد لنبان کے دروازہ پر آ کر رکا۔

مسجد لنبان صفوی دور میں، علاوہ خانۂ خدا ہونے کے ایک سماجی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ یہ محلّہ قدیم اور اصفہان کے ابتدائی آباد محلوں میں سے تھا اس لیے باہر سے ہر نووارد مسافر اس مسجد کے ایک دو پھیرے ضرور کرتا تھا۔ شہر کے پڑھے لکھے، عالم، ادیب اور شاعر روزانہ یہاں آتے۔ ان کی محفلیں جمتیں، مباحث ہوتے اور شعر و سخن کی مجلسیں برپا ہوتیں۔ ایک دوسرے سے میل ملاقات کا مرکز بھی یہی مسجد تھی، اگر کہیں اور ملاقات نہ ہو سکے تو یہاں ملاقات ہو جانا یقینی تھا۔ گویا پورے اصفہان کا ثقافتی اور سماجی مرکز یہی تھا۔

طاہر نصیر آبادی نے اپنے مشہور "تذکرۂ شعرا" (۱۰۸۳ھ) میں اس مسجد اور مسجد میں میل ملاقاتوں کا بہت ذکر کیا ہے۔ یہ میرزا طاہر وہی ہیں جن کا جد اعلیٰ میرزا محمد صادق مینا، ہندوستان آ کر رہا اور دو بہت اہم تاریخیں لکھیں۔ "صبح صادق" جس کو (۱۰۴۸ھ) میں اس نے مکمل کیا اور شاہزادہ شجاع کے نام پر معنون کیا۔ دوسری تاریخ ہے "شاہد صادق" جسے اس نے (۱۰۵۶ھ) میں مکمل کیا۔ میں جس زمانے میں "تذکرۂ شعرائے کشمیر" مرتب کر رہا تھا اس وقت "تذکرۂ نصر آبادی" میں اکثر شعرا اور علما کی محافل اور دلچسپ مجالس کا ذکر پڑھتا تھا اور ایسا معلوم ہوا کہ یہ مسجد اصفہان کا ایک بہت اہم علمی مرکز تھا۔ قدرتاً مجھے اس کے دیکھنے کا خیال ہوا اور اس وقت سے اسی آرزو کو پالتا رہا۔

"لنبان" اس پورے محلّہ کا قدیمی نام ہے۔ یہ دراصل شہر سے باہر ایک دیہہ کا نام تھا اور جب شہر بڑھا تو یہ دیہہ اصفہان کا ایک محلّہ بن گیا۔ اس کے دروازہ کا نام "دروازۂ لنبان" تھا۔ اس محلّہ میں کئی ایک عالم، صوفی، درویش، ادیب اور شاعر رہتے تھے جن کا ذکر تاریخ میں اسی محلّہ کی مناسبت سے درج ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور علما "لنبانی" نسبت سے معروف اور مشہور ہیں۔ "تذکرۂ عرفات العاشقین" کا مؤلف تقی اوحدی (۹۷۳۔۱۰۳۰ھ) اسی محلّہ کا تھا جو ہندوستان آیا اور یہیں رہ کر اپنا معرکتہ الآرا تذکرہ لکھا۔

مسجد لنبان آٹھویں صدی ہجری میں جمال الدین وزیر دیلمی نے بنوائی۔ مسجد کی اب وہ قدیم عمارت نہیں رہی۔ وقت بوقت مرمت نے اس کی اصل ہیئت کو بدل دیا ہے۔ اس وقت یہ ایک بالکل جدید عمارت ہے۔ فقط گچ کی دیوار کا ایک ٹکڑا، صفوی عہد کی کاشی کاری کے چند نمونے اور اسی دور کے کچھ تاریخی کتبے بطور یادگار باقی رہ گئے ہیں۔ صحن میں البتہ ایک بہت بڑا اور تناور درخت سواس آٹھویں صدی کی یاد دلا رہا ہے۔ یہ چنار کا درخت ہے اور پورے صحن کو اپنے سائے میں لیے ہوئے ہے۔ مسجد کے ہال کے نیچے سے ایک نہر جاری ہے جس میں اہل حاجت اپنی حاجات اور ضروریات کے لیے عریضے لکھ کر بہا دیتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ان کی حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ اس مسجد میں حضرت امام حسن نے نماز ادا کی ہے۔ مسجد کا منبر "منبر صاحب الزمان" کے نام سے مشہور ہے جو اصفہان کے منابر میں اپنی خوبصورتی کی وجہ سے نفیس ترین منبر شمار کیا جاتا ہے اور اس پر (۱۱۴۲ھ) سال کندہ ہے۔

"رسالہ محاسن اصفہان" کا فارسی مترجم بنیاد رکھتے وقت خود موجود تھا اور اس نے "عمارت جمال الدین" کے نام سے اس کو یاد کیا ہے اور بانی کا نام لکھا ہے: "صاحب معظم، قدوہ اعاظم الامم، جلال الوزراء، جمال الدولتہ والدین، محمد دیلم دستجردی الاصفہانی۔"

سعید ہروی اسی زمانے کا شاعر تھا، اس نے اس کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں:

از پئ ذوق و تفرج، گر بہ لنبان میروی
مسجدی بینی مروح، برسر آب روان
در جوارش صاحب "صاحب قدم" رابقعۂ
کز لب تعظیم بوسد، آسمانش آستان
صاحب عادل جمال الدین محمد، کآورد
سبز خنگی آسمان را، حکم او در زیر ران

کاشی کے قدیم کتبوں میں دو کتبے محمد رضا الامامی الاصفہانی (۱۰۸۰ھ) کے ہیں اور ایک کتبہ محمد باقر شیرازی (۱۲۵۶ھ) کا ہے۔ اس کتبے کے اوپر دروازے کی عین پیشانی پر تذکرہ کے مصنف محمد طاہر نصر آبادی کے اشعار رضا امامی کے خط میں کاشی کی تختی پر لکھے ہوئے ہیں:

در زمان دادور گیتی ستان بحر دل
آفتاب دولت مشرق، سلیمان پادشاہ

پادشاہی، کز برائی کسب اقبال و شرف
فتح در ظل ھمائی رایتش گیرد پناہ
یافت تعمیر این بنااز لطف آن گردون شکوہ
شامل حال شریفش بار الطاف الہ
تابود مسجد برائی سجدہء اھل ورع
آستانش پادشاھان جھان را مسجد گاہ
خامہ بہر سال تاریخش، عبارت زد رقم
نو، شداین مسجد، زامر عادل عالم پناہ(۱۰۸۰ھ)

نصر آبادی نے اپنے تذکرے میں یہ اشعار دیے ہیں۔

اندر باہر، گنبد، منار اور درودیوار پر کاشی کا بہترین کام کیا ہوا ہے۔ جس وقت ہم پہنچے ہیں اس وقت بھی منار کی مرمت ہو رہی تھی۔ مسجد نہایت خوبصورت، صحن اور عمارت دلکشا اور محلّہ ایسی جگہ واقع ہے کہ ہر آنے جانے والے کا گزر ضرور وہاں سے ہوتا ہے۔

معاشرہ بدل چکا ہے، محافل کے مراکز کی نوعیت بھی مختلف ہو گئی ہے اور ہماری تہذیب بھی گردش روزگار سے دگرگون ہو گئی ہے اس لیے اب مساجد تہذیبی اور ثقافتی مرکز نہیں رہیں۔ سوائے تاریخی اہمیت کے خود مذہبی معاشرے میں بھی ان کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں رہا۔ مساجد میں اکثر چوکیدار بیٹھے رہتے ہیں اور سیاح ادھر ادھر فوٹو نکالتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔

جب ہم مسجد لنبان میں داخل ہوئے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہم اس کو دیکھتے رہے اور جب باہر نکلے ہیں اس وقت بھی کوئی آنے والا نہیں ملا۔

دارالبطیخ:

مسجد لنبان سے نکل کر ہمارا موٹر اب میدان شاہ کی سمت چلا۔ خیابان حافظ سے ہوتے ہوئے محلّہ احمد آباد کی ایک گلی میں مڑا۔ دو گلیوں میں ادھر اُدھر مڑ کے چنار کے ایک تناور درخت کے قریب آکر رکا۔

اس وقت موسم بہت ہی خوشگوار تھا ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل کر دھوپ چھاؤں کا سماں پیدا کر رہے تھے۔

گلی آباد تھی، کریانے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں، عورتیں سیاہ برقع پہنے ہوئے کھانے پینے

کاسامان خرید رہی تھیں اور گلی میں کام پر جانے والے مردوں کی آمد و رفت مسلسل جاری تھی۔

یہ جو چنار کا بڑا درخت کھڑا ہے اس کی وجہ سے اس حصہ کو "مقبرۂ پائی چنار"، "تکیہ پائی چنار" اور "تربت نظام" کہا جاتا ہے۔ یہ چنار ڈاکٹر ہنر فر کی تحقیق کے مطابق اسی "مدرسۂ ملک شاہ" کی باقی ماندہ یادگار ہے۔ اس قسم کے چند ایک قدیم درخت اصفہان میں موجود ہیں جن کو اپنی کہن سالگی کی وجہ سے تاریخی حیثیت حاصل ہے، مثلاً "چنار امام زادہ اسماعیل" "چنار دستگرد" اور "چنار باغ زرشک۔"

اسی مقام کو "دار البطیخ" اس لیے کہا جاتا تھا کہ قدیم دور میں یہاں سبزی منڈی تھی اور سبزی کے علاوہ تمام اقسام کا میوہ، خصوصاً اعلیٰ قسم کا خربوزہ بہت افراط سے یہاں آتا تھا۔

یہیں ملک شاہ سلجوق نے مدرسہ قائم کیا تھا اور ایک وسیع باغ اس سے ملحق لگوایا تھا۔ اسی باغ کے ایک گوشے میں خواجہ نظام الملک طوسی کو دفنایا گیا جس کے بعد یہ حصہ "تربت نظام" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ سال (۷۲۴ھ) میں اس مقام کو اسی نام سے کتابوں میں لکھا گیا ہے۔

گورستان :

یہاں برصغیر میں، عبد الرزاق کانپوری مرحوم پہلا شخص ہے جس نے نظام الملک طوسی کی مفصل اور مستند سوانح عمری لکھ کر، ان کی عظمت اور ان کے کارناموں سے ہمیں آگاہ کیا۔ پڑھا لکھا طبقہ اس کے بعد ہی ان کی شخصیت سے متعارف ہو گیا۔ نظام الملک کی حیات پر غالباً اس قسم کی مفصل کتاب کسی زبان میں اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔

خواجہ نظام الملوک طوسی سلطان ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ بغداد جا رہا تھا کہ نھاوند کے حدود میں منزل "سحنہ" پر ایک باطنی نے درخواست کے بہانے قریب آکر ان کو چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہ ۱۲ رمضان ۴۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جس پر تمام عالم اسلام نے ماتم کیا۔ ان کی نعش وہاں سے لائی گئی اور اصفہان کے اس محلّہ میں "مدرسۂ ملک شاہی" کے باغ میں دفن کی گئی۔

اس بڑے چنار کے مقابل ایک معمولی دروازے سے ہم ایک چہار دیواری کے اندر داخل ہوئے۔ چھوٹے صحن کے بعد چار فٹ اوپر ایک دالان تھا جس پر چھت تھی۔ کھلے صحن کے درمیان چند میوہ دار درخت تھے جو ہر ایرانی کے مکان کا خاصہ ہے۔

اسی دالان پر وہ مجموعۂ مقابر ہے جس میں خواجۂ بزرگ کی قبر بھی ہے اور چند سلجوقی

سلاطین بھی مدفون ہیں۔

ہر چند کہ سلجوقیوں میں سلطان سنجر کے بعد ملک شاہ سب سے زیادہ نامور بادشاہ گزرا ہے لیکن خواجہ نظام الملک جیسے نامور وزیر، عالم اور ادیب کے پہلو میں دفن ہوا اس لیے اس کا نام دب گیا اور "زبان خلق" پر "قبر نظام" ہی کا نام رہ گیا ہے۔ خواجہ بزرگ کے اچانک مارے جانے کا واقعہ اتنا عظیم تھا کہ اس کے ایک ماہ بعد جب ملک شاہ کی نعش لا کر اس جگہ پر دفن کی گئی تو اس کے مدفن کو کسی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

خواجہ نظام الملک کا مزار :

دالان پر آتے ہی پہلی قبر خواجہ کی پڑتی ہے۔ لوحِ مزار سنگ مرمر کا، کنارے نقشی دار اور آیات قرآنی سے مزین۔ اوپر کے کناروں پر آیات ہیں اور سرہانے کی طرف بعض جگہ سے مٹا ہوا کتبہ ہے جس کی عبارت یوں پڑھی جاتی ہے۔

"واصل گشت بجوار مرحمت وغفران، وفایز شد بغرفات جنان و روضہ رضوان، حضرت مغفرت مآب قیام بصفت رحمہ دیان..... المفاخر وافتخار الاکابر ولعاظم الوزراء..... خواجہ..... الملک"

مجھے ڈاکٹر ہنر فر نے بتایا کہ یہ اور دیگر قبروں کے پتھر عصر صفوی کے معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ عمارت تو قریبی دور کی بنی ہوئی ہے۔

اسی قبر کے آس پاس خواجہ کے بیٹے ابو بکر عبید اللہ مؤید الملک کی قبر بھی تھی جس کو سلطان برکیارق نے پہلے اپنا وزیر بنایا اور پھر (۴۹۴ھ) میں اپنے ہاتھ سے اُس کی گردن اڑائی۔ اب یہ قبر ظاہر نہیں ہے، مرمت اور زمانے کے نشیب و فراز میں اور قبروں کے ساتھ یہ قبر بھی مٹ گئی ہے۔

اس عظیم الشان شخصیت کی تاریخی قبر کے چاروں طرف میں بار بار پھرا اور عبرت سے پتھر کے اس نشان کو دیکھتا رہا جس کے نیچے قوی گمان یہ ہے کہ نظام الملک جیسی عظیم شخصیت ابدی نیند سو رہی ہے۔ تصویریں نکالیں اور آگے قدم بڑھائے۔

ملک شاہ سلجوقی کی قبر :

چند قدم کے فاصلہ پر دو قبریں ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ دونوں کے سنگ مزار سنگ مرمر کے ہیں۔ ایک منقش اور آیات سے مزین ہے، دوسرا نسبتاً زیادہ نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ دونوں پر نام نہیں ہے۔ گمان ہے کہ جو کم نقشی دار قبر ہے وہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کی ہے جس کو خواجہ نظام الملک کی شہادت کے ایک ماہ بعد شوال (۴۸۵ھ) میں جمعہ کے روز بغداد میں موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔

رفت در یک مہ بہ فردوس برین، دستور پیر
شاہ برنا، از پس او رفت، در ماہ دگر
کرد ناگہ قہر یزدان، عجز سلطان آشکار
قہر یزدانی ببین و عجز سلطانی نگر

سلطان کی نعش پہلے بطور امانت بغداد میں "شونیز" کے گورستان میں دفن کی گئی، جہاں سے اس کے بیٹے محمود شاہ نے لاکر اصفہان کے اس "مدرسۂ ملک شاہی" میں جوار خواجہ نظام الملک میں دفن کی۔

ترکان خاتون :

ترکان خاتون ملک شاہ کی باعظمت ملکہ تھیں، جیسا عظیم خاوند تھا ویسی ہی بڑی یہ بیگم تھی۔ سال (۴۸۷) میں، خاوند کی وفات کے تقریباً دو سال بعد اصفہان میں اور یہیں سلطان ہی کے پہلو میں دفن ہوئی۔ لوحۂ قبر چاروں طرف سے منقش ہے۔ نام اس پر بھی لکھا ہوا نہیں، فقط آیات قرآنی نقش کی ہوئی ہیں۔

سلطان برکیارق۔ سلطان محمد :

یہ دونوں ملک شاہ کے بیٹے تھے زندگی میں یہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے سخت مخالف اور جانی دشمن تھے لیکن جب اس جہاں سے کوچ کیا تو قسمت اور ان کی بے بسی نے دونوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں جگہ دے دی۔

ملک شاہ کے سرہانے دوڈھائی فٹ بلند سطح ہے جس پر دو قبروں کے نشان ہیں اور یہی دو قبران دو بھائیوں کی کہی جاتی ہیں۔

اس پورے مسقف ایوان کا فرش اور دیواریں سبز ٹائیلوں کی ہیں۔ سلطان برکیارق کی قبر کا صندوق نما تھلہ اسی سبز ٹائیلوں سے بنا ہوا ہے۔ کوئی نقش یا کتبہ نہیں ہے، روایت یہی رہی ہے

کہ یہی قبر برکیارق اور محمد کی ہے۔

دوسری قبریں:

معلوم ہوتا ہے کہ "مدرسہ ملک شاہی" کے باغ کا یہ گوشہ، جس میں پہلے نظام الملک کو دفن کیا گیا، بعد میں سرکاری گورستان کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اصفہان سلجوقی سلاطین کی اس شاخ کا دارالسلطنت رہا اس لیے جو سلجوق سلطان فوت ہوا اس کی دفن گاہ یہی گوشہ بنا بعد کے ادوار میں بھی کچھ اور لوگ دفن ہوئے ہیں چنانچہ کچھ قبریں نویں اور دسویں صدی کی بھی موجود ہیں جن کی شخصیتوں کی تاریخی حیثیت معلوم نہیں ہے۔ نام اور سال ان پر مرقوم ہیں۔

ہم نے اس عبرت گاہ پر تقریباً دو گھنٹے گزارے اور قبروں کے گرد بار بار گھومتے رہے، بحث کرتے رہے اور ان کے قتل اور مظالم کی داستانیں یاد کرتے رہے۔

تاریخی شخصیتوں کا آغاز اور انجام اور پھر یہ کسمپرسی کی حالت دیکھ کر دنیا اور دنیا والوں کی بے ثباتی پر نفرین کرتے ہوئے ہم اس چہار دیواری سے باہر نکل آئے اور اس قدیم چنار کی شاخوں اور تنہ کو ایک دفعہ پھر غور سے دیکھتے ہوئے موٹر میں سوار ہو کر "مہمان خانۂ شاہ عباس" کی طرف چلے۔ موٹر چلتی رہی اور میرے ذہن میں خاقانی کا یہ شعر پھرتا رہا:

ملک شہ، آب و آتش بود، رفت آن آب و مرد آتش

کنون، خاکستر و خاک است مانده، در صفاهانش

سلطان ملک شاہ خوش قسمت تھا کہ خواجہ نظام الملک کے جوار میں دفن ہوا اور اس نام آور وزیر، دبیر اور مصنف کی وجہ سے، اس کی قبر آج تک قائم رہتی چلی آئی ہے۔ جو پڑھا لکھا نظام الملک کی زیارت کو جاتا ہے وہ اس عظیم سلجوقی پادشاہ کی قبر کو بھی حیرت سے دیکھ لیتا ہے۔

کراچی ۶۔۸۔۷۴ء

سلطان محمود بکھری کی زندگی کا ایک پہلو

دسویں صدی ہجری میں بخارا سے لے کر دہلی تک کچھ ایسے غیر معمولی واقعات اور حادثات وقوع پذیر ہوئے کہ جنہوں نے ان مختلف سرزمینوں کی دنیا ہی یکسر بدل ڈالی۔ پرانے حکمرانوں کے تخت و تاج اُلٹ گئے، نئی قوتیں اُبھر آئیں، نئے خانوادے نکل آئے اور نئی حکومتوں نے تشکیل پائی۔

شیبانیوں کا اُبھرنا (۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء)، صفوی سلطنت کی بنا پڑنا (۹۰۷ھ/ ۱۵۰۲ء)، ہرات کے تیموریوں کا بہ وجہ کثرتِ اولاد و ازدواج چراغ گل ہو جانا (۹۱۳ھ/ ۱۵۰۶ء)، بابر کا فرغانہ سے آوارہ ہو کر کابل اور قندھار پر تسلط پیدا کر کے (۹۲۸ھ/ ۱۵۲۲ء) پھر ہندوستان میں ایک بڑی سلطنت کی بنیاد رکھنا (۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء)، سندھ میں سمہ خاندان کا مٹ جانا، شاہ حسین بایقرا کے ایک امیر شاہ بیگ ارغون کا قندھار میں بابر سے شکست کھا کر سندھ پہنچ کر حکومت کی داغ بیل ڈالنا (۹۲۸ھ/ ۱۵۲۲ء)، ہمایوں کا سوری سلطان سے شکست کھا کر سندھ میں جائے پناہ نہ ملنے کی (۱)، وجہ سے (ربیع الآخر ۹۵۰ھ/ ۱۱ جولائی ۱۵۴۳ء تا ۷ محرم ۹۵۲ھ/ ۲۱ مارچ ۱۵۴۵ء) ایران جا کر پناہ گزیں ہونا اور شاہ طہماسپ کی ہمدردی اور امداد سے پھر ہندوستان کا تخت و تاج حاصل کرنا۔ یہ سارے واقعات دسویں صدی کی پہلی تین چوتھائیوں میں رونما ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایران قدیم کی سرزمین سے لے کر برصغیر کی خاک تک کا پورا سیاسی سماجی ماحول اور ثقافتی صورت حال بالکل تبدیل ہو کے رہ گئی۔ اس کی وجہ سے ایک اور خاص بات جو

ہمارے ہاں رونما ہوئی، وہ یہ ہے کہ آیندہ کئی صدیوں تک جغرافیائی حدود اگرچہ بظاہر قائم رہے لیکن سیاسی اور سماجی معاملات اور مسائل میں اس برصغیر پر ہمیشہ ایران کی ایک قسم کی بالادستی رہی۔ کیونکہ سماجی یا سیاسی معاشرے کی جن امرا اور اہلِ فکر نے یہاں آکر تشکیل کی وہ تمام تر ایرانی اور تورانی تھے۔

سلطان محمود بکھری اور اس خاندان کے دیگر افراد بھی انہی میں سے تھے جو مذکورہ صدی کے آغاز میں آئے اور صدی کی آخری چوتھائی تک ہرات، کابل، قندھار اور پھر بعد میں سندھ کے سیاسی اور سماجی ردوبدل میں بہت بڑا کردار ادا کرتے رہے۔ امیر ذوالنون ارغون اور شاہ بیگ ارغون کے ہاتھ سے کابل، قندھار، بست اور زمین دلور کے علاقوں پر جو کچھ گزری اُس میں سلطان محمود بکھری کے باپ میر فاضل کوکلتاش(۲)، کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور پھر جب یہ سب لوگ وہاں سے نکالے جانے کے بعد سندھ پر آکر مسلط ہوئے، تو یہاں کے ملکی امور اور معاملات میں جو کچھ ردوبدل ہوا اس میں اس خاندان اور خاص طور پر سلطان محمود بکھری کا کردار بہت ہی اہم رہا ہے(۳)۔ یہاں تک کہ جب شاہ حسن ارغون نے ۹۶۲ھ/ ۱۵۵۵ء میں لاولد ہوکر وفات پائی تو اس نے سیوستان سے لے کر سیوی تک اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی۔

سلطان محمود بکھری کے اجداد کا تعلق اصفہان کے موضع خراسکان(بلوک جی) سے تھا(۴)۔ میر معصوم نے سلطان محمود بن میر فاضل بن میر عادل بن احمد خواجہ تک کا سلسلہ بتلایا ہے(۵)، اور لکھا ہے کہ احمد خواجہ کا تین واسطوں سے اصفہان کے مشہور اور معروف سخی اور جواد ملک محمود "نان دہ" سے نسب ملتا ہے۔ امیر تیمور نے جب اصفہان کو تاراج کیا (۷۸۹ھ/ ۱۳۸۷ء) تو (۶)، سلطان محمود کا دادا احمد خواجہ، امیر ذوالنون ارغون کے والد میر حسن کے ہاتھ آیا جس نے اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کی اور اپنے ہی گھر کا فرد بنالیا۔ سلطان محمود بکھری کے خاندان کا امیر ذوالنون ارغون کے خاندان سے تعلق یہیں سے شروع ہوا جو اس کے پوتے شاہ حسن ارغون کی وفات (۹۶۲ھ/ ۱۵۵۵ء) تک برابر قائم اور استوار رہا۔

ارغونوں کے ساتھ ترخانوں کا ایک بہت بڑا اور طاقتور قبیلہ سندھ میں آیا تھا۔ ان کے مقابلے میں میر فاضل کوکلتاش کا خاندان، جو سندھ میں وارد ہوا، وہ فقط ایک گھر کے

چند افراد پر مشتمل تھا (۷)۔ ظاہر ہے کہ سلطان محمود نے سندھ میں جو مقام حاصل کیا اور ترخانوں جیسے بہادر اور اکثریت والے قبیلے کی رقابت اور دشمنی کے باوجود نصف سندھ پر اپنی حکومت قائم کرلی، اس کا سبب نہ فقط اس کے جانباز اور وفادار سپاہی تھے بلکہ اس میں اس کی اپنی بہادری، شجاعت، جواں مردی، عزم، ذہانت اور سب سے زیادہ معاملہ فہمی اور آداب ملک داری کے اوصاف کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ اس کی شخصیت نہایت دلچسپ اور سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔

جس وقت اس نے بالائی سندھ کی زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اُس وقت کے حالات اس کے لیے نہایت خطرناک اور پُر آشوب تھے۔ سندھ میں ٹھٹھہ کا حکمران میرزا عیسیٰ خاں ترخان اس کا جانی دشمن اور اس کو مٹا دینے کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا اور ہمسایہ ملک ہندوستان پر شاہ حسن کے انتقال (۹ جمادی الاول ۹۶۲ھ / یکم اپریل ۱۵۵۵ء) سے ایک ماہ پیشتر ہمایوں لاہور پر قبضہ کرچکا تھا (۲ ربیع الثانی ۹۶۲ھ / ۲۴ فروری ۱۵۵۵ع) اور تین ماہ بعد (۲ شعبان ۹۶۲ھ / ۲۲ جون ۱۵۵۵ء) سرہند کے پاس سوریوں کو شکست دے کر پورے ہندوستان پر مغل سلطنت کا جھنڈا دوبارہ لہرا دیا تھا۔ ہمایوں، سلطان محمود بکھری کا بڑا دشمن تھا کیونکہ جب وہ شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ میں پناہ لینے پہنچا (۲۸ رمضان ۹۴۷ھ / ۲۶ جنوری ۱۵۴۱ع تا ۷ ربیع لآخر ۹۵۰ھ / ۱۱ جولائی ۱۵۴۳ع) تھا اُس وقت اپنے ولی نعمت شاہ حسن ارغون کے حکم پر سلطان محمود نے قدم قدم پر ہمایوں کو روکا اور اس طرح مقابلے کیے کہ کہیں اس کے پاؤں ٹکنے نہیں دیے اور آخر مجبور ہوکر اسے ایران کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ میر معصوم کا قول ہے کہ سندھ میں دل برداشتہ ہونے اور ایران چلے جانے کا سبب ہی وہ جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود نے ہمایوں کے اچھے اچھے امیر اور نامی گرامی سپاہی مار دیے (۸)۔

ایسے خطرناک، مایوس کن اور تاریک وقت میں ظاہر ہے کہ سلطان محمود کا عالم کیا ہوگا؟ لیکن اُس نے دل نہیں ہارا۔ عقل، ذہانت اور تدبر کا جتنا کچھ سرمایہ اس کے پاس تھا اس موقع پر اس نے اس سے کام لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک قوی حکومت کے مقابلے میں ایک اتنی ہی قوی تر سلطنت کی ہمدردیاں اپنے ساتھ رکھے اور ایک ہمسایہ ملک کے مقابلے میں دوسرا اہم جوار ملک اس کی پشت پناہی پر موجود ہو اور وہ ملک ایران

ہی تھا جو ہمایوں کا بھی محسن تھا۔

ایران سے اپنا آبائی وطن ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ سلطان محمود کا روحانی تعلق تو پہلے سے تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت شاہ حسن کے دور (۶۲۔۹۳۰ھ/ ۵۵۔۱۵۲۴ع) سے سیوی تک کی ایالت اس کے سپرد تھی، اس وقت سے ایران کے خاص لوگوں اور مذہبی پیشواؤں سے ان کی راہ و رسم اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع تھا۔ چنانچہ شاہ حسن کے آخری ایام حیات میں جب کہ ان کا اپنا قبیلہ اور ترخانی امیر ان کے خلاف ہوگئے اور ٹھٹھہ میں بغاوت کردی، اس وقت (محرم ۹۶۲ھ/ نومبر ۱۵۵۴ع) سلطان محمود اپنا لشکر لے کر اپنے ولی نعمت کی مدد کو بکھر سے روانہ ہوا تو دوسری منزل پر سید جعفر مشہدی روضہ رضویہ کے نقیبوں کی طرف سے نقاروں کا ایک جوڑا لے کر ان کے پاس پہنچا(۹)۔ سلطان محمود نے پورے ادب اور احترام سے لیا اور اس کو اپنی حکومت کے لیے فال نیک اور بشارت سمجھا۔

سلطان محمود نے ایران کے ساتھ روابط بڑھانے کی کوششیں اور تیز کردیں لیکن ساتھ ہی اس سے بھی غافل نہیں رہا کہ ہمایوں کے دل سے جب تک تکدر دور نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت سدی علی رئیس تُرک امیر البحر یہاں پہنچا ہوا تھا (۹۶۲ھ/ ۱۵۵۵ع) اور شاہ حسن کی موت پر موجود تھا۔ عیسیٰ ترخان کے مقابلے میں سلطان محمود کے ساتھ اس کا یارانہ ہوگیا تھا۔ ہندوستان جاتے وقت سلطان محمود نے ہمایوں کا مسئلہ اس کے کان میں ڈال دیا تھا۔

سلطان محمود خوش بخت تھا، تقدیر اس کے ساتھ تھی۔ سدی علی رئیس نے پہنچتے ہی خوشنودی کا فرمان شاہی مہر کے ساتھ حاصل کرکے بھیج دیا (۱۰)۔ جس کی وجہ سے فوری جو خطرہ تھا وہ سردست ٹل گیا، لیکن چند ماہ بعد خود ہمایوں بھی (۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ/ ۲۸ جنوری ۱۵۵۶ع) اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

اسی کشمکش کے دوران میں سلطان محمود نے شاہ طہماسپ کی غیر معمولی ہمدردیاں اور سرپرستی حاصل کرلی تھی اور کئی ایک مرتبہ سفیر آئے، سوغات لائے اور خطابات عطا ہوئے۔ میر معصوم کی "تاریخِ سند" سے معلوم ہوتا ہے کہ سال ۹۶۵ھ/ ۵۸۔۱۵۵۷ع میں شاہ ایران نے سلطان محمود کو "خان" (۱۱)، کا خطاب دیا۔ اگرچہ

مغلوں کی تاریخوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور اس کو ہمیشہ "سلطان محمود بکھری" لکھتے رہے، لیکن سندھ میں یہ خطاب اس کے نام کا جزو بن گیا اور تمام تاریخوں میں اس کو "سلطان محمود خاں بکھری" لکھا گیا ہے۔ اس خطاب کے ساتھ اس کے لیے "علم و نقارہ و تمن طوغ و جامہ و اقوا" بھی مرحمت ہوا تھا(۱۲)۔

ہمایوں اگرچہ فوت ہو گیا اور فرمان خوشنودی بھی سلطان محمود خاں کے پاس موجود تھا لیکن خطرہ بہرحال اپنی جگہ پر اب بھی باقی تھا۔ اکبر جو ہمایوں کے بعد تخت کا وارث ہوا وہ نوجوان بلکہ نوخیز تھا۔ جس وقت سلطان محمود خاں سندھ میں ہمایوں کے لیے باعثِ آزار بنا ہوا تھا، اس وقت وہیں عمرکوٹ میں اکبر پیدا ہوا (۵ رجب ۹۴۹ھ/ ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء)۔ اور وہ چند ماہ کا تھا جب ہمایوں نے ایران جانے کے ارادے سے سندھ کو خیرباد کہا (۹ ربیع الاول ۹۵۰ھ)۔ اس لیے باپ اگر وفات پاچکا تو بیٹا انتقام کے لیے تازہ دم تھا۔ سندھ میں اس قافلے پر بیتے ہوئے دنوں کی داستانیں سنانے والے بہت سے امیر موجود تھے۔ خود ان کا اتالیق اور وقت کا 'خانِ خاناں" اور سپہ سالار بیرم خاں اور پھر اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم گزشتہ واقعات کے عینی شاہد موجود تھے۔ ہوسکتا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی آفت کھڑی ہو جائے۔

سلطان محمود خاں نے اس خطرے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حفظ ماتقدم کے طور پر خانِ خاناں کے قریبی عزیز شاہ تردی بیگ کی لڑکی گوہر تاج خانم سے عقد کرلیا تاکہ بیرم خاں اس رشتے کی وجہ سے اس کا ہمدرد بن جائے۔ اس شادی پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ چنانچہ میر معصوم کی اطلاع کے مطابق: "طوی عجب کردہ شہر و بازار را آئین بندی کردہ قبھا بستند و مجالس متعدد، آراستہ بانواع حظوظ نفسانی پرداختند"(۱۳)۔ ظاہر ہے کہ سڑسٹھ برس کی عمر میں اتنے بڑے اہتمام سے شادی رچانا نہ تو ازدواجی ضرورت کے تحت تھا اور نہ ہی سنت نبوی کی پیروی تھی۔ فقط خانِ خاناں بیرم خاں سے ایک نسبت پیدا کر کے اس سے ان حادثات کے اثرات دور کرنے تھے جو ہمایوں کے ساتھ ساتھ خود ان پر بھی سندھ میں بیت چکے تھے۔ لیکن جب درباری سازشوں کی وجہ سے اکبر کے باپ کا یہ بوڑھا ساتھی یعنی بیرم خاں معتوب ہوا اور حج کو جاتے ہوئے اس رشتے کی بنا پر چاہا کہ بکھر میں ٹھہر کر آگے چلے تو سلطان محمود نے بدلے ہوئے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے بکھر کے

ساتھ کا "چہار باغ ببرلوی" ویران کرا دیا کہ مبادا بیرم خاں یہاں ٹھہر کر ٹک نہ جائے (۱۴)۔ کیونکہ ہمایوں کو بھی یہ جگہ اپنی سرسبزی، شادابی اور آب و ہوا کی وجہ سے بہت پسند تھی۔ سلطان محمود خاں کی مزاجی کیفیت اور اس کی سیاست مداری کو سمجھنے میں یہ واقعہ آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

سلطان محمود خاں، اکبر کے قریب بھی ہونا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں ملک ہی نہ ہاتھ سے نکل جائے اور اسے اپنے سے ناراض کرنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ اپنی اس پالیسی کو کامیابی سے قائم رکھنے کے لیے شاہ ایران کی خصوصی عنایات اور توجہ کا شامل حال رہنا بہت ضروری تھا جس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔

مذکورہ بالا خطاب کے بعد (۹۶۹ھ / ۶۲۔۱۵۶۱ء میں) شاہ طہماسپ کا ایلچی حق ویردی بیگ، سلطان محمود خاں کے لیے "حلقہ لعل و تاج و کمر مرصع و خلعت فاخرہ و چتر و اتاغہ و جیغہ زلف و عقار و انواع تفقدات و انعامات شاہی" لے کر بکھر پہنچا (۱۵)۔ سلطان محمود خاں نے سفیر کی پذیرائی میں اور شاہی خلعت اور انعامات کو لیتے وقت غیر معمولی اہتمام سے کام لیا اور اس کی بہت تشہیر کی۔ دراصل سندھ میں اپنے رقیب اور دشمن میرزا عیسیٰ خاں ترخان کو مرعوب کرنا بھی مقصود تھا۔ میر معصوم نے لکھا ہے کہ ایک سال حق ویردی بکھر میں رہا اور جاتے وقت سلطان محمود نے سید ابوالمکارم کو اپنی طرف سے سفیر بنا کر اس کے ساتھ روانہ کر دیا (۱۶)، تاکہ دربار میں پہنچ کر ان غیر معمولی عنایات کا تشکر ادا کرے جو وقت بوقت سلطان محمود خاں پر ہوتی رہی ہیں۔ سال ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء کے واقعات میں "عالم آرائے عباسی" میں اس سفارت کا ذکر یوں ہوا ہے: "در سنہ احدی و سبعین و تسعمایۃ سلطان محمود خاں والی بکھر و سند، ابوالمکارم نامی ایلچی خجستہ پیام، بدرگاہ سدرہ مقام ارسال داشتہ اظہار حسن عقیدت واخلاص موروثی و تذکر حقوقِ ماضیہ نمودہ تبرکات و پیلاکات لایقہ فرستادہ بود" (۱۷)۔

شاہ طہماسپ نے ایک بار پھر حق ویردی کو سلطان محمود خاں کے پاس بھیجا اور اس دفعہ بقول میر معصوم خطاب 'خان خانی' ان کو مرحمت کیا اور کئی ایک اور سوغات بھی بھیجے۔ چنانچہ عبارت یہ ہے کہ "بارِ دیگر حق ویردی را رفیق میر ابوالمکارم گردانیدہ سلطان محمود خاں را بہ خطاب 'خان خانی' و اجناس تشریفات و انواع تفقدات بنواخت" (۱۸)۔

اس خطاب اور حق ویردی کی آمد کا سال متعین نہیں کیا جاسکتا۔ میر معصوم نے واقعات کے تسلسل اور تاریخوں کے تعین اور صحت کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس واقعے کو اس نے ۹۷۰ھ / ۱۵۶۲ء کے تحت بیان کیا ہے(۱۹) ، حالانکہ "عالم آرائے عباسی" نے آمد کا سال "۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء" دیا ہے اور "احسن التواریخ" نے میر ابوالمکارم کی واپسی بھی اسی سال میں دی ہے (سنہ احدی و سبعین و تسعمایة) "دریں سال ملوک آفاق رسل و هدایا بدرگاہ شاہ عالم پناہ فرستادند از آں جملہ سلطان محمود خاں والی بکھر ابوالمکارم نامی را بانواع هدایا و اصناف پیلکات ارسال نمود.... شاہ دین پناہ رسولاں را خلعہائے گراں بخشید و رخصت انصراف داد (۲۰)۔

سلطان محمود خاں ایرانی دربار کے اس خطاب "خان خانی" (۲۱)، سے نہ کبھی مشہور ہوا اور نہ ایران کی کسی تاریخ میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ دراصل یہ خطاب ایرانی نہیں بلکہ فقط برصغیر کے مغل دربار سے مختص رہا ہے۔ میر معصوم کو اس بنا پر یہ مغالطہ ہوا ہے کہ سلطان محمود کی خواہش تھی کہ بیرم خاں کے بعد اکبر کے دربار سے یہ اعلیٰ ترین خطاب اس کو ملے تاکہ اپنے رقیبوں، یعنی میرزا عیسیٰ ترخان اور بعد میں اس کے بیٹے میرزا محمد باقی ترخان کی سازشوں اور مخالفتوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ اور مامون ہو جائے۔ میر ابوالمکارم (۲۲)، کو شاید اس غرض سے شاہ طہماسپ کے پاس بھیجا تھا اور حق ویردی جو دوبارہ اس کے ساتھ ہی واپس آیا وہ دراصل شاہ کا خط اکبر کے لیے لایا تھا اور غالباً بکھر سے ہوتے ہوئے اکبر کے دربار میں چلا گیا۔ یہ قیاس ہے جو مندرجہ ذیل واقعات کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔

شاہ طہماسپ اور اکبر کے درمیان قندھار کے معاملات پر اندرونی طور پر ناراضی پیدا ہوگئی تھی، لیکن بظاہر ڈپلومیسی کے طور پر روابط خوش گوار تھے۔ شاہ نے اس سلسلے میں جو خط لکھا ہے اس کے جواب کا حال "اکبر نامہ" میں ابوالفضل کے ان الفاظ میں ملتا ہے :
"دریں سال (۹۷۲ھ / ۱۵۶۴ء) ایلچی شاہ طہماسپ با گلدستۂ یک جہتی در رسید و تنسوقات آں دیار برسم ارمغانی آورد۔ سلطان محمود بکھری کہ ہموارہ اظہار بندگی کردی، در آرزوے آں افتاد کہ منصب "خان لار خانی" کہ "خان خانی" باشد، از درگاہ معلی یابد۔ وچوں امرائی کلانند ازو بودند کہ از مرتبہ شناسی و بہ حال پیش فرمان خود آرزوی ایں پایہ بخاک

نرسانیدندی، کامروائی ایں امنیت نگشت، مبلغھائے زر برسم پیشکش شاہ غفران پناہ فرستاد کہ شاید بوسیلہ سفارش شریف ایشان ایں دولت روزی گردد۔ شاہ ملتمس اورا قبول فرمودہ اشارت گونہ بداں رقم پذیر کلک محبت ساختہ بودند۔ لیکن چوں خدیو عالم (اکبر) برمسند مرتبہ دانی و معدلت آرائی بودند، روائی استحقاق بود نہ رواج سفارش۔ خصوصاً کہ مثل منعم خاں بایں منصب والا اختصاص داشت، بنابراں استدعائی شاہی را معذرتی خجستہ فرمودہ آمدہ را بائین بزرگان رخصت فرمودند" (۲۳)۔ اس عبارت کے بہت سے الفاظ اکبر اور شاہ طہماسپ کے تعلقات کی ناہمواری کی غمازی کرتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اس خط کا لانے والا حق ویردی بیگ ہی تھا جو ابوالمکارم کے ساتھ بکھر پہنچا اور وہاں سے اکبر کے دربار میں آیا۔ میر معصوم اسی مراسلت کی بنا پر غلط فہمی سے، بجائے اس کے کہ شاہ طہماسپ کی سفارش کا ذکر کرتا، اس نے خطاب دینا ہی شاہ کی طرف منسوب کر دیا۔

اکبر کے جواب میں شاہ طہماسپ نے جو خط لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے لکھا تھا کہ سلطان محمود کو فی الحال 'اعتبار خاں' کا خطاب دیا گیا ہے اور آئندہ بھی اس کا خیال رکھا جائے گا (۲۴)۔ اس "اعتبار خاں" کے خطاب ملنے کی تائید اس خط کے سوا اور کسی ذریعے سے نہیں ہوتی۔ میر معصوم کی تاریخ، ابوالفضل کا اکبر نامہ اور بعد کی کتابوں میں "تذکرۃ الامرا" کیوں اس سے خالی ہے۔ یہ آخری کتاب تو فقط خطاب یافتہ امرائے حالات میں ہے۔ "اعتبار خاں" کے تحت سلطان محمود خاں کا نام اس میں نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں اکبر کے خط میں اس کا اشارہ کیسے آگیا۔

۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء میں سلطان محمود خاں کا مقامی دشمن میرزا عیسیٰ ترخان فوت ہو گیا اور اس کا ظالم اور مغلوب الغضب بیٹا میرزا محمد باقی جانشیں ہوا (۲۵)۔ سلطان محمود خاں کے ساتھ رقابت کا عمل، جو اس کو ورثے میں ملا تھا، وہ برابر جاری رہا۔ اگرچہ ایرانی دربار اور سلطان محمود کے درمیان ایلچیوں کی آمد و رفت یا مراسلت کا ذکر ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء کے بعد بظاہر تاریخوں میں دستیاب نہیں ہوتا لیکن بعض واقعاتی اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی ہمدردیاں آخر تک ان کے شاملِ حال رہیں۔

۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء میں میرزا باقی نے اکبر کو سلطان محمود خاں کے خلاف ایک

عرضداشت بھیج کر شکایت کی ہے کہ قندھار کے قزلباشوں کی مدد سے وہ اس کی حدود میں دخل دے رہا ہے، اسے تنبیہ کی جائے(۲۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ طہماسپ کے بھائی بہرام میرزا کے بیٹے سلطان حسین میرزا (۹۸۴ھ/۱۵۷۶ع) وغیرہ کی ہمدردیاں اور تعلقات برابر سلطان محمود خاں کے ساتھ قائم تھے۔

سلطان محمود خاں ایک صدی کی تین چوتھائیوں کی اس پرآشوب اور ہنگامہ خیز زندگی سے اکتا بھی گیا تھا اور تھک بھی چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ بڑھاپے نے بھی آکر دبوچا ہوگا۔ اولادِ نرینہ تھی نہیں کہ اس کے بعد ملک کی وارث ہوتی۔ ایک لڑکی تھی (بکھری بیگم) جس کو اس نے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ع میں اکبر کے نکاح(۲۷)، میں دے کر بقیہ زندگانی سکون اور اطمینان سے گزارنی چاہی۔ لیکن اطمینان اور سکون کا یہ زمانہ فقط دو ہی برس رہا۔ ۸ صفر ۹۸۲ھ/۳۰ مئی ۱۵۷۴ع کو استقا کے مرض سے ۸۴ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا(۲۸)، اور پھر دوسرے دو برس بعد اس کے مربی اور محسن بادشاہ، شاہ طہماسپ نے بھی اس دنیا سے رخصت ہو کر اس شخصی روابط کے باب کو 'تمت بالخیر'' کہہ کر ختم کر دیا۔

میر معصوم نے سلطان محمود کی مزاجی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے: ''حاکمی بود جامع صفات متضادہ، شجاعت کامل و سخاوتی شامل داشت.....ہمت او مشہور است وحدت مزاج او در نہایت استعلا بود۔ چوں در غضب آمدی ضبطِ خود بہ ہیچ وجہ نتوانستی و در خونریزی ملاحظہ نداشت و باندک توھم و بدگمانی خان و مان مردم برمی انداخت۔'' اور پھر ان صفات والے شخص کی وفات کی جب تاریخ نکالی تو یہ بشارت دی:

''در بھشت آسود''(۲۹)۔

۹۸۲ھ

حوالا جات

۱۔ Humayun in Persia, p.p.1-49, Calcutta,1948

۲۔ دیکھیے ۹۲۰ھ کا کتبہ جو میر فاضل کو کلتاش نے بابا حسن ابدال (بابا ولی) قندھاری کے مزار پر نصب کیا ہے (مجلۂ آریانا، کابل، ش ۱۰ سال ۶) اور تحفۃ الکرام (حصہ اول، ص ۹۵۔ ۱۹۲) مرتبہ راقم الحروف (۱۹۷۱ع)۔ نیز دیکھیے مولانا صبحی کی حکایت جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر فاضل 'گزیو' زمین داور کا جب صوبہ دار تھا، اس وقت اتنے ظلم کیے گئے تھے کہ لوگ چلا اٹھے (بدایع و تایع واصفی، چاپ مسکو، ص ص ۵۷۔۱۱۵۶) و تحفۃ الکرام،

ص ۴۹۵)۔

۳۔ شاہ بیگ کے دور میں سلطان محمود بکھر کا حاکم تھا (میر معصوم، ص ۱۲۲) اور شاہ حسن کے زمانے میں اس کی صوبے داری کے حدود بکھر سے سیوی اور شال (کوئٹہ) تک بڑھ گئے (طاہری، ص ۴۲)۔ سیوی سال ۹۵۰ھ میں اس کی تحویل میں آئی (میر معصوم، ص ۲۲۰)۔ بکھر کی نسبت سے محمود اس لیے مشہور ہوگئے کہ پورا وقت سندھ کے اسی حصے میں انہوں نے گزارا۔ "تاریخِ طاہری" نے لکھا ہے کہ: شاہ حسن نے ملتان کی فتح (۹۳۳ھ) کے بعد ملک کا یہ حصہ کاملاً اس کی نیابت میں دے دیا: "در بکھر رسید، محمود خاں بن فاضل کوکلتاش را در آنجا (بکھر) قائم مقام کرد و مہام ایں صوبہ از سرحد سیوان تا ملتان و سیوی و گنجاواہ بعہدۂ او گزاشت۔" (ص ۴۲)۔

۴۔ خوار سکان (فرہنگ جغرافیائی ایران، ج ۱۰، ص ۲۱۶۔ ۸۰)۔ (گنجینہ تاریخی اصفہان، ص ۳۰۳) اصفہان اور یزد کے راستے پر واقع ہے۔ "خراسگان" بھی لکھا گیا ہے (فرہنگ آبادھای ایران، ص ۱۷۰)۔ جی: (فرہنگ جغرافیائی ایران، ج ۱۰، ص ۲۱۶۔ ۶۰۔ فرہنگ آبادہای ایران، بخش اوّل، ص ۱۲۶)۔ جی اصفہان سے ملحق ایک دیہہ کا نام ہے۔ شعر میں اس طرح آیا ہے:

چہار شہر عراقش ہمیشہ باد مقام
بہ چار فصل کہ نبود زوالش اندر پی
ربیع در قم و ھنگام صیف در ھمدان
خریف در جیِ فرخندہ و شتا در ری

"قابوس نامہ" جی میں ختم کیا گیا ہے:

نوشت دفتر قابوس نامہ را بخطی
چو آفتاب ہویدا و در نظر چو جدی
بروز بیست و ہفتم ز ماہ ذیقعدہ
بسالِ شش صد و ہفتاد و سہ بخطہ جی

اسی طرح "کلیلہ و دمنہ" کا قدیم نسخہ (۶۷۳ھ) جی میں کتابت ہوا ہے:

بسال ششصد و ہفتاد و سہ بخطۂ جی
کہ شد تہی ز بد اندیشی و جفاکیشی
(از سعدی تا جامی، ص ۴۵۔ ۱۴۴)

جی کے قصبے کو راقم الحروف نے ۱۹۷۴ع کے مارچ میں دیکھا ہے اور اس پر ایک مقالہ بھی لکھا ہے (ہلال پاکستان، کراچی)۔ دراصل یہ عبارت غلط لکھی گئی ہے اور سہوِ کتابت ہے۔ ویسی ہی غلطی "منتخب التواریخ" انکی سے ہوئی ہے: "اصل ایشاں از ملوک جرہ من اعمال اصفہانست" (خطی) "جرہ" کے بجائے "جی" کا کلمہ ہونا چاہیے۔ میر معصوم میں عبارت یوں غلط ہوگئی ہے: "موضع خراسان و اصل ایشاں از ملوک چین من اعمال دارالسلطنت اصفہان۔" (ص ۲۱۸) حالانکہ ہونا چاہیے "موضع خراسکان و اصل ایشان از ملوک جی من اعمال دارالسلطنت اصفہان۔"

۵۔ تاریخ سندھ، از معصوم، ص ۲۱۸۔

۶۔ عراق اور عجم پر تیمور کا یہ دوسرا حملہ تھا(۱۳۸۷ء/۷۸۹ھ) جس میں اصفہان کے تمام باشندوں کو تہ تیغ کیا گیا تھا(History of Arghuns and Tarkhans of Sind, by Dr.M.H.Siddiqi 1972) بحوالہ توزک تیموری، ظفر نامہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر)۔

۷۔ سلسلہ اس طرح سندھ میں آیا۔
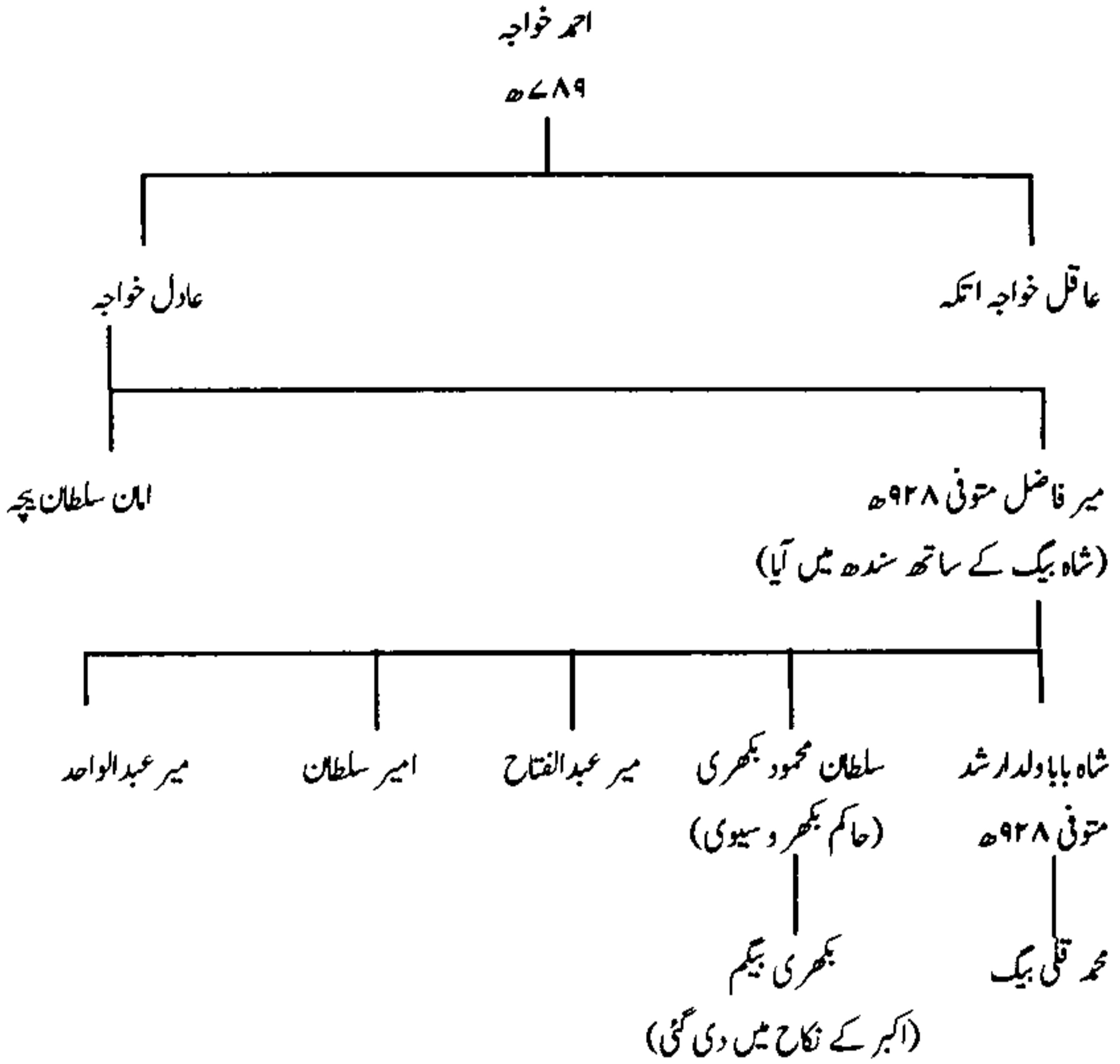
تفصیل کے لیے دیکھیے تاریخ معصومی۔ تحفۃ الکرام، چاپ راقم الحروف (ص ۲۰۰) یہی چند افراد تھے اور یہ سلسلہ یہیں پر ختم ہوگیا۔ سکھر اور بکھر میں کسی کی قبر یا مدفن گاہ کا پتا نہیں۔ کسی زمانے میں میر معصوم شاہ کے منارے کے سامنے، جہاں ڈاکٹر مس الفریڈ کا مکان تھا اور جانب مغرب فوجی عمارتیں تھیں، ایک قبر کاشی کاری کی خوب صورت موجود تھی۔ اس کو سلطان محمود کی قبر کہا جاتا تھا لیکن اب وہ بھی نئے مکان بننے کی وجہ سے مٹ مٹا گئی۔

۸۔ ہمایوں اور شاہ حسن ارغون کے درمیان جون کے قریب ہولناک جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود کے

ہاتھوں ہمایوں کے کئی نامی امرا مارے گئے اور بقول میر معصوم: "از حدوث این امر خاطر پادشاہ بغایت محزون گردید ..... لاجرم دل از سند سرد ساختہ راہ توجہ بجانب قندھار مصمم ساختند" (ص ۱۷۹) "تاریخ طاہری" بھی دیکھیے جس کے مولف نے اسی کشت و خون کی وجہ سے "محمود نامسعود' اوباش، بدمعاش کو کلتاش" کے الفاظ سے اس کو یاد کیا ہے (ص ۴۷)۔

۹۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۱۸۹۔

۱۰۔ دیکھیے "مراۃ الممالک" سدی علی رئیس (چاپ ۱۳۱۳)۔ سندھ کے حصے کو راقم نے ترجمے اور حواشی کے ساتھ رسالہ "مہران"، حیدر آباد (۱۹۷۱ء) میں شائع کیا ہے۔ صص ۱۱۷، ۱۵۵، ۱۲۱، ۳۹، ۴۶، ۴۸، ۱۲۲،۴۸، ۱۲۷۔ سدی علی رئیس سندھ میں ۲۰ ربیع الاول سے لے کر نصف شعبان ۹۶۲ھ تک رہا (پانچ مہینے اور پانچ روز)۔

۱۱۔ "خان" کے لقب کے لیے دیکھیے Encyclopedia of Islam, vol.II (ص ۸۹۸۔ ۸۹۷)۔ صفویوں کے دور میں چھوٹے صوبے کے حاکم کو سلطان کہا جاتا تھا۔ سلطان، خان کا زیردست ہوتا تھا جو اس سے بڑے صوبے کا والی ہوتا تھا (بارتول)۔ تیموری ترکوں کے سامنے خان کا لقب سلطان سے کہیں زیادہ اہم ہوتا تھا اور بڑے بڑے امرا کو دیا جاتا تھا۔ لقب 'خان' ازبکوں میں پادشاہ کا متبادل خیال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح صفوی پادشاہ "خانی" کا لقب فقط اہم ترین امرا کو دیتے تھے۔ یا ولایت کے حکمران یا والی کے لیے مخصوص ہوتا تھا (دائرۃ المعارف، غلام حسین، ج ۱، ص ۸۷۹)۔ "لغت نامہ دھخدا" میں تفصیل دیکھیے (کلمہ س، ص ۱۵۲)۔

۱۲۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۲۳۔ متن میں لفظ "اقوا" سہو کتابت کی وجہ سے ہے۔ دراصل یہ کلمہ قور ہے جس کے معنی ترکی میں جبہ اور سلاح کے ہیں۔

۱۳۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۲۳۔

۱۴۔ میر معصوم نے لکھا ہے کہ: سال ۹۶۶ھ میں یہ خبر پہنچی کہ بیرم خاں مکہ جاتے ہوئے سندھ سے گزرنے والے ہیں۔ سلطان محمود خاں نے "چہار باغ ببرلوی" کو تباہ کرادیا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ خطہ ہمایوں کو بہت پسند تھا اور ایک مدت تک اس نے یہاں قیام کیا تھا..... عین ممکن ہے کہ بیرم خاں بھی یہاں تک جائے۔ محمود خاں کی رشتہ داری جو ولی بیگ سے تھی، اس بنا پر واقعی بیرم خاں کا ارادہ تھا کہ اسی راستے سے آئے لیکن جب اس بربادی کی خبر سنی تو پٹن گجرات کا راستہ اختیار کرلیا (ص ۲۲۴) میر معصوم نے حسب دستور سال غلط لکھا ہے۔ بجائے ۹۶۶ھ، یہ سال ۹۶۸ھ کا واقعہ ہے جب کہ وہ اکبر سے رنجیدہ ہو کر مکہ معظمہ جارہا تھا اور گجرات میں مارا گیا (دیکھیے مقالات الشعرا، راقم الحروف کا شائع کردہ، ص ۹۹)۔

۱۵۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۲۵۔

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ عالم آرائے عباسی، ج ۱، ص ۱۱۶، طبع ایران۔

۱۸۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۲۵۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔

۲۰۔ احسن التواریخ (چاپ، برودہ، ۱۹۳۱ء، ص ۴۲۲)۔

۲۱۔ بیورج کا قول ہے کہ "خانِ خاناں" کا لقب بابر کے زمانے سے ہند میں رائج ہوا اور پہلا شخص جو "خان خاناں" کے لقب سے سرفراز ہوا وہ دولت خاں پسر دولت خاں (؟) تھا۔ یہ لقب ہندی مغلوں کے لیے مختص تھا اور انھی کا ایجاد کردہ تھا (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ۲: ۸۹۸)۔ "لغت نامہ، دھخدا" میں "اسندرلج" اور دیگر کتب کے حوالے سے آیا ہے کہ :پادشاہ چین بھی اسی لقب سے مخاطب تھا۔
نظامی کا شعر ہے :

خان خاناں رولنہ گشت ز چین
تا شود خانہ گیر شاہ زمین

ہر ترکی قبیلے کا جدا جدا سردار ہوتا تھا اور پھر ان تمام سرداروں کا ایک بڑا سردار ہوا کرتا تھا جس کے وہ تابع ہوتے تھے۔ اس سردار سرداراں کو "خان خاناں" کہتے تھے (رودکی، سعید نفیسی) مقدم اور امیروں کو "کور خاں" کہتے ہیں، یعنی 'خان خاناں" (جہاں کشائے جوینی) اور ذکر کردہ دولت خاں کا دلاور نام کا کوئی بیٹا نہیں تھا اور نہ ہی میری معلومات کی حد تک اس نام کے کسی شخص کو "خانِ خاناں" سے مخاطب کیا گیا تھا۔

۲۲۔ میر ابوالمکارم ولد میر غیاث الدین محمد سبزواری، میرزا شاہ حسن اور بعد میں سلطان محمود کے امرا میں شامل تھا۔ محمود خاں نے اس کو شاہ طہماسپ پادشاہ کی خدمت میں سفیر بناکر بھیجا تھا۔ پادشاہ نے اس کو "سلطان" کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔ بہت خوش طبع اور کمالات علمی سے آراستہ تھا۔ شعر بھی کہتا تھا (میر معصوم : ص ۲۳۹) "مقالات الشعرا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوالمکارم "سلطان" کا خطاب محمود خاں کے لیے لایا تھا : "برسم رسالت..... فرستاد، تا ازبرائے وی بانواع نوازش و خطابِ "سلطان" مراجعت کرد....." (ص ۱۷)۔ اسی طرح متضاد بیانات ملتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ محمود خاں کے لیے سلطان کا خطاب لایا۔ (دوسری کتابیں اس سلسلے میں دیکھنی چاہئیں : ماثر رحیمی (۲ : ۷ ۳۳۔۴۸۹)، تحفۃ الکرام، چاپ قدیم (۳ : ۲۸۔۱۲۷)۔ عالم آرائے عباسی اور احسن التواریخ روملو۔ جہاں ابوالمکارم کا ذکر آیا ہے وہاں خطاب "سلطان" کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں۔ اسی خطاب کے تنزل کے متعلق دائرۃ المعارف غلام حسین صاحب (۱ : ۲۲۔ ۱۳۲۳، چاپ ۱۳۴۵) میں دیکھنا چاہیے۔

۲۳۔ دیکھیے اکبر نامہ : ۲ : ۷ ۲۳۔ تحفۃ الکرام، شائع کردہ راقم الحروف، ص ۱۹۷۔

۲۴۔ Indo-Persian Relations, by Dr.Riaz-ul-Islam چاپ بنیاد فرہنگ ایران (۱۹۷۰ء) ص ۵۰۔ ۴۹۔ اس خط کا متن "عالم آرائے عباسی" ایک ورق (۱۷۸) پر لکھا ہوا ہے۔ عالم آرائے عباسی کا یہ نسخہ برٹش میوزیم (Add-16703/Add7654) میں موجود ہے۔ خط کا پورا متن میں نے پہلی مرتبہ "تحفۃ الکرام" میں چھاپ دیا ہے (ص ۴۹۵)۔

۲۵۔ دیکھیے تاریخ سندھ، میر معصوم۔ تاریخ طاہری۔ حواشی مکلی نامہ۔ تحفۃ الکرام۔

۲۶۔ دیکھیے اکبر نامہ ۲ :۹۷۔ ۲۷۸، کلکتہ۔ بدایونی ۲ :ص ۹۱، کلکتہ، ۱۹۳۱ء۔ عبارت یہ ہے : "درین ولا سلطان محمود والی قلعہ بکھر بمعاونت قزلباش کہ در قندھار میباشند، اطراف ولایت بندہ را مزاحمت میرساند" (نیز دیکھیے تحفۃ الکرام، ص ۴۹۵)۔

۲۷۔ تاریخ ۱۵ رجب، ۹۸۰ھ، بکھر سے رخصت کیا (تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۳۰)۔

۲۸۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۳۵۔ بدایونی ۲: ۷۶۔۱۶۵۔

۲۹۔ تاریخ سندھ، میر معصوم، ص ۲۳۷۔

17. CENTRAL ASIA: HISTORY, POLITICS AND CULTURE: being the Proceedings of the International Confreence on Central Asia November 1993. Edited by Dr. Riazul Islam, Dr. Kazi A. Kadir and Dr. Javed Hussain. Published, 1999.

Price Pak Rs:	**500.00**
US$:	**25.00**

18. NUSRAT NAMA-I-TARKHAN by Mir Muhammad b. Bayazid Purani. Edited by Dr. Ansar Zahid Khan. A rare work on the history of Sindh, compiled during Akbar's reign, of which there is only one manuscript in the world. Published in 2001.

Price Pak Rs:	**800.00**
US$:	**50.00**

19. ROZNAMA-I-GHAZAWAT-I-HINDUSTAN or Sa'adat Nama by Ghiyath ud-din Ali Yazdi. A diary of Timur's campaigns in India, which was one of the sources of Nizam Shami and Sharaf uddin Ali Yazdi. A highly important source work. Edited by Professor Iraj Afshar, Tehran, the foremost scholar of Iran. Joint publication with the Markaz-i-Nashr-i-Mirath-i-Maktub, Tehran, Iran. Published 2000.

Price Pak Rs:	**500 .00**
US$:	**25.00**

20. Sindhi Translation by Professor Nawaz Ali Shouq: of Professor Annemarie Schimmel's Lecture: MAKLI HILL: A Centre of Islamic Culture in Sindh. Published in 2001.

Price Pak Rs:	**40.00**
US$:	**5.00**

21. MAQALAT-I-SYED HUSSAMUDDIN RASHIDI (in Urdu), compiled and edited by Dr. Ghulam Mohammad Lakho.

INSTITUTE OF CENTRAL AND WEST ASIAN STUDIES

109, Faculty of Arts, University of Karachi, Karachi-75270

E-mai: icwas@yahoo.com

E-mail: icwas@pakwatan.com

Paperback Price Rs: **20.00**
US$: **2.00**

11. Second Syed Hussamuddin Rashdi Memorial Lecture: SYED HUSSAMUDDIN RASHIDI AND HIS LITERARY WORKS (in Urdu) by Malulana Syed Sabahuddin Abdur Rahman (Azamgarh). Printed 1984. Publication No. 11.

Hardbound Price Rs: **90.00**
US$: **9.00**
Paperback Price Rs: **75.00**
US$: **7.00**

12. JAMI' AL-TAWARIKH-I-HASANI by Hasan b. Shihab Yazdi (Compiled circa mid-9th centuryA.H./15th Century A.D.) Edited byDr. Iraj Afshar (Tehran). Publication No. 12 Text Series No.7, 1987.

Hardbound Price Rs: **90.00**
US$: **7.00**
Paperback Price Rs: **70.00**
US$: **5.00**

13. KHAN-I-KHANAN NAMA by Munshi Debi Prasad. Late 19th Century work on Abdur Rahim Khan-i-Khanan, based on Persian and Rajput Sources. Edited by Dr. M.H.A. Beg. Publication No. 13, Text NO. 8, 1990. (Output of print).

Paperback Price Rs: **60.00**
US$: **5.00**

14. MUTHMIR by Siraj-ud-din Ali Khan Arzu (died 1169/1756). Edited by Dr. Rehana Khatoon. MUTHMIR is the first work on Persian linguistics, presaging latterday researches on the affinity of Indo-Persian languages. Introduction by Dr. Abu Lais Siddiqui. Publication No. 14. Text Series No. 9. 1991. (Out of Print.)

Hardbound Price Rs: **400.00**
US$: **30.00**

15. BAIRAM KHAN by Professor Sukumar Ray. A definitive work on the life and Political role of Khan-i-Khanam Bairam Khan. Based on Persian sources. Publication No. 15, 1992. (Out of print).

1st Quality: Pak Rs: **200.00**
US$: **10.00**
2nd Quality: Pak R.s: **150. 00**
US$: **8.00**

16. THE DUTCH EAST INDIA COMPANY AND DIEWEL-SIND IN THE 17TH AND 18TH CENTURIES. By Professor Willem Floor (Holland). Based on Dutch sources little known or used earlier. Publication No. 16, 1993.

Price Pak Rs: **95.00**
US$: **6.00**

Appendices and Index, 17 pages of Introduction in English. The edition is based on an unique manuscript in the Bodleian Library, Oxford. Publication No.6. Text Series No.5 (out of print.)

Hardbound Price Rs: **110.00**
US$: **13.00**
Paperback Price Rs: **100.00**
US$: **12.00**

7. **SOUTH ASIAN TRAVELOGUE** (Bahr ul-Asrar), by Mahmud bin Amir Wali. Edited by Riazul Islam. 106 pages of Persian text: over 50 pages in English comprising a detailed Introduction and historical and geographical notes. Mahmud bin Amir Wali of Balkh here gives a fascinating account of his travels in India and Ceylon during the years 1624-31. Publication No.7. Text Series No.6. (out of Print).

Hardbound Price Rs: **50.00**
US$: **6.00**
Paperback Price Rs: **45.00**
US$: **5.00**

8. **A CALENDAR OF DOCUMENTS ON INDO-PERSIAN RELATIONS (1500-1750)** by Riazul Islam, Published in collaboration with the Bunyad-i-Farhang-i-Iran, Tehran, Volume 1, 1997. Brings together in standardized calendared form all the correspondence having a bearing on Mughul-Iran relations from Babur to Aurangzeb. It calendars 276 letters, and runs over 500 pages includinga detailed Introduction on the art of Insha, and an Index. Based on an extensive study of Persian and Turkish chronicles and collections of letters in the libraries of Great Britain, Europe, Turkey,Iran, Pakistan and India. Publication No.8.

Hardbound Price Rs: **250.00**
US$: **30.00**

9. **A CALENDAR OF DOCUMENTS ON INDO-PERSIAN RELATIONS, 1500-1750,** volume II, 1982. Published in collaboration with the Bunyad-i-Farhang-i Iran. This volume brings together all the correspondence of the Later Mughuls with the Later Safawids and Nodir Shah, and all relevant correspondence of the Mughul Empire and Iran with the Kingdoms of the Deccan, the Khanates of Turan and the Ottomon Empire; it contains 224 letters and runs over 450 pages including Index, Bibiliography and twenty facsimiles of documents. Publication No.9.

Hardbound Price Rs:
250.00
US$: **30.00**

10. **First Syed Hussamuddin Rashdi Memorial Lecture: MAKLI HILL,** A Center of Islamic Culture in Sindh by Professor Dr.Annemarie Schimmel, 1983. Publication No.10. (out of print)

Hardbound Price Rs: **50.00**
US$: **3.00**

INSTITUTE OF CENTRAL AND WEST ASIAN STUDIES

LIST OF PUBLICATIONS

1. **SHAMLU LETTERS:**
A New Source of Iranian Diplomatic Correspondence, Edited by Dr Riazul Islam, 1971. Based on unique MS in the British Museum. Throws fresh light on Mughul relations with Iran during Shah Jahan's reign. 92 pages of Persian text in facsimile, and 35 pages of Introduction in English, Publication No.1. Text Series No.1 (Out of Print)

Papeback Price Rs: **15.00**
US$: **2.00**

2. **DIWAN OF BAYRAM KHAN:**
Persian and Turki Diwans of Bayram Khan Khan-i-Khanan, Edited by Hussamuddin Rashdi and Dr. Muhammad Sabir, Introduction by Dr M.H. Siddiqi, 1971. 39 pages of Persian Poetry: 44pages ofTurkish poetry, 19 pages of Introduction in English, giving a succinct account of Bayram Khan's Life. Publication No.2 Text Series No.2, (out of Print).

Paperback Price Rs: **15.00**
US$: **2.00**

3. **TADHAKIRAT-USH-SHU'ARA,** of Emperor Jahangir, Edited by Academician Abdul Ghani Mirzoyef, Introduction and Annotation by Syed Hussamuddin Rashdi. 26 pages of Introduction in Urdu which brings under critical discussion Mutribi Samarqandi's attribution of the Tadkhira to Jahangir. Publication No.3, Text Series No.3.

Paperback Price Rs: **20.00**
US$: **3.00**

4. **KHATIRAT-I-MUTRIBI SAMARQANDI,** being Memoirs of Meetings with Emperor Jahangir, Edited by Academician Abdul Ghani Mirzoyef. 1977. Foreword by Dr. M. H Siddiqui. Total pages 82. Mutribi Samarqandi, author of the Nuskha-i-Ziba-i- Jahangir, here gives an account of his 24 sessions with Emperor Jahangir, at Lahore during 1626-27. The dialogues bring out vividly the artistic and Literary propensities of Emperor Jahangir. Publication No.4 Text Series No. 4 (out of Print.)

Paperback Price Rs: **20.00**
US$: **3.00**

5. **THE CALLIGRAPHERS OF THATA,** by Dr. M.A. Ghafur, 1978 pages 90, including an Index Plus 32 plates of inscriptions of Thatta and Bhanbhore. Publication No.5 (out of Print).

Paperback Price Rs: **65.00**
US$: **7.00**

6. **MAJMA' AL-SHU'ARA-I-JAHANGIR SHAHI,** of Mulla Qati'i-Herawi (died 1024/1615). Edited, Introduced and Annnotated by Dr. Muhammad Saleem Akhtar, 1979, 400 pages of Persian text including Bibligraphy,

مقالاتِ راشدی
سید حسام الدین راشدی
انسٹیٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز
جامعہ کراچی